SULTAN AHMAD

who gave you

HEERA

and

GANGA KI SAUGAND

now gives you

AN EMOTIONAL DRAMA OF HUMAN LIFE

"DHARAM KANTA"

Music :	*Photography :*	*Lyrics :*
NAUSHAD	R. D. MATHUR	MAJROOH

Story-Screenplay :	*Dialogue :*
BHARAT B. BHALLA	KADAR KHAN

★ing RAAJ KUMAR – WAHEEDA REHMAN – JEETENDRA
RAJESH KHANNA – REENA ROY – SULAKSHANA PANDIT
and AMJAD KHAN

ہندو پاک کے مقبول شاعر اور نغمہ نگار

قتیل شفائی پر ایک اہم ادبی دستاویز

نرگس پبلیکیشنز کی جانب سے "فن اور شخصیت" کی ایک اور

فخریہ پیشکش

قتیل نمبر

ترتیب:

ڈاکٹر راہی معصوم رضا

صابر دت

ہمارے گذشتہ شمارے

مہندر ناتھ نمبر
قیمت ۳۰ روپے

جاں نثار اختر نمبر
قیمت ۴۰ روپے

کملیشور نمبر
قیمت ۲۵ روپے

غزل نمبر
قیمت ۴۰ روپے

فیض احمد فیض نمبر
قیمت ۷۰ روپے

شخصیات

قتیل شفائی نمبر

مدیر اعلیٰ:

صابر دت

معاون مدیرہ:

حمیدہ قمر

انتخاب:

غزل — **عزیز قیسی**

گیت: — **راجندر کرشن**

حسن کار: — امروز

موجودہ شمارہ:

۶۰ روپے

بیرون ہند:

۱۵ ڈالر

نرگس پبلیکیشنز

۳۸ ریوپرس کورٹ لین، ہینڈلوم ہاؤس انیکس

پوسٹ بکس نمبر 1391

فورٹ بمبئی ۴۰۰۰۰۱ — فون: — 266710

زیر تحریر

شمارہ نمبر ۱۳ - ۱۴

ستمبر ۸۱ - مارچ ۸۲

کتابی شکل میں

اشاعت: جون ۱۹۸۲ء

خاکے: امروز (اندرجیت)

کتابت: سید ظفر مہدی اور دیگر

تصاویر بشکریہ

- نوید نقش (لاہور) • تنویر نقش (گلاسکو)
- سوہن راہی (لندن) • اسد مفتی (ہالینڈ)
- عزیز قیسی • اقبال محمد • جگن ناتھ آزاد • فکر تونسوی
- ڈاکٹر خلیق انجم • امریک آنند اور • بابا بہادر شاہ

ٹائٹل کے لئے تصاویر:

عالم اور ظفر شاہ



غریبِ شہر سخن ہائے گفتنی دارد

جب مجھ سے کوئی یہ کہتا ہے کہ تجھے کیا لکھنا چاہیئے اور کیا نہیں لکھنا چاہیئے تو مجھے بڑی کوفت ہوتی ہے کیونکہ میں صرف اپنے دل کی باتیں لکھنے کا قائل ہوں مگر کبھی کبھار دوستوں اور بزرگوں کا دباؤ پڑتا ہے اور تھوڑی دیر کے لئے اپنی بغاوت کو زنجیریں پہنانے پر مجبور ہو جاتا ہوں یہی اس اداریہ کی کہانی بھی ہے۔

"فن و شخصیت" کے اس "قتیل نمبر" کے لئے میں یہ دوسرا اداریہ لکھ رہا ہوں کیونکہ میرا پہلا اداریہ اپنی بے باکی کی وجہ سے بعض بزرگوں اور دوستوں کو پسند نہیں آیا تھا۔

اُس اداریہ میں میں نے کچھ زبان کی بات نکالی تھی۔ اردو کے کچھ ہندوستانی دوستوں کا ذکر کیا تھا اور یہ سوال اٹھایا تھا کہ پاکستان کے محمد طفیلوں کو آخر یہ توفیق کیوں نہیں ہوتی کہ وہ ہندوستانی اردو ادیبوں پر کوئی نمبر نکالیں۔

سیاسی طور پر ہندوستان اور پاکستان دو آزاد اور خود مختار ممالک ہیں۔ لیکن تہذیبی طور پر میں آج بھی انھیں الگ نہیں مانتا۔ اسی لئے فراق و مخدوم بھی ہمارے ہیں اور جوش و فیض بھی!

یہ "قتیل نمبر" بھی "اپنے فن" کے اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ کئی حضرات یہ پوچھ چکے ہیں کہ ہم آخر قتیل شفائی پر نمبر کیوں نکال رہے ہیں۔ قتیل نہ تو سیاسی طور پر بہت بڑے ہیں اور نہ ادبی طور پر۔ تو اس بات کا ایک جواب تو یہ ہے کہ قتیل ہمیں اچھے لگتے ہیں اس لئے ہم اُن کا نمبر نکال رہے ہیں۔ اور دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ بات تو آپ اُن ساٹھ ستر صاحبانِ قلم سے پوچھیئے جنہوں نے ہماری دعوت پر قتیل شفائی کے فن اور اُن کی شخصیت پر مضامین لکھے۔ اگر

صاحبانِ فہم کے اشتراک کو پیمانہ مانیں تو قتیل شفائی فیض احمد فیض سے انگل دو انگل اونچے نظر آئیں گے۔ لیکن میں گز لے کر ادیبوں کے قد ناپنے کا قائل نہیں ہوں۔ نقاد چاہے اپنے آپ کو کتنا ہی الگ تھلگ اور غیر جانبدار رکھے وہ داخلیت سے آزاد نہیں ہو سکتا اس لئے یہ بحث تو ہونی ہی نہیں چاہیے کہ کون کس سے بڑا یا چھوٹا ہے۔ جو شاعر اچھا ہے وہ بڑا ہے۔ اور جو شاعر اچھا شاعر نہیں ہے وہ شاعر ہی نہیں ہے۔ بحث ختم!

ڈاکٹر محمد حسن نے اپنے کسی مضمون میں کہیں میرے بارے میں یہ لکھا ہے کہ مجھ میں اگر ایک آنچ کی کسر نہ رہ گئی ہوتی تو میری گنتی بھی اچھے شاعروں میں ہوتی۔ میں ڈاکٹر محمد حسن کی اس بات کو تسلیم کرتا ہوں اور اسی لئے ہر شاعر میں میں وہی ایک آنچ ڈھونڈھتا رہتا ہوں جس کی کمی مجھ میں رہ گئی ہے اور مجھے جس کے یہاں وہ ایک آنچ مل جاتی ہے میں اسے اچھا شاعر مان لیتا ہوں۔

قتیل شفائی کے یہاں مجھے وہ ایک آنچ ملی ——————

اگر میری نگاہ میں میری اپنی رائے کی کوئی قیمت ہوتی تو میں بھی قتیل کے فن اور اُن کی شخصیت میں بخیہ لگانے یا ان کا بخیہ اُدھیڑنے کی کوشش ضرور کرتا۔ لیکن اس نمبر میں مجھ سے بہتر لوگوں نے اُن کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ تو میری خاموشی نامناسب نہیں ہے۔

لیکن میں اتنا ضرور عرض کروں گا کہ شاعری میں مصوری اور موسیقی کو شامل کرنے کا کام تو تمام قدیم اور جدید اچھے شاعروں نے کیا۔ مگر قتیل کے سوا رقص کو کسی دوسرے نے شاعری میں تحلیل کرنے کی کوشش نہیں کی۔

میں آخر میں اُن تمام فسادیوں کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جن کے فساد برپا کرنے نے ہماری ہمت افزائی کی اور ہم اتنا خوبصورت اور اتنا بلیغ نمبر آپ کی خدمت میں پیش کرنے کے لائق ہو سکے۔

اپنے دو دوستوں سُنیل دت اور راج کھوسلہ کا شکریہ ادا کرنا بھی میرا فرض ہے کہ اُن کے عملی تعاون کے بغیر نہ "فیض نمبر" نکل سکتا تھا اور نہ "قتیل نمبر"۔ ہم نے اُن کی زندگی تلخ کی اور انھوں نے ہمیں اپنی زندگی تلخ کرنے کا حق دیا۔ خُدا ایسے دوست دشمنوں کو بھی دے کہ وہ کچھ تو دوستی کرنا سیکھ لیں۔

راہی معصوم رضا

من آنم کہ من دانم

مہابردست کی یہ ستم ظریفی نہیں تو کیا ہے کہ وہ "قتیل شفائی نمبر" شائع کر رہے ہیں یہ سوچے بنا کہ یار لوگ کیا کہیں گے؟ میرے "یار لوگ" بھی اور اُن کے "یار لوگ" بھی! اور اگر دونوں یار لوگوں نے مل کر کچھ کہنا شروع کر دیا تو اُن کی زبان کون پکڑے گا؟ اس لیے کہ وہ جو کچھ بھی کہیں گے درست کہیں گے کیونکہ وہ اس سے پہلے بھی درست ہی کہتے چلے آ رہے ہیں۔

بات یہیں ختم ہو جاتی تو ہم دونوں کا بھلا ہوتا لیکن موصوف چاہتے ہیں کہ میں "قتیل شفائی" نمبر کے سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار بھی کروں یہ تو وہی بات ہوئی کہ "آ بیل مجھے مار" ——— اگر میں انکسار سے کام لے کر یہ کہتا ہوں کہ "اجی صاحب میں کس قابل ہوں آپ تو خواہ مخواہ مجھے اس نمبر کے کانٹوں میں گھسیٹ رہے ہیں" تو بھی جگ ہنسائی ہوگی ——— اور اگر شاعرانہ تعلّی کے حوالے سے یوں فرماؤں کہ حضرت اگر آپ یہ نمبر شائع نہ کرتے تو مستقبل کا نقّاد آپ کو پرلے درجے کا بددیانت قرار دیتا۔ تو بھی مذاق کا نشانہ تو بننا ہی پڑے گا۔ سو میرا خیال ہے کہ مجھے اس نمبر کے سلسلے میں خاموش ہی رہنا چاہیے ——— ہاں جب یہ نمبر شائع ہو جائے تو جس جس گلی سے جو پتھر آئے اُسے اپنے لیے ایک اعزاز سمجھ لینا میرے لیے ضروری ہو سکتا ہے کیوں کہ اس کم فرصتی کے دور میں پتھر پھینکنے کی بھی کسے فرصت ہے۔

قتیل شفائی

ورق ورق زندگی

پیدائش۔ ۲۴ر دسمبر ۱۹۱۹ء　　بمقام: ہری پور ہزارہ (سرحد)

تعلیم: گورنمنٹ ہائی اسکول ہری پور ہزارہ

شادی: سنہ ۳۳ء میں ہوئی　　اولاد: تین بیٹے (پرویز، تنویر اور نوید) دو بیٹیاں (مسرت، ثمینہ)

مشاغل۔ "ادبِ لطیف" لاہور اور "سنگِ میل" پشاور کی ادارت ابتدائی دور میں پاکستان رائیٹرز گلڈ مغربی پاکستان کی سکریٹری شپ آٹھ برس تک پاکستان کی اولین فلم "تیری یاد" سے تادمِ تحریر نغمہ نگاری۔

ادبی اعزاز: مجموعہ کلام "مطربہ" پر پاکستان کا اہم ترین ادبی انعام آدم جی پرائز حاصل کیا۔

فلمی اعزاز: مختلف فلموں کے بہترین نغموں پر سولہ ایوارڈ حاصل کئے۔

نمائندگی: امریکہ، برطانیہ، سوویٹ یونین، کینیڈا، فرانس، ہالینڈ اور انڈیا کے ادبی اجتماعات میں پاکستان کی نمائندگی کی (مشاعروں کے علاوہ)

تصانیف:

"ہریالی"	ابتدائی گیتوں کا مجموعہ
"گجر"	نظموں، غزلوں اور گیتوں کا مجموعہ
"جلترنگ"	نظموں اور غزلوں کا مجموعہ
"روزن"	نظموں اور غزلوں کا مجموعہ
"جھومر"	گیتوں کا مجموعہ
"مطربہ"	یک موضوعی نظموں کا مجموعہ
"گفتگو"	غزلوں کا مجموعہ
"چھتنار"	نظموں کا مجموعہ
"پیراہن"	غزلوں کا مجموعہ
"آموختہ"	غزلوں اور نظموں کا مجموعہ

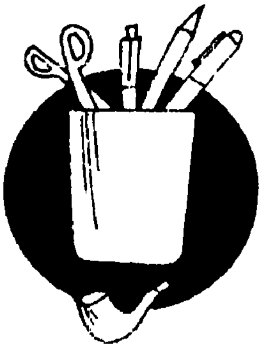
شوقِ فلمسازی: "اک لڑکی میرے گاؤں کی" اردو میں شروع کی جو مکمل نہ ہو سکی۔ "عجب خان آفریدی" پشتو زبان میں بنائی جو کامیاب ہوئی۔ "قصہ خوانی" ہندکو زبان میں بنائی جو فلاپ ہو گئی ——

قتیل ـــ میرا چہرۂ جاں

محشر بدایونی۔ ناظم آباد، کراچی

قتیل نظم و غزل کا شاعر — وہ آج کا اور کل کا شاعر
جمالِ انسانیت کا مظہر — نفاست و شعریت کا پیکر
وہ اک نشاں صلح مندیوں کا — وہ اک ہمالہ بلندیوں کا
وہ سب میں فرد اور سب میں شامل — نہ خود ہی تنہائی خود ہی محفل
زباں شگفتہ۔ کلام سادہ — وہ آپ اپنا چراغِ جادہ
خلوص پر جان دینے والا — وفا کو پہچان دینے والا
بڑی سکت اس کے ظرف میں ہے — نئی چمک اس کے حرف میں ہے
وہ دل میں رکھ لے لیں جو کانٹے — خزاں سمیٹے ـــ بہار بانٹے
ہنر کی خوشبو نگر نگر ہیں! — شریک ہے وقت کے سفر میں
وہ فن کے شجرے کو مانتا ہے — قلم کی حرمت کو جانتا ہے
فدائے تاثیرِ ہر سخن ہے — وہ مخبرِ معجزاتِ فن ہے
کہیں جرس میں سنائی دے وہ — کہیں ستارہ دکھائی دے وہ
برستا اس کا گھٹا دُھن جیسا — وہ دھوپ بھی ہے تو چھاؤں جیسا
نگارِ دل اعتبار اس کا — قصیدے لکھوائے پیار اس کا
محبت ایمانِ شاعری ہے — یہ شاعری دل سپردگی ہے
وہ یوں بھی ہے خوش قیاس میرا — کہ وہ ہے قیمت شناس میرا

وہ جانِ جاں میرا چہرۂ جاں
قتیل شاعر ـــ قتیل انساں



پڑھنے والوں کے نام

"صابر دت کا دماغ خراب ہوگیا ہے" "فیض احمد فیض" کے بعد "نقش لائلپوری نمبر" نکال رہا ہے ——— نقش معمولی شاعر ہے، فلموں میں گیت لکھتا ہے، گیت تو مجروح بھی لکھتا ہے"۔
جب میں نے "نقش لائلپوری نمبر" کا اعلان کیا تو کچھ اسی قسم کی آوازیں میرے کانوں میں بمبئی کے ادبی حلقوں سے پڑنے لگیں۔

میں نے نقش کی غزلوں کا انتخاب عزیز قیسی، اس کے گیتوں کا انتخاب راجندر کرشن اور اس کی نظموں کا انتخاب ڈاکٹر راہی معصوم رضا کو سونپ کر۔ حمیدہ قمر (معاون مدیرہ فن اور شخصیت) کو انڈو پاک کے ادیبوں کی ایک فہرست تھما دی اور چندی گڑھ عالمی اردو کانفرنس میں چلا گیا۔

راستے بھر ٹرین میں سوچتا رہا کہ نقش واقعی معمولی شاعر ہے کیونکہ وہ خود اپنے پیسے خرچ کر کے اپنی کتابیں نہیں چھپواتا، ناشر اس کے پیچھے پیچھے گھومتے ہیں۔ اس کی مقبولیت کی خوشبو برصغیر سے باہر بھی کئی ممالک تک پھیل چکی ہے کیونکہ وہ بہت معمولی شاعر ہے۔!

نقش نے فلموں میں گیت لکھنے کے بعد صرف دس شعری مجموعے "دنیائے شعر و ادب" کو دئیے جبکہ ہمارے یہاں ہر ادیب و شاعر فلم میں آنے کے بعد فلم کا ہی ہو کے رہ جاتا ہے۔

میری سمجھ میں معمولی، بڑے اور عظیم شاعر کی تفریق اب تک نہیں آئی، کیونکہ اس سے پہلے میں ساحر لدھیانوی، جاں نثار اختر، فراق صاحب اور فیض صاحب سے مل چکا تھا ——— گویا معمولی اور بڑے شاعروں سے۔

عظیم شعراء سے میری ملاقات بمبئی میں ہوئی، یا چند ناقدوں کی فہرست میں۔ عظیم شاعر زیادہ تر باتھ روم میں رہتے ہیں یا کسی سیمینار میں یا پھر کسی فلم پروڈیوسر کی سٹنگ پر۔

چندی گڑھ سے لوٹتے ہی میں بیمار پڑ گیا ——— ایک ماہ بستر پر پڑا رہا—

قتیل نمبر کی EDITING ٹیلی فون پر ہی ہوتی رہی۔ بہت سے ادیبوں کے مضامین آ گئے۔ کچھ نے قتیل کی کتابیں مانگیں۔ کچھ کو حمیدہ نے نمبر دے دیئے۔ اس طرح ان تین مہینوں میں قتیل نمبر مرتب ہو گیا جو آپ کے سامنے ہے۔

"یعنی ایک معمولی شاعر کا نمبر!"

اس نمبر میں آپ کو صرف قتیل شفائی ہی نظر آئے گا۔ اگر اب تک آپ اس سے نہیں ملے تو اس شمارے کے ذریعہ نہ صرف آپ اس سے متعارف ہو جائیں گے بلکہ اچھی طرح واقفیت حاصل کر لیں گے۔

اگر یہ شمارہ آپ کو پسند آئے تو اس کی داد آپ ڈاکٹر راہی معصوم رضا، عزیز قیسی، راجندر کرشن اور حمیدہ قمر کو دیجئے۔ میں نے تو صرف اس نمبر کا خاکہ تیار کیا ہے۔ بقول فلم والوں کے اسکرین پلے (SCREENPLAY) بنایا ہے۔

آخر میں

میں ہندو پاک کے ان تمام ادیبوں، شاعروں اور نقادوں کا شکر گزار ہوں جنہوں نے اپنے مضامین سے مجھے نوازا اور قتیل شفائی نمبر کی قدر و قیمت میں اضافہ کیا۔

اب
اگلے شمارے تک کے لئے اجازت دیجئے
خدا حافظ!

مخلص
صابر دت

قتیل شفائی نمبر

ترتیب

پیغامات

کام آگئی دیوانگی اپنی

غزل کہتے ہیں

شاعری سچ بولتی ہے

آئینے کے سامنے

مطربہ کا مطرب

سوچ سمندر سے گہری

نغمہ آنگن آنگن

پرنٹر پبلشر **حمیدہ قمر** نے شری سیدھ لیتھو ورکس 172- اے جگن ناتھ شنکر سیٹھ روڈ بمبئی ۲ سے چھپوا کر ۴۸ پولیس کورٹ لین ہینڈلوم ہاؤس اینکسی فورٹ ۱ سے شایع کیا۔



اِنتساب

اِنسان دوست اور اُردو نواز

کے۔ کے۔ اُپل

(چیئرمین پورٹ ٹرسٹ ، ممبئی)

کے نام

جس کی گفتار سے نیل دو نیم :
جس کی خموشی سے فغانِ نیم شبی سربلند

صابر دت

فیض احمد فیض — بیروت

مجھے مسرت ہے کہ فن و شخصیت نے آئندہ شمارے کے لئے ہمارے عزیز دوست قتیل شفائی کو منتخب کیا ہے:

مطرب، نغمہ گر، شگفتہ طبع، شیریں گفتار قتیل شفائی ترقی پسند شعراء کے قافلے میں اہل قافلہ کے ہمسفر بھی ہیں اور اُن سے جدا بھی۔ اگر جذباتی اور نظریاتی معاملات میں اُن کے دل و دماغ اپنے ہمرہوں کے ہم آہنگ ہیں تو اظہار و ترسیل کے مقامات میں قتیل کی آواز منفرد بھی ہے اور ممتاز بھی۔ اوّل تو کچھ یوں ہے کہ گویا قتیل نے کسی پلیٹ فارم یا چھت پر کھڑے ہو کر اپنے پڑھنے سننے والوں کو وعظ و تلقین سے مستفید نہیں کیا بلکہ انہیں کے ساتھ فرش پر بیٹھ کر میٹھی کڑوی باتیں کی ہیں پھر ان باتوں میں بھی غیظ و احتجاج کی کڑواہٹ کم ہے۔ درد و محبت کی مٹھاس زیادہ، دوسرے یوں ہے کہ جو کچھ لکھا ہے "بلا شرکتِ غیرے" لکھا ہے، جو کچھ کہا ہے کسی کے کہنے پر نہیں اپنے دل کی شہادت پر کہا ہے۔ الفاظ کے طرز بیل بوٹے نہیں بنائے، افکار میں کسی بال کی کھال اتارنے کی کوشش نہیں، حسن اور لاشعور کے جوہر میں ڈبکیاں نہیں لگائیں، دھیمے سُر لگائے ہیں اس لئے نغمہ کبھی بے سرا نہیں ہونے پاتا، ہلکے رنگ استعمال کئے ہیں اس لئے تصور کا کوئی نقش آنکھ میں نہیں کھٹکتا، یہی سادگی اور کم نمائی اُن کے فن اور شخصیت کی نمایاں خوبی ہے۔ یہی شیرینی اور رسیلا پن اس کا زیور،

سنتے آئے ہیں کہ کسی شاعر یا ادیب کا صحیح مقام آنے والی نسلیں متعین کرتی ہیں، یہ بات اپنی جگہ مسلّم لیکن یہ دیکھنا بھی لازم ہے کہ سخنور نے اپنے زمان و مکان کے دائرے میں کتنے دلوں میں گھر کیا ہے اور اس کے کہے سے کتنے پڑھنے سننے والوں کو محسوس ہوا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے، اس اعتبار سے قتیل شفائی کا کلام اپنے وقت کی مخلوق میں یقیناً مقبول اور محبوب ہے: عاقبت کی خبر خدا جانے۔

فیض احمد فیض

اِفتخار عارف — لندن

ہمارے عہد میں جن لوگوں کے سبب اردو شاعری کو اعتبار و افتخار حاصل ہوا ان میں ایک ممتاز اور اہم نام قتیل شفائی کا ہے۔ قدرت نے انھیں بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں سے سرفراز فرمایا ہے۔ انہوں نے خود اپنی ساری زندگی شجرِ ہنر کی آبیاری میں صرف کر دی۔ قتیل نے غزل لکھی، نظم لکھی، گیت لکھے اور سب ایسے کہ اردو دنیا اُن تازہ تخلیقات کے لئے ہمہ تن انتظار رہتی ہے۔ ادب کی بارگاہ قبول عام میں کم لوگ ہوں گے جو قتیل شفائی سے ہمسری کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔

مُردہ پرستی کے دور میں زندہ لوگوں کی صلاحیتوں کو تسلیم کرنے اور اُن کی تصدیق کرنے کا ہُنر صابر دت کو خوب آتا ہے۔ میں اُردو مرکز کی جانب سے اُن کے اس رویہ پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

افتخار عارف
معتمد اعزازی اُردو مرکز۔ لندن

احمد فراز　　اسلام آباد۔ پاکستان

میرے دل میں قتیل صاحب کی شاعری اور شخصیت کی قدر ہے۔ وہ ہمارے عہد کے سینئر SENIOR لکھنے والوں میں سے ہیں۔ ملنسار خوش گو اور خوش طبع ہیں اور اپنے عہد کے مسائل پر نظر رکھتے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ بھارت کے جریدے اس قسم کی دستاویزات مرتب کرنے میں پہل کر رہے ہیں جو دو ملکوں کے لوگوں کو قریب لانے میں محبت کے پُل کا درجہ رکھتی ہیں۔

مجھے اس سے زیادہ خوشی ہوگی اگر یہ ٹریفک دو طرفہ ہو جائے، اور اس طرح ایک طرف تو لکھنے والوں کو اپنے قبیلے کے لوگوں کو سمجھنے اور ان سے قریب تر آنے کا موقع ملے اور دوسری طرف کوئی ایسی صورت نکل آئے کہ اُن کی تصانیف کا خون دونوں ملکوں کے پبلشر بھیڑیے پینا بند کر دیں۔

میں جریدہ فن اور شخصیت کو "قتیل نمبر" شائع کرنے پر محبت بھری مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

احمد فراز
۱۳ر مئی۔ ۸۲ء اسلام آباد۔ پاکستان

سُنیل دت　　شریف آف بمبئی

ڈیئر صابر دت!

فن اور شخصیت کا فیض نمبر تم نے خوب نکالا۔ یقیناً تمہاری محنت کے لئے دل سے تعریف نکلتی ہے۔ اُردو زبان ہمیشہ سے کو پیاری رہی ہے اور اس زبان نے جو اچھے شاعر ہمیں دئے ہیں اُن پر خصوصی نمبر نکال کر تم نے ادب میں ایک مثالی کام کیا ہے۔ اس کی تقلید سے بہتوں کو فائدہ ہوگا۔ سچ تو یہ ہے کہ ایسے ٹھوس کام بڑے بڑے ادارے ہی کر سکتے ہیں لیکن تم اکیلے ہی ہمت کر کے چلے تو کامیابی سے پہلے کچھ مشکلات بھی ضرور سامنے آئیں گی۔ ایڈونچر زندگی میں مجھے بھی پسند رہا ہے۔ یوں تمہارے کاموں سے ایک لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ تمہاری محنت اور لگن کو دیکھ کر دل سے دُعا نکلتی ہے کہ تمہیں مخلص انسانوں کا تعاون ملے۔ "فیض نمبر" کی طرح "قتیل نمبر" بھی خوبصورت اور معیاری ہوگا۔ "قتیل شفائی نمبر" جیسے ہی چھپے اُس کی ایک کاپی مجھے بھجوا دو۔ نہ جانے کس نے غالب کا ایک مصرع سنایا تھا۔ ابھی جو کیفیت ہے ٹھیک ویسی ہے۔ ع
اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ۔

مخلص: سُنیل دت

احمد ندیم قاسمی —— لاہور (پاکستان)

مکرمی صابر دت صاحب۔ تسلیم

برادرم قتیل صاحب سے آپ کو میری طویل علالت کا پتا چلا ہوگا۔ قتیل نمبر کے لئے پیغام تو میں بہت پہلے بھجوا دیا مگر یہ سوچ کر کہ نمبر تو اب اشاعت پذیر ہو چکا ہوگا، خاموش رہا۔ اچانک کل آپ کا تار ملا، اور میں فوراً لکھنے بیٹھ گیا۔ یہ مختصر سا پیغام نذر کر رہا ہوں خدا کرے بروقت مل جائے اور مجھے بھی قتیل نمبر میں شمولیت کی مسرت حاصل ہو۔

طویل علالت نے اتنی مہلت نہ دی کہ میں قتیل کے سے خوبصورت شاعر اور دلآویز وجود کے فن اور شخصیت کے بارے میں تفصیل سے کچھ عرض کر سکتا۔ دو آپریشنوں کی آزمائش میں سے گزرنے کے بعد اگرچہ اب گھر واپس آ چکا ہوں مگر نقاہت اتنی شدید ہے کہ لگ کر کوئی کام انجام دینے کی نہ قوت ہے نہ حوصلہ۔ میرا پختہ ارادہ تھا (اور یہ میرا فرض بھی تھا) کہ قتیل کی سراسر منفرد شاعری کو اس کے حقیقی تناظر میں دیکھوں اور دکھاؤں مگر حالات نے بے بس کر دیا ہے۔

آپ کی عالی حوصلگی کی تحسین کرنا ہوگی کہ آپ نے اتنے معیاری اور ضخیم خاص نمبروں سے اردو ادب کو مزید باثروت بنایا اور پھر حال ہی میں فیض نمبر شائع کرنے کے فوراً بعد قتیل نمبر بھی شائع فرما رہے ہیں۔ تاریخ ادبِ اردو میں آپ کے یہ کارنامے ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

قتیل اس دور کا شاید سب سے رسیلا شاعر ہے مگر شعر و فن کے بیشتر نقادوں نے اس کے ساتھ ہمیشہ تعصب برتا ہے۔ اس کی شاعری کے حسن، اس کے موضوعات کے تنوع اور اس کے لہجے کی مٹھاس اور کاٹ کی وہ داد اسے شاذ ہی ملی ہے جس کا وہ بدرجۂ اولیٰ مستحق ہے۔ دراصل ہمارے ہاں کی تنقید بہت سک چڑھی ہے۔ اور شاید احساسِ کمتری کی بھی شکار ہے کہ فرانس اور انگلستان کا بودا سے بودا شاعر بھی اس کے نزدیک بے مثال ہے، مگر اپنے ہاں کا بھرپور سے بھرپور شاعر بھی تشنہ اور ادھورا ہے۔ پھر آج سے برسوں پہلے اگر کسی معروف نقاد نے دو چار شعراء کے سینے پر تمغۂ عظمت آویزاں کر دیا تو بعد کے ہر نقاد کی آنکھیں اس تمغے سے خیرہ ہوتی رہیں گی اور اس کی مجال نہیں ہوگی کہ وہ اپنے آس پاس بھی نگاہ دوڑا سکے۔ اور اپنے مطالعے سے اپنے نتائج اخذ کر سکے۔ چند دیگر اہم شاعروں کے علاوہ قتیل کے ساتھ بھی یہ بددیانتی برتی گئی ہے۔ مگر قتیل کو تو جیسے کسی داد و بیداد کی پرواہ ہی نہیں۔ وہ پوری تندہی سے تخلیقِ شعر کئے جا رہے ہیں اور اس کی ہر نئی تخلیق، نئی تازگی اور آفاق کی نئی وسعتوں اور نئے امکانات سے مزین ہوتی ہے۔ کہیں تھکن کے آثار نہیں، تکرار کے آثار نہیں، رجعت کے آثار نہیں۔ زندگی اور اس کی لطافتوں سے چھلکتا ہوا یہ شاعر نہایت استقامت کے ساتھ تخلیقِ فن کی شاہراہ پر رواں دواں ہے اور داد و تحسین سے اتنا بے نیاز ہے کہ اگر وہ اس معاملے میں حساس ہوتا تو نقادوں کے سلوک کے حوالے سے کب کا ترکِ فن کر چکا ہوتا۔ اعلیٰ شاعری کے علاوہ فلمی شاعری میں بھی قتیل کے کمالات کا اعتراف

کہنا ضروری ہے کہ اس سے کبھی آرزو لکھنوی، ساحر لدھیانوی، مجروح سلطانپوری، سیف الدین سیف اور احمد راہی کی طرح فلموں کے لیے فنی لحاظ سے بلند پایہ گیت لکھے۔ ایسے گیت جن میں سے بیشتر کو تخلیقی ادب کے اچھے نمونے قرار دیا جا سکتا ہے۔ اعلیٰ معیار کی شاعری کو عوام الناس کے دلوں اور دماغوں کے اتنا قریب لے جانا کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے۔

آئندہ صدیوں میں جب بیسویں صدی کے چند بڑے اور اہم شاعروں کی فہرست تیار ہوگی تو اس میں قتیل شفائی کا نام بہرصورت شامل ہوگا کہ قتیل نہ صرف حُسنِ اظہار کے معاملے میں بلکہ حسنِ فکر کے معاملے میں بھی شستہ اور غیر فانی شاعر ہے۔

آپ کا مخلص

احمد ندیم قاسمی

اندر کمار گجرال ——— نئی دہلی

یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ اپنی سابقہ روایات کو برقرار رکھتے ہوئے "فن اور شخصیت" اب قتیل شفائی نمبر شائع کر رہا ہے۔ ہندوستانی ادب کی تاریخ میں "فن اور شخصیت" کی خدمات کو ہمیشہ سراہا جائے گا۔ "فن اور شخصیت" کے مدیر صابر دت قتیل نمبر کے ذریعہ ہمیں برِصغیر کے ایک عظیم شاعر کے ادبی کارناموں سے واقف کروا رہے ہیں۔

اُردو شاعری کو قتیل کا عطیہ بیش بہا ہے۔ عصرِ حاضر کے تقاضوں کی ترجمانی کرتے ہوئے قتیل نے نہ صرف اپنی شاعری کو رفعتوں سے آشنا کیا ہے بلکہ اُردو شاعری کو بھی نئی سمت دی ہے۔

میری دُعا ہے کہ قتیل صاحب سالہا سال ہزار برس جئیں۔ اور "فن اور شخصیت" کا قتیل نمبر ایک یادگار دستاویز بن کر جگمگاتا رہے۔

ڈاکٹر تاراچرن رستوگی ——— گوہاٹی

مائی ڈیر صابر صاحب

جیسے ہی یہ خبر ملی کہ "فن اور شخصیت" کے آئندہ خصوصی شمارہ کو قتیل شفائی سے نسبت ہوگی یقین جانیے بے ساختہ دل چاہا کہ آپ تک اپنی مبارکباد پہنچاؤں۔ آپ نے ہمیشہ اپنے موقر جریدہ "فن اور شخصیت" میں اہمیت اور گہرائی کے موضوعات کو پیش کیا ہے۔ یوں آپ کی صلاحیتوں کے اعتراف کے ساتھ میں نے اپنے اندر کہیں رشک کے جذبہ کو بھی آنکھیں کھولتے دیکھا ہے۔ "فن اور شخصیت" یہ خصوصی پیشکش کو علم و ادب کی تحقیقی راہ گزار میں سنگِ میل مانتا ہوں۔ یہاں فنکار کی خلاقی، اس کے سماجی پس منظر اور نفسیاتی عوامل، فنکارانہ تخلیقات کی طرزیں، عصری رویّوں، فنکار و فنکاری کا باہم رشتہ، دورِ حاضر میں زندگی کا تناؤ اور دباؤ اور اسی قبیل کے دیگر معاملات سے آگہی اور ان کی ترجمانی و تفسیر کھلے کھلے بکھیر دی جاتی ہے۔
آپ کے کام کی اس سمت و رفتار کو دیکھتے ہوئے اُمید کی جا سکتی ہے کہ قتیل شفائی نمبر بھی فنی تکمیل کے ساتھ اپنے

وجود میں ایک مختصر لائبریری سے کم نہ ہوگا۔ اُردو میں تحقیقی کاموں سے شغف رکھنے والے طالب علموں کے لیے یہ مشعلِ راہ بنے گا۔ اور عمومی طور سے اُردو ادب کی صدرت کے ساتھ بالخصوص شعر و سخن کی قدر پیمائی کے باب میں اسے ایک گرانقدر اضافہ تسلیم کیا جائے گا۔

اب تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ صابر دت کسی فردِ واحد کا شخصی نام نہیں ہے بلکہ اُس اہلیت و تحمل کو صابر دت کہتے ہیں جو اس کی وسیع کائنات میں خوب سے خوب تر ستاروں کی جستجو میں سدا منہمک نظر آئے۔

فیض نمبر کی پذیرائی کا اندازہ کیا ہوگا اس کے بارے میں کیا پیش گوئی کی جاسکتی ہے۔ نیک تمنائیں قبول فرمایئے۔

مخلص

ڈاکٹر ٹی۔ سی۔ رستوگی

ایم۔ اے (ٹرپل) پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ریسرچ گائیڈ، گوہاٹی۔ یونیورسٹی

مالک رام ——————— نئی دہلی

جناب صابر دت صاحب۔

آداب!

میں بہت شرمندہ ہوں کہ کمزوریات کے باعث میں آج تک آپ کے گرامی نامے کا جواب نہیں دے سکا۔ معذرت خواہ ہوں۔ میں فیض شفائی کا مداح ہوں۔ وہ اُردو کے خادم ہیں اور اُردو کا ہر خادم میرا محبوب ہے۔ پس، جو بھی میرے محبوب کا مداح ہے، میں اس کا مداح ہوں۔ فیض اس کے جائز طور پر مستحق ہیں کہ اُن کے فن کی قدر و منزلت کی جائے۔ اگر آپ اپنے رسالے کا فیض شفائی نمبر شائع کر رہے ہیں، تو گویا ہم سب کی طرف سے فرض کفایہ ادا کر رہے ہیں، اس کے لیے ہم سب کو آپ کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ میں آپ کی کامیابی کے لیے دعاگو ہوں۔ والسلام والاکرام

خاکسار

مالک رام

پروفیسر محمد حسن ——————— نئی دہلی

فیض شفائی اُردو ادب کے طرح دار ادا ایسے شاعروں میں ہیں اُن کے نغموں کی جھنکار موہ لینے والی ہے۔ ان کی شاعری اور شخصیت کا جادو اُن کے وطن سے لے کر پوری اُردو دنیا تک پھیلا ہوا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اُن کا مترنم احساس جو نغموں میں ڈھل کر ہر اس دل کو چھو لیتا ہے جو درد اور کیف سے آشنا ہو۔ ایسے تمام لمحے جو فیض جیسے شاعر کی وساطت سے ادب دوستوں اور نغمہ آشنا انسانوں کو ملے ہیں اس کا تقاضا کرتے ہیں کہ ان کو خراجِ عقیدت پیش کیا جائے۔ ہندوستان میں یہ خراجِ عقیدت دہری اہمیت اور معنویت رکھتا ہے۔ اس سے اُردو کی بین الاقوامی اہمیت اور مقبولیت کا ثبوت بھی ملتا ہے اور

شاعری کی ہمہ گیری اور ہمہ جہتی کا بھی۔ قتیل کا موضوع انسانیت ہے اور انسانیت سے وفاداری، وابستگی اور کمٹمنٹ شاعر کو ملکی سرحدوں سے بے نیاز کر دیتا ہے اور اس کی شاعری کو ایک عالمگیر آہنگ عطا کرتا ہے۔ قتیل شفائی اسی آہنگ کے شاعر ہیں۔ ہمیں اسی آہنگ میں انھیں اور ان کی شاعری کو خراجِ عقیدت پیش کیا جانا چاہیے۔

محمد حسن

پروفیسر گوپی چند نارنگ —— جامعہ ملیہ دہلی

قتیل شفائی برصغیر ہندو پاک کے ان منفرد اور مقبول شاعروں میں ہیں جو اپنے لہجے سے الگ پہچانے جاتے ہیں۔ ان کی آواز میں ایسا رس اور لوچ ہے جس نے سطح اور گہرائی کے درمیانی فاصلے کو تقریباً مٹا دیا ہے۔ قتیل شفائی کے نغموں کی دل آسائی، لطافت اور قوتِ شفا اردو دور کی جدید شاعری کی تاریخ سے بھلائی نہ جا سکے گی۔ لفظوں کے خاموش سنگیت، برقاریت اور اس کی رمز آشنائی صرف انھیں شاعروں کے حصے میں آتی ہے جو صبح و شام کے لامتناہی سناٹوں سے ہم کلام ہو سکتے ہوں یا انسانیت سے وہ یگانگت یا رشتہ محسوس کرتے ہوں۔ قتیل شفائی کی شاعری کی دلوں میں اترنے والی پُر تاثیر لے کی اصل وجہ بھی انسانی رشتوں کے درد کو محسوس کرنے کی ان کی بے پناہ صلاحیت ہے۔ یہ بات محض اتفاق نہیں کہ انھوں نے پاکستانی فلموں کی شاعری کو ایک خاص معیار دیا ہے اور اس کا تحفظ کیا ہے۔ ادارہ فن اور شخصیت لائق مبارکباد ہے کہ قتیل شفائی پر ایک خاص نمبر شائع کر رہا ہے جس میں معتبر ادیب اور دانشور حصہ لے رہے ہیں۔ یہ محض ایک نمبر نہیں بلکہ خراجِ تحسین ہے پورے ہندوستان کا پاکستان کے ایک ایسے ہر دلعزیز اور محبوب شاعر کو جو اس ملک میں بھی سب کے دلوں میں بستا ہے اور جس کے نغمے یہاں بھی فضاؤں میں گونجتے رہتے ہیں۔

ڈاکٹر خلیق انجم —— انجمنِ ترقی اردو ہند۔ نئی دہلی

اے مردِ باکمال۔ عام طور سے یہ ہوتا ہے کہ انسان جب کوئی بڑا کام مکمل کرتا ہے یا کسی منزل پر پہنچتا ہے تو کچھ دیر ٹھہر کر سستاتا ہے، سانس لیتا ہے، آگے بڑھنے کی طاقت حاصل کرتا ہے اور پھر اگلی منزل کی طرف قدم اٹھاتا ہے۔ آپ نے ابھی تو فیض احمد فیض پر ایک عظیم الشان ضخیم اور یادگار نمبر نکالا تھا۔ ابھی تو اردو والے آپ کی محنت کی داد دینے کے لیے الفاظ تلاش کر رہے تھے کہ اچانک "قتیل شفائی" نمبر کا اعلان کر دیا گیا اور یہ بھی اعلان کیا گیا کہ ہر حالت میں مارچ سنہ ۱۹۸۲ء کے آخری ہفتے تک "قتیل شفائی" نمبر شائع کر دیا جائے گا۔ آپ کی ہمت اور حوصلے پر آفریں اور صد آفریں۔ خدا آپ کو ہمیشہ تندرست اور سلامت رکھے اور اس سے بھی بڑے معرکے سر کرنے کی توفیق دے۔ آمین —— جامع مسجد کا "چندو خانہ" یاد

کیجئے۔ جو پندرہ برس کی بات ہے۔ ہم لوگ شام کو دنیا کا ہر کام چھوڑ کر جامع مسجد کے اس چنڈو خانے میں ضرور آتے تھے۔ یہیں سعید مرحوم، گوپال متل، ملا ناموری اور صابری، ڈاکٹر اسلم پرویز، مخمور سعیدی، ڈاکٹر نثار احمد فاروقی اور نہ جانے کون کون وہاں آتا تھا آپ ایک کم عمر شخص۔ میں اور کم کو نوجوان تھے۔ اس وقت کون سوچ سکتا تھا کہ آپ ادب کی اتنی بڑی خدمت کریں گے۔ اس دفعہ فیض نمبر کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے وہ دن بہت یاد آئے۔ شاید ہماری زندگی کے بہترین دن تھے جو ہم نے اس چنڈو خانے میں جسے ہم "چنڈو خانہ" ــــ اور جسے اس کا مالک "مرچنٹ ریسٹوران" کہتا تھا گزارے۔

بھائی! اب سے فیض نمبر جب سے مجھے ملا ہے تو شروع سے آخر تک پڑھا۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں فیض کا عاشق ہوں۔ پھر بھی فیض نمبر کے مطالعے سے جہاں فیض کی شخصیت اور فن کے بارے میری معلومات اتنی زیادہ نہیں تھیں، جتنی اب ہیں اور یہ صرف آپ کی کرم فرمائی کی وجہ سے۔ فیض نمبر اس بات کا ثبوت ہے کہ ایک جغرافیائی حد بنا کر ایک ملک کو دو ملکوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے اور کیا گیا لیکن زبان، ادب اور ادیبوں اور شاعروں کو تقسیم کرنے والی کوئی حد ابھی تک دنیا میں وجود میں نہیں آئی۔ فیض پاکستانی شاعر ہیں اور اسی حیثیت سے ساری دنیا میں پہچانے جاتے ہیں، مگر ان کے مداح اور ان کے چاہنے والوں کی تعداد ہندوستان میں بھی کچھ کم نہیں، شاید زیادہ ہی ہو۔

آپ نے غالباً ان لوگوں کا خاص نمبر نکالنے کا فیصلہ کیا ہے جن کا میں عاشق ہوں۔ اسی لیے تو اب آپ قتیل نمبر شائع کر رہے ہیں۔ قتیل صاحب اردو کے ممتاز اور صف اول کے شاعروں میں ہیں۔ انھیں اردو شاعری میں ابھی تک وہ مرتبہ نہیں دیا گیا جس کے وہ مستحق ہیں۔ آپ کا یہ خاص نمبر قتیل کے ساتھ انصاف اور اہل اردو پر احسان ہوگا۔

میں اور آئی کے گجرال صاحب ہسپتال میں فراق صاحب سے ملنے گئے تھے۔ وہ سو رہے تھے۔ آدھے گھنٹے انتظار کر کے ہم لوگ واپس آ گئے۔ یہ بہرحال فن و شخصیت کے فراق نمبر کا ہم نے تو اعلان کر دیا۔ جیسا کہ آپ کو منسلکہ خط سے معلوم ہوگا اب آپ جانیں اور آپ کا کام۔

آپ کا

خلیق انجم

سید ضمیر جعفری ـــــ اسلام آباد۔ پاکستان

مجھے یہ معلوم کر کے دلی مسرت ہوئی کہ آپ جناب قتیل شفائی کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ایک شاندار ہدیہ مرتب کر رہے ہیں۔ خوبیوں کا حق ہے کہ ان کی برملا شہادت دی جائے۔ آپ اس اقدام کے لیے قابل مبارکباد ہیں۔

مجھے تقریباً پینتالیس (۴۵) برس سے قتیل صاحب کی نیاز مندی کا شرف حاصل ہے۔ اپنی شاعری کے حوالے سے وہ سب کی متاع ہیں۔ ذاتی حوالے سے میں نے انھیں فاصلے سے بھی دیکھا ہے اور قریب سے بھی۔ گزشتہ برس (۱۹۸۲ء) کینیڈا، امریکہ اور بلادِ فرنگ کے ادبی دورے میں کچھ عرصہ ان کے ساتھ ہم سفری کی سعادت بھی حاصل رہی۔ قربت میں وہ اور زیادہ پیارے معلوم ہوئے۔ ہمہ محبت، ہمہ اخلاص، نکتہ طراز، کشادہ مشرب، منظم، جری ـــــ اس مخلص و محبوب انسان کے شخصی

خدوخال انشاءاللہ پھر کسی فرصت میں بیان کروں گا۔

قتیل شفائی اردو کے عصری ادب کی ایک اہم شخصیت ہیں۔ ان کی اہمیت ان کے فکر کی صداقت اور لہجے کی انفرادیت سے عبارت ہے۔ قتیل مانگی ہوئی آواز میں شعر نہیں کہتا۔ وہ صاحبِ اسلوب شاعر ہے۔ اس کا شعر اس کے نام کے بغیر بھی اسی کا شعر ہوتا ہے۔ اس نے جہاں اپنے فکر سے اجتماعی انسانی ذہن کو روشن کیا اور زندگی کو آسودگی بخشی ہے وہاں اظہار و ابلاغ کی نئی نئی راہیں بھی تراشی ہیں۔ وہ فن و فکر میں سچائی کا پرستار اور رعنائی کا علمبردار ہے۔ شعلہ و شبنم کا جو زندہ و تابندہ امتزاج قتیل کے ہاں ملتا ہے اس نے قتیل کے شعر کو بہت ہی کامیاب بنا دیا ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی روح میں چاندنی اور رنگ کا ایک بے کنار سمندر موجزن ہے۔ اور ان کا اسلوب اسی چاندنی ـــــ انہی رنگوں سے ایک خوش تر زندگی کے خواب کی تعبیر کر رہا ہے۔ میری نگاہ میں قتیل شاید تنہا شاعر ہے جس کی للکار میں گیت کی جھنکار بھی ہوتی ہے اور تلوار کی کاٹ بھی۔ ہماری جدید شاعری کو احساس و اظہار کا جو "گلابی جمال" ملا ہے قتیل ہی کی وارفتگی سے ملا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ قتیل کی عظمت ہر طلوع ہونے والے سورج کے ساتھ روشن تر ہوتی چلی جائے گی۔ ابھی تو ہم ان کے بہت قریب کھڑے ہیں۔

سید ضمیر جعفری

ڈاکٹر داؤد کشمیری ـــــــــ بمبئی

دوست!

تم تو بہت شاطر نکلے:
کیسی خطرناک فرمائش کر دی تم نے!

ذرا سوچو قتیل پر لکھا تو کتنے ادیب ناراض ہوں گے؟ تم کہو گے کتنے قارئین خوش بھی ہوں گے! چلو میں بھی لاجواب ہوا۔ آخر تم ایک ٹھاٹ کے ٹھہرے۔ جب ایک سر نکالا بہتوں کی گتھی سلجھ گئی!

تمہاری فرمائش کی تکمیل میں قتیل پر ایک مضمون بھیج رہا ہوں۔ تم اندازہ نہیں لگا سکتے اس موضوع پر قلم اٹھانے وقت کیسی زنجیروں کو توڑنا پڑا ہے۔ یہی الجھن تھی کہ شروع کہاں سے کروں۔ چونکہ سال تک پروفیسر رہ کر برباد ہوا۔ لیکن قتیل کو کیوں برباد کروں؟ پروفیسر حضرات (کم از کم بمبئی کی روایت یہی ہے کہ) نہ شعر کہتے ہیں نہ شعر فہمی کا ملکہ رکھتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اردو کے جو جغادری ناقد بمبئی پہنچے تو اپنے نقاد آپ بن بیٹھے۔

ایک سوال یہ بھی پریشان کر رہا کہ قتیل کو معمولی شاعر کہہ کر نظر انداز کرنے کی کوشش میں بہتروں نے دھما چوکڑی بھی خوب مچائی۔ چنانچہ قتیل پر قلم اٹھانے سے پہلے اس پر انگشت نمائی کی اصل کو سمجھنا بھی ضروری تھا۔ اگر قتیل معمولی شاعر نہیں ہیں تو ان کے پاس یقیناً کوئی نظریۂ فن رہا ہوگا۔ اس کی کیفیت کو معلوم کرنے بیٹھا تو نظر سردار سردار

نظریے لگے۔ یعنی دیکھو، دو نظریوں کی بھنک کبھی کانوں میں پڑی تھی۔ (۱) ادب برائے ادب (۲) ادب برائے زندگی۔ بعد میں پتہ چلا تھا کہ پہلا ہینڈ، نظریہ والٹر پیٹر کے ہینڈ بیگ سے نکالا گیا تھا اور دوسرے کے لئے میتھیو آرنلڈ کی جیب کتری گئی تھی لیکن "مالِ مفت دلِ بے رحم" دونوں نظریات کی ریڑھ مار دی گئی۔ پہلے کو لائنس کلب اور دوسرے کو انجمن معین الغرباء بنا کر یہ لوگ چین سے بیٹھے۔ اور آج تک بنسری بجا رہے ہیں۔

پھر کچھ اور منچلے سودائی اٹھے۔ پھر دو نظریات سامنے آئے (۱) ادب برائے ادیب (۲) ادب برائے نقاد یعنی کچھ ادیبوں نے قارئین، ناشر اور دوسرے ادیبوں سے بے پرواہ ہو کر ادب کی تخلیق شروع کی۔ کتابیں چھاپیں اور دوستوں میں مفت تقسیم کرتے رہے۔ مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے۔

چند نے یہ وطیرہ بنایا کہ نقادوں کے لئے لکھنے لگے اور قارئین سے پہلے نقادوں کو کتابیں پڑھوائیں اور دیباچے لکھوائے ـــــ بعد میں مضامین بھی۔

اب انصاف کی بات تو یہ ہے کہ قتیل کے پاس ان میں سے کوئی بھی نظریہ نہیں۔ اسی بنا پر قتیل کو معمولی شاعر مان کر انہوں نے بغلیں بجائیں۔ اب نمبر نکال رہے ہو تو شاید وہ بغلیں جھانکنے لگیں۔ لیکن واقعہ تو یہ ہے کہ بچہ بغل میں اور ڈھنڈورا شہر میں۔ وہ ڈھول پیٹتے رہ گئے اور بچہ "کو تم نے تلاش کر لیا۔!

یہ بچہ تمہیں پیلو نزد پایا۔ ایسا ایلیٹ کے گھر پر نہیں ملا۔ میر و غالب کے مجاور کے ہاں بھی نہیں۔ بلکہ کنٹری پیٹرن سڑکوں پر تم نے اسے دیکھا اور اس کے ارد گرد زبردست بھیڑ تھی۔ میں بھی اس بھیڑ میں تھا۔ وہ بچہ کس غضب کا آرٹسٹ ہے۔ اپنی خداداد صلاحیتوں سے دو منٹوں میں کاغذ پر ایک نئی تصویر بنا دیتا۔ ہر تصویر کے کئی خریدار تھے میں نے بھی چند تصویریں خریدی ہیں۔ تم جب اس سے ملے تو تمہیں اس کے گھر کا پتا تھا سو اسے ساتھ لے گئے۔ تمہارے پاس بھی یقیناً اس کی کئی تصویریں ہوں گی۔ میری تصویر بھی لے لو۔ اور رسید بھیجو۔

مخلص

داؤ کشمیری

حسن رضوی ـــــ لاہور، پاکستان

محترم صابر دت صاحب۔

تسلیمات۔ آپ کا خط مجھے پتہ تبدیل ہونے کی وجہ سے کافی لیٹ ملا۔ بہرحال یاد آوری کا شکریہ۔ میں نے قتیل نمبر کے بارے میں جنگ کے ادبی صفحہ میں خبر شائع کر دی ہے۔ پیغام پیشِ خدمت ہے۔

"فن اور شخصیت" کے محترم صابر دت اور محترمہ حمیدہ قمر کو یہ فخر حاصل ہے کہ وہ برِ صغیر کے نامور ادیبوں کی کاوشوں کو ایک خصوصی نمبر کے ذریعہ شائع کرکے ادب کی تاریخ میں ایک نئے اور روشن باب کا اضافہ کر رہے ہیں۔

فیض نمبر جیسی خوبصورت دستاویز کے بعد یقیناً قتیل نمبر بھی بے مثال ہی ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ نام تخلیقی و تحقیقی اعتبار سے پی ایچ ڈی کے مقالے کے ہم پلہ ہے۔ سو میں "ڈاکٹر" صابر دت اور "ڈاکٹر" حیدر قمر کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتا ہوں" بھائی کو آداب ——— کچھ یادگار فوٹو یادیں بطور تحفہ پیشِ خدمت ہیں۔

فقط والسلام
مخلص
حسن رضوی
نگران صفحہ ادب و ثقافت روزنامہ "جنگ" لاہور (پاکستان)

کملیشور ——————— نئی دہلی

قتیل شفائی میرے لئے ایک دور کا نام ہے۔ ایک ایسا دور جو خوبصورت بھی ہے اور ساتھ ہی بہت اپنا اور بہت گہرا۔ قتیل بھائی کے بارے میں جب بھی کچھ سوچتا ہوں یا جب کبھی پڑھتا یا یاد کرتا ہوں تو وہ سوچنا یا پڑھنا یا انھیں یاد کرنا ویسا ہی ہوتا ہے جیسے میں خود کو سوچ یا یاد کر رہا ہوں۔ ان سے ملتا ہوں تو لگتا ہے اپنے سے مل رہا ہوں۔ جب کبھی میں خود سے نہیں مل پایا ہوں تو میں نے بار ہا قتیل بھائی کے خطوں یا ان کے ساتھ گزرے لمحوں سے ملنے کی کوشش کی ہے۔ کبھی اکیلا ہوا ہوں تو انھیں گنگنا لیتا ہوں! سچ کہوں تو شاید ایک شاعر کے ساتھ ہیں وہ ادبی دنیا کے آدمی رہے ہوں پر میرے لئے وہ ہوا کی طرح ہی رہے ہیں جس میں میں نے ہمیشہ تب تب سانس لی ہے جب جب میرے بھیتر کچھ گھٹتا ہوا ہوتا تھا۔ اس لئے میں انھیں اپنا۔ اپنے دور کا حصہ مانتا ہوں اور وہ میرے لئے بے حد اہم ہیں۔

فیض نمبر نکالنے کے بعد صابر دت صاحب اگر قتیل شفائی نمبر نہ نکالتے تو مجھے لگتا کہ انھوں نے ایک ادبی ہی نہیں انسانی غلطی بھی کی ہے ——— اچھا ہوا کہ یہ غلطی ان سے نہیں ہوئی کیونکہ اپنے دور کو اس میں نہیں پایا جا سکتا۔ دور جن کا ہے انھیں کے نام۔

فیض صاحب اور قتیل شفائی کے آگے کا دور بھی بہت [illegible] ہے۔ مجھے پوری امید ہے کہ فن اور شخصیت اسے صحیح دور کو ہمیشہ پہچان کر اس کے ناموں کے نام نکالتا رہے گا۔

عبدالسلام خورشید ——————— لاہور (پاکستان)

محترمی صابر دت

آداب! بہت خوشی ہوئی کہ آپ "فن اور شخصیت" کا قتیل نمبر چھاپ رہے ہیں۔

قتیل شفائی برِعظیم پاک و ہند بلکہ پورے جنوبی ایشیا کے نامور اردو شعرا کی صف میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ وہ غزل اور گیت، دونوں اصناف میں کمال رکھتے ہیں۔ ان میں بلا کا تغزل اور موسیقیت موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ

انھیں لاکھوں اور کروڑوں اردو داں اہلِ ذوق پسند کرتے ہیں۔ پھر ان میں انسان دوستی کا جو جوہر ہے وہ شاعری میں بڑے بھرپور انداز میں عکس بستہ ہوا ہے۔ میں نے ان کے مداحین کا دائرہ اور بھی زیادہ وسیع کر دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ "فن اور شخصیت" کا قتیل نمبر قتیل کی شخصیت، شاعری، فن اور پیغام کا جامع مرقع ہوگا۔ میں آپ کی کامیابی کے لئے دعا گو ہوں۔ محترمہ صبیحہ قمر کو میری طرف سے سالِ نو کا پیغام دیجئے۔

آپ کا مخلص

عبدالسلام خورشید

ڈاکٹر احمد سجاد ——— رانچی۔ بہار

محترمی! آداب

"فن اور شخصیت" کا فیض نمبر ملا۔ میں کہا ہے فیض کے فکر و فن کا ایک انسائیکلوپیڈیا ہے۔ فیض پر اب تک کئی رسالوں نے خصوصی شمارے پیش کئے ہیں مگر ان کا انداز عام طور سے مداحیہ یا تجزیہ تھا۔ آپ نے اس نمبر کے ذریعہ "نقوش" لاہور کے بعد اپنی محنت و دیانت کا ایک شاندار ریکارڈ قائم کیا ہے اور فیض کے فکر و فن کے رسائیوں اور نارسائیوں دونوں پہلوؤں کو بڑے سلیقے سے اجاگر کیا ہے۔ ادبی گروہ بندی کے اس دور میں اس طرح کی غیر جانبدارانہ کاوش کوئی آسان کام نہیں۔

اپنی اس شاندار کامیابی پر دلی مبارکباد قبول کریں۔

"قتیل شفائی نمبر" کا اعلان کر کے آپ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ آپ مردہ پرستی کے قائل نہیں۔ اردو کی غزلیہ شاعری میں قتیل کی ذہن اور ان کی انفرادیت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہمیں آپ کے سابقہ کارناموں کی وجہ سے یقین ہے کہ یہ نمبر بھی اردو ادب کی تاریخ میں قتیل شفائی کے فکر و فن کا ایک بہترین آئینہ خانہ ہوگا۔ اس نمبر کے لئے پیشگی مبارکباد عرض ہے۔ خدا کرے آپ مع متعلقین بعافیت ہوں۔

والسلام

نیاز اندیش

احمد سجاد (پروفیسر شعبہ اردو رانچی یونیورسٹی)

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید ——— تروپتی

محبی صابر دت صاحب!

تسلیم! آپ کا مکتوب اور چند روز قبل ٹیلیگرام بھی ملا۔ میں نے عرصہ ہوا مقالہ لکھ لیا تھا لیکن مسودہ صاف کرنے میں تاخیر ہوئی۔ وجہ ظاہر ہے اردو اساتذہ کی کانفرنس کے سلسلے میں مصروف تھا۔ یقین ہے اس تاخیر کو نظر انداز فرمائیں گے۔ مقالہ کی وصولی اور آپ کی گرانقدر رائے سے مطلع فرمائیں گے۔

"فن اور شخصیت" کے خصوصی شمارے اپنی مثال آپ ہوتے ہیں۔ بلاشبہ قتیل شفائی پر خصوصی اشاعت بھی

آپ ہی کے شایانِ شان ہوگا۔

سب کی خدمت میں آداب! امید کہ آپ بعافیت ہوں گے۔

تاخیر کے لئے معذرت کے ساتھ، آپ کے مکتوب کا منتظر

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید

ایس، وی یونیورسٹی۔ تروپتی

کے، ایل، نوسوال —— چندی گڈھ۔ ہریانہ

پیارے دبابیہ دت!

یہ معلوم ہوکر خوشی ہوئی کہ آپ 'قتیل شفائی نمبر' ترتیب دے رہے ہیں۔ "فن اور شخصیت" نے اردو ادب کی دنیا میں ایک ممتاز نام پیدا کیا ہے۔ اس کے پہلے خاص شمارے ہر اعتبار سے ایک نمایاں حیثیت اور اہمیت رکھتے ہیں۔

آپ نے کمال یہ کیا ہے کہ پاکستان کے نقوش، اوراق، اور فنون کا جواب ہندوستان میں ایک ممتاز خصوصیت کے ساتھ پیدا کر دیا ہے۔ ادبی جرائد کی تاریخ میں ایک کارنامہ ہے جس کی ایک دوامی حیثیت ہے۔

میں امید کرتا ہوں کہ قتیل شفائی نمبر بھی اپنی سابقہ روایات اور شان و شوکت کے ساتھ آپ اپنی مثال قائم کرے گا۔ میں اپنی تمام نیک خواہشات کے ساتھ اس خصوصی نمبر کے لئے آپ کو پیغام خوش نوید دیتا ہوں۔ اور امید کرتا ہوں کہ آپ اردو ادب کی دنیا کی آرزوؤں کو پورا کریں گے۔

صرف دعائے کامیابی، آپ کے کمال اور فن کا معترف

کے۔ ایل۔ نوسوال

حکیم محمد یحییٰ خاں شفا —— راولپنڈی۔ پاکستان

فن اور شخصیت کے 'قتیل شفائی نمبر' کے لئے نیک خواہشات کے ساتھ

- ہائے وہ شخص کہ جس شخص کی خاطر ہم نے
  اپنے جیسے کئی لوگوں کی سنی ہیں باتیں

والسلام

خیر طلب

حکیم محمد یحییٰ خاں شفا

ندا فاضلی — بمبئی

محترمی صاحب

بیقش نمبر کی اشاعت کے بعد تپش شفائی کے فن اور شخصیت پر آپ کے نئے نمبر کا اعلان خوب ہے۔ اُمید ہے یہ نمبر بھی غزل نمبر، آپ بیتی نمبر اور افسانہ نمبر کی طرح کامیاب ہوگا۔

آپ اپنے دور کے ان اہم ذہنوں میں سے زیادہ بہتر ابلاغ ہوگا ہوا ہے کہ زندگی، مذہب اور فلسفہ کی اشتراکی دانش سرحدیں جاری ہو گئی تھیں اور مینوں مترنم سب ذکر دھرکے لئے ہمیں اپنے اپنے الگ رنگ کے اس جادو نگری میں پہنچا دیتے ہیں جہاں ہر نئے تجربے کو ... ہوتی ہے۔ ... باوجود ہر لفظ کے ساتھ قربت ہوتی محسوس ہوتی ہے۔ لیکن یہ شعلوں میں پھولوں کی طرح دور سے نظارہ کرنے کا حسن ہے ہاتھ لگانے سے ان کا رنگ بہت جلد پھیکا پڑ جاتا ہے۔

گیت بنتے ہوئے چہرے، پاؤں تھرکاتے موسم، گھونگھٹ اٹھاتے سویرے، باہیں لہراتے اندھیرے، آسمان چومتے درخت، چاند کھیلتے آنگن۔ یہ دنیا پرانے البم کی تصویروں کی طرح اب بھی جب کبھی سامنے سے گزرتی ہے تو وقت کچھ سانسوں کو ہمارے لئے آسان کرتا ہے۔

> کھنکتی ہوئی چاندنی ہر فلک سے اتر دیں — کوئی بدلی نرمی پازیب سے ٹکرائی ہے

تپش شفائی سے میں کبھی نہیں ملا۔ لیکن وہ ان شاعروں میں ہیں جن کی شاعری مجھے اُن دنوں سے اچھی لگتی ہے جب اچھے برے کا کوئی پیمانہ میرے ذہن نے متعین نہیں کیا تھا۔ اس کی وجہ شاید ان کی ترنم، کورس اور الفاظ کی رنگین نغمگی ہو۔ جس سے میں زیادہ مانوس اور متعارف تھا جو اپنے ارد گرد کے ماحول سے جڑی ہوئی تھی۔ اور جس میں ترقی یافتہ ABSTRACT زبان اور چونکا دینے والی تصویروں میں باتیں کی گئی تھیں۔ اس میں چونکا جانا تھا وہ بے دکھی تھا۔ ممکن ہے تپش شفائی دوسرے شاعروں کی دیکھا دیکھی ایسی مرعوب کر دینے والی کوشش کرتے اور نفسیات و فلسفہ کی بیساکھیاں تھام لیتے۔ لیکن آواز اس کمائی سے محروم ہو جاتی جو ان کی پہچان ہی نہیں، پڑھنے والوں کے لئے بھی ایک خاص کشش رکھتی ہے۔ نفس لغزش ہیں۔ ان کی شاعری میں ہمارا لوک ادب اپنی نئی شناخت لے کر ابھرتا ہے۔ اس اعزاز کا بھولپن اور بے تکلف انداز ہمیں ہمارا بچپن کہیں کھویا ہوا واپس لوٹانے کا خوبصورت اور بہترین عمل کرتا ہے۔ جو یہ نظر بہت سے زیادہ پُرکشش محسوس ہوتا ہے۔

ندا فاضلی

اوپیندر ناتھ اشک — الہ آباد۔ یوپی

پیارے صابر دت! ——— تم تپش شفائی پر فن اور شخصیت کا نمبر نکال رہے ہو، میں اس نمبر کی کامیابی کی دعا کرتا ہوں۔ تپش میرے پسندیدہ شاعروں میں سے ہیں۔ ان کی غزلوں میں غنائیت کے علاوہ کچھ ایسی سادگی ہے جو دل میں گھر کر لیتی ہے۔ کچھ ایسی اداسی جو صرف ان کے ہاں ملتی ہے۔ یہی سادگی اور پرکاری تپش کی غزلوں کا خاصہ ہے۔ اس کے شعر دل پر اثر کرتے ہیں اور انہیں گنگنانے کو جی ہوتا ہے۔ فن اور شخصیت کا تپش نمبر کامیاب رہے گا، اس کی پوری امید ہے۔ — خیر اندیش، اوپیندر ناتھ اشک

روشن روشن یادیں

صابر دت

"آپ نے فن اور شخصیت کے ذریعہ ادب کی جو خدمت کی ہے اس پر ہم سب کو فخر کرنا چاہیئے۔"

قتیل صاحب کا کلام دیکھ رہا تھا۔ اچانک ادارہ کا نام سامنے آ گیا۔ پہلی بار واقعی فخر کا احساس ہُوا کیونکہ قتیل صاحب اس وقت اُردو کے مقبول ترین شاعروں میں شمار ہوتے ہیں اور اس سے اہم بات یہ ہے کہ اُن کی مقبولیت محلوں سے زیادہ گلی کوچوں میں ہے۔ لہو میں گرمی پیدا ہوئی۔ لگا سارا لہو دماغ کی طرف دوڑ رہا ہے۔

"آپ سے ملے غالباً سولہ برس گذر چکے ہیں۔ اِس عرصہ میں دنیا کیا سے کیا ہو گئی۔"

داغوں کو چراغاں کر لیا ہے اور دیکھ رہا ہوں۔ خود کو گذشتہ دنوں میں پاتا ہوں۔ انٹر آرٹس کا ایک طالب علم صابر دت جس کا نام اسے کھانی کشمیری لال ذاکر کے ساتھ مشاعرہ میں شریک ہونا ہے۔ پنڈت ہری چند اختر اناؤنسر ہیں۔ جگر کی موت کا اعلان کیا جا رہا ہے کسی کو یقین نہیں کہ جگر صاحب سامنے بیٹھے ہیں لیکن یہ اُن کا آخری مشاعرہ ہے اور قتیل صاحب سے پہلی ملاقات بھی اسی مشاعرے میں ہوتی ہے۔ وہ غزل پڑھ رہے ہیں۔

جب بھی آتا ہے مرا نام ترے نام کے ساتھ
جانے کیوں لوگ مرے نام سے جل جاتے ہیں

آج مرا نام قتیل صاحب سے جڑ گیا ہے تو جو میری جاں نثاری کرتے تھے اور رفیق یاں ہی سے ناراض، اب جل کر دھواں بکھیر رہے ہیں، روشنی اُن میں کہاں۔

دُنیا واقعی کیا سے کیا ہو گئی؟

قتیل صاحب ان دنوں ترنم کے ساتھ پڑھتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ ایک آدمی جس کی وضع قطع سب سے جدا تھی، جدید لباس زیبِ تن کئے سگریٹ پی رہا تھا۔ اور سگریٹ کے مرغولوں میں جتنی لچک تھی، اُس سے زیادہ ترنم فضا میں لہریں پیدا کر رہا تھا۔ میرے ذہن میں یکایک شاعر کا تصور بدل گیا۔ شیروانی کے ساتھ شاعری بھی کھونٹی پر لٹکی نظر آئی۔ میری اپنی شعر گوئی کا یہ ابتدائی زمانہ تھا۔ پھر ایک عرصہ تک قتیل سا گھومتا رہا۔ اور اب ہاتھوں میں شفائی نمبر اُٹھا لیا ہے۔ شاید اسی کو لوگوں نے

صورت کا نام دیا ہے تو یوں ہی سہی۔ بہرحال ادب زندگی کا ترجمان ہی تو ہے۔

''۱۳ ستمبر کو، مرتضیٰ برلاس، دماسہ، ممبئی کے مشاعرے میں آپ کو سُنا۔''

اور پہلی ملاقات کے بعد یہ عالم کہ جب کبھی قتیل صاحب ہندوستان آتے، اُن کے ساتھ دِلّی کلاتھ مل کے مشاعرے میں موجود تھا۔ ہندوستان سے کم اور پاکستان سے زیادہ ہو گیا۔ دِلّی سترہ سال بعد فیض بمبئی تشریف لائے۔ ٹیلی ویژن پر میں نے بھی شعر پڑھے۔ اُس مشاعرے کو قتیل صاحب نے امرتسر ٹی۔ وی۔ سے دیکھا اور مجھے خط لکھا

میں نے اُن اور شخصیت کے شمارے جو فیض پر تھا، تیاریوں کی مختصر روداد سُنائی۔ اشارہ دیا کہ آپ پر بھی کام کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن پاکستان میں ہو تو تمہیں ہندوستان میں کہاں کہاں نظر آتے۔ قتیل صاحب نے بات مان لی۔ اور پندرہ سال بعد سات دنوں کے لئے ممبئی وارد ہوئے۔ ایئر پورٹ سے فون کیا، ضیغم ہوٹل میں اُن سے ملاقات کی اور وہ سات دن کے بجائے دو ماہ رُک گئے۔ ہر پارٹی میں قتیل صاحب کے ساتھ شرکت کی اور محسوس کیا کہ شاعر کے پیچھے پنڈال، ڈنڈا، پولیس، ٹوڈا اور ایئیٹ کی آواز نہیں، کوئی لازم نہیں، صرف عزم ہے حیاتِ رواں کا۔ تو وہ جہاں بھی سرد مہری سے سکڑی سمٹی ہوئی کوئی دراز سکی ہے پھیلتی گئیں، ایسی محبت میں نے ساحر لدھیانوی کے بعد قتیل صاحب ہی کے حصّہ میں دیکھی۔

۲۱ ستمبر ۱۹۸۷ء کو قتیل صاحب بمبئی پہنچے تو گم کردہ منزل اور دامادۂ سفر بھی یادوں کے کارواں میں شامل ہو لیے۔ بمبئی کے اُردو ہندی ادیبوں سے انہیں ملنے لگا۔ یہ محسوس ہوا کہ جس انسان کو وہ آگ و خون کی سرحدوں پر دم توڑتا چھوڑ آئے تھے، آج نغمۂ نو کو لبوں میں بسائے پھر بزم میں ایک ملال نے آ پہنچا ہے۔ راماننداساگر، چیتن آنند، منوج کمار، راج کھوسلہ، ساحر لدھیانوی، راہی معصوم رضا، ابرار علوی، راجندر کرشن، ادبی نیر، کلیان جی آنند جی، کملیسور، کیفی اعظمی، مانک ٹالہ اور امریک سنگھ جیسے فن و ادب کے درخشاں ستارے بھی روشن روش کی سیر کو نکلے۔ آنند بخشی نے مدت کے یار کی مہمانی کے لیے گھر کو چراغاں کر دیا۔

۲۵ ستمبر کو سنیل دت (جو اب شیرف آف بمبئی ہو گئے ہیں) اور اُن کی رفیقِ حیات نرگس دت نے (جو بعد میں چمن کی بہاروں کو داغِ مفارقت دے گئیں) اپنے بنگلہ پر ایک مخصوص تقریب کا انعقاد کیا۔ انسانیت نوازی کی اس محفل میں راجندر سنگھ بیدی، خواجہ احمد عباس، اختر الایمان، معصوم رضا، جاوید (سلیم جاوید) عزیز قیسی، سلمیٰ صدیقی، حسن کمال، ــ ــ علی رضا، نمی، رینا رائے، ورما ملک، جیلان صدیقی، اختر حسن، مہادیو رادھیکاری اور دنود تیواری (ایڈیٹر مادھوری۔ بمبئی) نے خلوص و عقیدت کے پھول لُٹائے۔ قتیل صاحب کو قفس میں دو دار چمن کا ملن آ گیا ہے، اس احساس نے وہاں موجود ہر شخص کے دل سے کلیوں کا خوف نکال دیا۔ مشینوں کے شور کی مسلسل دھمک سے ٹوٹتے ہوئے سب کے تاروں کو جوڑ کر اب چلے تو سحر سے پہلے وہ اپنے اپنے آشیانوں میں نئی رفعتوں پر محوِ خواب تھے۔

۳۰ ستمبر کو ہوٹل سی پرنسس میں فلمساز اور ہدایت کار موہن کمار نے ایک استقبالیہ اور مشاعرے کا اہتمام کیا۔ نظامت کے فرائض اُردو کے ایڈیٹر اور جدید شاعروں میں مقبول حسن کمال نے انجام دیئے۔ کیفی اعظمی، مجروح سلطان پوری، آنند بخشی، نقش لائلپوری، راہی معصوم رضا، ونشاد، من موہن کرشن ۔ رائے، رامانند ساگر، شکتی سامنت، سوہن لال کنور، سلیم (سلیم جاوید)، جے اوم پرکاش، دیو آنند، پران، پریم چوپڑہ، لکشمی کانت پیارے لال، رویندر جین، راجیش روشن، خیام، راکیش روشن، مشتاق جلیلی، رام دیال، بابا بہادر شاہ اور راقم الحروف بھی حلقۂ رنداں میں شامل تھے اور سرمستیٔ ارل کا شاعر قتیل حسبِ دستور خیال کی بادیہ پیمائیوں میں کھو چکا تھا۔

"میں آپ سب کے درمیان پہنچ کر خود کو قطعی اجنبی یا پردیسی محسوس نہیں کر رہا ہوں۔ یہ عمارتیں، یہی بازار ہے جسے یہی کھینچ لائے ہیں، رنگ و نور کی اس سرزمین پر جسے آج بھارت کہتے ہیں اور پہلے سب ہندوستان کہتے تھے۔"

صاحبزادے نے فن اور شخصیت کے ذریعے ہند و پاک کے ادیبوں اور شاعروں کے درمیان ایک پل بنا دیا ہے۔

مجھے کبھی یہ احساس ہمیشہ جھنجھوڑتا رہتا ہے کہ وہ ہند و پاک سرزمین ہی تھی جو رزق حلال کے خواب کی چھتوں پر پھیلنے والی چاندنی کا ٹھنڈا سایہ نہ ملا تو اس کے پہنچنے کی آنچ وہاں تک کم ہی پہنچی، لیکن غنیمت ہے کہ زندگی کے چار دن ہم محبت نگر کی گزرگاہوں سے الجھتے رہتے ہیں۔ قتیل صاحب ان میں سے ایک ہیں۔ وہ جتنی کی سرخیوں پر پھول کھلانے والے شاعر ہیں کہ ان کے دامن پر آنسوؤں کی سرخی آپ کو نظر نہیں آئے گی۔

ان کی ہر دلعزیزی سے متاثر ہو کر مہاراشٹر اردو اکادمی، مہاراشٹر کالج اور اسمعیل یوسف کالج، جوگیشوری کی جانب سے بھی ان کے اعزاز میں استقبالیہ تقاریب منعقد ہوئیں۔ جن میں شہر برابر شریک رہے۔

قتیل صاحب غزل اور گیت کے بڑے شاعروں میں سے ایک ہیں۔ ان کے کلام میں قدیم و جدید رنگوں کی جھلک ملتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کا کلام یک رنگ ہے شاید اس لئے کہ ان کی اور عشق کے ساتھ ساتھ الفاظ اور بندشوں کے انتخاب میں بھی وہ نمایاں انفرادیت رکھتے ہیں اور ان کے شعروں پر ایک رومانی پرسرور فضا چھائی رہتی ہے۔

قتیل شفائی صاحب عرصہ دراز سے پاکستان کی فلمی دنیا سے وابستہ ہیں لیکن فلموں سے وابستگی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکی کیونکہ انہوں نے فلمی گیتوں کا معیار بلند کیا اور ان میں ادبی چاشنی پیدا کی یہ قتیل شفائی کا ناقابل فراموش کارنامہ ہے۔

ہندوستان کے کئی فلم ساز اور ہدایت کار جو ان کی فنکارانہ صلاحیتوں کے معترف ہیں اور اس امر سے بخوبی آگاہ ہیں ان کے کئی گیتوں کے سکھڑے گیت کاروں نے اڑائے ہیں اور شہرت و دولت حاصل کی ہے۔ قتیل شفائی سے اپنی فلموں کے گیت لکھوانے کے آرزو مند ہیں۔ قتیل کے دس شعری مجموعے ہریالی، گجر، روزن، جھومر، جل ترنگ، مطربہ، گفتگو، چھتنار، پیراہن اور آموختہ شائع ہو چکے ہیں۔ مجموعہ کلام آوازوں کے سائے طباعت کے مراحل سے گزر رہا ہے۔ "مطربہ" کے لیے انہیں پاکستان رائٹرز گلڈ کی جانب سے آدم جی ادبی انعام بھی مل چکا ہے۔

اور اب حسابِ کم و بیش کی ٹھہرے تو مایۂ خویش، سرمایۂ قتیل میزان برداروں کے سپردِ خدمت ہے۔



ہماری آئندہ پیشکش

پیکرِ مہر و وفا اور مظہرِ انسانیت

جس نے مغرب کے اندھیروں کو اُجالے کے آداب سکھائے

جس نے مشرق کی صدائے نرم و لطیف کو انقلابی آہنگ کی آنچ دی

یعنی باوقار خاتونِ عصر کی لہر لہر حیات کی کہانی

نرگس دتّ نمبر



جب بھی آتا ہے مرا نام ترے نام کے ساتھ
جانے کیوں لوگ مرے نام سے جل جاتے ہیں — فیض

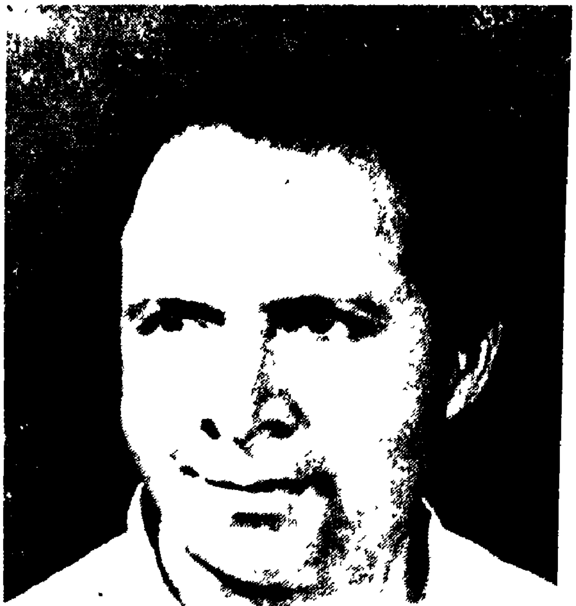
قتیل شفائی ۔





چار کہانیاں ۔ ۔ "یادیں آکے رہ گئیں"







▲ قتیل شفائی اور ان کی پوری فیملی کے ساتھ: بیگم، بیٹی، داماد، بیٹا، نواسے



▲ لاہور میں سوہن راہی۔ محمد طفیل
اور قتیل شفائی



▲ گُلزیب (بھائی) کے ہمراہ ۱۹۵۴ء



قتیل کے بیٹے اور بیٹیاں
(دائیں سے، تنویر قتیل، نوید قتیل، مسز
مسرت توکل۔ ثمینہ خورشید۔ پرویز



قلعہ ایڈنبرا میں قتیل شفائی اپنے
بیٹے اور پوتے کے ساتھ۔



قلعہ ایڈنبرا میں قتیل اپنے پوتوں اور پوتیوں
کے ساتھ (دائیں سے) قتیل شفائی۔
نوید قتیل جونیر۔ مریم قتیل۔ عینی قتیل
اور جانی قتیل۔



◄ قتیل شفائی کے گھر ۱۹۶۲ء کی ایک نشست
(دائیں سے) فیض احمد فیض ـ صوفی تبسم ـ قتیل شفائی



▲ حیدرآباد دکن میں
(دائیں سے) قتیل شفائی ـ شاہد صدیقی مرحوم ـ مخدوم محی الدین مرحوم ـ اور حبیب جالب۔





▲ [illegible]

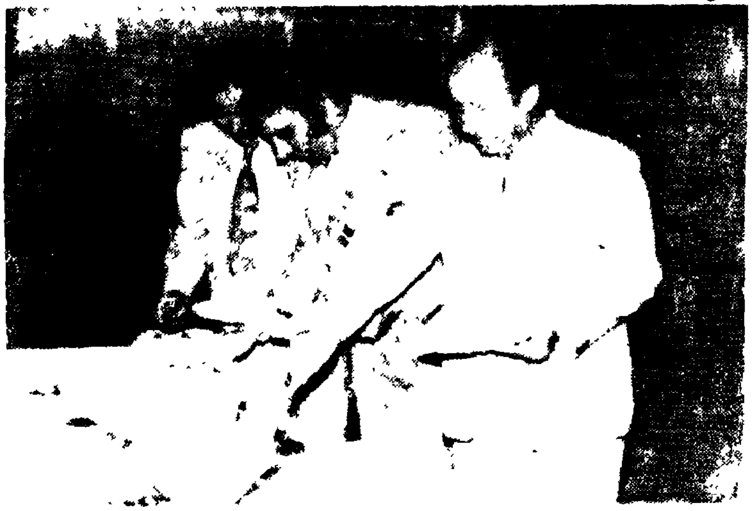
▲ [illegible]





▲ فیض صفائی۔ صبیح محسن۔ سراج اور

▲ فیض صاحب کے ہمراہ [illegible] فیض [illegible]
احمد ندیم قاسمی۔



برمنگھم میں۔ قتیل شفائی اور احمد فراز



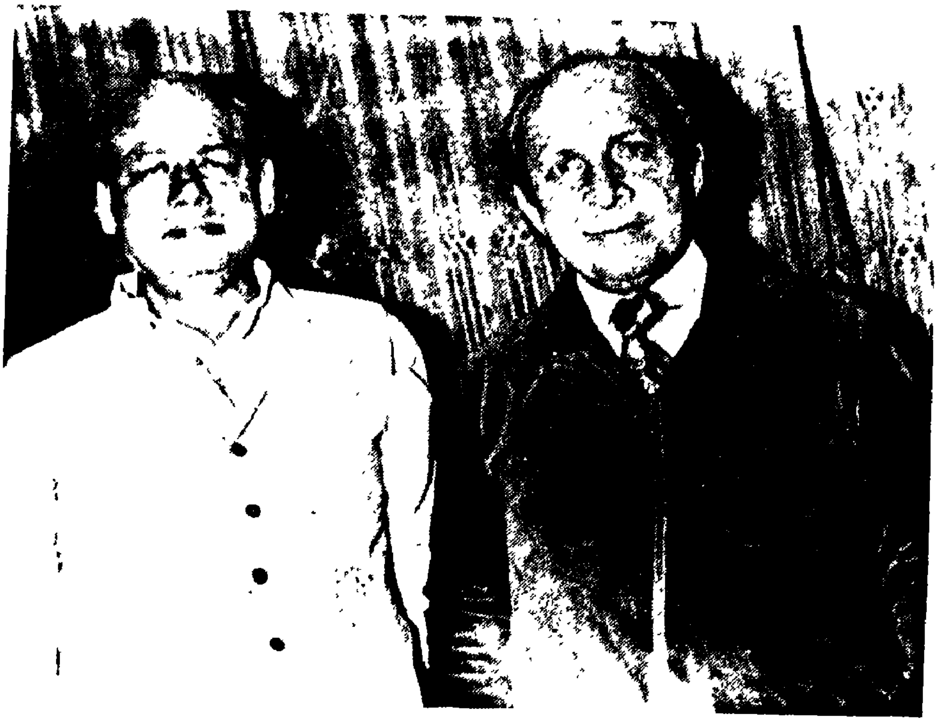
قتیل شفائی۔ یونس دہلوی اور کملیشور



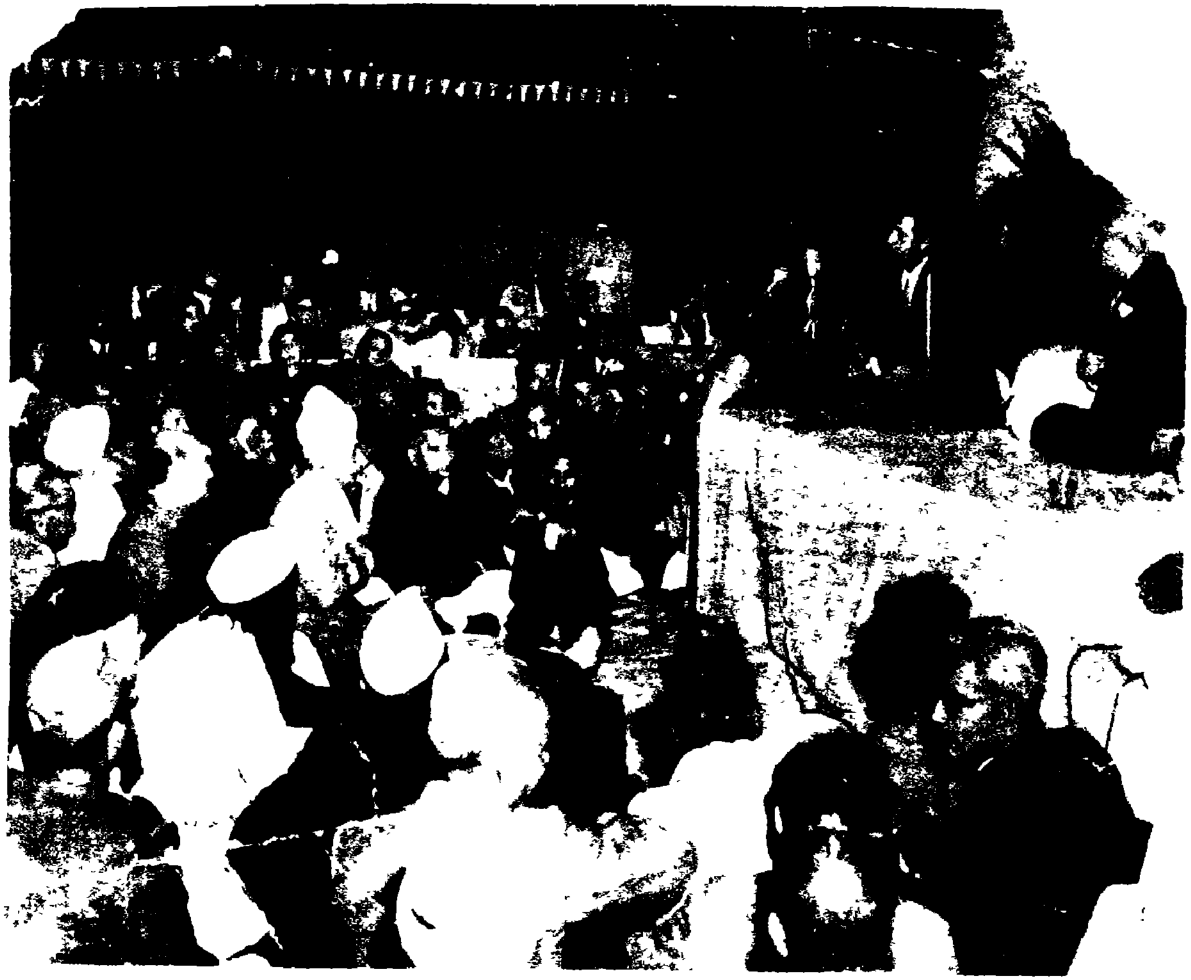
خواجہ احمد عباس۔ قتیل اور اختر الایمان



▲ دو دوستوں میں فیض ثانی، احمد ندیم قاسمی اور عبدالحمید عدم



▲ قتیل شفائی اور
حبیب جالب



▲ چیمسفورڈ کلب دہلی کے مشاعرے میں کلام پڑھتے ہوئے (۱۹۵۲ء) دوسرے شعراء میں جوش ملیح آبادی۔ تلوک چند محروم۔ ہری چند اختر۔ جگر مرادآبادی۔ جسٹس میانی۔ عرش ملسیانی۔ سرشین کارتاد اور کئی نامور شعراء شریک ہیں۔



▲ ریڈیو اسٹیشن کا ایک یادگار مشاعرہ ۱۹۴۹ء ... دائیں سے ... رضا ہمدانی ... جعفری مرحوم ... [illegible]
... حسن ... مرحوم ... سیف الدین سیف ... یوسف ... مرحوم ... [illegible]
... [illegible]



◄ مشہور ادیبوں کے ساتھ
دائیں سے
محمود نواز ...
رحیم گل۔ سرور رضا ...
اور قتیل شفائی۔
... پشاور



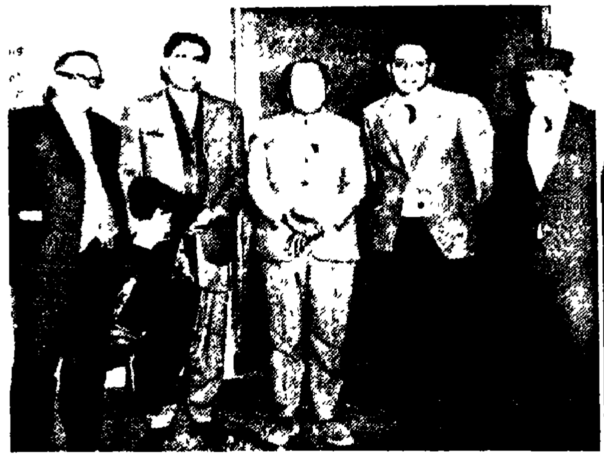
▲ احمد آباد کے مشاعرے میں ۔ سنہ ء



◄ احمد ندیم قاسمی اور قتیل شفائی
سنہ ۱۹۵۰ء کی
ایک یادگار تصویر



▲ تیتل شفائی۔ افروایشیائی مصنفین کی کانفرنس منعقدہ دہلی میں پاکستان کی نمائندگی کرتے ہوئے۔ نیچے سے اوپر کی تیسری قطار میں تیسرے نمبر پر۔ اعجاز بٹالوی۔ عبادت بریلوی اور عبدالمجید سالک بھی شریک تھے۔



▲ (دائیں سے بائیں) خاطر غزنوی۔ رحیم گل۔ قتیل شفائی۔ محسن احسان اور تاج سعید۔



▲ (کراچی میں) ابراہیم جلیس قتیل شفائی اور محمود شام



▲ قتیل شفائی۔ کشمیری لال ذاکر۔ فیض اور ساحر ۱۹۵۶ء کے ایک مشاعرہ (منعقدہ دہلی) میں



▲ کوہ مری (پاکستان) کی ایک راہ گذر پر شعراء کا قافلہ۔ (بائیں طرف سے) قتیل شفائی۔ دیگر شعراء میں احمد ندیم قاسمی۔ فارغ بخاری۔ احمد راہی۔ حمید ملک۔ احمد ظفر۔ ظہیر کاشمیری۔



▲ پاکستان رائٹرز گلڈ کے سالانہ اجلاس میں
[illegible] محسن شفائی [illegible] اور مرحوم ڈاکٹر [illegible]

▼ محسن شفائی [illegible]

[illegible] محسن شفائی





▲ نقوش کے ایڈیٹر محمد طفیل مغربی پاکستان کے سکریٹری کی حیثیت سے روسی اور ہندوستانی ادیبوں کے اعزاز میں تقریب منعقد کی۔ دائیں سے (بائیں سے تیسرے نمبر پر) میرزا ادیب، (... آنند۔ جوگندر پال۔ (آٹھویں نمبر پر) سرور کاشمیری ... حمید۔ نقوش طفیل۔ محمود احمد گیلانی۔ پشتو کے ایک ادیب۔ رؤف ملک۔ شاد امرتسری مرحوم۔ احمد ندیم قاسمی
دو روسی ادیب ... ڈاکٹر وزیر آغا



▲ صابر دت کی شادی کی سلور جوبلی کے موقع پر لی گئی تصویر (دائیں سے بائیں) ثاقب زیروی۔ حبیب جالب۔ حسن ... منیر نقوی۔ رشید حسن کاظمی۔ کلیم عثمانی۔ عارف بخاری۔ احمد ندیم قاسمی۔ یوسف شاد۔ جاوید قمر۔ اکرم ... مظفر وارثی
طفیل ہوشیارپوری۔ احمد ظفر۔ حبیب کیفوی۔ سلیم کاشر۔



▲ فیض احمد فیض ۔ ساحر لدھیانوی ۔ مخدوم محی الدین اور جیندر رشیکھر



▲ قتیل شفائی ۔ مخدوم محی الدین ۔ مجروح سلطانپوری ۔ دجیندر رگوڑ اور رشید صدیقی۔

بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا ؛ غنیمت ہے جو ہم صحبت یہاں دو چار بیٹھے ہیں



ساحر کی آخری قیام گاہ پر
قتیل شفائی

آہستہ برگِ گُل بفشاں بر مزارِ ما
بس نازک است شیشۂ دل در کنارِ ما



قتیل
ساحر لدھیانوی اور بابا بہادر
شاہ کے ساتھ۔



▲ صنیل دت، نفیس شفائی اور راج کھوسلہ
—— ہم ایسے محوِ نظارہ نہ تھے کہ ہوش آتا



◀ نفیس شفائی۔ صابر دت۔ سنیل دت اور نرگس دت۔
—— "چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے"



اداکار پران قتیل شفائی پر سے روپے
نچھاور کرتے ہوئے



فلمساز موہن کمار قتیل شفائی کی گلپوشی
کرتے ہوئے درمیان میں آنند بخشی۔



▲ فلم ... منوج کمار کی فلم ... پر بانو ... گانے کی ریکارڈنگ کے موقع پر ... کو سوامی منوج کمار عتیق سعدی اور ... منگیشکر ...



▲ گیت کار آنند بخشی کے گھر پر (بائیں سے دائیں) صابر دت۔ عتیق سعدی۔ آنند بخشی۔ موسیقار روشن اور فلمساز ریاض



▲ قتیل شفائی، اداکارہ نمی اور ان کے شوہر ریتی روپ اور ترجمہ اداکار مُظفری کے ہمراہ



▲ قتیل شفائی اور ان کی بیگم، دلیپ کمار کے ساتھ منوج کمار کی فلم کرانتی کے سیٹ پر



▲ قتیل ۔ رام دیال اور راما نند ساگر



◄ قتیل اور گلزار



◄ قتیل اور نوشاد



▲ تفتیل شفائی اور منوج کمار

تم کو دیکھا تو سرچشم ہوئے
تم کو چاہا تو اور چاہ نہ کی



▲ قتیل شفائی۔ مہدی حسن اور اے حمید (میوزک ڈائریکٹر) کے ساتھ۔



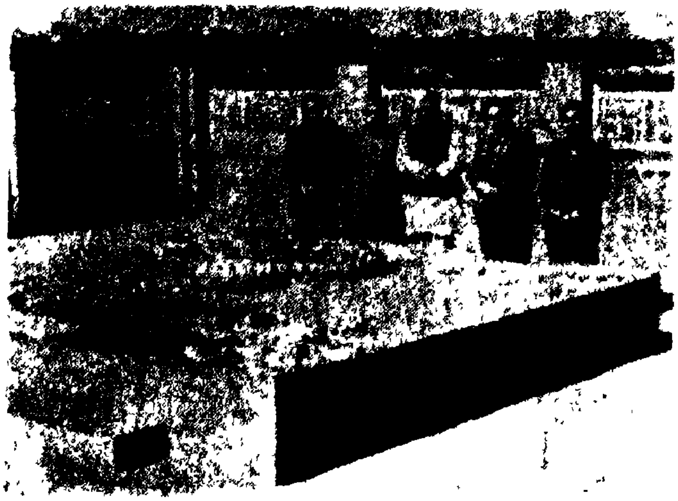
بیٹے نوید بٹ اور ملکۂ ترنم نورجہاں کے
ہمراہ۔



دبئی میں [illegible]
ادبی تقریب کے موقعہ



بائیں سے دائیں: آنند بخشی۔
راجندر کرشن۔ موسیقار خیام
[illegible]۔ [illegible]۔ نقش لائلپوری
اور مجروح سلطانپوری۔



ساحر ہوشیارپوری۔ مولوی سمیع اللہ۔
کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، قتیل شفائی
اور نریش کمار شاد
مہاتما گاندھی کی سمادھی پر (۱۹۵۲ء)



(بائیں سے دائیں) کے۔ کے۔ اُپل
امریک آنند۔ راجندر کرشن
قتیل شفائی۔ ثریا۔ مسز بابا بہادر شاہ۔



قتیل شفائی ڈاکٹر ظ۔ انصاری کے ساتھ



▲ حسن کمال۔ کیفی اعظمی اور قتیل شفائی



◀ فلم "ایک لڑکی میرے گاؤں کی" میں محمد علی (درمیان میں) ہمایوں مرزا سنہ ۱۹۷۰ء (مکمل ریلیز نہیں ہوئی)



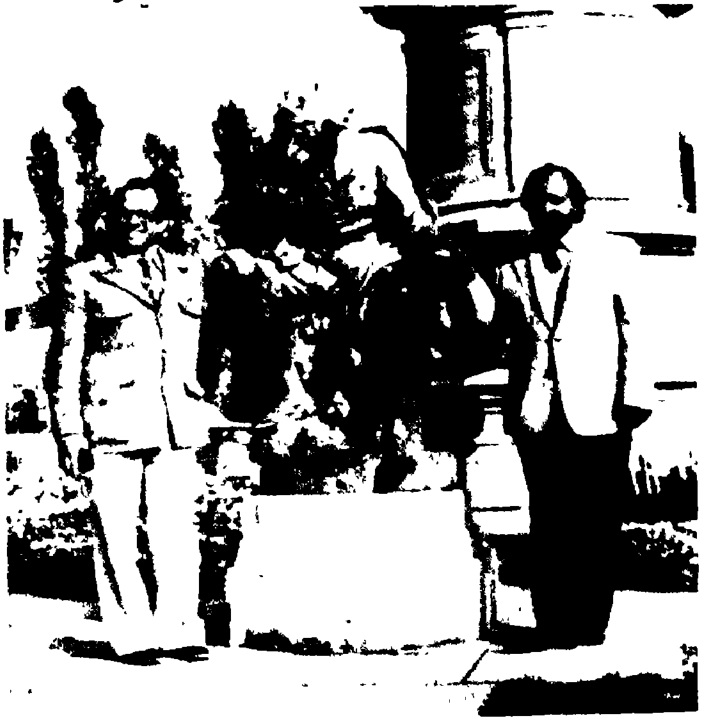
ایمسٹرڈیم ہالینڈ میں
سید مغنی اور قتیل شفائی



ڈنی لینڈ میں
ضمیر جعفری۔ جمیل الدین عالی۔ قتیل شفائی
ثابت علی شاعر۔ فرحت شہزاد ... ر
... فاتید۔



وائس آف امریکہ واشنگٹن میں
کلام کی ریکارڈنگ



شیکسپیئر کے کردار ہیملٹ کے مجسمے کے پاس
قتیل شفائی اور برطانوی صحافی سلطان محمود



عسکری (ابن سعید) اور قتیل شفائی
پیرس کے بازار
شانزے لیزے میں



پروین فرد۔ جمیل الدین عالی
اور قتیل شفائی
(ٹورنٹو سنہ ۱۹۸۱ء)



▲ قتیل شفائی اور رام لعل (امریکہ میں)



▲ قتیل شفائی اور پروفیسر جگن ناتھ آزاد (شکاگو میں)



▲ (بائیں سے دائیں) حمیدہ قمر (مدیر معاون، فن اور شخصیت) قتیل شفائی اور جہاں آرا کے ساتھ



▲ اردو زبان و ادب کی ترقی کے لئے صابر دت جس انہماک سے کوشاں ہیں، گزشتہ دنوں اس کے اعتراف میں جناب قمر الدین صاحب نے ادارۂ فن اور شخصیت کی مالی اعانت کے لئے مجلس نظر کاروان ادب (اندور) کے زیر اہتمام ایک مشاعرہ منعقد کیا جس میں شریف آف بمبئی شری سنیل دت صاحب نے خصوصی مہمان کے طور پر شرکت کی۔ اس موقع کی تصویر۔



▲ شریف آف بمبئی شری سنیل دت صدارتی خطبہ دیتے ہوئے۔ اسٹیج پر (دائیں سے) قمر الدین۔ شاذ تمکنت۔ قتیل شفائی
عزیز قیسی۔ اور کنور مہندر سنگھ بیدی نظر آرہے ہیں۔



...ہوی مون
...یل لسٹ ...
...ل تری نیل ...
...لگاتے ہوئے

حسن کمال۔ شاذ تمکنت
سنیل دت۔ عزیز قیسی
اور قتیل شفائی پر
مشتمل باوقار اسٹیج





سامعین کرام

فن اور شخصیت کے قافلہ سالار



صابر دت



ڈاکٹر راہی معصوم رضا



عزیز قیسی



حمیدہ قمر



امروز
(اندرجیت)



راجندر کرشن





ہم کہ ٹھہرے اجنبی

طے یہ ہوا تھا کہ قتیل صاحب ذرا فرصت سے دستیاب ہوں تو ٹیپ میں انہیں بند کر لیں لیکن پھر اسی پر قناعت کرنی پڑی کہ سوالات روانہ کر دیئے جائیں۔ اب قتیل صاحب کے جوابات آپ کے سامنے ہیں۔ ان میں قتیل صاحب کی شخصیت کیسے کیسے بنتی اور سنورتی ہے، آپ خود دیکھ لیں۔

—— حمیدہ قمر

● میرا تعلق ایک ایسے قبیلے سے ہے جس کے بیشتر افراد لکھ پتی تو تھے لیکن علم کی سطح پر ان جیسا قلاش اپنے وقت میں کوئی نہ تھا۔ دولت کے بل بوتے پر کوئی بزرگ میونسپلٹی کے وائس پریذیڈنٹ بن گئے اور کوئی انگریز بہادر کے کرسی نشین۔ دراصل قبیلے کے تقریباً تمام افراد سیٹھ کہلاتے سوائے میرے والد کے، جو دولت مند ہونے کے باوجود اس لفظ سے الرجک تھے۔ اگر کوئی شخص ہمارے دروازے پر "سیٹھ صاحب" کہہ کر آواز لگاتا تو میرے والد اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے کسی "سیٹھ" رشتہ دار کے دروازے پر پہنچا آتے۔ میرے والد بھی علم کے معاملے میں بہت پیچھے تھے لیکن دنیا بھر کی رنگینیوں میں رنگے ہوئے تھے۔ ان کی شامیں تو خصوصاً بڑی سہانی ہوا کرتی تھیں وہ اپنے بہت ہی مخصوص دوستوں کے درمیان بہت خوبصورت باتیں کیا کرتے تھے اور ان باتوں کا اکلوتا سامع میں ہی ہوا کرتا تھا۔ وہ اپنی گفتگو کا رخ بظاہر اپنے جھومتے جھامتے احباب کی جانب رکھتے لیکن غیر محسوس طور پر اس گفتگو کا بہاؤ پوری طرح میری طرف ہوتا۔ میں نے تلسی داس اور بھگت کبیر کا کلام اور اردو کے کلاسیکل شعراء کے بہت سے اشعار انہی کی زبانی سنے اور انہوں نے ہی چھوٹی چھوٹی حکایتوں کے پردے میں زندگی کے اسرار و رموز بہت سہل اسلوب میں مجھ تک پہنچائے۔ غلامی، توہم پرستی، پیر پرستی، مزار پرستی اور دقیانوسی خیالات سے وہ بہت متنفر تھے انہوں نے میرے بچپن ہی میں مجھے ہر قسم کے "شرک" کا مخالف بنا دیا اور میں اپنے ہم عمر دوستوں میں "وہابی" سمجھا جانے لگا۔ لیکن ان کے تربیت دینے کا یہ پہلو بالکل ضمنی حیثیت رکھتا ہے وہ میری افتاد طبع کو بھانپ چکے تھے اور چاہتے تھے کہ میرا علمی ادبی ذوق کسی طرح آگے بڑھے، چنانچہ کچھ تو ان کی

محفل آرائی میرے کام آئی اور کچھ انہوں نے گراموفون ریکارڈوں کے ذریعے اچھے شعراء کا کلام مجھے مہیا کیا جسے سن کر میرا جی چاہتا کہ میں بھی ایسے ہی شعر کہوں چنانچہ ابتدائی مشقِ سخن میں یہ ریکارڈ ایک طرح سے میری رہنمائی کرتے رہے خصوصاً سہگل کے ریکارڈ۔ اسی اثنا میں مجھے سکول کی "بزم ادب" کا سیکرٹری بنا دیا گیا۔ میرے والد نے میری پوری کلاس کو اس خوشی میں دعوت دی۔ پھر سکول میں شاعری کا انعامی مقابلہ ہوا میری غزل سب سے اچھی قرار پائی اور مجھے چند کتابیں انعام میں ملیں۔ پھر کیا تھا میرا قلم فر فر چلنے لگا اور میں اپنے شہر کی حد تک شاعر تسلیم کر لیا گیا۔ اور میں اب سوچتا ہوں تو مجھے خیال آتا ہے کہ اگر میرے والد کی تربیت اور میرے سکول کا ماحول مجھے حاصل نہ ہوتا تو شاید میں شاعر نہ ہوتا کچھ اور ہوتا۔ غالباً موسیقار ہوتا کیونکہ گراموفون ریکارڈوں کا ایک رستہ موسیقی کی جانب بھی تو جاتا ہے۔

● ٹھیک سے نہیں بتا سکتا کہ میری پہلی غزل کون سی تھی لیکن ابتدائی چند غزلوں کے اشعار میں سے جو ایک شعر یاد رہ گیا ہے وہ یہ ہے۔

کبھی پھول بنے اور مسکائے کبھی شبنم بن کر رو دیئے ہیں
اس گلشنِ ہستی میں اے دل یوں ہم نے عمر گزاری ہے

● آپ نے کیسے کہہ دیا کہ میں کسی ترقی پسند تحریک سے متاثر نہیں ہوا۔ میں تو وہ ترقی پسند ہوں جسے کسی ادبی رہنما نے نہیں بلکہ اپنے والد نے بچپن ہی میں ترقی پسندی کے راستے پر ڈال دیا تھا۔ اگرچہ وہ ترقی پسندی مذہبی حدود تک تھی۔ آپ آج سے چالیس پینتالیس برس پہلے کا زمانہ تصور میں لائیے جب مذہب کے مروجہ تجزیاتی پہلوؤں سے روگردانی کرنا اور غیر ملکی غلامی کو شدت سے محسوس کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اگر اس زمانے سے ہی میرا ذہن فرسودگی کے خلاف اور زندگی کے روشن حقائق کے حق میں تھا تو اس کے بعد میں رجعت پسندی کو کیسے قبول کر سکتا تھا۔ ہاں اگر آپ ترقی پسندی صرف ایک خاص قسم کی نعرہ بازی کو سمجھتے ہیں تو پھر مجھے اعتراف ہے کہ ایسی ترقی پسندی کے اثرات نہ میں نے کبھی پہلے قبول کیے تھے نہ اب میری شاعری ان سے ملوث ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایک فنکار کے لیے انسان دوستی اس کی سب سے بڑی پہچان ہے اور انسان دوستی کے ذیل ہی میں ظلم و استحصال کے سامنے سینہ سپر ہونا اور دنیا بھر کے پسے ہوئے عوام کے حق میں آواز اٹھانا خصوصیت سے آتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ لاؤڈ اسپیکر بنا ہوا گلا اور سر سے اوپر اٹھا ہوا مکا "تو پیش پیش ہو اور بیچارہ فن کہیں اُن کے پیچھے سرگوشیاں کرتا محسوس ہو۔ میرے نزدیک فنکار کے فن کو بہر صورت اولیت حاصل ہے اور میں یہ بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ ایک شاعر جو کچھ کہے اپنے اسلوب میں کہے اس کی آواز دوسری سینکڑوں آوازوں کے کورس کا ایک حصہ بن کر نہ رہ جائے۔ یوں لوگ اس پر توجہ دیتے ہیں اور اپنی شاعری کے وسیلے سے جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ لوگوں تک دوا بن کر نہیں بلکہ ان کے ذوق کی تسکین بن کر پہنچتا ہے۔ شاید میرے انہی خیالات کی وجہ سے کچھ سکہ بند ترقی پسند مجھے اپنا ساتھی نہ سمجھتے ہوں لیکن میں علی الاعلان کہتا ہوں کہ میں رجعت پسندوں کا ساتھی نہیں۔

● شاعری کے بارے میں میرا کوئی الگ نقطہ نظر کیا ہو سکتا ہے! یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ تاریخ کے معلوم ادوار کا ہر گزشتہ عہد ہی کچھ کہنے اور کچھ سننے کا تمنائی رہا ہے۔ اس دور میں بھی جب انسان لکھ پڑھ نہیں سکتا تھا بلکہ اس دور میں بھی جب انسان نے لفظوں اور آوازوں کو کوئی نام نہیں دیا تھا۔ لیکن وہ اظہار کے پیرائے اس وقت بھی جانتا تھا۔ وہ اس وقت بھی کبھی فرد کے طور پر اور کبھی قبیلے کی شکل میں اپنے جذبات اور دل کی باتیں دوسروں تک پہنچانے کی جستجو کرتا تھا اور آج بھی وہ اسی راہ پر گامزن ہے۔ جب ایک عام آدمی کا مسئلہ بھی اظہار ذات ہے تو ایک شاعر جو اپنے عہد کا نمائندہ ہوتا ہے وہ تو فرض سمجھ کر کچھ کہتا ہے کچھ لکھتا ہے اور میں بھی اپنے آپ کو اس فرض کا پابند سمجھتا ہوں کہ میرے عہد کے جو مسائل ہیں انہیں اپنے فن کا موضوع بناؤں۔ لیکن ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہر شاعر کو ان چند گنے چنے مسائل کو ایک ہی طرح سے اپنے فن کا موضوع بنانا چاہئے۔ میرا جواب نفی میں ہے کیونکہ ایک ایک مسئلے کے کئی رخ ہیں مثلاً ایک مسئلہ استحصال کا ہے۔ سیدھے سادے طریقے کی روشنی میں ہم سرمایہ دار ملک کو چھوٹے چھوٹے غریب ملکوں میں معاشی لوٹ کھسوٹ کا مجرم گردان سکتے ہیں۔ لیکن استحصال کی ایک چھوٹی سی شکل یہ بھی ہے کہ ایک بڑا سرمایہ دار کوئی ٹھیکہ لینے کے لئے اپنی خوبصورت بیوی کو بیچ میں ڈال دے اور استحصال کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ کوئی لالچی باپ اپنے بیٹے کو دولہا بنانے کے عوض دلہن کے غریب باپ سے ناقابل برداشت جہیز کا مطالبہ کرے اور استحصال کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ ایک لڑکی ایک لڑکے کو محبت بھرے خطوط اس امید پر لکھے کہ وہ اس سے شادی کرے گا لیکن ایسا نہ ہونے کی شکل میں جب لڑکی کی شادی کہیں اور ہو جائے تو لڑکا انہی خطوط کو بلیک میلنگ کے لئے استعمال کرے — مثالیں کہاں تک دی جائیں یہ ساری شکلیں استحصال کی شکلیں ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کو موضوع فن بنانا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا مل مالک اور مل مزدور کو — لیکن میں نے جب کبھی اس قسم کے موضوعات پر کام کیا ہے میرے بعض دوستوں نے اسے پسند نہیں کیا ان کے نزدیک فن کا یہ رویہ ثقہ نہیں۔ لیکن میرے نزدیک ان اوچھی قسم کے رخوں کو سامنے لانا زیادہ ضروری ہے۔ اور اجتماعی کورس سے ہٹ کے لکھنے کا ایک طریقہ بھی اسی طرح ایک شاعر اس عالمگیر ادبی نقطہ نظر کے دائرے میں بھی جاتا ہے۔ اس کی پہچان بھی ہوتی ہے اور اگر شاعر کو اپنے فن پر کامل دسترس بھی ہے تو اعلیٰ شاعری کی تخلیق کا اعزاز بھی اس کے حصے میں آجاتا ہے۔

● داخلیت اور خارجیت کی بحث ایک عرصے تک چلتی رہی ہے اور اب بھی اس سے چھٹکارا نہیں ملا۔ بات سیدھی سادی ہے، ہم جو لقمے باہر سے اپنے معدے میں اتارتے ہیں اگر معدہ ساتھ نہ دے تو بے ہضمی ہو جاتی ہے اس لئے میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ داخل اور خارج لازم و ملزوم ہیں تنہا داخلیت کسی کام کی نہ خارجیت

● کونسی جدید شاعری ــــ ؟ جس کا غلغلہ میرے بچپن میں تھا اور جس کی خوب خوب مخالفت ہوئی یا وہ جدید شاعری جس کا الزام میری جوانی پر بھی لگا اور اس پر خوب لے دے ہوئی یا آج کی جدید شاعری ــــ ! جس کے علمبردار نوعمر قتیل شفائی ہیں اور جن کی مخالفت سن رسیدہ قتیل شفائی کر رہے ہیں ـ! سنئے جناب! ہر دور میں ہر نئی چیز کی مخالفت ہوتی آئی ہے ـ اب بھی ہو رہی ہے ـ اور پچھلے تجربوں کو فراموش کر کے ہو رہی ہے ـ میں تو ادب اور زندگی کے میدان میں ابھرنے والے ہر نئے رویئے کا حامی ہوں ـ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا ناکہ اس تازگی کا رس تو ہماری صحت بنائے گا اور اس کے چھلکے ــ! انہیں ہم پھینک بھی دیں تو کوئی حرج نہیں ـ

● جیسا کہ میں آپ کے کسی پہلے استفسار کے جواب میں کہہ چکا ہوں کہ میں تھگ بندھے مسائل کو (چاہے وہ سیاسی ہوں یا سماجی) بالکل اسی طرح موضوعِ فن بنانے کے حق میں نہیں ہوں جس طرح بعض گروہ مل کر اجتماعی صورت میں موضوعِ فن بناتے ہیں ـ اس طرح فنکار اپنی پہچان کھو بیٹھتا ہے میری شاعری ہو یا کسی اور کی، سیاسی موسموں کے اثر سے بچ نہیں سکتی ـ فرق صرف اتنا ہے کچھ لوگ دیوانے ہو کر ناچنے لگتے ہیں اور کچھ لوگ جھومنے پر اکتفا کرتے ہیں ـ میں صرف جھومنے والوں میں ہوں فیض صاحب کی طرح ـ

● بنیادی طور پر تو میں ایک رئیس زادہ تھا لیکن جب وقت پڑا تو میں نے مزدبن ہر وہ ذریعہ معاش اپنے لئے باعثِ افتخار سمجھا جس کی حدیں رزقِ حلال سے ملتی ہیں ـ چاہے وہ کتنا ہی چھوٹا اور حقیر تھا ـ لاکھوں روپے کاروباری ناتجربہ کاری کی نذر کر دینے کے بعد میں نے ہری پور میونسپل کمیٹی کی محرری کی ـ راولپنڈی اور ہری پور میں ٹرانسپورٹ کمپنی کی بکنگ کلرکی کی ـ لاہور میں بہت معمولی معاوضے پر کتابوں کی پروف ریڈنگ کی ـ یہ سب کچھ کیا لیکن میرے عزائم کا جو ہدف تھا اسے کبھی فراموش نہ کیا ـ

● آپ کا تجزیہ درست تسلیم کرتے ہوئے یوں محسوس کر رہا ہوں جیسے میں خودستائی کا مرتکب ہو رہا ہوں ـ یہ حقیقت ہے کہ میں گھسے پٹے راستوں پر چلنے سے ہمیشہ گریز کرتا رہا ـ اور اگر کوئی ایسا راستہ سامنے آ بھی گیا تو میں نے پہلے اس راستے کو پتھروں اور کنکروں سے صاف کیا اس کے نشیب و فراز مٹائے اور جب وہ میرے چلنے کے قابل بن گیا تو میں نے اس پر قدم رکھے ـ میں زندگی اور فن کے توازن اور ترنم کا قائل ہوں میں نے بہت سے بے سرے موضوعات کو نغمگی سے ہمکنار کیا ہے یہاں تک کہ سناٹوں کو بھی کوئل کی کوک کا وصف آ گیا ـ رہا غمِ عاشقی اور غمِ روزگار کا معاملہ سو یہاں بھی آپ نے اپنے سوال میں ہی میرا جواب شامل کر دیا ـ آپ کا یہ تجزیہ بھی درست ہے کہ میں نے عشق کی دلدل میں گلے گلے تک دھنس جانے کے باوجود زندگی کی امر حقیقتوں کو کبھی نہ بھلایا ـ کسی انسان کی زندگی کا موڑ بےحد خطرناک ہوتا ہے جب اس سے کوئی یہ کہے

کہ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ میری زندگی میں ایسے کئی موڑ آئے لیکن نہ جانے ہر بار میرے کان میں کون یہ سوال پھونک جاتا کہ تمہیں پا کر یہ شخص تو زندہ رہ جائے گا لیکن اس گھر کا کیا بنے گا جس کی زندگی تم ہو! اور میں زندگی کے کسی بھی دور میں اپنے گھر کو دیواروں اور دروازوں کا مرگھٹ نہ بنا سکا۔

● یہ آپ کا حسنِ نظر ہے۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

● راولپنڈی سے کوئی پچاس میل دور ایک چھوٹا سا شہر ہے جسے ہری سنگھ نلوا نے ہری پور کے نام سے آباد کیا تھا۔ یہ شہر ہزارہ ڈویژن کی ایک تحصیل ہے اور جغرافیائی اعتبار سے اس کا تعلق صوبہ سرحد سے ہے۔ میرا جنم اسی شہر میں ہوا اور جب میں نے آنکھ کھولی تو چاروں طرف ہریالی کے میلے لگے تھے۔ شہر کے چاروں طرف پھلوں سے لدے ہوئے درخت اور پھولوں سے مہکتے ہوئے پودے اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ نورانی راتوں اور خوشبودار دنوں سے آراستہ اس شہر کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ شہر کی سڑکوں اور گلی کوچوں میں صاف شفاف پانی کے چھوٹے چھوٹے نالے بہتے تھے اور جب دن ڈوب جاتا تھا تو سرِ شام ہی سے جگنوؤں کے جلوس فضاؤں کو جگمگانے لگتے تھے اور جب صبح ہوتی تھی تو پنچھیوں کی چہکاریں کانوں میں رس گھولنے لگتی تھیں، یہ خوبصورت ماحول جسے میسر آیا ہو اس کی سوچیں کیوں نہ گنگنائیں۔

● میں نے فلم کے لئے جب شاعری کا آغاز کیا تو میرے سامنے ایک مشن تھا۔ میں نے پیسے کے لئے کبھی کسی فلمساز سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ شروع شروع میں دنگے فساد بھی ہوئے لیکن کچھ عرصہ بعد بہت سے لوگ میری بات ماننے لگے اور باقی مجھ سے اتنے دور چلے گئے کہ ان کے کان میں میری شاعری کی آواز ہی نہ پہنچ سکے۔ میرا ملک انڈیا جیسا وسیع ملک نہیں یہاں فلموں کا بجٹ انڈیا سے دس بارہ گنا کم ہوتا ہے۔ اس لئے شعبۂ موسیقی پر زیادہ رقم نہیں اٹھائی جا سکتی یہاں لے دے کے اچھی شاعری پر ہی گانے کی کامیابی کا دارومدار ہوتا ہے۔ لیکن جاہل کہاں نہیں ہوتے! یہاں بھی اللہ کا فضل ہے۔ اس کے باوجود میں نے کبھی کمائی کو اولیت نہیں دی شاید یہی وجہ ہے کہ میں اپنے گیتوں کا معیار برقرار رکھ سکا ہوں

● میں نے ایک سچے ترقی پسند شاعر کے ناتے ہمیشہ ان کرداروں کو اپنے فن کا موضوع بنایا ہے جنہیں منہ لگانا بھائی لوگ کسرِ شان سمجھتے تھے۔ میں نے کبھی کھیت کا منہ نہیں دیکھا مجھے کسان پر لکھنے کا کیا حق ہے۔ میں کبھی کسی مل کا مزدور نہیں رہا میں کیوں جھوٹا مزدور بن کر سامنے آؤں۔ میری زندگی کا بیشتر حصہ نگار خانوں میں گذرا ہے اور میں نے یہاں ایسے ایسے کرداروں کا مشاہدہ کیا ہے جن کے مسکراتے چہروں

تفصیل صفائی نمبر

فن اور شخصیت ـــ

کے مجھے نہ تو ہم اس کے دکھ کے کرب میں بیٹھے ہیں مجھے آسمان اور مزید دور سے بھی۔ بادہ مطلوبہ پر نظر آئے کیونکہ میں نے بالادست ان کا مشاہدہ کیا تھا۔ اگر میں ان کرداروں کو نظر انداز کرنے کی بجائے یا ادب نیشنوں کے طور پر اس طبقے سے ہمدردی جتلانے لگتا جس سے میرے تجربوں کا تعارف ہوا ہے تو آپ ہی بتائیے کہ بیان کا نقصان ہوتا کہ میں آپ دار بری شاعری کو ، دعا گو ہیں جیتے۔

● کبھی افسانہ نگاری سے کوئی نہیں ... میرا شعری سفر افسانے اور شاعری ... جعلی معیاروں پر موں میں تقسیم گئے تھے لیکن بہت ہو جاتا ہے اور شاعری کی دو تلواریں ایک میان میں ٹھیک نہیں اسی لئے میں نے افسانہ نگاری کو باقاعدہ الوداع کہی اور شاعری کو ہمیشہ کے لئے گلے لگا لیا

● روایتی مشاعرے ... دور میں سو مدالے ہیں بیس ہزار مددگار ثابت ہوں ... تو نہیں کہوں گا کہ ان مشاعروں سے شعر کا معیار بہت متاثر ہوا بلکہ مجروح ہوا ہے۔ وہاں اس طرح کہ مشاعرے کے سامعین اکثر و بیشتر شعر کی سمجھ بوجھ سے عاری ہوتے ہیں اور مشاعرے میں شاعر کا سب سے بڑا مقصد داد وصول کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے ایک تو وہ اسی سطح سے شعر کہتا ہے ... کلام پیش کرتا ہے دوسرے وہ بار بار کی سنائی ہوئی چیزیں ... باہم مقابلہ اور شاعروں کو ان کے معیار کی ... سنانے کی مہلت بھی دے دی جاتی ہے لیکن پھر بھی ـــ

● زندگی قدرت کا وہ انمول عطیہ ہے جو انسان کے لئے سب سے زیادہ کشش رکھتا ہے۔ اس کا ایک ایک لمحہ رسیلے انگوروں کی طرح ہے جس سے شراب بھی کشید کی جا سکتی ہے اور سرکہ بھی بنایا جا سکتا ہے چونکہ میرا نظام ہضم درست ہے اس لئے مجھے سرکے کی ضرورت نہیں میں تو ان رسیلے انگوروں سے ٹپکتے ہوئے ایک ایک قطرے کا قدر دان ہوں

تین ادھورے خطوط

فکر تونسوی

(یہ تینوں خطوط پوسٹ نہیں کیے جا سکے کیونکہ ادھورے تھے اور خدائے واحد و لاشریک کے فضل و کرم سے شاید ادھورے ہی رہیں گے)

صابر دت کے نام۔

صابر دت، صاحب!

اگر [illegible] کے الفاظ سے تمہیں یہ خطرہ ہو کہ اس سے تمہاری عزت میں اضافہ ہو جائے گا تو میں (بریکٹ میں [illegible]) کے الفاظ کو بلا تکلف ہٹا دو [illegible] حالانکہ آج کل زمانہ ساز حضرات بریکٹ کو ہی ذریعہ عزت سمجھ کر ٹھاٹھ سے جی رہے ہیں۔

تم نے قتیل شفائی نمبر کے لیے مجھے کچھ اختصار سے سطریں تحریر کرنے کا حکم دیا ہے۔ حالانکہ حکم کی [illegible] عقیدت کی مسکراہٹ سنائی دیتی ہے۔ مگر صرف ایک بات میں لوں گا کہ اگر کوئی آدمی پہلی مرتبہ آپ پر ایک نظر ڈال دے اور پھر اس کا پورا وجود اپنی اس ایک نظر سمیت آپ کے اندر داخل ہو جائے اور آپ بے بسی کے مارے کچھ بھی نہ کہہ سکیں تو آپ اس اہل نظر کو بڑی آسانی سے قتیل شفائی کہہ سکتے ہیں۔

ہاں، مجھ پر بھی قتیل شفائی کی پہلی نظر نے یہی عمل کیا۔ اور میں کہ بزعم خود شریف انسان ہوں (بظاہر اگرچہ بزعم خود مردم شناس آدمی ہوں) بہ باطن، قتیل شفائی کو اپنے باطن سے نہیں نکال سکا۔ چالیس برس ہو گئے مگر ابھی تک نہیں نکال سکا حالانکہ ان چالیس برسوں میں کئی دلگداز حسینائیں اس کے اشعار گنگناتی ہوئی اس کے اندر داخل ہوئیں اور پھر نکل گئیں۔ کئی ساتھی کئی [illegible] اس کے اندر سمائے اور پھر نکل گئے۔ فی الحال [illegible] سر جھکائے، قتیل کے ایک خاموش قہقہے کے ساتھ نکل کر باہر اڑ گئے۔ گم ہو گئے۔

بلکہ ایک مرتبہ میں نے خود بھی کوشش کی (کوشش جلیبو ٹائپ تھی) کہ وہ میرے اندر کو خالی کر دے لیکن قتیل [illegible] یہ کپکپاہٹ [illegible] میرے کندھے پر بیٹھ کر انتہائی پیار سے پڑا اور کمبخت وہ جلیبو ٹائپ کوشش ناکام ہو گئی [illegible] طرح ناکام ہوئی۔

اس کے ہاتھ کی کپکپاہٹ میں کوئی تضاد و تصادم کی تہہ پر اسرار جذباتی بلکہ ابدی لہر ہوتی ہے جو اس الف لیلوی طلسم کی طرح ہوتی ہے جس کی زد میں شہزادی کی جان بند ہوتی ہے۔ یہ کلام محسوس ہوتی ہے۔ محفوظ اور سکون بخش۔

تمہارا بیان! قتیل کی روح پٹھان ہے۔ سخت اور سخت دو سمت۔ پٹھان ہونے میں کوئی عیب نہیں۔ لیکن قتیل — پٹھانی تہذیب اور اخلاق کی مثال ہے جس کی کمی میں تیکھی ہوا اور بلند دل نہیں ہے بلکہ قلم اور موسیقی ہے۔ البتہ ایک چیز دونوں میں مشترک ہے کہ تلوار اور بندوق بھی رقص کرتی ہے اور نغمہ و موسیقی بھی۔ میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ پٹھانی تہذیب نے یہ کیسا انسان پیدا کر دیا ہو۔ . . . .

. . . .

. . . .

. . . .

(خط جاری ہے)

ساحر ہوشیارپوری کے نام۔

ساحر پیارے!

تم لاہور سے لوٹے اور میرے لئے کوئی سوغات کیا ہوا خط نہیں لائے۔ بلکہ قتیل شفائی کے ہاتھ کا لکھا ہوا لو لیٹر لائے۔
قتیل کا خط پڑھ کر مجھے تعجب نہیں ہوئی۔ اسارے رنگ اور بے رنگ خط؟ نہ جانے وہ اتنی نفیس اور حسین شاعری کیسے کر لیتا ہے۔
قتیل کے خط میں صرف ایک فقرہ ایسا تھا جس میں ایک معصوم بچے کا سا لہجہ تھا (ہر معصوم لہجہ میں حسن ہوتا ہے) قتیل نے لکھا تھا۔
"نیلم بھائی! ہم دونوں ساٹھ برس کو تجاوز کر رہے ہیں۔ مجھے صرف اتنی سی بات بتاؤ کہ ان برسوں میں تمہیں میری شخصیت کیسی نظر آئی؟"
ہائے ساحر جی! اس فقرے میں جو معصوم تمنا تھی اس نے میرے دل میں کئی سوئے ہوئے جہاں جگا دیئے۔ حالانکہ عمر کی اس منزل پر میں اتنا زیادہ جاگ چکا ہوں کہ مجھے کوئی بھی اس سے زیادہ نہیں جگا سکتا۔ (البتہ قتیل کا وہ فقرہ مستثنیات میں سے ہے)۔ جاگے ہوئے جہانوں نے مجھے ایک ہی مختصر سا جواب دیا — "قتیل کی شخصیت؟ عیب ہی عیب!"

ساحر: جب تم کبھی دوبارہ لاہور جاؤ تو قتیل سے کہنا۔ "قتیل! اپنے سرخ و سپید چہرے کو مت چھوؤ، فقط اپنی نگاہوں سے دیکھو، دوسروں کی نگاہوں پر اعتبار مت کرو کہ وہ نگاہیں اپنے پورے جسم و روح کو ایک بوسہ سا کر تم پر لوٹا دیتی ہیں۔ اور تم خدا کی ایسی سادہ لوح تخلیق کہ اس بوسے کو اپنی نظموں میں گھول دیتے ہو۔ تمہارے ساتھ ٹریجڈی یہ ہوئی ہے کہ بوسہ مر جاتا ہے۔ تمہاری شاعری نہیں مرتی"

اسے کہہ دو گے ساحر میاں!؟

میرا خیال ہے ساحر! خدا نے قتیل شفائی کو سرخ و سپید چہرہ دے کر اس کے ساتھ فریب کیا ہے۔ فریب حسن کے ساتھ ساتھ ستم بر ستم یہ کہ اس چہرے کو قہر الٰہی بھی کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ یہ بھی کیا کہ قتیل کو اس فریب کا علم ہی نہیں ہے؟

میرا بیان ہے کہ سُرخ و سپید چہرہ، حسین شاعری کا لازمہ نہیں۔ اگر قتیل پرکشش نہ ہوتا تو بھی حسین شاعری کر سکتا تھا۔ اس کا حسن شعریت اس کے باطن کا اعجاز ہے جو انتہائی اذیت ناک ہے۔ سچویشن کو بھی رنگ دار بنگ کی خوشبو میں بھگو کر باہر نکال لاتا ہے۔

چنانچہ ایک عیب تو اس کا سرخ و سپید چہرہ ہے جو اس کی شخصیت کے ساتھ یوں جڑ گیا ہے جیسے کسی زندہ دل بوڑھے کے ساتھ مصنوعی دانت جڑ جائیں، مروارید کی دانت، جس کا زندہ دلی کے ساتھ کوئی ربطہ نہیں ہوتا۔ اور قتیل کی پوزیشن تو اور بھی عبرت ناک ہے کہ چالیس برس پہلے بھی جو اس کے سرخ و سپید چہرے کے اردگرد چک پھیریاں کرتی تھی۔ اب چالیس برس بعد اس حسن کی بیٹی اظاہر ہے! وہ بھی حسینہ اس میں غلطاں ہے۔ اگرچہ لوگ لاج کے مارے کہتی یہ ہے کہ قتیل شفائی کے رس بھرے نغموں کی بھوکی ہوں اور انہیں شئے لذیذ کی طرح دھیرے دھیرے چباتی اور لطف اٹھاتی تھا۔

مگر ساحر پیارے! وہ دروغ بیانی فرمائی ہے کیونکہ قتیل شفائی کا چہرہ ہی ایسا ہے کہ وہ چالیس برس بعد بھی اسی سرخی سپیدی سے آراستہ ہے اور یوں لگتا ہے گذرے ہوئے چالیس برس بھی دروغ بیانی تھے۔ جو اس پر گذرے مگر کہتے یہ ہیں کہ وہ اس پر گذرے ہی نہیں۔ عمر — قتیل پر گذری ہی نہیں۔ عمر سے اس کے تعلقات برابر ناہموار اور ناخوشگوار رہے۔ صرف آج اس کی شاعری سے اس کی مجبوری کی خوشبو پتہ دیتی ہے کہ اس پر جیسے ہزاروں جہاں گذر چکے ہیں۔ ہزاروں زحمتیں، ہزاروں اذیتیں، ہزاروں ضربیں، ہزاروں شکوے۔ مگر اس کا سُرخ و سپید چہرہ اب بھی کہتا ہے "آؤ! آؤ! اہلِ ذوق حضرات و حاضرات! مجھ پہ دروغ گوئیوں کی شگفتگی انڈیل دو۔ یہ چہرہ آج بھی جسم و روح کو بوسہ بنا سکتا ہے"

ہاں ساحر! میں اسے عیب سمجھتا ہوں کہ اس کی روح اس کے جسم سے الگ جی رہی ہے۔ مگر ذرا میری مضحکہ خیزی ملاحظہ ہو کہ...؟

(خط جاری ہے)

قتیل شفائی کے نام۔

پیارے پیارے قتیل!

میرا یہ خط اذیت ناک ہوگا۔ میرے لئے نہیں تمہارے لئے — یہ اذیت شاید تمہارے باطن کو روشن کر دے جہاں سالہا سال سے اندھیرا ہے۔

لیکن اس خط کی رنجیدہ صداقت کو بھی تم نے اپنے چلبلے اور بے باک قہقہے کے ساتھ اڑا دیا تو میں سمجھوں گا کہ کسی احمق کو خط نہیں لکھنا چاہئے۔ یہ حماقت بعض لوگوں کو خدا کی دین ہوتی ہے — تمہیں خدا سمندر ایسی وسیع اور گہری حماقت عطا کرے گا، مجھے خدا سے کم از کم ایسی کم ظرفی کی امید نہیں تھی۔

میں نے سمندر اور قتیل شفائی کو دیکھا ہے۔ اس احمقانہ دین پر کئی بار اُبل اٹھا ہوں لیکن جس کے نصیب میں گہرائی اور وسعت لکھی ہو، وہ اُبل اٹھنے پر کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا اور حد تو اس اُبال پر بھی قہقہہ لگا دیتا ہے۔ آہ قتیل! خدا کا قہقہہ بھی کچھ تمہارے قہقہے سے ملتا جلتا ہے۔

اس سے تو بہتر تھا کہ تم سمندر کی ایک چھوٹی سی ندی ہوتے جیسے خدا نے چھوٹے چھوٹے عوام پیدا کئے ہیں جو بغیر معقول وجہ کے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ بغیر وجہ کے جیتے رہتے ہیں اور بغیر وجہ کے مر جاتے ہیں۔ اور بغیر وجہ کے سمندر میں یوں شامل ہو جاتے ہیں کہ سمندر تک کو معلوم نہیں ہوتا۔ خدا کئی چھوٹی چھوٹی ندیوں کو بھی اسی لئے پیدا کرتا ہے تاکہ انہیں معلوم ہی نہ ہو کہ وہ پیدا ہو چکی ہیں اور پھر چند سانس لینے کے بعد سمندر میں داخل کر دی گئی ہیں۔ انفرادیت اوّل تو ان میں ہوتی نہیں۔ اور اگر ہوتی بھی ہے تو انہیں اس کا علم نہیں ہوتا۔

مگر آہ! تم سمندر ہو، ندی نہیں ہو۔ حالانکہ میں جانتا ہوں کہ تم ندیوں سے پیار کرتے ہو کیونکہ تم سمجھتے ہو کہ میں انہیں ندیوں کا ہی ایک مجموعہ ہوں —— ایک سمندر!

کیا تمہیں یاد ہے آج سے چالیس برس پہلے جب ہم دونوں لاہور کی گلیوں میں آوارہ گردی کر رہے تھے۔ گلی ڈنڈا کرکٹ اور راہ چلتی حسیناؤں کی خوشبو دونوں کو اپنے اندر جگہ دے رہے تھے تو راستے میں تمہیں دھنا دھوبی ملا۔ تم نے اس سے پوچھا "دھنا! کیا تم اپنا جنم دن مناتے ہو؟" اور اس نے لاعلمی کی بلند منزل پر کھڑے ہو کر حیرت سے کہا تھا "جنم دن؟ وہ کیا ہوتا ہے بابو جی؟"

تم نے اسے کہا تھا۔ "ارے جنم دن وہ مناتا ہے جو دنیا میں پیدا ہو جاتا ہے۔"

اور اس نے کتنی خستگی سے کہا تھا۔ "اجی بابو جی! ہمارا پیدا ہونا بھی کیا پیدا ہونا ہے۔ آپ کہتے ہیں تو ممکن ہے ہم پیدا ہو چکے ہوں۔ مگر جنم دن .... ؟"

اور قتیل! تم نے تبسم اور آنسوؤں کی ملاوٹ کر کے ایک سرد آہ بھری تھی اور مجھے کہا تھا "فکر بھائی! اسے تو معلوم ہی نہیں کہ وہ پیدا ہو چکا ہے۔"

"اور نہ اس کی آنے والی نسلوں کو معلوم ہوگا کہ وہ پیدا ہو گئے ہیں اور اس طرح دنیا کی نسلوں پر نسلیں اس لاعلمی کا شکار ہو کر ضائع ہو گئی ہیں لیکن پاگل! تمہاری آنکھوں میں آنسو کیوں اتر آئے؟"

"یار! تکلیف ہوتی ہے کہ ایک انسان کو معلوم ہی نہ ہو کہ وہ ایک انسان ہے۔"

"اور نہ اس کے والدین کو معلوم تھا کہ اس کا نام دھنا نہ رکھا جائے۔ کیونکہ ...."

اور تم نے میرا فقرہ مکمل کیا تھا۔ "کیونکہ یہ دھنا سیٹھ نہیں بنے گا۔ دھنا دھوبی ہی بنے گا۔"

اور یاد ہے قتیل! تم نے اسے برفی کا ایک موٹا سا ٹکڑا دیا تھا —— مٹھائی (بشرطیکہ اعلیٰ ہو) تمہاری پرانی کمزوری تھی (اب تک ہے) اس کی لطیف اور لذیذ شیرینی، تمہاری نظموں اور گیتوں میں بھی گھس آئی تھی —— لیکن ایسا تو نہیں ہے کہ تم نے برفی کے اس ٹکڑے کو اس کے جنم دن کا کیک سمجھا ہو؟ اور یوں دھنا دھوبی کا "ہیپی برتھ ڈے ٹو یو!" منایا ہو۔ اسے یہ شعور دلایا ہو کہ انسان کے جنم دن میں کتنی شیرینی ہوتی ہے ایسی شیرینی جو راہ چلتی حسیناؤں کے لمس میں بھی نہیں ہوتی۔

شیرینی تمہاری کمزوری تھی اور تم حسیناؤں کی کمزوری تھے۔ لیکن قتیل بھیا! برفی کھا کر بھی دھنا دھوبی بدستور دھنا دھوبی ہی رہا۔ حسینہ نہیں بن سکا۔ برفی کا حسن سے کوئی رابطہ نہیں ہوتا۔ رابطہ جب لذیذ بنتا ہے جب دنیا کا ہر دھنا دھوبی تمہاری شیرینی میں رچی ہوئی نظمیں پڑھے اور جھوم اٹھے اور اسے یہ احساس ہو جائے کہ میں یہ نظمیں پڑھ اور سن نہیں رہا بلکہ اپنا جنم دن منا رہا ہوں

تمہاری نظمیں، اس کے جنم دن کی علامت بن جائیں اور ہر دھنا دھوبی یہ سمجھے کہ ملکۂ ترنم نورجہاں، ایسے ہی جنم دن کے اعزاز میں قتیل کی غزل گا رہی ہے۔

مگر وہ دن ــــ؟ ہائے قتیل! آج میں سوچتا ہوں کہ تمہیں اس دھنا دھوبی کی بے بسی اور لاعلمی پر جو تکلیف ہوئی ہے اس کا عکس تمہاری نظموں اور غزلوں میں آج سما گیا ہے۔ اگرچہ تمہارا المیہ یہ ہے کہ تمہیں اس کا علم ہی نہیں۔ مگر علم کا نہ ہونا.................
....؟؟؟

(خط جاری ہے)

قتیل شفائی نے اردو شاعری کو کئی جہتوں سے اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے اور کوئی جہت ایسی نہیں جس میں ان کی انفرادیت آجاگر نہ ہوئی ہو۔ نظم، غزل اور گیت کو انہوں نے ایسے نغماتی لہجے سے ہمکنار کیا ہے جو خالصتاً ان کا اپنا ہے۔

ـــــــــ ڈاکٹر فرمان فتح پوری

ایک خط ایک خوشبو

پروفیسر عبدالقوی دسنوی

برادرم صابر دت صاحب

شاد باش۔ نوازش نامہ چند روز ہوئے ملا، خط پر تاریخ غائب ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ آج کل بہت مصروف ہیں۔ اس سے پیشتر آپ کے یہاں سے دو خطوط ملے تھے۔ جن کے جواب مختلف وقتوں میں دے چکا ہوں، لیکن جواب سے محروم رہا تو سمجھا کہ قتیل شفائی نمبر کی اشاعت میں ابھی دیر ہے اس لئے میں بھی اطمینان سے دوسرے کاموں میں مصروف ہوگیا،

اب جو آپ کا یہ خط ملا تو ایک گونہ حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی، حیرت اس بات کی کہ آپ نے بہت جلد "فیض نمبر" جیسے عظیم نمبر کے بعد دوسرے اہم شاعر پر نمبر تیار کر لیا ہے۔ نہ خود دم لیتے ہیں۔ نہ دوسروں کو دم لینے دیتے ہیں۔ خوشی اس بات کی ہوئی کہ آپ نے اردو شعراء کے نمبر شائع کرنے کا جو سلسلہ شروع کیا ہے وہ جاں نثار اختر اور فیض احمد فیض کے بعد اب ایک اور مقبول اور معروف شاعر۔ قتیل شفائی کو لے کر آگے بڑھ رہا ہے جو بہت جلد مکمل ہو جائیگا۔ اس طرح شعراء کے ضخیم نمبروں کی تیسری منزل بھی سر ہو جائے گی۔

آپ نے اہم نمبروں کا سلسلہ شروع کرکے ہندوستان میں ایک نئی روایت کی بنیاد ڈالی ہے۔ اللہ کرے آپ کے عزائم اور بلند ہوں اور بلند ہوں اور آپ کی نیک نامیوں اور کامرانیوں کو اور وسعت ملے اور رفعت ملے تاکہ ہندوستان کے اردو خدمت گذاروں، اور ادبی صحافیوں کی تاریخ میں آپ کا نام دوسرے ادب کے خادموں اور صحافیوں کے دوش بدوش بھی رہے اور آگے آگے بھی رہے۔

آپ کے اسی جذبے اور لگن سے متاثر ہوکر ہمیشہ خواہش مند رہا کہ آپ کی اس ادبی تگ و دو میں قلمی تعاون ضرور دوں اور ہم جیسے اردو کے خادم اس کے سوا اور کیا کرسکتے ہیں۔ میں نے پیشتر کے خط میں لکھا تھا کہ قتیل شفائی کی کتابیں یہاں نایاب سی ہیں، خط پاتے ہی تلاش شروع کی تو کامیابی نہیں ہوئی سوچا آپ ہی سے درخواست کروں آپ کے یہاں بھی خموشی نے مایوس کیا، حالانکہ یقین کیجئے آپ کے اس فیصلے کہ آئندہ قتیل شفائی نمبر ہوگا جتنی خوشیاں مجھے دیں اسکا اظہار ممکن نہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ جب ادب کے مطالعہ کا شوق ہوا اور افسانہ نگاروں کے ساتھ ساتھ شعراء نے اپنی

طرف متوجہ کیا تو جن شعراء کے کلام اور نام نے عنفوانِ شباب میں دل میں گدگدی اور سرشاری پیدا کی اور ادب کے ذائقہ سے لذت یاب ہونے کا شوق بیدار کیا ان میں قتیل شفائی کا نام بھی میرے لئے اہم ہے۔ — قتیل کو دیکھا نہیں تھا لیکن ان کا کلام میرے دل میں ان کے لئے نہ صرف جگہ پیدا کرتا جاتا تھا بلکہ دیکھنے، ملاقات کرنے اور ان کے منہ سے ان کا کلام سننے کا نہ صرف شوق بلکہ ایک خاص قسم کی تڑپ پیدا کرتا جاتا تھا۔ یہ صرف میری حالت نہ تھی بلکہ بہت سے میرے جیسے دوسرے نوجوان اردو کے لکھنے پڑھنے والوں کا بھی یہی حال تھا۔ ہم جتنا اختر شیرانی، مجاز، جذبی، مخدوم، اور سردار کا احترام کرتے تھے اتنا ہی قتیل شفائی کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے لیکن آنکھ سے دیکھنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔ دو تو خیر ہو جشن شاعر کا جس نے یہ صورت بھی پیدا کر دی۔ — فروری ۱۹۶۱ء میں شاعر کی سو سالہ اہم خدمات کے اعتراف کے اظہار کے لئے بمبئی میں جشن منایا گیا جس میں دوسری تقریبات کے ساتھ — انڈو پاک مشاعرہ کا اہتمام بھی کیا گیا تھا، شاعر کے مدیر محترم اعجاز صدیقی مرحوم نے شعراء کو لانے سے جانے کے انتظامات کرنے میں جن نوجوانوں کا انتخاب کیا تھا ان میں میرا نام بھی تھا۔ — قتیل شفائی سے پہلی ملاقات اسی مشاعرہ کے سلسلے میں غالباً سانتا کروز ہوائی اڈے پر ہوئی، دل کی حسرت پوری ہوئی، دراز قد، گداز جسم، بالکل شگفتہ پسندیدہ شاعروں جیسا، اردو تہذیب اور مزاج کی نمائندگی کرتے نظر آئے۔ علیک سلیک ہوئی تو محسوس ہوا کہ قدرت نے ایک اور دولت انہیں شیریں دہنی اور مزاج کی سادگی کی عطا کی ہے ادھر گفتگو شروع ادھر غیریت کا پردہ اٹھنے لگا۔ اور پھر اپنائیت کی خوشبو سے فضا معطر ہو گئی، اب نہ کوئی بڑا، نہ چھوٹا، کوئی ملکی نہ غیر ملکی ایسا محسوس ہونے لگا کہ ہم بہت پرانے ملاقاتی ہیں۔ ہمارے درمیان ہونے پر خلوص جذبات کے کوئی حائل نہیں۔ خوب باتیں ہوئیں، یہاں کی وہاں کی ادب کی، بیرادب کی، مشاعرے کی محفل کی، شاعروں کی، نثر کی، پہلے کی، بعد کی — یہ سلسلہ اس وقت ٹوٹا، جب ہم وہاں پہونچے جہاں قیام کا انتظام کیا گیا تھا۔ انہیں کمرے میں پہونچایا، سامان رکھوایا، خدا حافظ کہا اور رخصت ہوئے، پھر رات کو مشاعرے میں دور سے ان کا کلام سنا بڑا لطف آیا۔ دل میں قتیل شفائی کا احترام بڑھا، بحیثیت شاعر بحیثیت انسان — آج تقریباً بیتیس سال ہونے کو آئے ہیں گفتگو ساری ذہن کے پردے پر دھندلی پڑ گئی ہے۔ البتہ ایک جملہ بار بار یاد آ رہا ہے انہوں نے کہا تھا ہندوستان کے فلاں شاعر نے ان کے فلمی گیتوں کو اپنا ہی سرمایہ سمجھ کر جیسے جی چاہا ہے اپنا لیا ہے۔ یہ بات انہوں نے میرے علاوہ پروفیسر شیخ آدم سے بھی کہی تھی اس ملاقات کے بعد پھر ملاقات کی صورت پیدا نہیں ہوئی۔ البتہ ان کا کلام ان کی یاد تازہ کرتا رہا اور لطف دیتا رہا — ہاں گزشتہ سال محب مکرم محمد طفیل صاحب نے جب اپنی خوبصورت کتاب محبی بھیجی، تو ایک بار پھر قتیل شفائی صاحب سے ملاقات ہوئی، طفیل صاحب نے نہایت دل نشیں انداز میں ان کی شخصیت کے مختلف دلچسپ، کچھ ظاہر کچھ ڈھکے چھپے گوشے، اس کتاب کے چند اوراق پر پھیلا دیئے ہیں، انہیں آنکھوں سے لگایا۔ تو ان کی محبوب شخصیت نے ایک بار پھر متاثر کیا، محمد طفیل لکھتے ہیں:-

"مجھے فارغ بخاری صاحب نے بتایا یا کسی اور نے کہ ایک زمانہ میں کہ جب ان کی فاقہ مستی کے دن تھے، مقروض بھی تھے کہ فارغ صاحب ہری پور ہزارہ پہونچے، ادھر ان کی جیب خالی۔ قرض دینے والا بھی کوئی نہ تھا۔ خاصے پریشان ہوئے، انہوں نے جب دیکھا کہ چند روپے بھی کہیں سے میسر نہ آ سکیں گے تو — رسالوں کی فائلیں ردی میں بیچ دیں، وہ رسالے جو انہوں نے بڑے چاؤ سے اکٹھے کر رکھے تھے، ردی میں بک گئے ذہن کی دنیا الٹ گئی، دل کی دنیا آباد ہو گئی۔"

(محبی از محمد طفیل ص ۱۴۸)

مہمان نوازی کا یہ جذبہ جس میں اپنے کو مٹا کر بھی لطف اندوز ہوا جاتا ہے، بڑا قیمتی بھی ہے اور نایاب بھی — ہر کس و ناکس کے حصے میں

یہ دولت کہاں سے آسکتی ہے ۔ تو پھر قتیل جیسی شخصیتوں کے حصے کی چیز ہے جسے محبوب شخصیتوں کے لئے خاصے کی چیز کہہ جائے تو بجا ہوگا ۔ محمد طفیل صاحب کی تحریر سے ان کی شگفتہ مزاجی کا بھی علم ہوتا ہے ۔ وہ بیان کرتے ہیں : چونکہ دوستی ہے اس لئے چھیڑیں یہ بھی کریں گے ۔ فارغ بخاری صاحب باتھ روم میں جاتے ہیں تو خاصی دیر لگاتے ہیں ، چنانچہ ایک ایسے ہی موقع پر احمد ندیم قاسمی کی قتیل صاحب کے ساتھ مندرجہ ذیل گفتگو ہوئی :

احمد ندیم : فارغ صاحب غسل خانے میں جاتے ہیں تو نکلنے کا نام ہی نہیں لیتے " ۔

قتیل : وہ ایسا ہی کرتے ہیں ۔ کیوں ؟ "

وہ کام جس کا سب کو علم ہے وہ تو کرتے ہی ہیں اس کے علاوہ بھی کچھ کرتے ہیں ،

مثلاً مثلاً ! ۔

. مثلاً وہ بالوں کو خضاب بھی غسل خانے ہی میں لگاتے ہیں "

اتنے میں فارغ صاحب غسل خانے سے نکلے اور انہوں نے چھوٹتے ہی کہا ۔ قتیل تو ہر وقت میری برائیاں کرتا رہتا ہے باز آجا ۔

قتیل صاحب نے کہا میں نے کوئی برائی نہیں کی "

فارغ : " میں سب سن رہا تھا ۔

قتیل : " میں نے تو صرف بالوں کو خضاب لگانے کا ذکر کیا تھا ، اصل بات تو بتائی ہی نہیں کہ تیرے سامنے کے دانت مصنوعی ہیں ۔ "

(محتی از محمد طفیل ص ۱۰۵)

یہ بھی معلوم ہوا کہ اچھا کھانا ان کی کمزوری ہے ، خود بھی کھانے میں اور دوسروں کو کھلانے میں بھی دلچسپی رکھتے ہیں

ان خوبیوں کے ساتھ وہ ایک اچھے اور پسندیدہ شاعر بھی ہیں ۔ گیت ، غزل اور نظم سے انہیں ہمیشہ سے دلچسپی رہی ہے ۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گیت ان کی شخصیت میں زیادہ رس بس گیا ہے جس کا نتیجہ ہے کہ اکثر ان کی غزلیں اور نظمیں گیت سے متأثر نظر آتی ہیں ۔ شاید گیت سے اس تعلق کی وجہ سے وہ آسانی سے فلمی دنیا میں داخل ہوئے اور بہت کم مدت میں وہ قبولیت عام حاصل کی جو سب کے حصے میں آسانی سے نہیں آتی لیکن گیتوں سے ہٹ کر ان کی شخصیت بحیثیت نظم گو مسلّم ہے یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کی شاعری میں حسن و عشق کی کیفیت پر وہ فضا ملتی ہے جس کی وجہ سے وہ ایک خاص عمر کے نوجوانوں میں زیادہ مقبول رہے ہیں ، ان کی شاعری میں کوئی گہرا فلسفہ نہیں ہے ، نہ ہی کوئی رنگین بات اور نہ ذہن و دماغ میں جھنجھوڑنے والی فکر کی ان کی شاعری سے توقع کرنی چاہیئے ۔ لیکن اس کے باوجود ان کی شاعری پڑھنے کی چیز ہے گنگنانے کی چیز ہے ان کی شاعری کی ایک خاص فضا ہے اس میں لازوال کیفیت ہے ، ان کے یہاں زبان و بیان کا جادو ہے ، بعض غزلوں کے اشعار ملاحظہ کیجئے محبت کی سرمستی و سرشاری اسی کو کہتے ہیں : ۔

کسی کی نقرئی پازیب کی جھنکار کے صدقے   مجھے سارا جہاں گاتا ہوا محسوس ہوتا ہے

دل کو غم حیات گوارا ہے ان دنوں   پہلے جو درد تھا وہی چارہ ہے ان دنوں

یہ دل ذرا سا دل تیری یادوں میں کھو گیا   ذروں کو آندھیوں کا سہارا ہے ان دنوں

کچھ ایسی دکھ بھری باتیں بھی ہوتی ہیں محبت میں   جنہیں محسوس کرتے ہیں مگر سمجھا نہیں سکتے

سنا ہے اک اجنبی منزل کو اٹھ رہے ہیں قدم
برا نہ مانو تو رہنمائی کو میں سرِ رہ گزار آؤں

تھکا دیتی ہیں جب کونین کی پنہائیاں مجھ کو
ترے در پر پہونچ کر تازگی محسوس کرتا ہوں

کچھ تو ہونگی محبت کی مجبوریاں
کون سہتا ہے ورنہ کسی کے ستم

ذیل کے اشعار میں ذرا غم دوراں کی آواز بھی سنئے :

ملاحوں نے ساحل ساحل موجوں کی توہین تو کر دی
لیکن پھر بھی کوئی بھنور تک جانے کو تیار نہیں

قیدِ قفس کے بعد کریں گے قید تمنا ، کون گوارا
اب بھی وہی زنجیریں ہیں گو پہلی سی جھنکار نہیں

اپنی تقدیر کو روتے رہیں ساحل والے
جن کو آنا تھا وہ منجدھار تلک آپہنچے ہیں

ایک تم ہو کہ خداؤں کے پیچھے بیٹھے ہو
ایک ہم ہیں کہ لبِ دار تک آپہونچے ہیں

بھٹک رہا ہے زمانہ گھنے اندھیرے میں
وہ رات ہے جسے اندیشۂ سحر بھی نہیں

نہ جانے کون سی منزل کو لے چلا ہم کو
وہ ہم سفر جو حقیقت میں ہم سفر بھی نہیں

آ رہی ہے خود بخود شاید کوئی منزل قریب
مہرباں یوں قافلہ سالار پہلے تو نہ تھا

چمن والے خزاں کے نام پر گھبرا نہیں سکتے
کچھ ایسے پھول بھی کھلتے ہیں جو مرجھا نہیں سکتے

اے بادۂ ناب کے رکھوالے دو گھونٹ ادھر بھی پہنچا
معیارِ کرم اس محفل کا پیمانۂ نام و نسب سہی

چلو پابندیِ فریاد بھی ہم کو گوارا ہے
مگر وہ گیت جو ہم مسکرا کر گا نہیں سکتے ؟

کانٹا ہے وہ کہ جس نے چمن کو لہو دیا
خونِ بہار جس نے پیا ہے وہ پھول ہے

ذرا اس شعر کو بھی ملاحظہ کیجئے ،

نویدِ موسم بہار ۔ گل بہ گل ، چمن چمن !
کہ جیسے عاشقوں کا ذکر ، وہ بھی گاؤں گاؤں

اس شعر سے بھی لطف اٹھایئے

سوچ سمجھ کر دھوکا کھانا ، پچھتانا پھر پیار نبھانا
پیار کی ہے یہ کون سی منزل اے غم جاناں اے غم دوراں

وہ غم دوراں سے بے تعلق ہو کر غم عشق میں مبتلا ہونا نہیں چاہتے بلکہ :

دردِ عشق بھی مزے کی چیز ہے قتیل
گر غم حیات سے فراغ ملے

قتیل کی غزلوں کے یہ اشعار بھی توجہ چاہتے ہیں صابر صاحب ،

غم ذات سے مری زندگی غم کائنات میں ڈھل گئی
کسی بزم میں کھو کے بھی مجھے کائنات سے پیار ہے

غم زمانہ غم عاشقی ، غم فردا
ہم اہل دل کے لئے ہیں ہزار تعزیریں

قتیل جن میں نہیں تھا غم حیات کا رنگ
مٹی مٹی نظر آتی ہیں اب وہ تحریریں

دیکھئے اس شعر میں کیسی تجربے کی بات کہی ہے :

لٹ کر بھی رہے ہیں کہ نادم ہیں راہزن   کتنی حسین اہلِ مروت کی بھول ہے

قتیل کی غزلوں کے مطالعہ کے بعد جب ترقی پسند ادب میں سردار جعفری کے یہ خیالات نظر سے گزرے۔

: ترقی پسند ادب نے نظموں کے ساتھ ساتھ غزل پر بھی اثر ڈالا ہے۔ اب انفرادی جذبات اور مجرد تصورات کی جگہ اجتماعی جذبات اور سیاسی احساسات آ رہے ہیں۔ سیاسی مسائل بھی غزل کے سانچے میں ڈھل رہے ہیں۔ ایک طرف تو روایتی تشبیہوں اور استعاروں کا نیا اور شگفتہ استعمال ہے اور دوسری طرف نئے نئے الفاظ اور نئی ترکیبوں کی آمیزش ہے جو بڑی عمدگی سے حاصل کی گئی ہے۔ اس کوشش میں فراق گورکھپوری فیض احمد فیض، جاں نثار اختر، مدنی، حفیظ ہوشیار پوری اور مجروح سلطانپوری ہی نہیں جگر مراد آبادی بھی شریک ہیں۔

(ترقی پسند ادب۔ بحوالہ غزل نمبر نقوش ص [illegible])

تو یہ انتہا حیرت ہوئی کہ ان سات شاعروں کا نام لیکر سردار جعفری رک کیوں گئے۔ آٹھواں نام قتیل شفائی کا لینا چاہئے تھا اس لئے کہ ترقی پسند ادب جس قسم کی شاعری اور غزل گوئی کو اپنی میراث سمجھتا ہے اس قسم کا کلام قتیل کے یہاں غزلوں میں نمایاں ملتا ہے۔

صابر دت صاحب آپ بھی قتیل شفائی کی غزلوں میں غم جاناں کیساتھ غم دوراں کی بھرپور ترجمانی محسوس کریں گے لیکن یہ بھی حق ہے کہ انہوں نے غزل کے مزاج اور آہنگ کو مجروح ہونے نہیں دیا۔ انہوں نے ہندی کے نئے الفاظ دیپ، آکاش، کونپل، رس، روپ، الاؤ، گھور اندھیرا، لاج، پنچھی وغیرہ کو غزل میں اس انداز سے کھپایا ہے کہ نہ تو وہ کہیں اجنبی محسوس ہوتے ہیں نہ ہی ان سے غزل کی لطافت کو نقصان پہونچا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ غزل کا حسن اور اس کی رعنائی ان کی نظموں میں بھی نمایاں ہے۔ زبان سادہ لیکن دل میں اترنے والی، لہجہ میں نغمگی سرمستی اور سرشاری، اسلوب میں شائستگی لطافت اور روانی و ہم آہنگی وغیرہ سب کچھ تو ہے۔ گیت نگاری سے بہت زیادہ رغبت کی وجہ سے غزلوں کی طرح نظموں پر بھی گیت کے حسین سائے پڑتے محسوس ہوتے ہیں وہ محبت کے پرستار ہیں، حسن کسی رنگ میں ہو اس کے قدردان ہیں، جمال یار سے متاثر بھی ہوتے ہیں مضطرب بھی دونا صورت میں ان کے احساسات اور جذبات حسین شعر میں ڈھل جاتے ہیں۔ لیکن کیسے شعر؟ نرم، نازک، گداز، دلوں میں اترنے والے دماغ کو جھنجھوڑنے والے۔ ان کی نظمیں چاہے حسن کی وادی میں پہونچائیں یا کارزار حیات سے ہم کنار کریں ہر جگہ جادو جگاتی ہیں اور صداقت پر مبنی حسین تاثر چھوڑتی ہیں۔ دعا کے دو بند ملاحظہ کیجئے :-

گاؤں سے دور کھیتوں کے اس پار وہ صاف شفاف چشمہ ابلتا رہے
شوخ پنہاریوں کا گھمگھٹ گاگریں لے کے راہوں پہ چلتا رہے
حسن منظر کے سانچے میں ڈھلتا رہے
گرمیوں کی کڑکتی ہوئی دھوپ میں جھوم کر پیڑ سائے لٹاتے رہیں
ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کے پالے ہوئے مست جھونکے شرابیں پلاتے رہیں
نیند بن کر نظر میں سماتے رہیں

صابر دت صاحب ذرا، وادی سمر بن کی ایک صبح سے بھی لطف اٹھایئے :-

ہوگئیں صاف شفاف پگڈنڈیاں۔ میلی میلی چٹانوں کے منہ دھل گئے
سوئی سوئی فضا آنکھ ملنے لگی، سیلی سیلی ہواؤں کے پر تن گئے
پیارے پیارے پرندے چہکتے ہوئے آشیانوں سے اڑ اڑ کے آنے لگے
ننھے ننھے سے پر پھڑپھڑاتے ہوئے کوئی بے نام سا گیت گانے لگے

یہ لیجئے صابر صاحب "کروٹ" کے مناظر کی سیر بھی کر لیجئے نہایت فرحت بخش ہیں:

ننگے پیڑوں کو ڈھانپنے کے لئے
پھیلے جاتے ہیں ریشمی سائے
آگئے وہ پروں کو پھیلائے
غول کے غول سبز پریوں کے

ایک کروٹ سی اور خزاں ناپید
ایک آہٹ سی اور موسم گل۔
خشک پتوں کی کھڑکھڑاہٹ پر
چھا گیا ہے ترانۂ بلبل ــــ

ابر جھوما تو رند بھی جھومے
جام رقصاں ہیں، مے چھلکتی ہے
قہقہے سن کے موسم گل کے
دور بیٹھی خزاں سسکتی ہے

دنیا کے تلخ تجربات تھے جنہوں نے قتیل شفائی سے "ردعمل" جیسی نظم لکھوائی۔ جس میں طنز بھی ہے، حقیقت بھی ہے اور تلخی بھی:

اے گداگر! مجھے ایمان کی سوغات نہ دے
مجھ کو ایمان سے اب کوئی سروکار نہیں
میں نے دیکھا ہے ان آنکھوں سے مروت کا مآل
مجھ کو اب مہر و محبت سے کوئی سروکار نہیں

میں نے انسان کو چاہا بھی تو کیا پایا ہے
اب مرا کفر خدا کا بھی طلبگار نہیں
جا کسی اور سے ایمان کا سودا کر لے
میں تری بھیک دعاؤں کا خریدار نہیں

"مرا قلم" میں اپنے زمانہ کے مسائل کی جلوہ گری کی گئی ہے اور بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ :

مرے قلم سے تقاضا ہے شہر یاروں کا
کہ اس کے لب پہ رہے تذکرہ بہاروں کا
اگر کہیں نظر آئیں سلگتے ویرانے
قرار دے انہیں ہم سر گلاب زاروں کا
اگر زمیں پہ بلکتے ہوں خاک کے ذرے
گماں ہو ان پہ دمکتے ہوئے ستاروں کا
اگر شباب کے لوے فضا میں رچ جائیں
مذاق اڑائے زمانہ ستم کے ماروں کا
اگر کوئی سر بازار بھوک سے تڑپے
سنائے ان کو فسانہ خدا کے پیاروں کا

طنزیہ اسلوب کیساتھ یہ نظم عروج کو پہونچتی ہے، آخری بند اس کا ملاحظہ کیجئے اور قتیل کے احساس فرائض کو سمجھنے کی کوشش کیجئے :-

مرا قلم مرے جمہور کی امانت ہے
اسے عوام کی بے چارگی ستاتی ہے
مرے قلم کی زباں کاٹ دی گئی لیکن
مرے قلم کی خموشی بھی گنگناتی ہے
مرے قلم کی رگوں میں وہ خون جولاں ہے
کہ جس سے عظمت انساں کی آنچ آتی ہے
مرا قلم وہ مورخ ہے جس کے سینے میں
غم حیات کی تاریخ سرسراتی ہے
مرے قلم کو زمانہ تو کیا خریدے گا
کہ اکثر اس سے مشیئت شکست کھاتی ہے

میں خود اسیر سہی میرا فن اسیر نہیں
مرا قلم کسی جلاد کا ضمیر نہیں

لیکن اس کے ساتھ ساتھ ... دت صاحب آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ عورتوں کے احساسات، جذبات، اور مسائل سے زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔ وہ اس حسن کی پیکر کی محبت میں سرشار بھی نظر آتے ہیں اور اس کے ساتھ ناروا سلوک سے مضطرب بھی اور خود اس کی فطری کمزوریوں اور حالات سے مجبور ہو کر بے راہ رویوں سے بے چین بھی ہو جاتے ہیں۔ ایکٹریس، راستے کا پھول، البم، بانجھ، کھلونا، آئینے کے سامنے، راکھ، آج کی باتیں کل کے سپنے، ایسی ہی نظمیں ہیں جن کے موضوعات کچھ اسی قسم کے ہیں۔ شکوہ شکایت، مجبوریاں، خود غرضیاں، سچائیاں، ہوسناکیاں وہ انہیں حالات سے دوچار ہوتے ہیں اور مچلتے بدکتے کڑھتے، تاسف کرتے نظر آتے ہیں، کبھی عورت کے جذبات کی ترجمانی اس طرح کرتے ہیں۔

دیکھ کر کٹیا میں مجھ کو کروٹیں لیتے ہوئے،
غرق ہو جاتے ہیں احساسات گہری سوچ میں
رینگتی ہے دل کے اک تاریک گوشے میں امید
آرہے ہوں جیسے وہ مجھ کو صدا دیتے ہوئے

جن کے پس منظر میں میری جیتی جاگتی دکھیں
مسکراتے ہیں ابھی تک ان دریچوں کے کواڑ
جیسے میری زندگی بازیچۂ تقدیر ہے
جیسے میرے جھونپڑے کا کوئی مستقبل نہیں

میرا سمجھانا ہے کہ فردوس بریں کا پھول ہے
رات کی تنہائیوں میں دے کے اس کو لوریاں
لو وہ ابا آگئے۔ کہتی ہوں جانے کس لئے
وہ نہ آئیں گے، نہ آئیں گے۔ یہ میری بھول ہے   (کھلونا)

یہ احساسات بھی قابل غور ہیں:۔

رہی نہ سانس میں خوشبو تو بھاگ پھوٹ گئے
گیا شباب تو اپنے پرائے چھوٹ گئے
کوئی تو مجھ کو چھوڑ گئے کوئی مجھ کو لوٹ گئے
محل گرے سو گرے جھونپڑے بھی ٹوٹ گئے   (شمع انجمن)
رہا نہ کوئی ٹھکانہ

نظموں میں ان کے ہیئت کے تجربے بھی ملتے ہیں، جن کی مدد سے وہ تاثر اور کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

جاگ سہیلی

آنکھیں مل کر | جگ مگ جل کر

اڑا اندھیرا

ہوا سویرا

(دلہن)

یا —

اڑا اڑا سا رنگ ہے

وہ آ رہی ہے جس طرح کٹی ہوئی پتنگ ہے

نڈھال انگ انگ ہے

عجیب رنگ ڈھنگ ہے

ایاغ ہے۔ باغ ہے رباب ہے نہ چنگ ہے

ندامتوں میں جنگ ہے

(کھلونا)

یہ خط کیا ہوا مضمون کی صورت اختیار کرے لگا ہے لیکن مضمون یا مقالہ کیسے نے تمام کلام سامنے نہیں، کاش قتیل شفائی جی کو میری اس بے بسی کا احساس ہو جائے تو ممکن ہے ایک بھرپور مضمون قتیل شفائی کی شاعری سے متعلق تیار ہو جائے، اگر قتیل شفائی کو متوجہ کرنے میں کامیاب ہو گیا اور میں واقعی ایک بھرپور مقالہ تحریر کر سکا تو مجھے بے حد خوشی ہوگی۔

ایک بار پھر ایک اہم نمبر یعنی قتیل شفائی نمبر کے لئے دلی مبارکباد قبول کیجئے — چراغ سے ہمیشہ چراغ جلتا ہے مجھے یقین ہے کہ اس نمبر کے بعد پھر کسی اہم اردو کے شاعر یا ادیب پر نمبر نکالنے کا آپ اعلان کریں گے اگر وہ میرا پسندیدہ فنکار ہوا تو آپ کی محفل میں پھر حاضر ہوں گا۔

آپ کا اپنا

عبدالقوی دسنوی

۱۵ر فروری ۱۹۸۲ء

اپنے درمیان وہ شخص

ڈاکٹر داؤد کشمیری

کسی بھی شاعر کے متعلق بڑی غیر ذمہ داری سے کہہ دیا جاتا ہے کہ وہ ایک منفرد شاعر ہے۔ اس سے زیادہ عامیانہ بات کوئی اور نہیں ہو سکتی کیونکہ ہمارے نقادوں نے انفرادیت کی بحث کبھی تنقیدی اصطلاحوں سے آگے نہیں بڑھائی۔

قتیل کے بارے میں بھی اس طرح کا حکم لگانا تحصیلِ حاصل ہوگا۔ دراصل دیکھنا یہ چاہئے کہ اس شاعر کا کردار (مواد) کیا ہے اور اور گفتار (طرزِ ادا) کیسی ہے؟ اور اس مشاہدے پر روایت پرستی، ترقی پسندی اور جدیدیت کا خود ساختہ لیبل چسپاں نہ کیا جائے تو مجھے کہ شاعر کے ساتھ ہم نے خلوص برتنے کی کوشش کی ہے۔

اس خلوص کا تقاضا ہے کہ پہلے یہ تسلیم کر لیا جائے کہ قتیل شفائی ایک عظیم شاعر نہیں ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ فیض سے چھوٹے شاعر ہیں۔ کیونکہ پھر فیض اقبال سے، اقبال غالب سے اور غالب میر سے چھوٹے شاعر ہوئے۔ اور میر کالیداس سے، ورنہ کالیداس ہومر سے اور ہومر ــــــ

لیکن یہ طے شدہ ہے کہ قتیل اردو شاعری میں زندہ رہے گا۔ ہماری آپ کی نسل چلتی رہی ہے۔ ہماری آپ کی بات بھی چلتی رہے گی۔ قتیل کے پاس کہنے کو بس یہی ہے لیکن وہ بہتر انداز میں کہتے ہیں اور جیسے ہم نقادوں سے بہتر انداز میں سمجھتے ہیں۔ آخر قتیل نے نقادوں کی اجازت پروپیگنڈے اور جوڑ توڑ کے بغیر ہی قبولِ عام حاصل کیا ہے! تنقیدِ ادب سے تاریخِ ادب الگ ہوتی ہے اور تاریخِ ادب میں قتیل کا مقام محفوظ ہے۔

قتیل کے ضمن میں ہمارے سنجیدہ نقادوں کی غیر سنجیدگی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ قتیل نے نظم اور غزل کے بجائے گیتوں سے اپنی قدر منوائی۔ اس نکتہ کی اہمیت پر یوں غور کیجئے کہ گیت تب تک صرف حفیظ نے لکھے تھے یا عظمت اللہ خان نے۔ قتیل کے لئے لازم ہو گیا کہ وہ لہجہ و تیکنک میں اور بحنالٹی کا اظہار کامیابی کے ساتھ کرے تاکہ آئندہ گیت کے لئے راہ ہموار ہو۔

قتیل جب ترقی پسند نہیں تھے، جب ترقی پسند بنے اور جب ترقی پسند نہیں رہے، ہر صورت میں ربط استوار رہا۔ گیتوں سے ان کے مزاج کی موزونیت کو اسی سے وزن و وقار ملا۔ قتیل کے گیتوں میں جدید نظموں کی پیچیدہ پیکر تراشی نہیں ہے کیونکہ پیکر کی قدرِ متعین کے مقابلے میں انہیں پیکر کی معنویت کا تنوع زیادہ محبوب رہا۔ اس طرح پیکر مختلف سطحوں پر ترغیب سے شعور کی گرفت میں آ جاتے ہیں۔ قتیل نے گیتوں میں بھی ہجے کو قطعیت دینے سے پہلے اس کا خیال رکھا ہے کہ زبان ترسیل کا سامان نہیں بلکہ ترسیل کی اہمیت کو وسیع بنانے کی کوشش ہے۔ اسی بنا پر قتیل کے گیتوں کی زبان میں غزل کے روایتی اظہار کی گہرائی بھی نہیں ہے لیکن سوکھی ہڈیوں سے (چاہے وہ گنگا میں بہائی جائیں) دھڑکتی شریانوں میں لہو کی روانی زیادہ کارآمد ہوتی ہے اور قتیل کی زبان میں عصری زندگی کے مختلف جذباتی رویوں کی پہچان ملتی ہے۔ یہ پہچان قتیل کو اپنی سانسوں کی پیوند کاری سے ترقی کار لگتی معلوم ہوتی ہے۔ اگرچہ ہری پور ہزارہ سے رحیم پارک لاہور تک قتیل ایک موجِ خوں کے ساتھ گذرے ہیں لیکن شخصی بحران یا جذباتی تصادم کے کرب کو پیش کر کے انہوں نے اپنی شاعرانہ شخصیت کے ساتھ منافقانہ سلوک روا نہیں رکھا ہے۔ ان کی داستانِ حرم سادہ ہے رنگین نہیں۔ لیکن یہ سادگی شاعرانہ خلاقی کا فقدان نہیں ہے یہ سادگی تجربات کا قحط بھی نہیں ہے۔ اگر ہمارے ناقدین ایسا حکم لگائیں تو تسلیم کر لیجئے کہ قتیل کی شاعری کے سیاق میں ان کی حس تیز نہیں ہے۔

قتیل کی شاعری کے اس سیاق کو کہیں روایت کی چھاؤں کہیں عصریت کی دھوپ میں تلاش کرنا ہو گا۔ وارداتِ عشق کا اظہار اردو شاعری کی ایسی روایت ہے جسے ہمیشہ احترام کی نظروں سے دیکھا گیا ہے۔ یہ روایت ایک تواتر کے ساتھ ملتی ہے پھر بھی فرسودہ نہیں۔ قتیل کے یہاں بھی اس کی تازگی کی ضمانت دی جا سکتی ہے۔ یہ روایت پرانی شاعری میں سوتی رہتی ہے اور نیا شاعر تلووں کو گدگدا کر اسے بیدار کرتا ہے۔ قتیل کے یہاں بیداری کی کیفیت دیکھئے۔

اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں سجا لے مجھ کو
میں ہوں تیرا تو نصیب اپنا بنا لے مجھ کو

جب بھی آتا ہے مرا نام ترے نام کے ساتھ
جانے کیوں لوگ مرے نام سے جل جاتے ہیں

برسات کی بھیگی راتوں میں پھر کوئی سہانی یاد آئی
کچھ اپنا زمانہ یاد آیا کچھ ان کی جوانی یاد آئی

بہت دنوں سے نہیں اپنے درمیاں وہ شخص
اداس کر کے ہمیں چل دیا کہاں وہ شخص

دروازوں کی اوٹ میں کنگن جہاں کھنکتے رہے قتیلؔ
کچھ بھی کرے ان گلیوں میں دھیان ترا تو جائے گا

رات یوں چاند کو دیکھا ہے ندی میں رقصاں
جیسے جھومر ترے ماتھے پہ ہلا کرتا ہے
لوگ کہتے ہیں جسے نیل کنول وہ تو قتیلؔ
شب کو ان جھیل سی آنکھوں میں کھلا کرتا ہے

مچا ہے شور سا ہونٹوں کے پیچھے
یہی چپ ہے تو پھر آواز کیا ہے

چاندی جیسا رنگ ہے تیرا سونے جیسے بال
اک تو ہی دھنوان ہے گوری باقی سب کنگال
ہر آنگن میں سجے نہ تیرے اجلے روپ کی دھوپ
چھیل چھبیلی رانی تھوڑا گھونگھٹ اور نکال

والہانہ تڑپ، کامیابی کا احساس، حصولِ متاع کی قدر پیمائی، مرکزِ نظر کی جستجو، حسنِ آدم پر حسنِ فطرت کا انحصار، ادائے دلبری جسم کی کشش اور اس کے تقدس کو امانت تصور کرنے کا خیال، یہ ہیں وہ شگفتہ تجربات جو قتیل کے یہاں سادگی کو شاعرانہ خلاقی کا مظہر بنا دیتے ہیں۔ سادگی یوں کہ فکر قدرتی چشمہ کی طرح شفاف ہے۔ اور خلاقی ایسی کہ چشمہ کی راہ گذر پر چاند اور نیل کنول بھی ہیں۔ قتیل کا کمال یہی ہے کہ وہ تشبیہ اور استعارہ سے کام لیتے ہیں اور ان میں ندرت کے ساتھ حرارت بھی پیدا کرتے ہیں۔ مذکورہ اشعار میں نصیب، نام، زمانہ، جوانی، دروازوں کی اوٹ، آنگن۔ استعارہ ہی تو ہیں۔ لیکن قتیل نے انہیں فنکاری کے تقاضوں کی تکمیل کے لئے نہیں برتا ہے بلکہ غیر شعوری کوششوں کے نتیجہ میں ان کی شاعری میں زبردست حسی کیفیت ۔۔ اک لذیذ لطافت (SENSUOUSNESS) پیدا ہوگئی ہے۔ ایک قابل غور نکتہ یہ ہے کہ قتیل نے واردات کے اظہار کے لئے بیشتر ماضی کا صیغہ استعمال کیا ہے کیونکہ یہی واحد صیغہ ہے جو واردات کے المیہ کو اجاگر کرنے کے لئے ہمارے ممتاز شعراء کے نزدیک پسندیدہ رہا ہے۔

پھر قتیل واردات سے مشاہدات کی طرف آتے ہیں۔ یعنی تنقیدی اصطلاح میں غمِ جاناں سے غمِ دوراں کے مرحلہ میں داخل ہوتے ہیں۔

ایک تم ہو کہ خدا بن کے چھپے بیٹھے ہو
ایک ہم ہیں کہ لبِ دار تک آ پہنچے ہیں

یہ عجیب فصلِ گُل ہے کہ کسی بھی گُل کی رنگت
نہ بچی مری نظر میں نہ رہی ترے بدن میں

میں طلوعِ صبحِ نو سے ابھی مطمئن نہیں ہوں
ترا حُسن بھی تو ہوتا کسی خوشنما کرن میں

انتظار، حوصلہ مندی، خوابوں کی شکست، آرزو مندی۔ انہیں تیزابی احساسات نے ترقی پسندی کو ادب میں پہیا نچار رکھا۔ قتیل نے بھی انہیں بیشتر ترقی پسند شاعروں سے زیادہ خوبصورت انداز میں کہا ہے۔ مثال کے طور پر فیض اور قتیل کے ایک ایک شعر کا موازنہ دیکھئے۔

نہ گُل کھلے ہیں نہ ان سے ملے نہ مے پی ہے
عجیب رنگ میں اب کے بہار گذری ہے (فیض)

یہ عجیب فصلِ گُل ہے کہ کسی بھی گُل کی رنگت
نہ بچی مری نظر میں نہ رہی ترے بدن میں (قتیل)

فیض کا یہ شعر یقیناً بہت مقبول رہا ہے۔ خود میرے پسندیدہ اشعار میں یہ شامل تھا۔ لیکن قتیل کا شعر سحر کاری میں بڑھ کر ہے۔ فیض کے شعر میں کردار نہیں ہیں۔ خود کلامی ہے۔ قتیل کے یہاں نہ صرف دو کردار ہیں بلکہ ان کے باہمی ارتباط پر نظر بھی ہے اسی لئے مکالمہ کی صورت پیدا ہوئی ہے۔

اسی طرح تقسیمِ ہند کی صورت میں اس صدی کے سب سے بڑے فریب کو جب ترقی پسند شاعروں نے نمایاں کرنے کی کوشش کی مثلاً فیض نے نظم "صبحِ آزادی" لکھی۔ لیکن ایک مکمل پیکری سانچے کے باوجود وہ نظم احساس کی ترسیل میں اتنی لطیف نہیں ہے جس قدر نزاکتِ اظہار قتیل کے اس شعر میں ہے۔

میں طلوعِ صبحِ نو سے ابھی مطمئن نہیں ہوں
ترا حسن بھی تو ہوتا کسی خوشنما کرن میں

اگرچہ فیض نے بھی یہی بات کہی تھی۔
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی
نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی

وغیرہ ——

اور اگرچہ اثر انگیزی میں فیض کی نظم کو ترجیح دی جائے گی لیکن لہجہ کی نرمی قتیل کے یہاں سیاسی شعور سے بوجھل نہیں ہوتی ہے اس لئے قتیل کی نظم اور اس کا مذکورہ شعر زیادہ حسین ہے۔

اس موازنہ سے کسی قسم کی غلط فہمی کو جگہ نہیں ملنی چاہیئے۔ بتانا صرف یہ مقصود ہے کہ فیض کے اسلوب کو سردار جعفری نے جب برتنا چاہا تو کامیاب نہیں ہو سکے لیکن قتیل نے اس سے بہت ہی قریب کا ایک اظہار اپنے لئے تلاش کر لیا اور اس میں وہ (تقلید سے بچنے کے سبب) کامیاب ہو گئے۔ فیض اور قتیل دونوں نے یکساں استعارے استعمال کئے ہیں اور سیاسی شعور کی بنیاد محبت کے المیہ پر رکھی ہے۔ اسی کو میں نے نقادوں کی گفتار میں آگے یوں کہا ہے کہ قتیل بھی اپنے ہمعصر ترقی پسند شاعروں کی طرح غم جاناں سے غم دوراں کی طرف بڑھے ہے

کاٹے ہوئے پیڑوں کی خنک چھاؤں سے آگے نکل آئے
ہم دھوپ میں چلنے کو ترے گاؤں سے آگے نکل آئے

ابھی جو بات میں نے کہی ہے کہ قتیل نے فیض کے قریب کا ایک اسلوب پا لیا، یہ بے سبب اور بے بنیاد نہیں۔ اور بہت بڑی بات ہے۔ فیض کی نظم "تنہائی" آپ کے ذہن میں ہوگی۔ اب قتیل کا شعر سنیئے ؎

دل کی تنہائی کا مجھ کو خود ہی اندازہ نہیں
یہ اک ایسا گھر ہے جس کا کوئی دروازہ نہیں

فیض کی نظم میں تنہائی کی گہرائی ہے اور قتیل کے یہاں اس کا پھیلاؤ۔ اور لہجہ دونوں کا (ایک نہیں) ایک جیسا ہے۔ اس لئے اثر انگیزی بھی ایک جیسی ہے قتیل کا ایک شعر اور یاد آ رہا ہے ؎

سخی ضرور ہے وہ لیکن اے گدا تو نے
کٹے ہوئے سرِ دستِ طلب نہیں دیکھے

سخی اور دستِ طلب سے جس لہجہ کی تشکیل ہوتی ہے وہ فیض کی گفتار کے پڑوس میں ہے۔ وجہ ظاہر ہے۔ فیض اور قتیل میں مزاج کی نرمی اور کردار کی بلندی مشترک ہے۔ چند اور مثالیں دیکھئے ؎

کھلا ہے جھوٹ کا بازار آؤ سچ بولیں
نہ ہو بلا سے خریدار آؤ سچ بولیں

سکوت چھایا ہے انسانیت کی قدروں پر
یہی ہے موقعِ اظہار آؤ سچ بولیں

تمام شہر میں کیا ایک بھی نہیں منصور
کہیں گے کیا رسن و دار آؤ سچ بولیں

قتیل کے ان اشعار کے ساتھ فیض کے اشعار "مقتل تمنا" کو ملا کر پڑھئے۔ "آؤ سچ بولیں" اور "ہم بھی دیکھیں گے"

ہیں کردار کی بلندی اور مزاج کی نرمی کے یکساں جلوے نظر آئیں گے۔

فیض اور قتیل ایک اور حسین ادا میں بھی مساوی طور سے شریک ہیں یعنی فیض ہی کی طرح قتیل بھی گاہے گاہے کلاسیکی پیرایہ سے ذرا پرے ہو کر ترقی پسندی کی راست اپروچ کو ضرب کاری بنا لینا چاہتے ہیں ؎

ہم کو پاسبانوں سے یہ گلا یہ کہنا ہے
کب تک ہمیں آخر قاتلوں میں رہنا ہے؟

ٹوٹی ہوئی مسجد میں کھڑا دیکھ رہا ہوں
محفوظ شوالے کا گجر ہے کہ نہیں ہے

مسجد کی اذاں ہو کہ شوالے کا گجر ہو
اپنی تو یہ حسرت ہے کسی طرح سحر ہو

مسجدیں ترستی ہیں اس طرف اذانوں کو
اس طرف شوالوں میں رہ گئے صنم تنہا

ترقی پسندی شروع میں اقتصادیات میں الجھنے کے بعد جب انسان دوستی تک بلند ہوئی اور عصبیت کے عصری محاذوں پر اس نے لڑنے کے انداز سیکھے تو فیض اور قتیل جیسے فعال شاعروں کے فکر و آہنگ میں بھی اس کے آثار دکھائی دیئے۔ سیکولرزم پر بڑی سے بڑی سیاسی تقریر اپنے تمام زور و قوت کے باوجود قتیل کے ان اشعار کے آگے ہیچ معلوم ہوتی ہے۔ ان اشعار میں استحصال اور شر پسندی کے خلاف خاموش احتجاج بھی ہے۔ ایک ایسے انقلاب کی آرزو مندی بھی جو پرچم اڑاتا آئے لیکن ہم تک پہنچے تو جلترنگ بن جائے۔ اور پتے کی بات تو یہ ہے کہ مستقبل کی بشارتوں سے پہلے عصری حقیقتوں کی بھی شاعر کی بصیرت کو خبر ہے لیکن شاعری محض ترقی پسندی کی محفلوں میں شمع نہیں جلاتی۔ یہ جاوداں، پیہم رواں اور ہر دم جواں زندگی کی نفسیاتی صداقتوں کو بھی تجربات کا بدن عطا کرتی ہے اور ایک شناخت کا انہیں اہل بناتی ہے۔ قتیل کے اس نئے پہلو پر بھی توجہ ضروری ہے ؎

تمہیں کیا آج بھی کوئی اگر ملنے نہیں آیا
یہ بازی ہم نے ہاری ہے ستارو تم تو سو جاؤ

ہمیں بھی نیند آ جائیگی ہم بھی سو ہی جائیں گے
ابھی کچھ بیقراری ہے، ستارو تم تو سو جاؤ

سلانے آگئے پھولوں کو پھر جھونکے ہواؤں کے
یہی وہ موڑ ہے گلشن جہاں ویرانہ بنتا ہے

چلو اچھا ہوا کام آگئی دیوانگی اپنی
وگرنہ ہم زمانے بھر کو سمجھانے کہاں جاتے

نکل کر دیر و کعبہ سے اگر ملتا نہ میخانہ
تو ٹھکرائے ہوئے انساں خدا جانے کہاں جاتے

میں جو کانٹا ہوں تو چل مجھ سے بچا کر دامن
میں ہوں گر پھول تو جوڑے میں سجا لے مجھ کو

تم پوچھو اور میں نہ بتاؤں ایسے تو حالات نہیں
ایک ذرا سا دل ٹوٹا ہے اور تو کوئی بات نہیں

تمام تر اسی خانہ خراب جیسا ہے
مرے لہو کا نشہ بھی شراب جیسا ہے

اداسی دے رہی ہے جس پہ دستک
بھری بستی میں یہ کس کا مکاں ہے

ایک آنسو تھا مگر آخرِ شب اے لوگو!
جھلملایا ہے یہ تیال نگینہ کیسا کیا

اعترافِ شکست کی رندانہ جرأت، کشمکش پر اختیار کی تدریجی کاوش، فریبِ آرزو کی شاطرانہ آگہی، پیکارِ مصلحت کے تفوق کا شعور، استحصال سے منتج بے بسی کی طرف ہمدردانہ رویّہ، قوتِ تمیز کے ساتھ بے لاگ فیصلوں کا حوصلہ، محرومی کے داخلی سیاق کی خارجی تفہیم ـــ یہ ہیں نفسیاتی سچائیاں جن کے اظہار کے لئے شاعر کے تجربات

بن گئے ہیں۔ اور پھر ان اشعار کے مخصوص لہجہ پر غور کیجیے کہ وہ شاعر کی بے حساب اعصابی مضبوطی پر دلالت کرتا ہے۔ فنکارانہ حسن کی پوچھیے تو جواب یوں ہے کہ ہر شعر ایک مکالمہ ہے۔ اور لہجہ نے مکالمے کے ساتھ اس کردار کو بھی مکمل اور اجاگر کیا ہے جس سے شاعر مخاطب ہے۔ یعنی اُدھر ناپختگی اور ناواقفیت ہے۔ اِدھر جہاندیدگی اور دانشوری ہے۔ دونوں کے درمیان شعر ایک ندی کی طرح بہہ رہا ہے۔ اور آپ پر لازم ہے کہ اِدھر سے ندی میں اتریں اور اُدھر تک چلے آئیں۔ ندی کے اس کنارے چلتے چلتے آپ کو ایک سرسبز باغ ملے گا جس کے پھولوں پر ابھی ابھی جوانی آئی ہے۔

سدا اڑان کی دولت ملا نہیں کرتی
سنبھال کر اسے پنچھی پروں میں رکھتے ہیں

اک ایسی دھند چھائی بستیوں پر
کوئی ڈھونڈے سے اپنا گھر نہ پائے

در و دیوار تعاقب میں چلے
گھر سے میں جب بھی اکیلا نکلا

کیا کچھ ہونے والا ہے یہ شہر کو نہیں اندازہ
شہر کے لوگو! کھلا نہ رکھنا کوئی بھی دروازہ

لوگ آتے رہے کانچ کے ملبوس پہن کر
افسوس کہ پتھر بھی نہ مارا گیا ہم سے

جو بھی ملا سفر میں کسی پیڑ کے تلے
آسیب بن کے مجھ سے وہ سایہ لپٹ گیا

مل جل کے برہنہ جسے دنیا نے کیا ہے
اس درد نے اب میرا بدن اوڑھ لیا ہے

جس میں سورج کا طرفدار سراک سایا ہے
میں نے اس شہر میں گھر موم کا بنوایا ہے

وہ پھولوں اور خوشبوؤں میں پلا ہوا ہے
وہ جب کھلا تو کئی رتوں کا جلا ہوا ہے

ان اشعار میں معنی کی تہہ داری سے کون انکار کر سکتا ہے؟ یہ تہہ داری اس علامت نگاری کی عطیہ ہے جس پر جدید شاعری ب دربدر بسر ہوتے ہیں۔ قتیل بھی اپنا درد لئے ذات رات جاگے اور دن دن بھٹکے ہیں۔ اس آوارگی نے انہیں زندگی کی نئی راہ سے ملوایا ہے اور یہ قدریں ان سے جس لہجہ میں مخاطب ہوئیں، قتیل نے بلا کم و کاست اس لہجہ کو ہم تک پہنچانے کی ایماندارانہ ی ہے۔ گھر، دروازہ، پیڑ، سورج ـــ یہ سب جدید شاعری کا ڈکشن ہے لیکن قتیل نے اس ڈکشن کو فیشن کے طور پر ابرتا ہے۔ لہٰذا ان کی شاعری میں ان الفاظ کے مفاہیم کی سطح اور زاویہ دوسروں سے الگ ہے اور اتنا گنجلک نہیں کیونکہ بیشتر ر شاعروں نے گھر کی بات جس دم کی تو وہ پیڑ کے نیچے تھے اور سورج کو دیکھا تو گھر کے دریچوں سے۔ قتیل جہاں کی بات کرتے رہاں آپ انہیں موجود پاتے ہیں اور اس بات کو قتیل نقش پا بناتے آگے نہیں نکلتے بلکہ ساز کے پردہ میں ہمراہ لے جاتے یہی کیفیت دربدر پیار کے تعاقب میں ملتی ہے۔ یہی کیفیت پیڑ کے آسیب میں ملتی ہے۔ یہی کیفیت درد کو اپنا بدن اوڑھاتے تی ہے۔ اگر اس پہلو کی مزید آگہی درکار ہو تو قتیل کی نظموں کی طرف چلئے۔ حالانکہ قتیل کی بیشتر نظمیں اپروچ اور اثر انگیزی دیگر ترقی پسندوں کی سطح سے بلند نہیں اور ذاتی طور پر مجھے پسند نہیں ان نظموں میں خیالات پر شاعر کی توجہ اس قدر ہے کہ شعریت رد۔ تاہم قتیل کی چند نظمیں سمندر سے گہری بن جاتی ہیں۔ حدوں اور فصلوں کو توڑ کر نکل جاتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ نظمیں قتیل نمبر تیل کے منتخب کلام میں ضرور شامل کی جائیں گی، چنانچہ انہیں مکرر نقل کرنے سے گریز بہتر ہے۔ البتہ ان نظموں کے چند خوبصورت مات کی نشاندہی ضروری ہے۔ ایک نظم "یہ حدیں یہ فاصلے" میں ترک محبت کا نفسیاتی تجزیہ شعری ایقان بن کر کیسے رتا ہے۔ دیکھیے سہ

آرزوؤں کی زباں میں پیار کہتے ہیں جسے
کیوں سدا اس پیڑ کی چھاؤں گھنی رہتی نہیں
کیوں تلوّن کے لٹیرے لوٹ لیتے ہیں انہیں
رہرووں میں تا بہ منزل کیوں بنی رہتی نہیں

ترقی پسندوں نے انقلاب کی طرف بڑھنے سے پہلے جس انداز کی رومانی نظمیں لکھیں، ان میں قتیل کی یہ نظم زیادہ بن ہے اور لہجہ کی پراسرار جاذبیت کے سبب جدید رومانی نظموں سے قریب محسوس ہوتی ہے۔ لیکن پورے طور پر یدیت کے مبہم بیان یا غیر متعین علامتوں کو لئے ہوئے جو نظم قتیل کے یہاں چلی آئی ہے وہ "موج سمندر سے گہری" ہے

اس نظم میں ایڈونچر کا ذوق ہے اور خوف و اندیشہ کی فضا بھی۔ شاید آپ اس کو ظاہری سطح پر تضادِ رویہ سے تعبیر کریں لیکن واقعہ یہ ہے کہ خوف و اندیشہ کی موجودگی ہی میں ایڈونچر کی ضرورت و صلاحیت کے لئے گنجائش نکلتی ہے اس "تضادِ رویہ" کو ہم آہنگی فکر میں تبدیل کرنے کے لئے قتیل نے نظم میں ایک مکمل پیکر سا سانچا تیار کیا ہے چنانچہ جو پتھر نظم کی ابتدا میں شاعر کے سبک جسم سے بھاری تھا، نظم کے اختتام پر شاعر کا خدا بن جاتا ہے اور اسی کے ساتھ عفریت کا خوف شاعر کے دل سے نکل جاتا ہے۔ یقیناً فراق کی طرح قتیل کے یہاں بھی جتنے جتنے اشعار ایسے ہیں کہ جو اس کی شاعرانہ خلاقی کا اعتراف ہر قسم کے قاری سے کروالیں لیکن "موج، سمندر سے گہری" اور اس نوع کی نظموں سے قتیل کو ادب میں ان کا مقام بھی مل جائے گا۔ جس کی ہلکی سی خواہش شاعر کے احساسات کی موجوں پر ابھرتی ڈوبتی رہی ہے۔ ع

یوں تو لکھتا ہی رہتا ہے نظمیں غزلیں گیت قتیل
اسے کوئی تخلیق ہمیشہ زندہ رہنے والی دے

قتیل شفائی ایک غزل گو شاعر ہیں۔ نظم بھی خوب کہتے ہیں ——— لیکن انہوں نے غزل میں جو غنائیت کے ساتھ ساتھ اپنا اسلوب نکھارا ہے اس پر انہی کی اجارہ داری ہے۔

——— ڈاکٹر آغا سہیل

عوامی شاعر قتیل شفائی

ابراہیم جلیس (مرحوم)

پچھلی دو صدیوں کے دوران ارض ہمالہ پر دو مشہور "اورنگ زیب" پیدا ہوئے۔ ایک اورنگ زیب نے شہنشاہ عالمگیر بن کر اپنی تلوار کے ذریعہ جیحون سے لے کر راس کماری تک سارا ارض ہمالہ فتح کیا تھا تو دوسرے اورنگ زیب نے شاعر قتیل شفائی کا روپ دھار کر اپنے قلم کے ذریعے ارض ہمالہ پر آباد دنیائے شعر و ادب کو مسخر کر لیا۔

میں نے یہاں اورنگ زیب عالمگیر کے ساتھ اورنگ زیب قتیل شفائی کا اس لیئے نام لیا ہے کہ میری اپنی نظر میں قتیل شفائی بھی بڑا ہمالہ شاہ آدمی ہے۔ اس کے سوا اورنگ زیب عالمگیر اور اورنگ زیب قتیل دراصل الگ شخص ہیں۔ وہ اورنگ زیب قرآن مجید کا کاتب، یہ اورنگ زیب کلام قتیل شفائی کا مصنف ..... وہ حافظ قرآن، یہ صاحب دیوان ..... اس کی لمبی داڑھی اس کا منہ صفاچٹ ..... وہ خلعت ہفت پارچہ میں ملبوس اور یہ سوٹڈ بوٹڈ ..... اس لیے بہتر یہی ہے کہ میں پہلے اورنگ زیب کو یہیں رخصت کر کے دوسرے اورنگ زیب کے ساتھ آپ کی طرف آؤں۔

آپ دوسرے اورنگ زیب کو نہیں جانتے میں بھی نہیں جانتا، یا اگر جانتا ہوں تو بڑا واجبی واجبی سا ——— البتہ قتیل شفائی کو آپ بھی جانتے ہیں۔ میں بھی جانتا ہوں اور پاکستان اور ہندوستان کا ہر وہ شخص جانتا ہے جو تھوڑی بہت اردو زبان جانتا ہو یا پاکستانی فلمیں دیکھتا ہو قتیل شفائی دراصل اورنگ زیب ثانی کی ایک ارتقائی شخصیت ہے۔

قتیل شفائی اپنے ہمزاد اورنگ زیب سے کب آخری بار رخصت ہوا یہ میں نہیں جانتا لیکن قتیل نے اپنے ہمزاد اورنگ زیب کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ قتیل شفائی کا بچپن اور لڑکپن تھا۔ اس کے بعد جب شباب آیا تو وہ اورنگ زیب نہیں بلکہ قتیل شفائی کا نام لے کر آیا۔ اب ہمالہ کے دامن میں آباد پٹھانوں کی ایک بستی ہری پور ہزارہ کے چند لوگ اس اورنگ زیب کو جانتے ہوں تو جانتے ہوں یا ہری پور ہزارہ کے اسکول کے رجسٹروں میں یا پھر قتیل کے قریبی رشتہ داروں کی زبان پر اورنگ زیب کا نام شاید ابھی موجود ہو ——— ویسے اورنگ زیب اب کہیں نظر نہیں آیا۔ وہ اپنے آپ کو قتیل شفائی میں ڈھالنے کے لیئے پیدا ہوا تھا۔ اس نے اپنا کام مکمل کر لیا اور اب ہمیشہ کے لیئے قتیل شفائی کی جون میں

پ کے رہ گیا ہے۔

قتیل شفائی جو نہ میرا دوست، ہم سفر، ہم جنس، ہم عصر، ہم مشرب، ہم پیشہ اور ہم جلیس ہے اس لئے اس نے مجھے کبھی کبھار اورنگ زیب کی باتیں و بڑے مزے لے لے کر سنائی ہیں اور میں نے باتوں باتوں میں یہ پتہ چلا لیا ہے کہ اورنگ زیب کس طرح قتیل شفائی بنا ہے۔ اس تبدیلی کا عمل تقریباً وہی ہے جو ی کے قطرے کو گہر بنا دیتا ہے اب یوں سمجھئے کہ اگر اورنگ زیب ایک شخص تھا تو قتیل شفائی ایک شخصیت ہے۔

قتیل نے مجھے بتایا اورنگ زیب تقریباً تیس سال پہلے ہری پور ہزارہ کے ایک خوش حال گھرانے میں پیدا ہوا۔ ماں باپ کی پہلی اولاد جس ڈ پیار اور جس ناز نخرے سے پالی جاتی ہے ـــ اورنگ زیب کو بھی ماں باپ کا وہی لاڈ پیار ملا۔ اچھے ماں باپ۔ اچھا گھر، اچھی غذا، اچھے لباس، اچھی بیت اور اچھا ماحول ـــ ان ساری اچھائیوں نے ننھے اورنگ زیب پر بڑا اچھا اثر ڈالا۔ جن کے گھر یا اسکول ہر جگہ لوگ بڑے پیار سے یہی تے تھے کہ اورنگ زیب بڑا اچھا لڑکا ہے ـــ لوگ آجکل قتیل شفائی سے ملنے کے بعد پہلا تاثر یہی قائم کرتے ہیں کہ قتیل نہ صرف شاعر اچھا ہے بلکہ ی بھی اچھا ہے یہ اچھائی دراصل اسے ماں باپ کے خون کے ذریعہ ورثہ میں ملی ہے اور اس کو اورنگ زیب نے بیس برس تک اپنے پاس امانت کے ر پر رکھا اور پھر جب قتیل شفائی صرف شعر گوئی کی صلاحیت لے کر اورنگ زیب سے ملا تو اورنگ زیب کو قتیل شفائی کی بے مائیگی پر ترس آیا اور س نے اپنی ساری اچھائیاں قتیل شفائی کے حوالے کر دیں۔ یہی وجہ ہے کہ عام شاعروں کی طرح ہم قتیل کے بارے میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ ع

شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

قتیل کے آبائی نام اور اس کے وطن کو دیکھ کر بچپن میں قتیل کے والد کے دوست یہی اندازہ لگاتے ہوں گے کہ یہ بھی اپنے باپ کی طرح لازموں سے پاؤں دبواتے حقہ پیتے اور اپنی طرح کے اورنگ زیب پیدا کر کے زندگی کے دن گذارے گا اور ہری پور ہزارے کے باہر کسی کو بھی پتہ نہ چلے گا کہ کوئی اورنگ زیب پھر اس دنیا میں آیا تھا۔ قتیل شفائی میں شعر گوئی کا ذوق کب پیدا ہوا، اس نے پہلا شعر کب کہا، وہ شعر کیا تھا کیسا تھا یہ اب شاید قتیل کو بھی یاد نہیں۔ میں بس اتنا جانتا ہوں کہ وہ مجھے جب ملا تو وہ اس وقت ایک بھرپور شاعر تھا اور ایک مشہور شاعر تھا۔

قتیل سے ملنے سے پہلے میں نے قتیل کی آواز سنی، اس کی آواز اتنی میٹھی اور اتنی رسیلی تھی کہ میں بے قرار ہو گیا کہ میں نے رسالہ "سویرا" ہور کے موجودہ الوقت مدیر ساحر لدھیانوی کو خط لکھا کہ کل رات میں نے راولپنڈی کے ایک سنیما گھر سے ریلے ہونے والے مشاعرہ میں گاندھی جی کے قتل کے عنوان سے قتیل شفائی کی مترنم نظم سنی ہے اس کی آواز اور اس کا کلام سن کر میں اس کے بارے میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ کیسا شاعر ہے یہ! قتل بھی کرتا ہے اور ساتھ ہی شفا بھی عطا کرتا ہے ساحر لدھیانوی کا جواب آیا کہ تم نے اس کے بارے میں جو رائے قائم کی ہے وہ بالکل صحیح ہے وہ جتنا اچھا شاعر ہے اتنا ہی اچھا انسان بھی ہے ـــ ساحر کی اس رائے نے قتیل سے ملنے کی خواہش کی آگ پر تیل کا کام کیا ان دنوں قتیل شفائی لاہور میں تھا اور میں اس سے کوئی پندرہ سو میل دور حیدرآباد دکن میں ـــ اس لئے یہ آگ کئی برس تک جلتی رہی۔ عرصہ گذر گیا۔ پھر میں مہاجر بن کر لاہور پہنچا ـــ لاہور پہنچنے کے دوسرے دن یا تیسرے دن میں حضرت احمد ندیم قاسمی کے ہمراہ لاہور کے یارانِ ترقی پسند کی ایک بیٹھک "پیراڈائز ریسٹوران" سے باہر نکل رہا تھا کہ قاسمی صاحب نے اپنی مخصوص دھیمی آواز میں پوچھا۔

قتیل شفائی سے کبھی ملے ہو؟

میں نے تڑپ کر کہا ـــ

نہیں کہاں ہے وہ! میں تو کب سے اسے دیکھنے اور اس سے ملنے کے لیئے بے قرار ہوں۔

قاسم صاحب نے کہا ——

تو پھر آؤ —— — —

ایک ہی لمحے بعد اپنے آگے ایک سرشار جوان میں نے کھڑا پایا تھا اور وہ تھا قتیل شفائی —— گیبرڈین کے دیل پریسیڈ سوٹ اور ٹوئل کی بیش قیمت نکٹائی میں ملبوس گندمی رنگ نکھرے بھرے چہرے، چمک دار پیشانی، چمک دار آنکھوں، چمک دار گالوں والا متوسط قد کاٹھ والا بھرپور طور پر صحت مند قتیل شفائی اس قتیل شفائی سے بالکل مختلف تھا جس کا ہیولیٰ میں نے اپنے ذہن میں تیار کیا تھا۔ قتیل سے ملنے سے پہلے اور اس کے پرانے طرز کے ثقیل قسم کے تخلص کو ذہن میں رکھنے سے میرے تصور میں قتیل کا وہی ہیولیٰ بنا تھا جیسا کہ بالعموم پرانے روائتی شاعروں کا ہوتا ہے یعنی دھان پان جسم، اس پر جھولتی ہوئی میلی سیاہ اچکن، پچکے ہوئے گالوں میں دبا ہوا پان کا بیڑا، آنکھوں پر دوہرے تلے والی عینک، سر پر خشک لمبے لمبے بال، ٹانگوں میں علی گڑھ فیشن کا پاجامہ اور پیروں میں آیا سا ہی جوتی دن بھر آنکھوں سے چیپڑ پونچھنے والا سر شام ہی سے شعر نوشی کا آغاز کر کے نصف شب کے قریب مدہوش ہو کر کسی گندی نالی میں پڑے رہنے والا شاعر —— لیکن قتیل اپنے دقیانوسی تخلص کے بالکل برعکس بڑا کلے ٹھٹے والا اور نہایت جامہ زیب شخص ہے غزل گوئی کے ساتھ ساتھ وہ جتنا نظم گو شاعر ہے اس کی زندگی میں بھی ویسا ہی نظم و ضبط ہے جس طرح فیض دیکھنے میں شاعر کے بجائے ایم اے کا طالب علم، فلموں کا ہیرو یا سول سروس کا کوئی اعلیٰ افسر معلوم ہوتا ہے اسی طرح اس کا گھر بھی شاعر کا کلبۂ تاریک نہیں ہے لاہور کے ایک نواحی محلے مصری شاہ میں جیؔ مسیت (سفید مسجد) سے قریب رحیم پارک کے علاقے میں جدید ترین فرنیچر اور رنگ برنگے حریری پردوں سے سرسراتا ایک پختہ مکان ہے جس میں قتیل شفائی اپنی ایک عدد بیوی اور چار خوب رو بچوں کے ساتھ ایک کھاتی پیتی زندگی کے ساتھ فلرٹ FLIRT کر رہا ہے۔ یہ نہ سمجھیئے کہ یہ کھاتی پیتی زندگی قتیل کو اس کے خوش حال باپ سے ورثے میں ملی ہے بلکہ وہ اپنے باپ سے ملی ہوئی جائداد اور ذاتی مکان کو اپنے اقربا کے حوالے کر کے عرصہ ہوا ہری پور ہزارہ کو خیرباد کہہ آیا تھا اور اپنی زندگی کے فردوس کی آپ اپنے ہاتھوں تعمیر کے لیئے تقریباً خالی ہاتھوں اور خالی جیبوں کے ساتھ لاہور آیا تھا۔

اس سماج میں ایک شاعر کی زندگی کیا ہوتی ہے ملک کے خزانے میں شاعر کا کیا حصّہ ہوتا ہے! شعر کہنا بھوکے رہنا، یا شعر کہنا اور ننگے تانگے کی زندگی بسر کرنا، شاعر کو ہمارے سماج میں واہ واہ تو بہت ملتی ہے لیکن یہ واہ واہ کبھی چاندی کے سکوں میں ڈھل سکتی ہے اور نہ کرنسی نوٹوں میں بدل سکتی ہے! مگر قتیل نے (جو بڑا سرگشتہ خمارِ رسوم و قیود ہے) یہ عزم کیا کہ وہ اپنی شاعری کو اس طرح پیش کرے گا کہ واہ وا صرف آواز ہی نہ رہ سکے بلکہ کرنسی نوٹوں میں بدل سکے۔ اور چاندی کے سکے میں ڈھل جائے۔ قتیل پٹھان ہونے کی وجہ سے دھن کا بڑا پکا ہے چنانچہ اس نے اپنی جد و جہد اور اپنے وجود سے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ اردو زبان کا شاعر محض اپنی قوتِ شعر گوئی سے بھی ایک بڑی باعزت اور خوش حال زندگی کی تخلیق کر سکتا ہے۔

سردیوں میں ٹوئیڈ، گیبرڈین پک اینڈ پک وغیرہ کے بیش قیمت سوٹ اور شروانیاں پہننے والا اور گرمیوں میں ہر روز ململ کا سفید براق کرتہ اور اُجلا پاجامہ اور ہلکی سی چپل پہننے والا صاف ستھرا قتیل شفائی بقول خود اس خوش لباسی کو اس لیئے اہمیت دیتا ہے کہ خول صاف ستھرا ہو تو روح بھی صاف ستھری رہتی ہے چنانچہ قتیل کی شاعری میں جو پاکیزگی نفاست اور اجلا پن نمایاں طور پر نظر آتا ہے وہ دراصل

س کی اپنی نفاست طبع کی پیداوار ہے جس زمانے میں قتیل اپنے شعر سنانے کے لئے پہلی بار دنیا کے سامنے آیا اس زمانے میں شاعری کی روایات کچھ عجیب سی تھیں، یعنی شاعر وہ ہے جو بے حد شراب پیئے۔ جو بادہ خوار نہیں وہ شاعر نہیں زندگی کے راستے پر شاعر ہمیشہ لڑکھڑاتا چلے، سیدھا نہ چلے، تاکہ لوگ آسانی سے پہچان لیں کہ دیکھو ــــــ دیکھو وہ شاعر جا رہا ہے ان دنوں اختر شیرانی، جوش ملیح آبادی، جگر مراد آبادی (سابق) اسرار الحق مجاز اور عبدالحمید عدم کی بادہ خواری الف لیلیٰ کی کہانیوں کی طرح مشہور تھیں نوعمر شاعروں پر اس کا بڑا برا ہی اثر پڑ رہا تھا۔ ہر نوعمر شاعر ان بڑے شاعروں کی تقلید میں ان کے پیچھے لڑکھڑاتے ہوئے چلنے میں بڑا فخر محسوس کرنے لگا تھا مگر روایات کا باغی بہتوں کو نہ ماننے والا اور اپنے آپ پر پورا اعتماد رکھنے والا قتیل شفائی اس راستے پر چلنے کے لئے قطعاً نہیں تھا وہ اس دنیا کو اور انسان کی زندگی کو براہ راست اور بہ قائمی ہوش و حواس دیکھنا چاہتا تھا وہ شعروں کے پھول اور بیل بوٹے اگانے کے لئے شرابیاری کا قائل نہیں تھا اس نے کبھی ابتدا ہی میں غیر شعوری طور پر یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ شعر قتیل کہے گا۔ شراب نہیں، میں یہ نہیں کہتا کہ قتیل شراب نہیں پیتا ــــــ وہ شراب پینے کو برا کبھی نہیں سمجھتا لیکن وہ اسی طرح شراب پیتا ہے جیسے کوئی سدا گیروے رنگ کے کپڑے پہننے والا سادھو تنہائی میں دنیا کی نظروں سے چھپ کر رنگ برنگے بھڑکیلے کپڑے پہنے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھے، مسکرائے اور پھر چپکے سے انہیں اتار کر چھپا کر رکھ دے۔

کبھی کبھی جب آسمان پر گھرے بادل چھائے ہوں اور ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی ہو یا عید شب برات کی شام ہو یا نہایت بے تکلف دوستوں کا مجمع ہو تو قتیل چپکے سے تھوڑی دیر کے لئے غائب ہو جاتا ہے اور جب دوبارہ نمودار ہوتا ہے تو اس کے ہاتھ میں اس کاٹ لینڈ کی کوئی بڑھیا قسم کی وہسکی کی ایک دل آویز بوتل ہوتی ہے پھر جام رقصاں ہوتے ہیں۔ پھر مے چھلکتی ہے پھر قتیل پیتا ہے ــــــ لیکن اتنی ہی پیتا ہے کہ وہ سرور کی حد سے آگے نہ جائے اور نشے کی حد سے دور ہی رہے قتیل کے بلانوش دوست اسے کم ظرف کہتے ہیں، لیکن میرا خیال ہے کہ وہ کم ظرف نہیں "نوش ظرف" ہے۔ وہ روز نہیں پیتا، زیادہ نہیں پیتا اور اپنے کو برا نہیں سمجھتا اس لئے میری یہ پیشین گوئی ہے کہ وہ اختر شیرانی، منٹو اور مجاز کی طرح "غرق مے ناب" نہیں ہوگا بلکہ اس کی موت ایک صحت مند زندگی کے طبعی اختتام کی طرح آئے گی۔

ان دنوں میرے شب و روز کا بیشتر حصہ قتیل کے ساتھ گذرتا ہے اور میں قتیل کا بڑا گہرا مطالعہ کرتا رہتا ہوں۔ اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے، کھاتے پیتے، لکھتے پڑھتے، سوتے جاگتے قتیل شفائی کو میں غور سے دیکھتا رہتا ہوں ــــــ اور ماحصل مطالعہ یہ ہے کہ وہ زندگی کو عام آدمی کی طرح نہیں بسر کرتا بلکہ وہ زندگی کی ایک بہت بڑی ذمہ داری سمجھتا ہے وہ چاہتا ہے کہ زندگی کے لمحے لمحے کا رس نچوڑے، ایک لمحہ بھی بیکار نہ جانے پائے صبح کو شام کرنا اور شام کو صبح کرنا یہ قتیل کا وطیرہ نہیں بلکہ وہ روز و شب سے ان کی ساری لذتیں کشید کرنے کو "زندگی گزارنے" کا نام دیتا ہے، اسی لئے وہ بڑا سحر خیز ہے گرمی ہو یا سردی ہر صبح تازہ ٹھنڈے پانی کے غسل کے بعد دو مکھن لگے توس، دو فرائی انڈے تھوڑا سا شہد اور پاؤ بھر دودھ پر مشتمل ناشتے کے بعد وہ ضروری خطوط لکھنے میں مصروف ہو جاتا ہے ادھر نو بجتے ہیں ادھر قتیل گھر سے نکلتا ہے اور سہ پہر تک فلم کمپنیوں، اخباروں اور ناشران کتب کے دفتروں پر اپنے افکار کی سودا بازی میں مصروف رہتا ہے شام ہوتی ہے تو وہ اپنے چند منتخب دوستوں کے ساتھ برصغیر پاک و ہند کی سب سے زیادہ رومانی اور تاریخی سڑک مال روڈ پر ٹہلتا ہوا لارنس باغ کا ایک چکر لگا کر ساڑھے آٹھ نو بجے تک ایک شریف گھریلو آدمی کی طرح گھر پہنچ جاتا ہے، بیوی بچوں کے ساتھ کھانا کھانے میں لطف محسوس کرتا ہے۔ طبیعت شعر گوئی پر آمادہ ہو تو اس وقت تک جاگتا رہتا ہے جب تک رات کی زلفیں بکھر کر کمر تک یا اس سے

بھی نیچے نہ ہو جائیں اگر طبیعت موزوں نہیں ہے تو پھر دس گیارہ بجے کے درمیان کسی لمحے نیند کی پری آتی ہے اور قتیل کو ساتھ لے کر خوابوں کے جزیرے میں چلی جاتی ہے ،

ہو سکتا ہے کہ میرا تجزیہ غلط ہو لیکن جب بھی میں یہ سوچتا ہوں کہ قتیل کی شاعری میں اتنی مٹھاس کیوں ہے تو معاً میرا ذہن ، برفی گلاب جامن اور موتی چور کے لڈوؤں یا زردے کی طرف چلا جاتا ہے قتیل اپنی میٹھی طبیعت کے لحاظ سے میٹھے کا بڑا دلدادہ ہے ، ہر کھانے کے بعد ایک سوئیٹ ڈش اس کے لئے ایک لازمہ ہے کبھی کبھی دفتروں میں جب ہم دوپہر کا کھانا کھاتے ہیں تو قتیل کے کھانے کے بعد بالالتزام اٹھنی کی برفی ضرور منگاتا ہے شیرینی کے اس شوق نے بلاشبہ قتیل کو بڑا شیریں ذہن ، شیریں زبان اور شیریں بیان شاعر بنانے میں بڑی مدد دی ہے (میں پھر کہتا ہوں کہ ہو سکتا ہے میرا تجزیہ غلط ہو)

جس طرح قتیل کی شاعری میں جدید اور قدیم شاعری کا ایک حسین امتزاج ہے اسی طرح اس کی شخصیت میں بھی جدید اور قدیم تہذیب کی مناسب آمیزش ہے وہ مغربی تہذیب کو بھی پسند کرتا ہے اور مشرقی تہذیب کے اچھے اصولوں سے بھی کنارہ کش نہیں ـــــ دوستوں میں وہ احمد ندیم قاسمی کا بڑا احترام کرتا ہے حالانکہ قتیل ، قاسمی صاحب سے بے حد بے تکلف ہے لیکن اس پر مشرقی اخلاق کا اس قدر گہرا اثر ہے کہ وہ قاسمی صاحب کی موجودگی میں اپنے آپ کو چند خاص حدوں میں محصور کر لیتا ہے ۔

اس سلسلہ میں ایک خاص بات یہ ہے کہ بزرگوں کے اس روایتی احترام نے قتیل میں کبھی کوئی احساس کمتری نہیں پیدا ہونے دیا فیض احمد فیض اور احمد ندیم قاسمی کی محفل ہو یا پنڈت جواہر لال نہرو کے زیر صدارت مشاعرہ ، اخبار کا دفتر ہو یا فلم کمپنی کا دفتر ـــــ قتیل جہاں بھی پہنچتا ہے اور جہاں بھی بات کرتا ہے اس میں بڑا دبنگ پن ہوتا ہے جیسے اس کا وجود کہہ رہا ہو کہ کوئی بات نہیں ، آپ کوئی بھی ہوں آخر میں بھی تو قتیل شفائی ہوں

قتیل اپنی قسمت آپ بنایا کرتا ہے اس نے کسی موقع پر بھی اپنے آپ کو ارزاں نہیں ہونے دیا ۔ ان دنوں وہ فلموں کے لئے گیت لکھتا ہے پاکستان کی فلمی صنعت نے ابھی اتنی ترقی نہیں کی کہ فلمی شاعر کو ایک گیت کا معاوضہ زیادہ سے زیادہ سو روپے دے سکے لیکن قتیل وہ شاعر ہے جو فلمی صنعت کی اس زبوں حالی کے باوجود ایک گیت کا کم سے کم معاوضہ ساڑھے تین سو روپے لیتا ہے ، ویسے اس نے ایک ایک گیت چار چار سو اور پانچ پانچ سو روپیہ میں بھی لکھا ہے پاکستان کے فلم ساز قتیل سے اس کے مہنگے گیت اس لئے خریدنے پر مجبور ہیں کہ جن فلموں میں اس کے گیت ہوتے ہیں کم از کم سلور جوبلی فلم ضرور ہوتی ہے ویسے ثبوت پیش کرنے کا تکلف بیکار ہے اس لئے کہ قتیل کا صرف ایک ہی گیت ہے

الفت کی نئی منزل کو چلا ......

دل توڑنے والے دیکھ کے چل ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں

آج درہ خیبر سے سندر این تک اور جھیل ڈل سے راس کماری تک گونج رہا ہے ۔

قتیل علم کی دنیا سے قلم کی دنیا میں اس لئے داخل ہوا کہ علم کی دنیا میں قتیل کا ایک مجموعہ کلام جو اوسطاً سو غزلوں نظموں اور گیتوں پر مشتمل ہوتا ہے (بظاہر ایک ہزار تعداد والی ایک اشاعت جو شاعر کے مرنے تک ایک ہزار سے زیادہ فروخت نہیں ہوتا البتہ بیس ہزار گھروں کی کتابوں کی الماریوں میں ضرور پائی جاتی ہے) چار پانچ سو روپیہ حاصل کر لیتا ہے قتیل شاعر کے علاوہ ایک کنبے کا صدر خاندان ،

ایک بیوی کا شوہر، اپنے بچوں پرویز، مسرت، تنویر اور ثمینہ کا باپ اور اپنی بوڑھی والدہ کا کفیل ہے اور وہ صرف علمی دنیا کا شاعر بن کر زندگی کی اس گاڑی کو نہیں کھینچ سکتا جس میں اتنے سارے افراد سوار ہیں اس لئے وہ علم کی دنیا سے فلم کی دنیا اور فلم کی دنیا سے علم کی دنیا میں صبح سے شام تک محنت میں مصروف رہتا ہے کہ وہ جتنا خوددار ہے اس کی اور اس کے اہل وعیال کی زندگی بھی اتنی ہی خوددار رہے اور اس کے مرنے کے بعد اس کے دوستوں کو اس کے اہل وعیال کے لئے کوئی قتیل فنڈ نہ جاری کرنا پڑے یا اس کی بیوی بچے حکومت کے وظیفے کے محتاج ہوں۔

قتیل جن دنوں چنگی کے محکمے میں کلرک تھا، لاہور کے فلمی رسالوں اداکار اور اُجالا کا ایڈیٹر تھا اور مشہور ترقی پسند ماہانہ جریدے "ادب لطیف" کا مدیر بنا ہوا تھا ان دنوں اس کی زندگی مالی اعتبار سے اچھی یا خوش گذران نہیں تھی لیکن جچے تلے منصوبوں کے تحت زندگی بسر کرنے والے قتیل کو یقین تھا کہ وہ ایک دن خود اپنے ہاتھوں اس زمین پر اپنی زندگی کا ایک چھوٹا سا خوبصورت فردوس تعمیر کرے گا ——— چنانچہ وہ اس فردوس کی تعمیر بڑی حد تک مکمل کر چکا ہے۔

قتیل میں بعض خامیاں بھی ہیں لیکن چونکہ ان خامیوں نے قتیل کو شخص سے شخصیت بننے میں کوئی مدد نہیں دی ہے اس لئے ان کا تذکرہ ہی بیکار ہے اور اب جب کہ وہ شخص سے شخصیت بن چکا ہے تو ہمیں اور آپ کو اس کی خامیاں بھی اچھائیاں نظر آنے لگی ہیں۔ بعض دوست جو قتیل کی زندگی میں صرف خامیاں تلاش کرنا چاہتے ہیں وہ صرف ایک عورت تک پہنچ سکے ہیں وہ عورت (جو ابھی بقید حیات ہے) جوانی کے راستے پر قتیل کی پہلی لغزش ہے اور شاید آخری بھی اب بھی کبھی کبھی قتیل کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھئے تو اس کے تصور کی چلمن کے پیچھے ایک سایہ سا ضرور نظر آتا ہے وہ آنچل ہے کہ رخسار کہ پیراہن ہے کچھ تو ہے جو قتیل کی لغزش کی علانیہ طور پر چغلی کھاتا ہے، قتیل نے کچھ دن ایسے گزارے جب کہ اس کے شانوں پر اس کی بیوی کے علاوہ ایک اور عورت کی زلفیں پریشان ہو گئی تھیں۔ قتیل اس کی محبت کے بازار میں آوارہ و رسوا گھوم رہا تھا۔ قتیل سرتاپا ایک دل بنا ہوا تھا لیکن اچانک ایک دن اس کی محبت کا چاند غروب ہو گیا۔ ایک چھناکے کے ساتھ قتیل کا دل ٹوٹ گیا، قتیل پر ایک عرصہ تک نیم دیوانگی کا عالم طاری رہا اور اس کی دیوانگی جیسے زمانے بھر کو بھا گئی کہ قتیل کی شاعری میں درد اور احساس دونوں ایک دوسرے میں اس طرح گڈمڈ ہو گئے ہیں ——!

اب قتیل کبھی کبھی اس عورت کے بارے میں یہ ضرور سوچتا ہے کہ اب وہ شمع فروزاں کہاں ہے! لیکن قتیل اس کی جدائی کو ایک بہت بڑا سبق ایک بہت بڑا تجربہ سمجھتا ہے اور وہ اس سبق اور اس تجربے کو بڑے سلیقہ کے ساتھ اپنے شعروں میں گوندھتا جا رہا ہے یہی وجہ ہے کہ اس کی نظموں گیتوں اور غزلوں کے پڑھنے کے بعد یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ابھی ابھی ہمارے آپ کے سامنے سے ایک نہایت خوبصورت عورت چھپاک سے گزر گئی صرف اس کے جسم کی خوشبو ہے جو باقی رہ گئی ہے اور مشامِ جاں سے ٹکرا رہی ہے۔

جوانی کی اس پہلی لغزش کے بعد قتیل ایک دم سنبھل گیا ہے ——— آج کل وہ صرف ایک قلم ہے، وہ قلم جو جمہور کی امانت ہے جس میں وہ خون جولاں ہے جس سے عظمت انسان کو آنچ آتی ہے وہ مورخ جس کے سینے میں غم حیات کی تاریخ کے ورق سرسرا رہے ہیں وہ قلم جس سے مشیت بھی شکست کھاتی ہے اسی لئے قتیل بڑے فخر سے دعویٰ کرتا ہے کہ

میں خود اسیر سہی میرا فن اسیر نہیں
میرا قلم کسی جلاد کا ضمیر نہیں

رنگوں کا رسیا

فارغ بخاری پشاور (پاکستان)

قتیل کی رنگا رنگ شخصیت پر کچھ لکھنا آسان کام نہیں۔ اس کا خمیر کچھ ایسے مختلف النوع رنگوں اور خوشبوؤں کے امتزاج سے اٹھایا گیا ہے، جن کی گہرائی لامحدود اور وسعت بے پایاں ہے۔

۱۹۳۸ء میں اپنے ساتھی رضا ہمدانی کی معیت میں میں نے ہفت روزہ شباب اور ماہنامہ نغمۂ حیات کا پشاور سے اجراء کیا۔ انہی دنوں ہم ایک ترقی پسند ادبی ادارے "ادبستان" کا قیام بھی عمل میں لائے، دفتر میں ہر وقت سیاسی اور ادبی دوستوں کا جمگھٹا لگا رہتا۔ ایک دن لاہور کے ایک صحافی کے ساتھ ایک سانولا سلونا نوجوان وارد ہوا اور جب تعارف کے بعد اس نے کھنکتی ہوئی آواز میں غزل سنائی تو ہم مسحور ہو کر رہ گئے، یہ نوجوان قتیل شفائی تھا، ۳۴ برس پہلے کا یہ واقعہ آج بھی اس طرح تازہ ہے جیسے کل کی بات ہو۔ ان دنوں وہ چونگی میں ملازم تھا، اور اپنی جنم بھومی ہری پور سے باہر نہ نکلا تھا شہرت دنا موری چشم براہ تھی کہ وہ گاؤں سے باہر قدم رکھے اور اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جائے۔ چونگی کی نوکری زیادہ دنوں تک اس کا ساتھ نہ دے سکی اور وہ ایک نجی ٹرانسپورٹ کی ملازمت کرنے پنڈی پہنچ گیا۔ پنڈی میں قیام کے دوران اس کے شاعرانہ جوہر چمکے، اور کچھ عرصہ بعد ہی ملک کے مشہور ادبی مجلہ "ادب لطیف" کی ادارت کے لیے اسے لاہور بلا لیا گیا۔ لاہور جانا قتیل کے لیے نیک فال ثابت ہوا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ وہاں کی ادبی اور فلمی دنیا کا مقبول و محبوب شاعر بن گیا

لاہور میں قتیل کے ابتدائی ایام نہایت کڑے گذرے۔ "ادب لطیف" سے اسے محدود سی تنخواہ ملتی تھی۔ مشاعروں اور فلموں کی آمدنی غیر یقینی تھی، مہینوں فقر و فاقہ کی زندگی گزارنا پڑتی، اسے کھانے کے لیے میلوں پیدل چل کر ایک تیسرے درجے کے سستے ہوٹل میں جانا پڑتا جس کے ساتھ اس کا قرض کھاتہ چلتا تھا۔ پھر اس نے ہری پور سے بچوں کو بلا لیا تو مشکلات اور بڑھ گئیں۔ بڑھتے ہوئے اخراجات کا مقابلہ کرنے کے لیے اسے شب و روز محنت کرنی پڑتی۔ لیکن ہوائی آمدن کا کوئی اعتبار نہ تھا۔ کوئی مہینہ اچھا لگ جاتا تو گھر میں چہل پہل نظر آتی، ورنہ وہ عموماً قرض خواہوں سے آنکھیں چراتا پھرتا۔ مجھے یاد ہے کہ قتیل کے ایک دوست ڈاکٹر نے جو مشہور افسانہ نگار بھی ہے، اس کے بخار میں پھنکتے ہوئے بچے کا علاج کرنے سے اسلیے انکار کر دیا تھا کہ اس کے پچھلے بل کی ادائیگی میں دیر ہو گئی تھی۔ یہ دن بُرے تھے لیکن قتیل کی خندہ پیشانی نے انہیں ناگوار بننے نہ دیا۔ اس کی حوصلہ مندی

نے کبھی حالات سے شکست تسلیم نہیں کی۔ یاس اور بددلی کے الفاظ کو جیسے اس نے اپنی لغت سے خارج کر دیا ہو، ہمیشہ مثبت اور روشن پہلو ہی پر اس کی نظر رہتی ہے اور اپنے درخشندہ مستقبل پر اسے پختہ یقین ہے۔ ہر حال میں خوش رہنا اور مصائب و آلام کو خاطر میں نہ لانا اس کی زندگی کے سنہری اصول ہیں۔

سرحدی ہونے کے ناطے، مہمان نوازی قتیل نے ورثہ میں پائی ہے۔ فقر و فاقہ کے دنوں میں بھی اس کے ہاں مہمانوں کا ہجوم رہتا اور کبھی اس کے دل پر میل تک نہیں آئی۔ وہ قرض لیکر مہمانوں کی پذیرائی کرتا اور اپنی حالت کا انہیں احساس تک نہ ہونے دیتا۔ خوش پوشی اور خوش خوراکی اس کی زندگی کا لازمہ ہے لیکن اسے حالات کے مطابق اپنے دکھ ڈھالنے میں بھی بڑا ملکہ حاصل ہے۔ مالی بحران کے دنوں میں جب ہم رات کے دو بجے اس کے گھر جا کر ٹھنڈی دال روٹی سے پیٹ کی آگ بجھاتے تو وہ اس وقت دال کی تعریف ایسے شاعرانہ انداز میں کرتا اور اس کے فوائد اس عمدگی سے گنواتا کہ وہ دال بھی پلاؤ کا لطف دے جاتی۔

اپنی پسند، ناپسند کو بڑی شائستگی اور فنکاری سے دوسروں پر ٹھونسنے میں قتیل بڑا ماہر واقع ہوا ہے۔ جن دنوں اعلیٰ کوالٹی کے سگریٹ پیتا تھا ہمیں درمیانہ قسم کے سگریٹ پیتا دیکھ کر کہتا، بھائی سگریٹ کم پیو اور اچھے پیو، گھٹیا سگریٹ سے جان کو روگ لگا بیٹھو گے۔" پھر ہماری طرح کے سگریٹ پینے لگا تو ہم نے پوچھا "کیوں بھئی تم تو ایسے سگریٹ پینے سے منع کرتے تھے اب خود ہی ان پر آ گئے؟" تو مسکرا کر بولا "یار سچ پوچھو تو سگریٹ سب کے سب ایک ہی چیز ہیں، صرف اچھی پیکنگ کر کے اور اچھی برانڈ کا نام دے کر لوگوں کی جیبوں پر ڈاکہ ڈالا جاتا ہے۔ غور سے دیکھو تو وہی تمباکو، وہی نشہ، وہی ذائقہ۔ یہ اچھے برے کا فرق ہمیں بے وقوف بنانے کے لیے رکھا گیا ہے۔ پھر ہم بے وقوف کیوں بنیں اور اپنی محنت کی کمائی کیوں ضائع کریں۔"

صرف یہی نہیں بلکہ وہ اپنی ذاتی دوستیاں، دشمنیاں بھی دوستوں پر ٹھونسنے کے لیے مُصر رہتا ہے۔ پرانے دوستوں سے اس کی وفاداری مثالی ہے، لیکن اس کی نئی دوستیاں جو عموماً مصلحتوں پر استوار ہوتی ہیں ہمیشہ ناپائیدار ثابت ہوئی ہیں۔ وہ نئے آشناؤں کی ظاہری چکا چوند سے متاثر ہو کر ان کے قصیدے گانے لگے گا لیکن جب ان کا اصلی روپ دیکھے تو اپنی عجلت پسندی پر پشیمان ہو کر چھلکے اتارتے اتارتے انہیں بالکل ننگا کر کے چھوڑے گا۔

وہ دوستوں کا دوست اور دشمنوں کا بدترین دشمن ہے۔ اس معاملہ میں وہ پکا پٹھان ہے جس سے دوستی ہو گئی اس سے زندگی بھر ساتھ نبھایا جس سے بگڑ جائے اسے قبر تک معاف نہیں کرتا۔ وہ دوستوں سے بھی توقع رکھتا ہے کہ اس کے مزاج کے اتار چڑھاؤ میں اس کا ساتھ دیں لیکن خود دوستوں کے لیے اس اصول پر عمل کرنا ضروری نہیں سمجھتا۔

قتیل میں نخوت کا شائبہ تک نہیں لیکن مختلف طریقوں سے وہ اپنی برتری کا احساس دلانے سے کبھی نہیں چوکتا۔ شاید یہ کوئی نفسیاتی مسئلہ ہو کہ بعض اوقات وہ اپنی انا کی تسکین کیلئے جگری دوستوں کی انا کو مجروح کرنے کی عامیانہ حرکت بھی کر بیٹھتا ہے۔ یہ غیر شعوری عمل اس کی معذوری کا نتیجہ ہے جس میں میرے نزدیک اس کی نیت و ارادے کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ اس کی خوبی ہے یا کمزوری ——— بہر حال یہ ایک ایسا رنگ ہے جو اس کی شخصیت کا جزو بن چکا ہے اور اس کے بغیر اس کا خاکہ مکمل نہیں کہلایا جا سکتا۔

قتیل کی زندگی کے اور بھی بہت سے رنگ ہیں۔ شوخ بھڑکیلے رنگ بھی، خوشگوار رنگ بھی، چبھنے والے رنگ بھی۔ زمانے کے گرم و سرد نے اسے کسی حد تک دنیا دار ضرور بنا دیا ہے لیکن اس کے اندر کی معصومیت زندہ ہے اور جب وہ ابھر کر سامنے آتی ہے

تو نمکین حبت پر چمکتے لپکتے رنگوں کی دھنک پھوٹ پڑتی ہے اور وہ کسی ملکوتی دنیا کی مخلوق لگتا ہے۔ کاروباری دنیا میں اس کا کچھ اور ہی رنگ ہوتا ہے۔ عشق و رومان کے ماحول میں وہ محبت اور پرستش کے دیوتا کا رنگ لیے ہوتا ہے اور خرابات کی تخیلی فضا میں وہ ایک جام چڑھاتے ہی سارے مصنوعی رنگ جھٹک کر وہ اپنے اصلی اور حقیقی رنگ میں ایک سیدھے سادھے سچے فن کار کے روپ میں مسکراتا، قہقہے لگاتا اور لطائف و ظرائف کے دریا بہاتا نظر آتا ہے۔

قتیل ہمارا پرانا ساتھی ہے۔ وہ ادب کے اس مکتبۂ فکر سے تعلق رکھتا ہے جو مثبت، صحت مند اور انقلابی اقدار کو فروغ دینے کا قائل ہے اور ان بالغ نظر ادیبوں میں سے ہے جنہوں نے اس نظریہ کو سوچ سمجھ کر قبول کیا، پوری مستقل مزاجی اور حوصلہ مندی سے اسے اپنایا۔ اس وقت بھی اس کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی جب ترقی پسند مصنفین کو غیر قانونی جماعت قرار دیا گیا اور بڑے بڑے بقراط قسم کے ادیب، شاعر مستعفی ہو کر گوشۂ عافیت میں جا بیٹھے یا سودا بازی کر کے بڑے بڑے سرکاری عہدے سنبھال لیے۔ رجعت پرست استحصالی قوتوں نے ترقی پسندوں کو ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا۔ ان پر حصولِ معاش کے دروازے بند کر دیئے، قلم پر پہرے لگا دیئے اور انہیں آہنی سلاخوں کے پیچھے محبوس کر دیا۔ قتیل نے اپنے فن کی عظمت کو بلند رکھا، اپنے قلم کی آبرو کا تحفظ کیا اور اس کی پاداش میں وہ ساری اذیتیں ہنسی خوشی برداشت کیں جو اس ظالمانہ دور میں ایک نڈر اور بے باک فن کار کا مقدر بن چکی تھیں۔

قتیل نے سامراجی اور رجعت پرست ذہنوں کو ہر محاذ پر شکست دی۔ علم سے فلم تک، ریڈیو سے مشاعرے تک اور اخبار سے دربار تک قتیل نے اتنی شہرت کمائی کہ پاکستان کے تمام بڑے صنعت کار داؤد جی، آدم جی، اصفہانی جی، ہنگل جی وغیرہ نے مل کر اتنی دولت نہیں کمائی ہو گی، لیکن اس نے ہوشیاری یہ کی کہ اپنی یہ دولت غیر ملکی بینکوں میں جمع نہیں کرائی کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ عوامی حکومت آنے پر یہ مال اپنے ملک میں منتقل کرنا پڑے گا۔

قتیل نے اپنے فن کی پرورش کے لئے بڑی قربانیاں دی ہیں۔ اسے اپنے فن سے عشق ہے۔ اور اس کی راہ میں اس نے کسی چیز کو حائل ہونے نہیں دیا۔ وہ برصغیر ہند و پاک میں فلمی دنیا کا مقبول نغمہ نگار ہے۔ ہمارے بیشتر شاعر فلمی ماحول میں جا کر دم توڑ دیتے ہیں لیکن اس نے وہاں بھی فن کی عظمت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اس کے گیتوں میں جھرنوں کی گنگناہٹ اور بادِ صبا کے نرم جھونکوں کا ترنم محسوس ہوتا ہے۔ وہ حسن اور رومان کا شاعر ہے۔ لیکن اس نے انقلابی نغمے بھی گائے ہیں.... ..... وہ حقیقت میں شاعر ہے، سچ کہنے سے نہیں گھبراتا اور حقائق کو غلافوں میں چھپانے کو فنی بددیانتی سمجھتا ہے، اس نے ٹوٹ کر عشق بھی کیے، رسوائیاں بھی خریدیں، بدنامیاں بھی مول لیں لیکن زندگی کے ہر تجربے کو اپنے فن کا موضوع بنایا۔ وہ تصنع آمیز ماورائی شاعری کا قائل نہیں، اپنی کمزوریوں کو بھی اس نے دفن کرنے کے بجائے فن میں سمو کر پیش کیا۔ اس کے گیت، غزلیں اور نظمیں صداقتِ اظہار کے لئے بے مثل شاہکار ہیں۔ اس نے ہمیشہ جو کچھ محسوس کیا برملا کہا۔ کسی قسم کے ابہام سے اپنے فن کو کبھی آلودہ نہیں ہونے دیا۔ کیوں کہ اس کا ذہن صاف ہے اس میں کوئی الجھن نہیں، اپنی منزل کا تعین وہ کر چکا ہے اس لیے سفر میں [illegible] راہیں بدلنے کی اسے ضرورت پیش نہیں آتی۔ اس کا لہجہ منفرد ہے، سوچ اپنی ہے، اس نے بعض دوسرے شعراء کی طرح تقلید کی بیساکھیوں [illegible] کے ذہنوں سے اوپر اٹھنے کی کبھی کوشش نہیں کی بلکہ اپنے نظریے سے [illegible] حاصل کی اور اپنی مسلسل محنت، ریاضت اور [illegible] سے اپنے لیے مقام بنایا۔ آج [illegible] صدی عمر گزارنے کے بعد بھی اس کا ذہن زنگ آلود نہیں ہونے پایا اور اس کی سوچ اسی طرح شفاف اور براق ہے کیونکہ اس نے اپنے ذہن و فکر کے دروازے ہمیشہ کھلے رکھے ہیں وہ تازہ ہواؤں سے خوف نہیں کھاتا بلکہ انہیں صحتمندی کی علامت سمجھتا ہے اور جس فنکار نے یہ نکتہ جان لیا اس کا فن کبھی نہیں مر سکتا۔

قتیل صاحب

محمد طفیل لاہور، پاکستان

میں نے بڑے بڑے جغادری ادیبوں پر مضامین لکھے مگر قلم پر کبھی کپکپی طاری نہ ہوئی۔ مگر قتیل ایک ایسا شخص ہے جس پر لکھتے ہوئے دل کو آتا ہے سوچتا ہوں نہ جانے وہ میری کس اچھی بات پر خفا ہو جائے اور جانے کس بُری بات پر خوش ہو کر دس سو ر کہہ دے۔ ایسا تذبذب کیوں؟ آدمی موج کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں تعلقات کا بھرم رکھنے کے لئے جملہ انواع و اقسام کی باتیں ٹیپ ریکارڈ کی زینت بنا کر ترتیب دے رہا ہوں!

زندگی کے ابتدائی برسوں میں، میں جن شاعروں اور ادیبوں سے ملا ان میں قتیل کا نام آتا ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ لڑکپن کے اُس دور میں، میں صرف دس بیس ادیبوں ہی سے ملاقی تھا تو یہ سچ ہوگا۔

نہ جانے وہ کون سی تقریب تھی کہ میں ہری پور ہزارہ جا نکلا۔ وہاں قتیل صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وُہ دن اور آج کا دن کہ ہم ایک دوسرے کو اچھا سمجھتے ہوئے بھی ایک دوسرے کو ناپسند کرتے ہیں۔ تعلقات کی یہ نوعیت جیسی بھی ہو، تعلقات کی اس عجیب سی نوعیت کے باوجود ہم دور دور نہ رہ سکے۔ ویسے یہ مسئلہ الگ ہے کہ کبھی کبھی ہم بلا وجہ ہی ایک دوسرے کو گھورتے ہیں۔ موقع ملے تو برا رد دینے سے بھی گریز نہیں کرتے کہ آپڑ دستِ بڑیں اس کے باوجود میرا گمان یہ ہے۔ جیسے انہیں میری ضرورت ہو اور مجھے ان کی۔ جیسے ہم دریا کے دو کنارے ہوں۔ جو رہیں گے دو ہی اور ان دو کناروں کے درمیان جو دریا بہہ رہا ہو۔ وہ دوستی کا دریا ہو۔

ہر شخص اپنے آپ کو عقلِ کُل کا مالک اور شائستگی کا منبع سمجھتا ہے۔ الحمدللہ کہ بندہ بھی اپنے آپ کو ایک ایسا ہی شخص سمجھتا ہے۔ قتیل صاحب کے بارے میں بھی میرا ایسا خیال ہو سکتا تھا۔ بشرطیکہ یہ پٹھان نہ ہوتے۔

اصل میں ان میں جتنی خرابیاں یا اچھائیاں ہیں۔ وہ ان کے پٹھان ہونے کی وجہ سے ہیں۔ میں نے لغت میں پٹھان کے معنی دیکھے۔ وہاں یہ لکھا تھا سپاہی، خونخوار اور لڑاکا۔ اس سے زیادہ میں قتیل صاحب کی تعریف کیا کروں؟ ویسے اگر میں صاحبِ لغات کی رائے کو نہ مانوں اور اپنا ان کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کروں تو وہ کچھ ایسی ہوگی کہ ان کی سپاہیت میں، ان کی خونخواریت میں اور لڑاکیت میں ایک توازن ضرور ہے۔ فنکارانہ توازن!

پہلے میں سے آپ کو لفظ پٹھان کے معنی سنائے۔ اب ایک محاورہ بھی سن لیجئے۔ لغت میں لکھا ہے کہ پٹھان کا بُت گھڑی میں ادنیا گھڑی میں ٹھوتا۔ نہ جانے ہر لغت پٹھانوں کے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہیں۔ اگر میں نے کوئی لغت ترتیب دی تو میں پٹھان کے معنی بدلوں گا۔ اسی طرح محاورے کو بھی ٹھیک ٹھاک کر دوں گا۔ اگر ٹھیک نہ کر سکا تو ٹھاک تو کر ہی دوں گا۔

اب آیئے اُس ماحول کو ٹٹولیں کہ جس شہر میں یہ پلے اور بڑھے۔ وہ علاقہ ادبی اعتبار سے بنجر تھا۔ کچھ بابو ٹائپ کے لوگ تو تھے مگر ادب کے نام سے کوئی واقف نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک صاحب نے جب ان سے مشاعرہ کا لفظ سنا تو پوچھا۔ نوشہرہ میں تو میں نے سنا ہوں۔ مشاعرہ کہاں واقع ہے؟

ہری پور میں جو پہلا مشاعرہ ہوا۔ وہ انہی کے دم سے ہوا۔ وہ مشاعرہ ۱۹۴۰ء میں یوم اقبال کے سلسلے میں ہوا تھا۔ اس کے لئے چندہ اکٹھا کیا گیا۔ جب ایک دوکان دار سے مشاعرہ کے لئے چندہ مانگا گیا اور ساتھ ہی یہ بتایا گیا کہ مشاعرہ ڈاکٹر اقبال کی برسی کے موقع پر ہو گا تو دوکان دار نے آبدیدہ ہو کر پوچھا

"اچھا، ڈاکٹر اقبال کا انتقال ہو گیا؟"

ہاں ہاں! یہی وجہ ہے کہ اُن کی برسی پر مشاعرہ ہو رہا ہے۔ دوسرے لوگوں نے تو ایک ایک دو دو روپے بطور چندہ دیئے مگر اُس دوکان دار نے پانچ روپے دیئے۔ ساتھ ہی یہ کہا "ڈاکٹر صاحب بڑے قابل انسان تھے"

قتیل صاحب اس تبصرے پر خاصے خوش ہوئے۔ پوچھا "آپ تو ڈاکٹر صاحب کے کام اور نام سے واقف نکلے۔"

"جی ہاں، جی ہاں!"

"بہت خوب!"

"میری بھینس بیمار ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑی محنت سے علاج کیا تھا۔"

بے شک اس واقعہ پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے۔ مگر ماحول تھا یہ جس میں قتیل صاحب پروان چڑھے مگر انہوں نے آہستہ آہستہ وہاں کے ادبی ماحول کو بدلا۔ اب وہاں کے لوگوں کو معلوم ہے کہ مشاعرہ کسے کہتے ہیں اور نوشہرہ کسے اور معلوم یہ بھی ہے کہ ادب کسی شخص کا نام نہیں بلکہ یہ اُس ہنر کو کہتے ہیں کہ جو آدمی کو انسان بناتا ہے۔

مشہور ہے کہ یہ دوستوں کے دوست ہیں اور دشمنوں کے دشمن، پھر دوست بھی سیانے، دشمن بھی سیانے، شاید یہی وجہ ہے کہ میرے دشمن ہیں۔ میرا ان سے واسطہ، نادان دوست والا نہیں دانا دشمن والا ہے۔ یہ الگ مسئلہ ہے کہ یہ مجھے دانا دوست اور نادان دشمن سمجھتے ہوں قصہ صرف اتنا ہے کہ ہمیں ایک دوسرے کو سمجھنے سمجھانے میں غلطی ہوئی اور یہ غلطی ہم مسلسل چالیس برسوں سے کرتے چلے آ رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری دوستی کی اس اجنبیت پر قدرت بھی حیران ہے۔ اس لئے کہ ہم نے قدرت کے مسلمہ ضابطوں میں رخنہ ڈال رکھا ہے۔

یہ صاف گو ہیں۔ اتنے صاف گو کہ بعض اوقات ان پر منہ پھٹ ہونے کا شبہ ہونے لگتا ہے۔ مگر میں یا کیا علان کہ جو شخص صاف نہیں کہہ سکتا ہو اس کے بارے میں یہ یقین کرنے کو جی چاہتا ہے کہ اس کی سیرت ناقص اور ضمیر ناتواں ہے۔ یہ صاف گو ہوں یا منہ پھٹ، ان کی سیرت ناقص اور ناتواں نہیں ہے۔

قتیل صاحب بڑے فقرے باز ہیں۔ بڑے کٹیلے فقرے کستے ہیں۔ پھر اُن میں نہ صرف کٹیلا پن ہوتا ہے بلکہ لطافت بھی ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں ایک دو باتیں ہو جائیں۔

جن دنوں قتیل صاحب مجھ سے خفا تھے۔ میں نے انہیں کہا "کسی دن آیئے کہ آپ کو چرغا کھلایا جائے۔"

کہنے لگے۔ "اب آپ کا چرغا ہضم نہ ہو گا۔"

فن اور شخصیت

فارغ بخاری صاحب سے ان کی دوستی حد درجہ کی ہے۔ جیسے ایک نیام میں دو تلواریں سما گئی ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ایک دوسرے کے بارے میں بڑی بے تکلفی سے گفتگو کرتے ہیں۔ چنانچہ فارغ صاحب کا یہ فقرہ بھی اُنہی کہاوتوں میں سے ہے۔ "وہ پر کہ قتیل جس کے پیچھے پڑ جاتا ہے۔ اُسے قبر تک معاف نہیں کرتا۔" یہ فقرہ کوئی اور کہہ دیتا تو قتیل صاحب آپے سے باہر ہو جاتے۔ چونکہ معاملہ دوستی کا تھا۔ اس لئے یہ فقرہ بھی پی گئے۔

چونکہ دوستی ہے اس لئے انہیں یہ بھی کرنی ہے۔ فارغ بخاری صاحب باتھ روم میں جاتے ہیں تو خاصی دیر لگا دیتے ہیں۔ چنانچہ ایک ایسے ہی موقع پر احمد ندیم قاسمی کی قتیل شفائی کے ساتھ مندرجہ ذیل گفتگو ہوئی۔

ندیم صاحب۔ "فارغ صاحب غسل خانے میں جاتے ہیں تو نکلنے کا نام ہی نہیں لیتے۔"

قتیل: "وہ ایسا ہی کرتے ہیں۔"

"کیوں؟"

"وہ کام جن کا علم سب کو ہے۔ وہ تو کرتے ہی ہیں۔ اس کے علاوہ بھی کچھ کرتے ہیں۔"

"مثلاً، مثلاً!"

"مثلاً وہ بالوں کو خضاب بھی غسل خانے ہی میں لگاتے ہیں۔"

اتنے میں فارغ صاحب غسل خانے سے نکلے اور انہوں نے چھوٹتے ہی کہا۔ "قتیل تو ہر وقت میری برائیاں کرتا رہتا ہے۔ باز آجا!"

قتیل صاحب نے کہا۔ "میں نے تو کوئی برائی نہیں کی۔"

فارغ: "میں سب سن رہا تھا۔"

قتیل: "میں نے تو صرف بالوں کو خضاب لگانے کا ذکر کیا تھا۔ اصل بات تو بتائی ہی نہیں کہ تیرے سارے دانت بھی مصنوعی ہیں۔"

جس دوست نے قتیل صاحب سے میرا تعارف کرایا تھا۔ وہ بچوں کے ادب میں اچھی خاصی شہرت رکھتے تھے۔ اُنہی کی وجہ سے میرا ان دونوں سے ملنا جلنا ہوا پھر اُسی مذکورہ شخصیت کے اشتراک سے میں نے پبلشنگ ہاؤس کی داغ بیل ڈالی تھی۔ مگر وہ بیل منڈھے نہ چڑھی۔ اُس اشتراک میں جو حصہ مجھے ملا۔ وہ ایک جملہ تھا "طفیل ایک نالائق شخص ہے۔ جو کچھ ہوں۔ وہ میں ہوں۔"

اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ "جو کچھ ہوں۔ وہ میں ہوں۔" مجھے اس سوچ پر کبھی اعتراض نہیں ہوا۔ بلکہ سبحان اللہ کہنے کو جی چاہتا ہے۔ جب کوئی دوست یہ کہتا ہے کہ میں نالائق ہوں تو دکھ ہوتا ہے۔ میری نفی کے ساتھ قدرت کی عنایتوں کو بھی جھٹلایا جاتا ہے۔ اُس وقت میری سوئی ہوئی انا بیدار ہوتی ہے۔ تب میں اپنی صلاحیتوں کے اظہار کے سلسلے میں حائل پہاڑوں کو بھی ریزہ ریزہ کرنے کی ٹھان سکتا ہوں۔ مگر احتیاط اتنی کرتا ہوں کہ اوچھے ہتھیار استعمال نہیں کرتا۔ بلکہ صبر اور استقامت کی پونجی کو خرچ کرنا شروع کر دیتا ہوں۔ وہی مندرجہ طعنہ آمیز کلمہ، میرے لئے ادب کی وادیوں میں کودنے کا سبب ہوا۔ اور وہی طعنہ آمیز کلمہ قتیل صاحب سے جنگ چھڑنے کا!

قتیل صاحب سے جنگ چھڑنے کی تلمیح، رائٹرز گلڈ کے الیکشن میں قتیل صاحب مجھ سے ہار کر سرخرو ہو گئے۔ میں جیت کر اس میں لت پت ہو گیا۔ سارے ادبی کام چھوٹ گئے۔ ان ایک دو جملوں کے علاوہ میں اس موضوع پر کچھ کہنا نہیں چاہتا۔

قتیل صاحب کو الیکشن لڑنے کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ پہلا الیکشن انہوں نے اس وقت لڑا جب یہ چھٹی جماعت کے طالب علم تھے۔ الیکشن لڑنے سے پہلے کلاس میں سب سے ہونہار طالب علم تھے۔ الیکشن کے بعد آٹھویں نویں نمبر پر آگئے۔

چونکہ الیکشن لڑنے کا تجربہ انہیں بچپن سے تھا۔ اس لئے ادیبوں کی تنظیم رائٹرز گلڈ کے بھی انہوں نے الیکشن لڑے۔ کسی کو بھی دس بارہ برس تک، پاس پھٹکنے نہ دیا۔ ہم نے صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کو ان کے حق میں دستبردار ہوتے دیکھا۔

مشاہدہ میں آیا ہے کہ جو دوست الیکشن ہار جاتے ہیں۔ وہ طرح طرح سے تنگ کرتے ہیں۔ مگر آفریں ہے قتیل صاحب پر کہ جب مقبولیت کی بازی کا فیصلہ ہو گیا تو انہوں نے مجھے ایک لمحے کے لئے بھی پریشان نہ کیا۔ میں قتیل صاحب کے اس وصف پر اگر خطِ غلامی نہیں تو خطِ محبت لکھنے کے لئے ضرور آمادہ ہوں۔

قتیل صاحب کا دسترخوان بڑا وسیع ہے۔ مطلب یہ کہ وہ پیروں کی طرح صرف کھانا ہی نہیں جانتے بلکہ مریدوں کی طرح کھلانا بھی جانتے ہیں۔ ویسے رسم تو یہ ہے کہ اپنے سے بڑوں کی دعوت کرو اور خوشنودی حاصل کرو۔ مگر یہ اپنے برابر کے دوستوں کو بھی نوازتے ہیں یا دوستیوں کو مزید مستحکم کرتے ہیں۔ یہ نہ صرف بیرونِ لاہور کے دوستوں کی دعوتیں کرتے ہیں بلکہ مقامی دوستوں کو بھی اکٹھا کرتے رہتے ہیں۔ یعنی مل بیٹھنے کے بہانے ڈھونڈتے ہیں۔ کھاؤ پلاؤ ان کا روزمرّہ ہے!

ذوق بھی عمدہ پایا ہے۔ اچھا کھانا ان کی کمزوری ہے۔ انہیں معلوم ہے کہ شہر کی کس جگہ اچھی ملتی ہے۔ کباب کہاں اچھے بنتے ہیں۔ کھیر کس دکان کی اور چرغا کہاں کا مشہور ہے۔ غرض یہ بڑے چسکے کے آدمی ہیں۔ یعنی یہ چسکے اور چسکی دونوں ہی طرح کے آدمی ہیں۔ ایک دروازہ تو اب بند ہو چکا ہے۔ البتہ دوسرا دروازہ ابھی کھلا ہے یعنی چسکے والا!

قتیل صاحب نے ایک دفعہ کہا تھا کہ مجھے مہمانوں کی آمد سے خوشی ہوتی ہے۔ بیوی بھی اٹھلاتی پھرتی ہیں۔ کوئی مہمان نہ ہو تو گھر اجڑا اجڑا سا لگتا ہے۔

مجھے فارغ بخاری صاحب نے بتایا یا کسی دوسرے نے کہ ایک زمانہ میں کہ جب ان کی فاقہ مستی کے دن تھے کہ مقروض بھی تھے کہ فارغ صاحب ہری پور ہزارہ پہنچے، ادھر ان کی جیب خالی، قرض دینے والا بھی کوئی نہ تھا، خاصے پریشان ہوئے۔

انہوں نے جب دیکھا کہ چند روپے بھی کہیں سے میسر نہ آسکیں گے تو رسالوں کی فائلیں ردّی میں بیچ دیں۔ وہ رسالے جو انہوں نے بڑے چاؤ سے اکٹھے کر رکھے تھے۔ ردّی میں بک گئے۔ ذہن کی دنیا لٹ گئی۔ دل کی دنیا آباد ہو گئی۔

قتیل صاحب شاعری کے ماتھے کا جھومر ہیں۔ توقع ہے کہ تحریر کی دنیا میں ایک لمبے عرصہ تک یاد رکھے جائیں گے۔ غزل اور گیت ان کا خاص میدان ہے۔ ان دو شعری میدانوں کے علاوہ، ان کی دھاک ایک اور فیلڈ میں بھی ہے اور وہ ہے فلمی شاعری، جسے انہوں نے ادبی شاعری کے قریب تر کر دیا۔ بعض نامور شاعر فلمی شاعری کی طرف گئے تو اس میں غرق ہی ہو گئے۔ پھر ان کا ادب میں سراغ نہ ملا۔ مگر یہ واحد شاعر ہیں۔ جنہوں نے ان دونوں جہتوں کا حق ادا کیا۔ بلکہ فلمی گیتوں کو بھی مشرف بہ ادب کیا!

فلمی دنیا میں انہیں پہلے پہل محبوب اختر لائے جو ہندوستان کی جانی پہچانی شخصیت تھے۔ محبوب اختر تو پاکستان آکر اپنے جوہر دکھا نہ سکے مگر قتیل صاحب خوب چلے اور خوب چمکے۔ ریڈیو جب بھی سنیں گے کسی نہ کسی اسٹیشن سے ان کے نغمے براڈکاسٹ ہو رہے ہوں گے۔ اس میدان میں ان کی مقبولیت ادبی دنیا سے کچھ زیادہ ہی ہے۔ مگر یہ مسئلہ وقتی ہے۔ دائمی زندگی ان کے نام سے چھپے ہوئے اکھروں ہی کی بدولت ملے گی۔

یہ فلم میں تو روزگار کی خاطر گئے تھے۔ تاکہ ادب کی طرف بے فکری کے ساتھ رجوع کیا جا سکے۔ فلم لائن اختیار کرنے سے پہلے ان کا صرف ایک مجموعہ "ہریالی" منظرِ عام پر آیا تھا۔ اس کے بعد جتنے بھی مجموعے سامنے آئے وہ فلم انڈسٹری میں داخل ہونے کے بعد ہی آئے۔

غرض یہ روزگار کی خاطر، بھٹکنے والی عمر کا سارا حصہ فلمی دنیا میں گزار آئے۔ عورت زدگی کی بجائے عورت نگاری کرتے رہے۔ ناگاہ جہاں دل حاوی ہو گیا۔ وہاں انہوں نے تدبیر کی چادر ڈال دی۔ بے شک وہاں ترغیب اور پھسلنے کے سینکڑوں مواقع تھے۔ مگر یہ زیادہ تر دامن کشاں رہے۔ اگر کہیں ڈوبے بھی تو ہوش مندی کے ساتھ، سنبھلے بھی تو سود و زیاں کی تمیز کی بدولت، غرض چھینٹے بہت اڑے۔ داغ بھی خاصے لگے مگر اس صاحبِ تدبیر انسان نے گھر کے ماحول کو پُرسکون رکھنے کے لئے خاصے جتن کئے۔

پچھلے دنوں قتیل صاحب ہندوستان گئے تھے۔ کوئی سیر و تفریح کی خاطر۔ مجھے معلوم ہوا کہ وہاں کی فلم انڈسٹری میں ہاتھوں ہاتھ لیے گئے۔ جیسے نورتنوں میں سے کوئی ایک رتن ان کے ہاں پہنچ گیا ہو۔

چند دوست جو ادب کے میدان میں ان کے رفیق تھے وہ انہیں اپنے ہاں پا کر اور ان کی پذیرائی کو دیکھ کر پہلے تو ٹھٹھک گئے۔ اس کے بعد بہک گئے۔ سب کا دماغ ان کی کامیابیاں دیکھ کر بگڑ گیا تو بیچ ہی سے سب پروگرام واپس آ گئے۔

قتیل صاحب ہمیں سامنے رکھ کر ان کا تذکرہ تفصیل کے ساتھ، یہ سلسلہ قلم ہے۔ وہ ادب کے خادم بن کر زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ وہ ادب کی راہوں میں اپنی دوستیوں کو قائم رکھ کر سرخرو ہونا چاہتے ہیں۔

قتیل صاحب دشمن نہیں پالتے۔ دوستیاں بھی پالتے ہیں۔ دوستیاں پالنے کا جذبہ ان کی شخصیت میں بہت نمایاں ہے۔ ان کے جو دوست ہیں۔ وہ ان کے نزدیک ہر طرح کی طرفداری کے مستحق ہیں۔ مجرم ٹھہرے ہوں تو، سچے ہوں تو،

مذاق تک کسی بات کو برداشت نہیں کر سکتے۔ مصلحت آمیز سمجھوتے ان کی زندگی سے یکسر خارج ہیں۔ عرصے کی بات ہے کہ یہ ریڈیو کے کسی افسر سے ناراض ہو گئے۔ باقاعدہ ٹھن گئی۔ قتیل صاحب نے باقاعدہ تحریک چلا دی کہ ادیب ریڈیو کا بائیکاٹ کریں۔ لاہور کے بیشتر ادیبوں نے قتیل صاحب کا ساتھ دیا۔ اشتہارات چھاپے گئے۔ پوسٹر لگائے گئے۔ اخباروں میں لکھا لکھایا گیا۔ بات افسرانِ بالا تک پہنچی۔ بالآخر اس افسر کو تبدیل کرایا۔ تب قتیل صاحب نے اپنے دوستوں میں بیٹھ کر اعتراف کیا۔ میں تو اس کی جدپشت کو تبدیل کرا دیتا۔

میرے ایک دوست کا خیال ہے کہ میاں بیوی میں، کم از کم سال میں ایک دو جھڑپیں ضرور ہونی چاہئیں۔ ضرور ایک دوسرے کو غضب ناک نگاہوں سے دیکھنا چاہئے۔ اگر یہ کچھ نہ ہو تو زندگی بے کیف ہو جاتی ہے۔ جینے کا لطف جاتا رہتا ہے۔ تجدیدِ محبت کے امکانات ختم ہو جائیں۔

میرا خیال ہے کہ اس فارمولے پر قتیل صاحب بھی عمل پیرا ہیں۔ بیوی میاں سے ڈرتی ہے، میاں بیوی سے، جس لمحے دونوں ایک دوسرے سے نہیں ڈرتے تو اس لمحے کچھ ہو ہوا کے تجدیدِ محبت کے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں۔

میں نے ایک دن بھابی سے پوچھا "آپ کیوں قتیل صاحب سے لڑتی ہیں ؟"

"میں کہاں لڑتی ہوں۔ لڑتے تو وہ ہیں۔"

"اچھا!"

"مگر یہ آپ کو بتایا کس نے ؟"

"بتانا کس نے ہے۔ یہ سوال وہ ہے کہ جو ہر میاں بیوی کے بارے میں کیا جا سکتا ہے۔ یہ سوال بھی یونیورسل ہے اور جواب بھی یونیورسل!"

قتیل صاحب کی جزئیات پر بڑی نگاہ رہتی ہے۔ وہ آپ کو دیکھیں گے تو فوراً یہ تک جان سکیں گے کہ آپ کی قمیص میں کتنے بٹن لگے ہیں۔ یا آپ کے جوتے کا تسمہ ٹوٹا ہوا ہے یا ٹھیک ہے یا یہ کہ آپ کی مونچھوں میں کتنے بال سفید ہیں اور کتنے کالے!

پھر ان کا دماغ بڑا حاضر ہے۔ وہ آپ کو آج سے بیس برس پہلے کی ملاقات کا تفصیلی حال بتا سکتے ہیں جتنی باتیں ہوئی ہوں گی۔ اُن کی ذرا ذرا سی تفصیل بھی ان کے ذہن سے باہر نہ ہو گی۔

قتیل صاحب تو جزئیات پر دسترس اور اس نوع کی حاضر دماغی کی تردید ہی کریں گے۔ کہیں گے کہ مجھے تو اشعار تک یاد نہیں رہتے۔ لیکن شخصی میل جول میں، ان کی یادداشتیں حیران کن ہوتی ہیں۔

میں نے قتیل صاحب سے دریافت کیا۔ صدر ایوب کے زمانے میں یہ مشہور ہوا تھا کہ حکومت نے آپ کو سرکاری طور پر نوازا تھا۔ موتیوں سے بھر دیا تھا۔ کہنے لگے سب افواہیں ہیں۔ ہوا یوں تھا کہ جب میں رائٹرز گلڈ کا ریجنل سیکرٹری تھا تو انعامات کی ایک تقریب میں صدر ایوب سے ملاقات ہوئی تھی۔ گلڈ کے سیکرٹری جنرل قدرت اللہ شہاب نے صدر سے یہ تعارف کرایا تھا یہ بھی آپ کے ہم شہر ہیں۔ یعنی ہری پور ہزارہ کے!

اس پر صدر نے کہا تھا "کوئی خدمت بتائیے!"

جواب میں میں نے کہا تھا کہ میں اس بات پر خوش ہوں کہ آپ مجھے شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ ساتھ ہی میں نے رائٹرز کالونی کی درخواست صدر صاحب کی خدمت میں پیش کر دی تھی کہ ادیبوں کا کچھ کیجئے۔ انہوں نے وہ درخواست شہاب صاحب کو دے دی تھی۔ شہاب صاحب نے گورنر صاحب کو بھجوا دی تھی۔ اس کے بعد درخواست کا سراغ نہ ملا۔

اس موقع پر میں نے پھر سوال کر ڈالا۔ "یا راُن دنوں دستاویزی فلمیں بنانے کے لئے بھی تو حکومت نے آپ کو روپیہ دیا تھا"

"ہاں ہاں دیا تھا۔ مگر وہ تو مزدوری تھی۔"

قتیل صاحب نے غیر ملکی دورے بھی کئے ہیں۔ جن دنوں یہ رائٹرز گلڈ پنجاب کے سیکرٹری تھے۔ یہ روس گئے تھے۔ ادیبوں کا ایک وفد روس گیا تھا۔ جس میں ان کے دو ساتھی مشرقی پاکستان کے تھے۔ مثلاً پروفیسر شوکت عثمان اور سردار مرشد!

مگر یہ روس سے خوش نہ لوٹے۔ ان کا خیال تھا کہ ہمیں ایک سیاح کے طور پر اپنایا گیا۔ ایک ادیب کی حیثیت سے برتاؤ نہ کیا گیا۔

روس کے دورے کے بعد قتیل صاحب نے لندن کا رخ کیا۔ اپنے بیٹے کے پاس گلاسگو گئے۔ وہاں بیٹے کی انگریز بیوی سے جیسی گفتگو کرتے رہے۔ وہ کچھ کچھ خاتون کے لئے اجنبی تھی اور کچھ کچھ ان کے لئے!

غرض یہ لوٹے تو بہت خوش تھے۔ کیوں کہ انگریزوں کی دریا دلی نے ساری کلفتیں دور کر دی تھیں۔ آنکھوں میں چمک بڑھ گئی تھی۔ دل کی دنیا مہک اٹھی تھی۔ ایک شاعر کو اور کیا چاہئے تھا؟

یہاں ایک فقرہ لکھنا چاہتا ہوں۔ مگر وہ موزوں معلوم نہیں ہوتا۔ وہ یہ کہ کردار کی بے عمل خوبیوں سے باعمل شرارتیں زیادہ قیمت رکھتی ہیں۔

میں نے شروع میں ایک محاورہ تحریر کیا تھا کہ پٹھان کا پوت گھڑی میں اولیا گھڑی میں بھوت۔ بے شک یہ بھوت بن کر بہت سامنے آئے۔ مگر اب یہ انسانی عظمتوں کی تکریم کر کے اولیا بننے کے چکر میں ہیں۔ غرض ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ اب نہ تو قتیل صاحب کی طبیعت میں ویسی تنک مزاجی رہی اور نہ ہی ویسی سینہ زوری کیونکہ عمر کے ساتھ ساتھ ان کی شوخیاں اور طراریاں بھی بوڑھی ہو رہی ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ تدبر کی جھلملاہٹوں سے زندگی منور ہو رہی ہے۔

میرا یہ مضمون، تاثر کچھ ایسا دے رہا ہے کہ جیسے میں قتیل صاحب سے اب بھی روٹھا ہوا ہوں۔ مجھے اپنی قلبی کیفیتوں کا ذکر کرنا تھا۔ سو وہ کر دیا۔ میں نے جتنا قتیل صاحب کو جانا تھا۔ وہ بھی آپ کو بتلا دیا۔ اللہ اللہ خیر سلا! باقی رہا قتیل صاحب کے بارے میں غیر تعصباتی تبصرہ، وہ صرف اتنا ہے کہ وہ ایک چاند ہے جو روشنی دیتا ہے۔ "کیا آپ نے کوئی ایسا چاند دیکھا ہے۔ جو روشنی نہیں دیتا؟" "میں نے بہت دیکھے ہیں"!

محمد طفیل
(مدیر نقوش)

موسموں کا شاعر

کشمیری لال ذاکر

لاہور میں میرے چار دوست ہیں۔

احمد ندیم قاسمی، محمد طفیل، شریف کنجاہی اور نفیس صفائی۔

احمد ندیم قاسمی سے دوستی کے علاوہ میرا قلمی اور ہمسائیگی کا بھی رشتہ ہے۔ جن دنوں میں نوشہرہ میں تھا، اُن دنوں قاسمی صاحب کی خرابی کی وجہ سے اپنے گاؤں انگہ میں تھا جو نوشہرہ سے بہت قریب تھا۔ قاسمی کے بڑے بھائی محمد بخش میرے کولیگ بھی تھے اور اس طرح ہمارا ملنا جلنا اکثر رہتا تھا۔ اسی طرح قلمی رشتہ بھی قائم ہوا۔ تقسیم کے بعد ہمسائیگی والا رشتہ تو قائم نہ رہا لیکن قلم کا رشتہ اُستوار ہوتا رہا۔ ابھی کچھ مہینے پہلے قاسمی کا خط بھی آیا تھا۔

محمد طفیل سے میں آج تک نہیں ملا لیکن خط و کتابت اکثر رہی اور میرے بہت ہی مقبول افسانے پہلی بار نقوش ہی میں شائع ہوئے۔ بلکہ بقول فکر تونسوی میرے افسانے ہندوستان سے زیادہ پاکستان میں چھپے اور ہندوستان میں بعد میں ڈائجسٹ ہوئے۔

شریف کنجاہی تو ایک طرح سے میرا بھائی ہے۔ تقسیم کے دوران میرے خاندان کے افراد کو کنجاہ سے گجرات کے ریفیوجی کیمپ میں حفاظت سے اُسی نے پہنچایا بلکہ ہماری بھینس بیچ کر رقم میرے چچا جان کو کیمپ میں دے آیا تھا۔ تقسیم کے بعد خط و کتابت ضرور رہی لیکن ایک دوسرے سے ملنا نہ ہوا۔ ادھر چند برس پہلے وہ چنڈی گڑھ بھی آیا لیکن میں اُن دنوں ہندوستان سے باہر تھا اس لیے ملاقات نہ ہو سکی۔ ابھی پچھلے دنوں لاہور سے پنجابی کے کچھ ادیب ادھر آئے تھے۔ شاہین ملک، کنول مشتاق اور دلشاد گوانہ۔ اُن سے شریف کے بارے میں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اب وہ پنجاب یونیورسٹی سے ریٹائر ہو کر گجرات چلا گیا تھا۔ ایڈریس انہیں معلوم نہیں تھا ورنہ نوٹ کر لیتا۔

نفیس شفائی سے میری دوستی بہت پرانی ہے۔ ادھر پچھلے دو برسوں میں اُس نے مجھے لاہور آنے کے اتنے دعوت نامے بھیجے ہیں کہ اگر میں غمِ دوراں کے جھگڑے میں نہ اُلجھا ہوتا تو اب تک لاہور ہو آیا ہوتا۔

ہری پور ہزارہ کا یہ پٹھان آج سے بہت برس پہلے، جب پاکستان وجود میں آیا تھا، لاہور کے ادبی پرچوں میں پیاری پیاری غزلیں چھپوایا کرتا تھا۔ کبھی کبھی غزلوں کے ساتھ تصویریں بھی چھپتی تھیں۔ اُن دنوں میں نے نیا نیا لکھنا شروع کیا تھا۔ اُردو کے پرچے بہت سستے تھے اور خاصی تعداد

میں بھی چھپتے تھے۔ پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ پرچے خریدتا بھی تھا۔ مانگ کر بھی پڑھتا تھا اور چرا کر بھی۔ جانے کس پرچے میں قتیل کی ایک غزل پڑھی تھی جس کا یہ شعر ذہن میں کھب گیا تھا،

گنگناتی ہوئی آتی ہیں فلک سے بوندیں
کوئی بدلی تری پازیب سے ٹکرائی ہے

قتیل کی شاعری میں جو غنائیت، تازگی، نغمگی اور رنگوں کا خوبصورت امتزاج تھا وہ بڑا من موہک تھا۔ جوان جوان شعر تھے جو اٹک کے دریا کے پانی جیسے ہنستے ہنساتے اور پھوار کی طرح اِدھر اُدھر بکھرتے بڑے پیارے لگتے تھے۔ رفتہ رفتہ قتیل میرا محبوب شاعر بن گیا اور اُس سے میری ذہنی دوستی پکی ہو گئی۔

مُلک تقسیم ہو گیا۔ دوستیاں اُجڑ گئیں۔ دلنوازیاں ختم ہو گئیں۔ پیاری پیاری صُورتیں یُوں غائب ہوئیں کہ پھر کبھی دیدار بھی نہ ہُوا۔ فسادات کی آندھی نے رشتوں کے آشیانے یُوں اُجاڑے کہ تنکے بھی نظر نہ آئے۔ کچھ عرصہ ذہن کی حالت ایسی رہی کہ ایکدم مرگھٹ کا سماں تھا۔ ایک بھیانک سُکوت۔ ایک کڑا جمُود۔ ایک ناقابلِ برداشت سناٹا۔ لگتا تھا اب اس کے بعد کچھ بھی ہونے والا نہ تھا۔ اب نہ گھر بسیں گے نہ دِل۔ نہ رشتے جُڑیں گے نہ دوستیاں جنم لیں گی۔ لیکن ہندوستان اور پاکستان کے دونوں ملکوں میں ادیب اِنسان دوستی کی قدروں کو اُستوار کرنے میں مصروف رہے۔ اِدھر کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، ساحر لدھیانوی، سیلے سرینی۔ راجندر سنگھ بیدی، رامانند ساگر اور بہت سے دُوسرے فن کار اپنی تخلیقات سے تعمیری قدروں کی آبیاری کر رہے تھے تو اُدھر احمد ندیم قاسمی، سعادت حسن منٹو، ممتاز شیریں، فیض احمد فیض، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، قرۃ العین حیدر، قتیل شفائی اور کئی دوسرے ادیب اور شاعر اس کام میں مصروف تھے۔ بہت اچھی کہانیاں لکھی جا رہی تھیں، بہت اچھی نظمیں کہی جا رہی تھیں، بڑے خوبصورت ڈرامے سٹیج کیے جا رہے تھے۔ علاقے تو تقسیم ہو گئے تھے لیکن دِل تقسیم نہیں ہُوئے تھے۔ پاکستان کی ادبی تخلیقات ہندوستان میں آزادی سے آ رہی تھیں اور یہاں کے ادبی رسائل اور کتابیں اُدھر بھیجنے پر کوئی پابندی نہ تھی۔ اِس لئے ستلج اور راوی کے اُدھر ستلج اور راوی کے اِدھر جو بھی ادب تخلیق ہو رہا تھا اُس میں سبھی فن کار شریک تھے۔ نقوش، سیپ، سنگِ میل، نیا دور، فنون، شاہراہ، گفتگو، بیسویں صدی، شمع اور دُوسرے کئی رسالوں میں دونوں مُلکوں کے ادیب اور شاعر برابر چھپ رہے تھے۔ اب جبکہ زمانہ نہیں تھا کہ ہندوستان میں رہنے والے پاکستان میں چھپنے والے رسالوں کو ترستے ہیں اور پاکستان کے باسی اِدھر کی تخلیقات کا دیدار تک نہ کر سکنے پر مجبُور ہیں۔ اب تو کبھی اُدھر سے کسی دوست کا خط آ جاتا ہے تو جی خوش ہو جاتا ہے۔ کئی بھُولی بسری یادیں ذہن میں اُبھر آتی ہیں۔ کئی کہانیاں مکمل ہو جاتی ہیں کئی خواب ایک بار پھر زندہ ہو اُٹھتے ہیں۔

محمد طفیل جو لڑ جھگڑ کر افسانے منگوایا کرتا تھا اب میری خیریت بھی دُوسروں سے پُوچھتا ہے۔ شریف کنجاہی جس سے ایک عرصہ تک دِن رات ساتھ رہنے کا رشتہ تھا اب صرف تحریروں میں نظر آتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی جو ایک زمانے میں دِل کی دھڑکن کی طرح تھا اب مہر بہ لب ہے۔ یا اللہ یہ کیسا اندھیر ہے! یہ کیسا انقلاب ہے! کیا ہندوستان اور پاکستان کے سیاست دانوں کی یہی آرزو تھی کہ ایک دِن دونوں مُلکوں کے عوام ایسے ہی دور میں جئیں؟ کبھی کبھی سوچتا ہوں تو دماغ ایکدم شل ہو کر رہ جاتا ہے۔ بہرحال یہ ناخوشگوار حقیقت ہمارے سامنے ہے اور ہم اسکی تمام تلخی اور کڑواہٹ کے باوجود اسے تسلیم کر رہے ہیں کہ ہم اسے جھُٹلا نہیں سکتے۔

میں بات کر رہا تھا تقسیم کے بعد کی فضا کی۔ اُسی فضا میں کچھ کرنیں بھی پھُوٹی تھیں۔ جب بٹوارے کے باوجود کئی برسوں تک دونوں

ملکوں کے ادیب ادبی نشستوں اور مشاعروں میں ایک دوسرے سے ملتے تھے کئی بار وہ جلسے بہت بڑے بھی ہوتے تھے اور کئی بار محفلیں مختصر بھی ہوتی تھیں۔ جام بھی کھنکتے تھے اور شعروں کے شعلے بھی لپکتے تھے۔ دل بھی دھڑکتے تھے اور لب بھی رقص کرتے تھے ایک بار ایسا ہی ایک انڈو پاک مشاعرہ چیمسفورڈ کلب دہلی میں بھی منعقد ہوا اُس مشاعرہ میں پنڈت ہری چند اختر بھی موجود تھے اور قتیل شفائی بھی، اُس مشاعرہ میں ہری چند اختر نے ایک بڑا ہی کیوٹ جوک بڑے ہی کیوٹ طریقے سے کیا تھا۔ دسمبر کا مہینہ تھا۔ خوب زوروں کا جاڑا تھا۔ چیمسفورڈ کلب کا وسیع لان شامیانوں اور قناتوں سے گھرا ہوا تھا۔ روشنیوں کی جھلمار تھی۔ اگلی قطاروں میں بڑے خوب صورت صوفے لگے تھے جن پر نہایت ہی خوبصورت عورتیں بیٹھی تھیں۔ اُن کے ہاتھوں میں رنگا رنگ اُون کے گولے تھے جو اُدھر اُدھر لڑھک جاتے تھے اُنگلیاں سلائیوں پر تھرک رہی تھیں، سویٹر بنے جا رہے تھے۔ کہیں آغاز تھا، کہیں بالشت بھر بن چکا تھا کہیں وہ مکمل ہو چکا تھا۔ کچھ اس قسم کی فضا بنی ہوئی تھی۔ جب شاعر لوگ اپنا کلام سُنا رہے تھے۔ جب کوئی بہت اچھا شعر پڑھا جاتا تو زوروں کی داد دی جاتی۔ لوگ خوب ایک سماں بندھ جاتا۔ لیکن اگلی قطاروں کے صوفوں پر بیٹھی خوبصورت عورتوں پر اس کا ردعمل صرف یہ ہوتا کہ ان کی انگلیوں کی سلائیوں پر تھرکنے کی رفتار تو بہت تیز ہو جاتی لیکن ہونٹ بالکل نہ ہلتے۔ پنڈت ہری چند اختر اسٹیج کی ایک طرف بیٹھے سارا سماں دیکھ رہے تھے۔ اُن کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ پیتے تو مرے تھے، چڑھتی نہیں تھی۔ یوں سمجھئے کہ اُس وقت انہیں واقعی چڑھ گئی تھی۔ جب اس ذہنی کیفیت میں انہیں اپنا کلام پڑھنے کے لئے کہا گیا تو مائیک کے سامنے کھڑے ہو کر وہ سامعین سے یوں مخاطب ہوئے

اپنی غزل تو آپ کو ضرور سناؤں گا کیونکہ چیمسفورڈ کلب کے منتظمین نے
مدعو کیا ہے اور معاوضہ بھی معقول دے رہے ہیں لیکن غزل پیش کرنے سے پہلے
شعرا حضرات کو ایک خوشخبری دینا چاہتا ہوں

یہ سُنتے ہی پنڈال میں ایک دم خاموشی چھا گئی اور لوگ پنڈت جی کے اعلان کو سُننے کے لئے بے تاب ہو گئے۔ پنڈت جی پل بھر کو رُکے اور بولے

اگر داد دینے کا یہی انداز رہا تو مشاعرہ میں
شرکت کرنے والے ہر ایک شاعر کو صبح تک ایک ایک
سویٹر ضرور مل جائے گا۔

اعلان ہوا تو پنڈال میں قہقہے گونج اُٹھے اور قہقہوں کی ان گونجوں میں اگلی قطاروں کے صوفوں پر بیٹھی خوبصورت عورتوں کے سلائیوں پر تھرکتے ہوئے ہاتھ ایکدم رُک گئے اور اُون کے گولے اور سلائیوں پر چڑھے سویٹروں کے حصے صوفوں کے نیچے ٹھونس دیے گئے۔ اور پھر پنڈت جی نے غزل پڑھی، خوب داد حاصل کی۔ اب کی داد میں نسوانی آوازیں بھی شامل تھیں۔ اُن کا ایک شعر مجھے اب تک یاد ہے

ہمیں بھی آ پڑا ہے دوستوں سے کام کچھ یعنی
ہمارے دوستوں کے بے وفا ہونے کا وقت آیا

لیکن داد تو لوٹی قتیل نے۔ جب اُس نے غزل کے اشعار اپنی مخصوص لے میں پڑھے تو حسین اور مترنم آوازیں جو اب تک خاموش تھیں داد کی شکل میں فضا میں بکھر گئیں۔

تمہاری انجمن سے اُٹھ کے دیوانے کہاں جاتے

جو وابستہ ہوئے تم سے وہ افسانے کہاں جاتے
نکل کر دیر و کعبہ سے اگر ملتا نہ مے خانہ
تو ٹھکرائے ہوئے اِنساں خُدا جانے کہاں جاتے
تمہاری بے رُخی نے لاج رکھ لی بادہ خانے کی
تم آنکھوں سے پلا دیتے تو پیمانے کہاں جاتے
چلو اچھا ہوا کام آ گئی دیوانگی اپنی
وگرنہ ہم زمانے بھر کو سمجھانے کہاں جاتے
قتیل اپنا مقدر غم سے بیگانہ اگر ہوتا
تو پھر اپنے پرائے ہم سے پہچانے کہاں جاتے

قتیل نے آدھی رات گذر جانے کے بعد مشاعرے کی فضا میں شراب اور نغمگی گھول دی تھی جسے سبھی پی رہے تھے اور جھوم رہے تھے۔ مشاعرے کا ایسا مدہوش کُن سماں بہت دیر میں دیکھنے کو ملا تھا۔

۱۹۵۶ میں دہلی میں ایفرو ایشین رائیٹرز کانفرنس تھی۔ دنیو تھنڈ گیان بھون ادیبوں اور شاعروں کا ایک بہت بڑا بین الاقوامی جمگھٹ تھا۔ بہت اچھے اچھے مقالے پڑھے گئے۔ بڑے اُونچے اُونچے ریزولیشن پاس کئے گئے۔ بہت مشہور مشہور اہلِ قلم سے تعارف ہُوا۔ اعجاز حسین بٹالوی سے بھی ملے تھے۔ اُس کے بعد اُن کے نہ دیدار ہُوئے نہ خط و کتابت ہُوئی۔ مجھے یاد ہے پہلے دو سیشن کے بعد لنچ ایک ہُوا تھا۔ سوچا جا رہا تھا کہ لنچ کے لئے کہاں جایا جائے۔ کچھ طے نہیں ہو رہا تھا۔

اچانک قتیل بولا

"یار کاکے دے ہوٹل چلو"

اور پھر قتیل، فکر تونسوی، اعجاز بٹالوی اور میں ٹیکسی میں بیٹھ کر 'کاکے دے ہوٹل' آ گئے۔ اُن دِنوں اُس ہوٹل کی یہ شکل نہیں تھی جو اب ہے، ایک دُکان سی قسم کا ڈھابہ تھا جس کے اندر چند چھوٹی چھوٹی چیزیں تھیں۔ زیادہ چیزیں باہر فُٹ پاتھ پر پڑی رہتی تھیں اور زیادہ لوگ وہیں بیٹھتے تھے، گاہکوں کو اِنتظار بھی کرنا پڑتا تھا لیکن وہ کِسی دُوسرے ہوٹل میں نہیں جاتے تھے۔ ہم پہونچے تو زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ ہم چاروں پنجابی تھے اس لئے گفتگو پنجابی ہی میں ہو رہی تھی،

"میں دہلی آ کے روٹی ایسی ہوٹل وِچ ہی کھاناں واں" قتیل نے کہا

"کیوں؟" اعجاز کا سوال تھا

"فٹ پاتھ والا ہوٹل ہے، ایس واسطے" فکر نے جواب دیا

"اسی دوویں سے دی تے فُٹ پاتھیئے ادیب آں" میں نے فکر تونسوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا،

میرے اس جواب پر قتیل نے بھرپور قہقہہ لگایا

" طفیل تیری کہانیاں دا مجموعہ چھاپنا چاہندا اے۔ اجازت نامہ لکھدے ۔"

" رائلٹی کس طرح ملے گی ؟ "

" میں لے لواں گا۔ طفیل یار آدمی ہے ۔"

" پبلشر وی کدے یار ہوسکدا ہے ؟ " فکر بولا

" یار، وی تے پبلشر ہوسکدا اے فکر۔" قتیل کا یہ جواب ہماری گفتگو کا مقطع تھا۔ اس کے بعد تو ایفروایشین رائیٹرز کانفرنس کی باتیں ہوتی رہیں۔ اور پھر کافی دیر ہوٹل کے کھانے کی تعریف کرتے ہوئے ہم سب کانفرنس کے بعد دوپہر والے سیشن اٹینڈ کرنے چلے گئے۔

قتیل سے ایک اور ملاقات !

گڑگانوہ میں (جو اب ہریانہ میں ہے) ایک انڈو پاک مشاعرہ تھا مشاعرے کا اہتمام کنور مہندر سنگھ بیدی نے کیا تھا جو اُن دنوں وہاں ڈپٹی کمشنر تھے۔ قتیل پاکستان سے آیا تھا۔ اُس کے ساتھ طفیل ہوشیارپوری بھی تھا اور شاید حبیب جالب بھی یہ آخری مشاعرہ تھا جس میں جگر مرادآبادی نے شرکت کی تھی۔ اس سے تھوڑے ہی عرصے بعد اُن کا انتقال ہوگیا تھا۔ جگر نے اُس مشاعرے میں ایک بہت ہی مقبول غزل پڑھی تھی جس کا ایک شعر اب تک میرے ذہن میں محفوظ ہے

یہ دِن بہار کے ایسے بھی راس آنہ سکے
کہ پھول کھل تو سکے، کھل کے مُسکرا نہ سکے

مشاعرہ کنور صاحب ہی کنڈکٹ کر رہے تھے، سب جانتے ہیں کہ مشاعروں کو کنڈکٹ کرنے کا کنور مہندر سنگھ بیدی کا اپنا ہی انداز ہے۔ نومبر کے آخری دِن، آدھی رات کا سماں، چبھتی ہوئی ٹھنڈک۔ شراب پر اُن دنوں اب جیسی پابندی نہ تھی۔ لیکن نریش کمار شاد پر ہم دوستوں نے پابندی عائد کر رکھی تھی۔ اُسے صرف ایک پیگ لینے کی اجازت تھی (اگرچہ چُھپ چُھپا کر وہ تین چار پیگ مار ہی لیتا تھا)۔ شاد کا نام اناؤنس کیا تھا کنور صاحب نے۔ اس سے پہلے کہ شاد مائیک کے سامنے کھڑا ہوتا کنور صاحب نے اُس کے بارے میں اور اُس کی شاعری کے بارے میں بہت کچھ کہا۔ بڑا خوشگوار ماحول تھا۔ شاد نے یہ قطعہ پڑھا

پتی پتی گلاب ہو جاتی
ہر کلی محوِ خواب ہو جاتی
تو نے ڈالی نہ اِک نشاں نظریں
ورنہ شبنم شراب ہو جاتی

شاد کی آواز مدھم تھی۔

کنور صاحب بولے "شاد اُونچی آواز سے پڑھو بھائی۔"

نریش نے جواب دیا

" ایک پیگ پی کر تو اتنی ہی اُونچی آواز میں شعر پڑھے جا سکتے ہیں۔"

پنڈال قہقہہ زار بن گیا۔

اور پھر قتیل شفائی کا نام اناؤنس ہوا۔ دیر تک تالیاں بجتی رہیں۔ تالیوں کی گونجوں میں ہی قتیل بڑے معشوقانہ انداز میں مائیک کے سامنے بیٹھ گیا۔ کنور صاحب قتیل کی شاعری کی تعریف کر رہے تھے اور وہ نئی نویلی دلہن کی طرح شرمائے جا رہا تھا۔

اور پھر اُس نے خوبصورت انداز میں خوبصورت غزل پڑھنا شروع کی

گرمیٔ حسرتِ ناکام سے جل جاتے ہیں
ہم چراغوں کی طرح شام سے جل جاتے ہیں
شمع جس آگ میں جلتی ہے نمائش کے لئے
ہم اُسی آگ میں گمنام سے جل جاتے ہیں
جب بھی آتا ہے مرا نام ترے نام کے ساتھ
جانے کیوں لوگ مرے نام سے جل جاتے ہیں

خنک رات کے تیسرے پہر میں ہلکی ہلکی آنچ رچنے لگی تھی۔ قتیل کی شاعری اور اُسکی شخصیت میں ایک عجیب سی گرماہٹ کی کیفیت ہے۔ ایسی گرماہٹ جو دسمبر اور جنوری کے مہینوں میں آتش دان میں لکڑیاں سلگانے سے ڈرائنگ رُوم پہ بیٹھے لوگوں کو محسوس ہوتی ہے ایسی دھیمی دھیمی حرارت جو سرد موسموں میں سورج کی پہلی پہلی کرنوں سے اکیلا پنے تھوڑے رنگوں میں رچتی ہے اور ذہن میں ہلکا ہلکا سرُور سا ہلکورے لینے لگتا ہے۔ کم سے کم مجھے تو ایسا ہی محسوس ہوتا ہے قتیل کی شاعری پڑھ کر اور اُس سے میل کر اور اُس سے گفتگو کر کے۔ کیا اِن شعروں میں ایسی ہی کیفیت نہیں؟

میں لئے لئے پھرا ہوں غمِ زندگی کا لاشہ
کبھی اپنی خلوتوں میں، کبھی تیری انجمن میں
سرِ دار بھی پکارا، لبِ بام بھی صدا دی
میں کہاں کہاں نہ پہونچا، تری دید کی لگن میں

ترس ترس کے مر رہی ہیں دل ہی دل میں حسرتیں
کہ جیسے بیگماتِ سیم تن حرم سراؤں میں

ٹوٹ گئے سیّال نگینے، پھوٹ بہے رُخساروں پر
دیکھو میرا ساتھ نہ دینا، بات ہے یہ رُسوائی کی

میرے خوابوں کے شبستاں میں اُجالا نہ کرو

کہ بہت دور سویرا نظر آتا ہے مجھے

ابھی تین روز پہلے قتیل نے مجھے اپنی غزلوں کا تازہ ترین مجموعہ "پیراہن" بھیجا ہے۔ اس مجموعے کی غزلیں قتیل کی شاعری کی کچھ نئی ں کی طرف اشارہ کرتی ہیں، قتیل کی شاعری نے "ہریالی" سے لے کر "پیراہن" تک فن اور ادراک کی کتنی منزلیں طے کی ہیں اسے جاننا بھی ضروری لگتا ہے۔ اہن" کی غزلوں کے کچھ شعر سنیئے اور دیکھئے کہ اب قتیل کا فن پرواز کے کن آسمانوں میں اپنے پنکھ پھیلا رہا ہے اور اُس پر سوچ اور تفکر کی کون سی ا کھل رہی ہیں۔ "پیراہن" کا ذکر کئے بغیر میری یہ تحریر یقیناً نامکمل رہتی،

اِک اِک پتھر جوڑ کے میں نے جو دیوار بنائی ہے
جھانکوں اس کے پیچھے تو رُسوائی ہی رُسوائی ہے

سورج ہے وہ تو اُس کی پرستش ضرور کر
سایا ہے وہ تو شام کو ڈھلتا بھی دیکھ اُسے

وہ پھول ہے اور خوشبوؤں میں پلا ہُوا ہے
وہ جب کِھلا تو کئی رتوں کا بھلا ہوا ہے

جِس میں سورج کا طرف دار ہر اِک سایا ہے
میں نے اس شہر میں گھر موم کا بنوایا ہے

تمام دن جو کڑی دُھوپ میں بھی ختم نہ ہو
وہ کام شام کا پہلا ستارا کر جائے

کِس نے دی آواز مجھے اِک پیڑ کی سُوکھی ڈالی سے
شاید یہ وہ موسم ہے جو بچھڑ گیا ہریالی سے

میری اُونچائی تو میرے سر سے ہوتی ہے شروع
میرے قدمیں ڈھونڈتے ہیں لوگ میرے ناپ کو

ایک اور ملاقات !

دہلی کا سپرو ہاؤس۔ آڈیٹوریم میں مشاعرہ تھا۔ فیض اور قتیل اور ساحر تینوں موجود تھے۔ میں بھی ڈائس پر بیٹھا تھا۔ ایک طرف قتیل تھے، دوسری طرف فیض اور ساحر۔ ہم آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ کرشن دیپ نے ایک تصویر اتار لی۔ وہ تصویر بہت دنوں تک میرے پاس رہی۔ پھر جانے قتیل اور فیض اور ساحر کا کون عاشق اڑا لے گیا۔ لیکن وہ تصویر آج بھی قتیل نے اپنے ڈرائنگ روم میں لگا رکھی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب قتیل پاکستان کی فلم انڈسٹری پر آہستہ آہستہ اپنی دھاک جما رہا تھا۔ پاکستان کے بہترین گانے والے اور والیاں اس کے گیت گاتی تھیں۔ خوبصورت آواز، پیاری پیاری اور دل میں اترنے والی شاعری۔ قتیل تو نغمہ نگار سے زیادہ فلمی ہیرو بنتا جا رہا تھا۔ جو غزل اس نے سپرو ہاؤس کے مشاعرے میں پڑھی اس کے کچھ اشعار سنئے۔

انگڑائی پر انگڑائی لیتی ہے رات جدائی کی
تم کیا سمجھو تم کیا جانو بات مری تنہائی کی
کون سیاہی گھول رہا ہے وقت کے بہتے دریا میں
میں نے آنکھ جھکی دیکھی ہے آج کسی ہرجائی کی
وصل کی رات نجانے کیوں اصرار تھا ان کو جانے پر
وقت سے پہلے ڈوب گئے تاروں نے بڑی دانائی کی
اڑتے اڑتے آس کا پنچھی دور افق میں ڈوب گیا
روتے روتے بیٹھ گئی آواز کسی سودائی کی

جتنے دن قتیل دہلی میں رہا بے حد مصروف رہا۔ ہر شام کوئی نہ کوئی محفل سجتی۔ کبھی کسی کلب میں۔ کبھی کسی انجمن کے اہتمام میں۔ کبھی شمع کے یونس صاحب، کبھی بیسویں صدی کے خوشتر گرامی اور کبھی دوستوں کے چھوٹے چھوٹے گروپ۔ قتیل سب کا محبوب تھا۔ افسروں کا بھی۔ سیاستدانوں کا بھی۔ ادیبوں کا بھی۔ دوستوں کا بھی۔

پچھلے برس جب قتیل ہندوستان آیا تو بہت دنوں بمبئی میں رہا۔ صابر دت نے مجھے خطوں میں قتیل کی مصروفیات کی تفصیلات لکھیں تو جی خوش ہوا۔ اب قتیل ایک طرح سے فلمی شاعر ہو گیا ہے۔ مزاج سے نہیں ویسے ہی۔ مزاج سے تو وہ پتھر ہے جو اب تک ٹمک کے دریا کے چٹانوں سے ٹکراتے ہوئے پانی میں پازیب کی آواز سنتا ہے اور ستاروں سے گفتگو کرتا ہے اور چاند کی پرچھائیوں میں گاؤں کی دوشیزاؤں کو کھیتوں کی منڈیروں پر گھومتے دیکھتا ہے اپنے محبوب کو ملنے جاتے ہوئے۔ قتیل بنیادی طور پر کچھ بھی بن جائے لیکن ذہنی طور پر وہ وہی البیلا موسموں کا شاعر ہے جو کہتا ہے۔

جب بھی چاند سے پگھلی ہوئی چاندی برسی — اونگھتی رات کے شانے کو جھنجھوڑا ہم نے
کھول کر بھی کبھی پلکیں نہ جھپکنے پائیں — اس قدر نیند کو آنکھوں سے پچھاڑا ہم نے

قتیل سے میری یہی مانگ ہے کہ وہ رہتا رہے جو کہ وہ ہے۔ فلموں کے لئے گانے لکھتے ہوئے وہ دوسرے شاعروں کی طرح فلمی مصرعوں کی ٹکسال نہ بن جائے۔ اس کے قلم کی نوک سے چاند اور ستارے تشکیل پائیں۔ صرف فلمی گانوں کے مکھڑے نہیں۔ جن کی چمک کبھی بھی ماند پڑ سکے۔

ڈرامے کا آدمی

اشفاق احمد۔ لاہور۔ پاکستان

اندر مردانہ اور نسوانی آواز کے قہقہے ہوں اور باہر دستک دینے والے کو کہا جاتے "وہ گھر پر نہیں ہیں"
جس خاتون پر بھری محفل میں راز کی بات نظم کے پیرائے میں پڑھی جائے اور اس کے استفسار پر کہا جاتے۔" وہ آپ نہیں ہیں محترمہ، آپ بُرا کیوں مان گئیں۔"

اور پھر ایسے ہی کسی اور لمحے میں پشیمان اور EMBARRESED بیگم صاحب جب نام پوچھیں اور شاعر کہے" نام کیا پوچھتی ہیں۔ نام میں کیا رکھا ہے۔ میں تو گمنام سا ایک شخص ہوں بیگم صاحب۔"

یہ سارے نام "ڈرامائی" ہیں۔ ان سب میں خطرے کی گھنٹی بجتی ہے۔ چھپے ہوتے الیتے سائرن بجاتے ہیں اور اگر بیک پروجیکشن سے کام لیا جا سکے تو لمبی چوڑی CONFLICT کہانی کے روپ میں نظم کے پیچھے پھیل نظر آتی ہے۔

دراصل قتیل شفائی "ڈرامے" کا آدمی ہے اگر تھیئٹر کا زمانہ ہوتا تو وہ آغا حشر کے جیسے "ڈرامے لکھتا جن میں اس کی شاعری کو بھی جگہ ملتی، نظم آمیز نثر کو بھی اور پلاٹ کے جوہر بھی کھلتے۔ ہر وقت ESCALATOR کی طرح ہے۔ کچھ لوگ کسی اور عہد سے تعلق رکھتے ہیں، کسی اور قسم کی روایات اور ماحولیات میں زندہ رہتے ہیں۔ وہ اپنی حد سے ہلتے بھی نہیں پھر بھی وقت کا ESCALATOR انھیں اوپر کی طرف اٹھائے لئے جاتا ہے۔ میں مانتا ہوں کہ قتیل شفائی کی سوچ میں موسیقی ہے، شاعری ہے، پرانی روایت ہے لیکن بنیادی بات یہ ہے کہ وہ "ڈرامے کا آدمی ہے اور تھیئٹر" سے بچھڑ کر وقت کے ESCALATOR پر سوار فلمی دنیا میں چلا گیا ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ جو شہرت اسے فلمی گیتوں سے نصیب ہوئی ہے اس کے بنیادی ضمیر کی وجہ سے جس کا اصل تعلق تمثیل اور تماثیل سے ہے۔

قتیل کی تقریباً ہر نظم ایک مکالمہ ہے یا خود کلامی ہے یا حدیث نفس ہے۔ چاہے وہ کسی دوسرے کو قائل کرنے کے لئے بات کرے یا اپنے اندر سوئے ہوئے درندوں کو گہری نیند سلانے کے لئے انھیں کہانی سنائے اس کی لوری قصہ ہے، خالہ شباب کی رخصتی پر دل ہی دل میں نصیحتیں کرتی ہوں یا دروازے کے پیچھے سے ناتواں ارے کنیز کو خاموش رہو سنتا ہو، اس کی شاعری کے اندر باتوں کے پس منظر میں اور باتیں بھی ہیں۔ "ڈرامائی انداز ہیں، "ڈرامائی لمحوں میں کبھی کبھی

یہ گفتگو قتیل کی نظم کا ایک اہم حصہ نہیں ہوتی۔ آپ کے ساتھ بھی یہ واقعہ گزرا ہوگا۔ کبھی اگر آپ ٹیلی ویژن کی آواز بند کرکے صرف تصویر دیکھنے لگیں تو احساس ہے۔ بانی یں اور جاذبیت پیدا ہوتی ہے اور مفہوم مختلف رنگ بدلنے لگتا ہے۔ اس طرح کبھی کبھی قتیل کی نظم میں مکالمہ بند ہوجاتا ہے لیکن گفتگو کا نقش اور گہرا ہونے لگتا ہے۔

ڈرامہ کبھی سماج کے بغیر پیدا نہیں ہوتا۔ شاعری تو پتھروں، ہواؤں، بادلوں، دریاؤں سے پیدا ہوسکتی ہے، لیکن ڈرامے کے لئے معاشرہ درکار ہوتا ہے۔ سر پھوڑنے والی لہریں، لہروں کے آگے لوہے اور کنکریٹ کے بند لہروں کو پھینٹنے والی مشینیں اور لہروں کو دم بخت کرکے بجلی نکلنے والے ٹربائن۔ آزاد انسان جو شل لہروں کے ہے معاشرے کے کنکریٹ سے ٹکرا کر گھومتا کا آمد تو بن جاتا ہے اس میں سے بجلی تو نکل آتی ہے، قمقمے تو جل اٹھتے ہیں لیکن ان کے اندر کا غنا ختم ہوجاتا ہے۔ اس کا ردم ٹوٹ جاتا ہے جس وقت یہ ردم ٹوٹتا ہے اسی وقت ڈرامہ پیدا ہوتا ہے۔ نثری ڈرامے میں اور قتیل شفائی کی ڈرامائی نظموں میں صرف فرق یہ ہے کہ قتیل کے ڈرامے میں غنا باقی رہتا ہے۔ لہروں کا ردم نہیں ٹوٹتا۔ گرداب بھنور رہتے ہیں پھر ہولے ہولے لہریں دور تک پھیلتی ہیں اور سطح ہموار ہوجاتی ہے۔ پرسکون، عمیق، گمبھیر اور زخار سطح۔

قتیل کی نظموں میں معاشرہ، معاشرہ کا دباؤ، بے کلی اور ٹریجڈی سب موجود ہے۔ بس مراجع "ضمیر" اور "جھیل کا بھنور" اور ایسی کئی نظمیں ہیں جن میں بڑے CONFLICT کی باتیں ہیں۔ اور دوسرے مضمون میں جب کبھی معاشرے کی بات آجائے تو یہ انسان سے علیحدہ کوئی پنجرہ، کوئی قید خانہ نظر آتا ہے جس میں انسان کو رسم ورواج کی زنجیر سے باندھ کر تاڑ کر اور بند کرکے رکھا جاتا ہے۔ معاشرے کی حیثیت گذائی جو انسانوں کی آویزش اور آمیزش سے پیدا ہوتی ہے اس کی صورت نظر کہیں نہیں آتی۔ جس معاشرے کی تصویریں قتیل کھینچتا ہے وہ رسم ورواج کے بندی خانے کی باتیں نہیں ہیں بلکہ انسانوں کے تال میل سے ان کی وفا اور بیوفائی کی خودغرضی اور انا پرستی سے پیدا ہونے والی گانٹھیں ہیں۔ قتیل کو یہ بھی شوق نہیں کہ وہ ہر ڈرامے کا ڈراپ سین بنائے۔ منطقی یا غیر منطقی طور پر المیہ یا طربیہ انجام کا فل اسٹاپ لگائے۔ وہ مکمل طور پر شاعر ہے، زندگی کی طرح کسی ڈرامے کا انجام نہیں، کسی نظم کا کوئی مقطع نہیں۔ قتیل بھی اپنی نظم ختم کرکے تو آپ کو دعوت دیتا ہے کہ باقی مضمون آپ اپنی طبع کے سیاق میں شامل کرلیں مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ وہ شاعر ہے، مکمل سوال ہے، تحیر ہے، وہ جس طرح سورج غروب، چودھویں رات کے چاند اور لہروں سے نکلی سیپی دیکھ کر حیران ہوتا ہے اس طرح انسانی رابطوں سے بنوں کی گرم بازاری سے دل کی بدلتی کیفیتوں سے سراسیمہ ہے جس طرح کسی بچے کو نئے نئے کنچے ملتے ہیں تو وہ بار بار ان مدور شیشوں کو ہتھیلی پر رکھ کر اندر بل کھاتے ہوئے رنگ دیکھتا ہے اس پر ان رنگوں کا سحر اور بھید نہیں کھلتا۔

قتیل کے پاس بھی کچھ کنچے ہیں جو اسے جان و دل سے عزیز ہیں لیکن ایک کنچا جس میں عورت کی شبیہہ کئی رنگوں میں ہے جو ہر رُت میں بدلتی ہے اور جس میں صبح و شام کا انوکھا اثر ہوتا ہے۔ یہ کنچہ قتیل کی جان ہے۔ شاعر لوگ کبھی کسی پہ دل وجان سے فدا نہیں ہوتے۔ ان کے اندر فینٹسی اور DREAM FIGURE ہوتے ہیں یہی فرق ہے کہ شاعر اپنے DREAM FIGURE کا پجاری رہتا ہے اور عاشق اپنے محبوب چن لینے کے بعد اس کے در سے نہیں ہلتا۔ شاعر انسانوں میں اپنی فینٹسی کا روپ تلاش کرتا ہے اس لئے اسے بار بار تلاش کرنی پڑتی ہے۔ بار بار وہ شکست سے ناآشنا ہوتا ہے۔ انسان کا قد، روپ، سیرت، عادات تو فیتے سے ناپی جاسکتی ہے لیکن DREAM FIGURE کنچے میں بل کھانے والی عورت کی طرح جام جمشید کی طرح دنیا سے ملا ہوا اور کٹا ہوا ہوتا ہے۔ اس لئے عاشق دکھ جھیلتا ہے۔ زہر کا پیالہ پیتا ہے لیکن اپنی جگہ سے نہیں ہلتا کیونکہ وہ گوشت پوست کے بنے ہوئے انسان سے محبت کرتا ہے۔ شاعر دکھ جھیلتا ہے زہر کا پیالہ پیتا ہے اور ریگستان میں آوارہ پھرنے والی ریت کی طرح دور نزدیک سائیں سائیں کرتا رہتا ہے

کہ اس کے خواب ہوا میں گرد ریت اڑاتے ہیں ۔

بات قتیل کی ہو رہی تھی ۔ قتیل کو میں نے کہا وہ عاشق ہے حالانکہ اس کی بنیادی خصوصیات شاعر کی ہیں ۔ اسے عورتوں کی باتیں مرغوب ہیں ۔ اپنے کنبے سے بہت پیار ہے لیکن اس کے کوچے میں رنگ نہیں ٹھہرتے ۔ اس کا خیال ہے کہ کوئی عورت اسے جموں کے بھنور سے نکال لے جائے گی، تنہائی کی آگ سے نجات دلائے گی ۔ وہ آم کے پیڑ تو لگاتا ہے لیکن کسی پھل پر اس کی مہر نہیں لگتی وہ عورت کی بے وفائی کا رونا روتا ہے اور آخر میں دل برداشتہ ہو کر ایسی نظم لکھتا ہے ـــ "یونہی روتی رہو ـــ" عورت سے محبت کی یہ آخری حد ہے جہاں مرد عورت کے نقطۂ نظر سے دیکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اور رانجھا رانجھا کرتے آپ رانجھا ہو جاتا ہے لیکن اس تمام تر محبت کے باوجود وفا کی آرزو اور بے وفائی سے نفرت کے بعد صرف قتیل عورت سے محبت کرنے کی کیفیات بیان کر کے ہلکا پھلکا سا ہو جاتا ہے ۔ بات فینٹسی سے شروع ہو کر نظم میں منتقل ہو جاتی ہے ۔ کینچا رنگ بدلتا ہے، قتیل تغیر کی زد میں آجاتا ہے ۔ یہ نظمیں بنتی ہیں اور بنتی رہتی ہیں ۔ لوگ داد دیتے رہتے ہیں ۔ کتابیں چھپتی رہتی ہیں ۔

ہر کتاب کے چھپنے کے بعد، ہر نظم لکھ لینے کے بعد قتیل درماندہ ہو جاتا ہے ۔ تھک جاتا ہے اور سوچتا ہے ۔

کنبے میں رہنے والی عورت ہمیشہ ایک سی کیوں نہیں رہتی ؟ رنگ کیوں بدلتا ہے ؟ میں ہمیشہ نئی نظمیں کیوں لکھتا ہوں، پرانی نظم پر کیوں اکتفا نہیں کرتا ؟ کیا میں ہمیشہ شاعر رہوں گا ؟ کیا انسانی تعلقات کا کوئی تت نہیں نکل سکے گا ؟ کیا سب کچھ ہو چکنے کے بعد بھی یہ ہوتا رہے گا ؟

قتیل

اچھا شاعر ۔ اچھا دوست ۔ بہت بُرا دشمن

ڈاکٹر وحید قریشی

قتیلِ شفائی

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

قتیل شفائی میرا عزیز دوست نہیں محبوب دوست ہے اور محبوب دوست کے بارے میں لکھنا آسان نہیں ہوتا۔ ایک طرح سے اِس میں آسانی کا پہلو یہ ہوتا ہے کہ لذتِ حضوری کے باعث داستان طویل سے طویل تر ہوتی چلی جاتی ہے لیکن مُشکل اِس اعتبار سے پیدا ہوتی ہے کہ قاری کو کہیں یہ احساس نہ ہو کہ اِس تحریر کی بنیاد محض دوستی ہے اَور بس۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ لکھنے والا اپنی طبیعت اَور اپنے مزاج سے مجبور ہو کر لکھتا ہے۔ تنقید اَور تحقیق کی بات دوسری ہے لیکن شاعر، افسانہ نگار اَور کردار نگار کا تخلیقی عمل تو غالب کے اس شعر کی تفسیر اَور تصویر ہوتا ہے

ما نہ بودیم بدیں مرتبہ راضی غالب
شعر خود خواہشِ آں کرد کہ گردد فنِ ما

اِسی "شعر خود خواہشِ آں کرد" کے مصداق میں نے قتیل کے متعلق ایک بار نہیں کئی بار لکھا ہے۔ میری سوانح حیات "باتیں ہماری یاد رہیں" کے اوراق جگہ جگہ قتیل کے ذکر سے روشن ہیں۔ میرے سفرنامے کئی موقعوں پر قتیل کے نام اَور کلام سے جگمگا رہے ہیں۔

مجھے جب مدیر "فن اَور شخصیت" نے لکھا کہ میں "فن اَور شخصیت" کے قتیل شفائی نمبر کے لیے کچھ لکھ کے اُنھیں بھیجوں تو میرا پہلا ردِ عمل یہ تھا کہ اپنے غیر مطبوعہ سوانح حیات میں سے وُہ اوراق نقل کر کے اُنھیں بھیج دوں جن میں قتیل کا ذکرِ جمیل موجود ہے۔ لیکن قیامِ جموں کی مصروفیات نے اِس بات کی مہلت نہ دی اَور آج جب کہ میں ایک دن کے لیے پرتاب گڑھ میں ہوں ——— اپنے دوست مازش پرتاپ گڑھی کے مجموعۂ کلام "دُردِ تہِ جام" کی رسمِ اجرا کے سلسلے میں ——— اَور محبِّ گرامی قدر افتخار علی جعفری کے دولت کدے پر سفر کی تکان اُتارنے کے نام پر اپنے کمرے میں محوِ آرام ہوں میرا جی چاہتا ہے کہ قتیل شفائی کی باتیں کروں، اپنے ساتھ، مدیر "فن و شخصیت" کے ساتھ اَور "فن و شخصیت" کے قارئین کے ساتھ۔

قتیل شفائی کے ساتھ میری اولین ملاقات کو آج چوالیس سال ہو رہے ہیں۔ یہ مُلاقات راولپنڈی میں ہُوئی۔ میں بی۔ اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد ایم۔ اے میں داخلہ لینے کے لیے لاہور آیا۔ داخلہ تو اُس سال نہیں لیا۔ لاہور میں پھرتا پھراتا رہا اَور پہلے "ملاپ" میں ملازمت کر لی اَور پھر "ٹریبیون" میں اسسٹنٹ ایڈیٹر بن گیا ——— اَور اِس خیال سے کہ داخلہ لینے پھر آؤں گا چند روز کے لیے میں راولپنڈی واپس گیا۔ میری آمد پر عبدالعزیز

فطرت مرحوم نے گارڈن کالج راولپنڈی میں ایک ادبی نشست کا اہتمام کیا۔ یہ فطرت صاحب کی محبت تھی جنھیں میں ہمیشہ اپنا بڑا بھائی سمجھتا تھا کہ میری آمد پر انھوں نے ایک ادبی نشست کا انتظام کیا ورنہ میں کیا اور میری بساط کیا اور بالخصوص آج سے چوالیس سال قبل۔ فطرت صاحب کے ساتھ میرا ایک رشتہ یہ بھی تھا کہ ہم دونوں نے مل کر ۱۹۳۳ء میں راولپنڈی میں انجمن ترقی اردو کی شاخ قائم کی تھی اور اس شاخ نے ۱۹۳۸ء میں اس وسیع پیمانے پر یوم اقبال منایا تھا کہ سارے برصغیر میں لاہور اور حیدرآباد کے بعد تیسرے نمبر پر اسی راولپنڈی کا یوم اقبال تھا۔

تو گارڈن کالج کی اس نشست میں اس وقت راولپنڈی کے تمام اہم شعرا شریک ہوئے مثلاً میرے والدِ محترم جناب محروم، حضرت حاجی سرحدی، جناب عبدالحمید عدم، آغا صدیق حسن ضیا، جناب فضل الرحمٰن اشک، جناب عطاء اللہ کلیم جناب اظہر امرتسری اور جناب عبدالعزیز فطرت۔ ان تمام شعرا میں سے کوئی نام میرے لیے نیا نہیں تھا لیکن اس فہرست میں ایک نیا نام بھی شامل تھا اور وہ نام تھا قتیل شفائی کا۔ اس محفل میں صرف قتیل شفائی ہی عمر میں مجھ سے جونیئر تھے۔ اور جب انھوں نے اپنی غزل پڑھی تو سماں بندھ گیا۔ غزل کی تازگی اور برنائی اور قتیل کا لحنِ داؤدی، ان دونوں نے مل کر ایک عجیب و غریب کیفیت پیدا کر دی۔ اگر میں اس وقت غلطی نہیں کرتا تو غالباً قتیل شفائی نے یہ غزل پڑھی تھی

کب تک فضا میں رنگ بکھیرا کرو گے تم　　　کیا مستقل افق پہ بسیرا کرو گے تم
اے دل کے دولو شبِ وعدہ قریب ہے　　　تا زندگی سویرا سویرا کرو گے تم

اُس وقت قتیل کی شخصیت نے مجھے بے حد متاثر کیا اور اس نشست کے بعد ہم بہت دیر گارڈن کالج کے لان پر بیٹھ کے آپس میں باتیں کرتے رہے۔ اسی ملاقات میں قتیل نے مجھے بتایا کہ انھوں نے لاہور نہیں دیکھا اور وہ لاہور آنے کے خواہش مند ہیں۔ وہاں آ کر وہ دل سُکھ پنچولی سے ملنا چاہتے ہیں کیونکہ فلم سے انھیں دلچسپی ہے اور وہ فلم میں کام کرنے کے آرزو مند ہیں۔

قتیل اس وقت غالباً ہری پور ہزارہ کی میونسپل کمیٹی میں ملازم تھے اور میں "ٹریبیون" لاہور میں پچیس روپے ماہانہ پر اسٹرنگر تھا۔ اب ٹریبیون کا ایک اسٹرنگر کسی شاعر یا ادیب کو لاہور آنے کی کیا دعوت دے سکتا تھا لیکن خدا کا کرنا کیا ہوا کہ مجھے چند روز بعد تحریکِ رفاقت میں ملازمت مل گئی۔ اگرچہ ضابطے کی رُو سے میں مولوی ابراہیم علی چشتی سیکرٹری تحریکِ رفاقت کا پی۔ اے تھا لیکن ادبی معاملات میں اُن کا مشیر تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ میرے مشورے کی زیادہ پروا نہیں کرتے تھے تاہم بعض دفعہ میرا مشورہ قبول کر بھی لیتے تھے۔ ہم لوگوں کا یا ہماری تحریکِ رفاقت کا کام یہ تھا کہ ہم پنجاب بھر میں ہندو مسلم رفاقت (ہندو مسلم اتحاد نہیں ——— مولوی صاحب اس نکتے پر خاص زور دیا کرتے تھے) کی تلقین کیا کرتے تھے۔ ہمارا پروگرام "حسن اصولوں" پر مبنی تھا وہ یہ تھے کہ مذہبی اور سیاسی امور میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں باہمی اشتراکِ عمل ممکن نہیں لیکن سماجی اور اصلاحی امور میں ممکن ہے۔ درحقیقت یہ تحریک پنجاب کی یونینسٹ حکومت کا چھیڑا ہوا ایک شوشہ تھا۔ اس سے نہ کانگرس کو دلچسپی تھی اور نہ مسلم لیگ کو کیونکہ اس کے اصول خاصے کھوکھلے اور لایعنی قسم کے تھے اور یہ دراصل حکومت پنجاب ہی کا ایک دفتر تھا۔ تحریک در تحریک نہیں تھی۔ اور ایک بار جب قائد اعظم محمد علی جناح نے لاہور میں آ کے یہ کہہ دیا کہ یہ تحریک یونینسٹ پارٹی کی تحریک ہے، مسلم لیگ اس کے خلاف ہے اور مسلمانوں کو اس سے دور رہنا چاہیے تو ہمیں اپنے جلسوں میں نظم پڑھنے کے لیے نہ کوئی قابلِ ذکر مسلمان شاعر ملتا تھا اور نہ ہی کوئی قابلِ ذکر مسلمان مقرر۔ لیکن یہ صورتِ حال بہت بعد میں جا کے پیدا ہوئی۔ شروع میں یہ بات نہیں تھی اور مولانا ظفر علی خان، حمید نظامی، مولانا محمد بخش مسلم اور شیر محمد پاکستانی ایسے مسلم لیگی زعما ہمارے جلسوں میں شریک ہوتے تھے اور مش ایسے صحافیوں کا ہمیں تعاون حاصل تھا۔

اِس وقت میں تحریک کے اسی ابتدائی زمانے کی بات کر رہا ہوں۔ قتیل سے ملاقات میری ہو چکی تھی۔ ان کے کلام سے میں راولپنڈی میں لذت اندوز ہو چکا تھا اور اس وقت تک "ادبِ لطیف" میں ان کا کلام شائع ہو کر ادبی حلقوں سے خراجِ تحسین وصول کرنے لگ گیا تھا۔ انھی دنوں میں ہم لوگوں نے تحریکِ رفاقت کی جانب سے ملتان میں ایک مشاعرہ منعقد کرنے کا پروگرام بنایا۔ اِس مشاعرے کے لیے میں نے چند اَور ناموں کے ساتھ قتیل کا نام * تجویز کیا۔ مولوی صاحب کہنے لگے میں نے یہ نام کبھی نہیں سُنا۔ اب مولوی صاحب کو کسی ایسی بات کا قائل کرنا جس کے متعلق اُن کی واقفیت نہ ہو بڑا مشکل کام تھا۔ وُہ اپنی دُھن کے بہت پکے تھے۔ ابوالاثر حفیظ جالندھری کو اُنھوں نے کسی مشاعرے میں شرکت کی دعوت نہیں دی اَور اِس کی وجہ ان کے الفاظ میں یہ تھی کہ "حفیظ پڑھتا اچھا نہیں ہے"۔ اب اِس بات سے اُن کے مزاج کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے اَور شعر و شاعری یا شاعروں کے متعلق اُن کی سوجھ بوجھ کا بھی۔ بہرطور میرے اصرار پر اُنھوں نے قتیل کا نام فہرست میں شامل کر لیا اَور چونکہ وُہ فہرست انگریزی میں مرتب کر رہے تھے اُنھوں نے قتیل کا نام یوں لکھا Qatil۔ اور چند روز بعد جب شعراء کو دعوت نامے بھیجنے کا وقت آیا تو اُنھوں نے مجھے بُلا کر پوچھا کہ یہ قاتل کون ہے اَور اِس کا نام فہرست میں کیسے شامل ہو گیا ہے۔ میں نے کہا کہ اِس وقت تک تو یہ قتیل ہے لیکن مشاعرے میں قاتل ہی نظر آئے گا۔ مولوی صاحب میرا یہ جُملہ سن کر ہنس پڑے۔ اَور "بہتر" "بہتر"، کہہ کر اس نام پر ٹِک مارک کر دیا۔

اُسی شام کو اتفاق سے پنڈت ہری چند اختر سے ملاقات ہوئی۔ وُہ ایک آدھ دن کے لیے دہلی سے لاہور آئے ہُوئے تھے۔ ملتان میں مشاعرے کے انعقاد اَور مولوی صاحب کے ساتھ بات چیت کی ساری روداد میں نے اُنھیں کہہ سنائی۔ اُنھوں نے اِس بات کا پورا لطف لیا کہ "حفیظ پڑھتا اچھا نہیں ہے (اَور یہ فقرہ لاہور کے ادبی حلقوں بالخصوص ادبی دنیا کے دفتر میں مدتوں گونجتا رہا) ساتھ ہی میں نے قتیل شفائی اَور قاتل والا واقعہ بھی سنایا اَور اُنھیں بتایا کہ میں قتیل کو آج یا کل دعوت نامہ بھیج رہا ہوں۔ اُنھوں نے کہا قتیل کو یہ لکھ دو کہ اب لاہور کے ساتھ ملتان بھی دیکھو۔ اِسے کہتے ہیں ایک ٹکٹ میں دو مزے۔ میں نے کہا پنڈت جی، قتیل کو سب سے زیادہ خوشی تو اس بات کی ہوگی کہ وُہ اَور میں دونوں اکٹھے ملتان کا سفر کر رہے ہیں۔ پنڈت جی بولے تو پھر لکھ دو ایک ٹکٹ میں تین مزے لیکن ایسا ٹکٹ کوئی ہوتا نہیں ہے۔

چنانچہ میں نے قتیل کو دوسرے دن دعوت نامہ بھیج دیا اَور اس میں پنڈت ہری چند اختر کے کہے ہوئے تمام الفاظ دہرا دیے

قتیل پہلے تو لاہور آئے۔ یہاں تمام نئے پُرانے دوستوں سے ملے۔ "ادبِ لطیف" کے دفتر میں گئے تو چودھری نذیر احمد نے اِس کی ادارت کی پیش کش اُنھیں کر دی۔ بہرطور اُن کی دوسری منزلِ ملتان تھی۔ یہ سفر ہم دونوں نے اکٹھا کیا۔ قتیل صرف خوش گو اَور خوش آواز ہی نہیں ہیں، خوش گِل بھی ہیں اَور غالباً یہ اسی تیسری خاصیت کا اعجاز تھا کہ ریل ہی میں ایک نو بیاہتا عورت بلکہ لڑکی جو اپنے شوہر کے ساتھ سفر کر رہی تھی ان پر عاشق ہو گئی اَور اُس نے کھُلم کھُلا ان کو پیش کش کر دی کہ مجھے اغوا کر کے لے جاؤ۔ میں چونکہ اِس سارے واقعے کی تفصیل اپنی سوانح حیات "باتیں ہماری یاد رہیں" میں بیان کر چکا ہوں اِس لیے اسے یہاں دہراؤں گا نہیں بلکہ صرف یہی کہنے پر اکتفا کروں گا کہ عورتوں اور لڑکیوں میں قتیل کی محبوبیت کا آج بھی وہی عالم ہے جو آج سے چوالیس برس قبل تھا۔

قتیل نے ملتان میں مشاعرہ لُوٹ لیا۔ نہ جانے اُنھوں نے سامعین کی فرمائش پر اپنی کتنی نظمیں اور غزلیں سنائیں لیکن چونکہ ہمارے مولوی صاحب اِس مشاعرے میں موجود نہیں تھے اس لیے ان کو یقین دلانا مشکل تھا کہ ہمارا مشاعرہ قتیل شفائی کی بدولت کتنی بلندیوں پر پہنچ گیا تھا۔

ادبِ لطیف" کی ادارت قتیل کو لاہور لے آئی۔ میں تو پہلے ہی سے وہیں تھا۔ قتیل نے پنچولی فلمز پروڈکشن کے لیے گانے لکھنا بھی شروع کر دیے۔ ایک بار قتیل سے میں نے کہا یار یہ فلم کیسے بنتی ہے۔ کبھی مجھے بھی پنچولی فلمز پروڈکشن کا اسٹوڈیوز دکھاؤ لیکن اُس وقت جب وہاں شوٹنگ ہو رہی ہو۔ قتیل نے کہا یہ کون سی مشکل بات ہے۔ میں ایسا انتظام کروں گا کہ فلم میں تمھاری تصویر بھی آجائے گی۔ میں نے کہا مجھے بیوقوف نہ بناؤ۔ یہ ایکٹنگ ویکٹنگ مجھ سے نہیں ہوگی۔ "ہرن پر لادی جاتی ہے کہیں گھاس ؟" کہنے لگا تمھیں ایکٹنگ نہیں کرنا ہوگی اور فلم میں ایکٹنگ کرنا کوئی آسان کام تھوڑا ہی ہے۔ ایک مغنیہ (شاید اُس کا نام منور ما تھا) ایک محفل میں گانا گائے گی اور اُس محفل میں تمھیں میں سامعین کی پہلی صف میں بٹھا دوں گا۔ بات مجھے پسند آئی۔ چنانچہ تاریخ مقررہ اور وقتِ مقررہ پر میں قتیل کے ہمراہ اسٹوڈیوز میں جا پہنچا۔ غالباً میرے ساتھ کیف عرفانی بھی تھا (یا قمر جلال آبادی کا بھائی گلشن جلال آبادی)۔ اب ٹھیک سے یاد نہیں آرہا لیکن ان دونوں میں ایک دوست ساتھ تھا۔ پہلے تو ہم دونوں میک اپ روم میں لے جائے گئے۔ وہاں ہمارا میک اپ ہُوا جس کے بعد قتیل نے ہمیں اسٹوڈیوز میں لے جا کر اُس محفلِ سامعین کی صفِ اول میں بٹھا دیا جو وہاں پہلے سے جمی ہُوئی تھی۔ اب وُہ ایکٹرس اسٹیج پر آئی اور سازوں کے ساتھ گیت کا پہلا مصرع اُس نے گایا۔ تلفظ یکسر غلط۔ اب ڈائرکٹر صاحب نے اِس مغنیہ کا تلفظ صحیح کرانا شروع کیا لیکن ہر بار وُہ غلط مصرع پڑھ دیتی تھی۔ اِس میں پورا ایک گھنٹہ گذر گیا اور فلم کا آدھا انچ بھی ریکارڈ نہ ہو سکا۔ ایک گھنٹے تک اِس بوریت کو برداشت کرنا ایک عذاب سے کم نہیں تھا۔ لیکن قتیل اِس نظارے میں مگن تھا۔ اُسے یہ احساس ہی نہیں تھا کہ اِس ایک مصرعے کو صحیح کرنے کی کوشش ناکام میں ایک گھنٹہ گزر چکا ہے۔ لیکن ہمارے لیے صبر اب دُشوار تھا۔ چنانچہ ہم دونوں (میں اور کیف عرفانی) اپنی کرسیوں سے اُٹھے اور قتیل سے جا کے ہم نے کہا یار ہم اِس شوٹنگ سے باز آئے۔ ہمیں نجات دلاؤ۔ قتیل نے بہت کہا کہ بس اب تھوڑی دیر میں یہ تلفظ ٹھیک ہو جائیگا اور شوٹنگ شروع ہو جائے گی لیکن ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ ہم نے کہا یار ہمیں معاف کرو، ہمارا مُنہ دھلواؤ تاکہ ہم باہر جانے کے قابل ہو سکیں۔ اسکے بعد پنچولی فلمز، ہم وطن لاہور میں چلتی رہی اور قتیل بھی اسی کے ساتھ وابستہ رہا۔ لیکن کبھی ان کے اسٹوڈیو کا رخ نہ کیا

مجھے اس وقت یاد نہیں آرہا کہ آل انڈیا ریڈیو کب قائم ہُوا اور لاہور میں ریڈیو اسٹیشن کب کھُلا لیکن اتنا یاد ہے کہ لاہور میں ریڈیو اسٹیشن کھُلنے سے قبل فلپس والوں نے وائی ایم سی اے لاہور میں ایک تجرباتی اسٹیشن قائم کیا تھا۔ اِس اسٹیشن کے پروگراموں کی ابتداء مشاعرے سے ہوئی۔ اس مشاعرے میں قتیل اور میں دونوں نے اپنا اپنا کلام پڑھا۔ دس دس روپے دونوں کو فیس ملی۔ ہم سے سینئر شعراء بھی اِس مشاعرے میں شریک تھے معلوم نہیں اُنھیں کیا فیس ملی تھی لیکن مجھے اتنا معلوم ہے کہ وقار انبالوی کو بھی دس روپے ہی کا چیک ملا تھا جس کی پشت پر اُنھوں نے یہ مصرع لکھ کر فلپس والوں کو واپس دے دیا تھا

شکرِ نعمت ہائے تو چنداں کہ نعمت ہائے تو

مجھے جب اُنھوں نے یہ چیک اِس مصرعے کے ساتھ دکھایا تو میں نے کہا وقار صاحب' آپ نے ضرورت سے زیادہ ہی مہذب ہونے کا مظاہرہ کیا ہے۔ آپ کو یہ لکھنا چاہیے تھا ـــــ عطائے تو بہ لقائے تو ـــــ وقار کہنے لگے بھئی پہلے کیوں نہیں بتایا۔ اب پہلا مصرع کاٹ کے یہ عبارت لکھنا تو اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ تم یہ الفاظ اپنے چیک پر لکھ کر چیک واپس کر دو لیکن میں وقار صاحب سے محض داد پانے کی خاطر دس روپے ضائع کرنے پر آمادہ نہ ہُوا۔

اُس زمانے میں قتیل اور میں اکثر آپس میں ملتے تھے اور ایک دوسرے کو اپنی غزلیں سنایا کرتے تھے کبھی کبھار ایک دوسرے کو مشورہ بھی دے دیا کرتے تھے چاہے وہ دوسرے کو قبول ہو یا نہ ہو۔ اُسی زمانے میں ایک گیت نما نظم میں نے کہی تھی

*

باغ یہ کس نے جادو پھیرا
پھولوں کو نیند آئی

قتیل نے یہ شعر سنتے ہی کہا کہ "جادو پھیرا" تو غلط ہے "جادو کا ڈنڈا پھیرا" ہونا چاہیے۔ اب "جادو پھیرا" صحیح ہو یا غلط یہ اصلاح ہمارے قہقہوں کی نذر ہو گئی

ایک بار قتیل کو میں نے اپنی غزل سنائی جس کا یہ شعر انھیں بہت پسند آیا

تہذیبِ کہنہ میری شرافت پہ ناز کر
دھوکا دیا ہے دوست نے شرما رہا ہوں میں

یہ غزل "شاہکار" لاہور میں چھپی۔ اکثر دوستوں نے اس کی تعریف کی۔ کچھ مدت بعد میں جوش ملیح آبادی کا ایک مجموعۂ کلام پڑھ رہا تھا اس میں یہ شعر نظر آیا

کوئی حد بھی ہے آخر احترامِ آدمیت کی
بدی کرتا ہے دشمن اور ہم شرمائے جاتے ہیں

اس کے بعد جو قتیل سے ملاقات ہوئی تو میں نے کہا یار غضب ہو گیا۔ جوش صاحب کے یہاں اسی مضمون کا شعر موجود ہے اور جب میں نے شعر سنایا تو قتیل نے کہا نہیں تمہارا شعر مختلف ہے۔ جوش نے دشمن کی بات کی تم نے دوست کا ذکر کیا ہے۔ تم یہ شعر اپنی غزل سے خارج نہ کرو۔ اب میں قتیل سے مشورہ نہ کرتا تو شاید غزل سے یہ شعر خارج کر دیتا لیکن قتیل سے مشورے کی بنا پر میں نے یہ شعر غزل سے خارج نہیں کیا اور ابھی تک اس میں چلا آ رہا ہے۔

قتیل کی شعر کے محاسن اور معائب میں گہری نگاہ ہے بمبئی کے ایک مشاعرے کا ذکر ہے جوش صاحب نے اپنی ایک نظم میں ایک مصرع پڑھا

کیا گلبدنی گلبدنی گلبدنی ہے

قتیل نے مجھ سے کہا کہ یہ مصرع غلط ہے۔ میں نے جلدی میں غور نہ کیا اور پوچھا کیا غلطی ہے کہنے لگے تینوں جگہوں "پر گُلبَدَنی" سے پہلے "کیا" آنا چاہیے اور فوراً ہی جرأت کی یہ مثال پیش کی

کیا بات ہے کیا بات ہے کیا بات ہے واللہ

اس وقت تک میں تقسیمِ ہند سے پہلے کی بات کر رہا تھا لیکن مذکورہ بالا واقعہ تقسیمِ ہند کے بعد کا ہے۔ تقسیمِ ہند سے قبل کی باتوں کا سلسلہ لامتناہی ہے۔ قاسمی صاحب اُس زمانے میں میکلوڈ روڈ یا نسبت روڈ پر رہتے تھے۔ قتیل اور میں دونوں اکثر اُن کے یہاں جا نکلتے تھے اور اُن کے کلام سے بھی مستفید ہوتے تھے اور اُن کے علم سے بھی۔ ایک دن میں اور قتیل قاسمی صاحب سے ملنے جا رہے تھے کہ راستے میں عدم صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ وہ بھی ہمارے ساتھ چل پڑے۔ ندیم صاحب کے وہاں پہنچے تو بات چیت شروع ہوتے ہی عدم صاحب نے نہ جانے

کس بات پر رفیع احمد خان کا ایک شعر سنایا اور اس میں ترمیم پیش کی۔ اِس پر بات چیت کا رُخ رفیع احمد خان کے انداز کی شاعری کی طرف ہوگیا اور مجھے پہلی بار اس کا پتہ چلا کہ قتیل کی طبیعت اس میدان میں کتنی رسا ہے۔

تقسیم ہند کے بعد ظاہر ہے کہ ملاقاتوں کی تعداد میں کمی آگئی۔ اور ان کی صورت صرف یہی باقی رہ گئی کہ یا میں کسی مشاعرے، سیمینار یا توسیعی لیکچر کے سلسلے میں پاکستان جاؤں اور یا قتیل ہندوستان آئیں۔ تو پاکستان بننے ہی خدا کے فضل سے میرے پاکستان جانے کے مواقع یکے بعد دیگرے سامنے آنا شروع ہوگئے اور قتیل کے لیے ہندوستان آنے کے مواقع۔ پاکستان میں انڈو پاکستان مشاعروں کی تعداد سنہ ۴۷ء سے سنہ ۶۵ء تک بہت زیادہ رہی۔ ہندوستان میں مقابلتاً کم۔ اس لیے قتیل کے ساتھ میری ملاقاتیں پاکستان میں ہندوستان کے مقابلے میں زیادہ ہوئیں۔ لائل پور کاٹن ملز دہلی کلاتھ ملز ہی کی ایک شاخ تھی۔ اِس میں ہر سال مشاعرہ ہوتا تھا اور سال میں ایک ملاقات تو اسی مشاعرے میں ہو جاتی تھی۔ اس کے علاوہ پاکستان میں مشاعرے کئی شہروں میں اور کئی جماعتوں کی طرف سے ہوتے تھے اور اکثر اُن میں میرا اور قتیل کا ساتھ رہتا تھا۔

اُس زمانے میں قتیل ترنم سے پڑھا کرتے تھے۔ اُن کا ترنم معمولی ترنم نہیں تھا۔ بہت دلکش ترنم تھا۔ میں بھی اُس زمانے میں ترنم ہی سے پڑھا کرتا تھا۔ میرا تو خیر ذریعۂ اظہار اِس وقت بھی تحت اللفظ کے ساتھ ترنم بھی ہے لیکن قتیل ترنم بالکل ترک کر چکے ہیں نہ جانے کیوں۔ تو لائل پور کے ایک مشاعرے میں میرا ارادہ تحت اللفظ پڑھنے کا تھا، شاید دہلی سے لائل پور تک کے سفر میں گلا خراب ہوگیا تھا۔ میں نے چاہا دو ایک اچھے ترنم والے شاعروں کو ساتھ ملالوں اور ہم سب تحت اللفظ پڑھیں۔ چنانچہ میں نے ترنم کے خلاف قتیل، عرش ملسیانی اور سرور بارہ بنکوی کے ساتھ سازش کی کوشش کی۔ اُس وقت تو میں نے ان تینوں کو قائل کر لیا کہ ترنم سے کلام پیش کرنے کا طریقہ کوئی باوقار طریقہ نہیں ہے لیکن جب مشاعرہ شروع ہُوا تو قتیل، عرش اور سرور بارہ بنکوی تینوں نے ترنم سے پڑھا حالانکہ ان تینوں کے مائکروفون کے سامنے جانے سے قبل میں ان کے کانوں میں ترنم کے خلاف کُھسر پُھسر کرتا رہا۔ جب قتیل ترنم سے پڑھ رہے تھے تو مجھے بہت غصہ آرہا تھا چنانچہ مشاعرے کے بعد میں نے قتیل کے ساتھ جھگڑا کیا کہ تم نے کیوں وعدہ خلافی کی ہے، قتیل نے کہا یار بہت چالاک نہ بنو۔ تمہارا گلا خراب تھا اور تم تحت اللفظ پڑھنے پر مجبور تھے۔ تم نے ہم تینوں کو پھانسنا چاہا۔ ہم تمہارے دام میں نہیں آئے۔ یہ کہہ کے قتیل نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور میرا سارا غُصّہ اِسی قہقہے میں بہہ گیا۔

ہندوستان کے مشاعروں میں ملاقاتیں دہلی میں تو خیر بہت ہوئیں دہلی کے علاوہ حیدرآباد اور بمبئی میں بھی ہوئیں۔ بمبئی میں ہم دونوں ساحر لدھیانوی کے یہاں ٹھہرے تھے۔ قتیل اور ساحر کے ساتھ یہ ہفتہ دس دن کا قیام اتنا خوبصورت قیام تھا کہ کئی سال گزر جانے کے باوجود اس کی یاد آج بھی دل میں تازہ ہے۔

حیدرآباد کے انڈو پاک مشاعرے میں قتیل منتظمینِ مشاعرہ کے مہمان رہے۔ غالباً مدینہ ہوٹل میں اور میں حسبِ معمول برادرم رشاد صدیقی کے یہاں مقیم تھا۔ اس مشاعرے کے سلسلے میں بھی حیدرآباد میں ہم لوگوں کا قیام کئی روز رہا۔ ایک رات راجہ دھن راج گیر کے یہاں دعوت تھی۔ نائے و نوش کا دور چل رہا تھا اور شعر و شاعری کی باتیں ہو رہی تھیں۔ ترقی پسند شاعری کی بھی، انقلابی شاعری کی بھی، کلاسیکی شاعری، مقصدی شاعری اور غیر مقصدی شاعری بھی زیرِ بحث آرہی تھیں۔ میر تقی میر کا ذکر بھی آیا، میر انیس کا بھی، غالب کا بھی اور اقبال کا بھی۔ مخدوم نے کہا اقبال شاعر واعر نہیں تھا۔ شراب کے عالم میں بحث کرنا تو نہیں چاہیے لیکن بحث چل ہی پڑی۔ قتیل نے مخدوم کو ٹوکا۔ سلیمان اریب نے مخدوم کی حمایت کی اور میں نے قتیل کی۔ مخدوم نے کہا کہ تم دونوں پنجابی ہو اس لیے اقبال کو شاعر مانتے ہو ورنہ وہ شاعر نہیں تھا۔ دراصل مخدوم کے لیے ہم سب کے دل میں بڑی عزت تھی اور ہے اور اُس سے اُلجھنے کو نہ قتیل تیار تھا اور نہ میں۔ لیکن سلیمان اریب سے

بے تکلفی تھی۔ سلیمان اُس وقت بھی سطحِ زمین سے ذرا زیادہ ہی اونچا تھا چنانچہ جب اُس نے برہنہ لفظوں میں اقبال کو غیر شاعر کہا تو قتیل نے وہ سارا غصہ جو اُس کے دل میں مخدوم کے لیے تھا ایک نہایت ہی برہنہ نشتریت جملہ کہہ کے اریب پر نکال دیا۔ مخدوم اِس طرح کی ان گنت محفلیں دیکھے ہُوئے تھا۔ اُس نے دیکھا کہ رنگِ محفل بگڑ رہا ہے تو فوراً ہی اقبال کے چند اشعار سنا کر مجھے اور قتیل کو ہموار کر دیا۔ اور سلیمان اریب کے ساتھ کسی اور مسئلے پر بات شروع کر دی اور چند ہی لمحوں میں محفل پھر اُسی رنگ پر آگئی۔ دوسرے دن صبح ہوتے ہی میں قتیل کے یہاں مدینہ ہوٹل پہنچا اور رات کی محفل کا ذکر کیا اور کہا کہ یار تمہارا وہ فقرہ بہت تلخ تھا۔ قتیل نے کہا ٹھیک تو تھا لیکن اُس وقت اس کے سوا چارہ نہ تھا۔ اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اِس سے اریب کی دلآزاری ہُوئی ہوگی۔ یہ صورتِ حال پیدا نہ ہوتی تو بہتر تھا۔ ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ اریب بھی آ نکلے۔ دراصل جب تک مشاعرے کے مہمان شاعر حیدرآباد میں رہے مدینہ ہوٹل شاعروں کی آمد و رفت کا مرکز بنا رہا۔ اریب آتے ہی قتیل کے ساتھ تپاک سے ملا۔ وہیں چائے کا دور چلا اور رات گئی بات گئی کے مصداق نہ قتیل کے دل میں کوئی ملال تھا نہ اریب کے دل میں، اریب بھی کیا لاجواب آدمی تھا۔

۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۷ء تک ہندوستان یا پاکستان میں نہ کوئی انڈوپاک مشاعرہ ہُوا اور نہ کوئی انڈوپاک سیمینار۔ ہندوستان کے دہلی کلاتھ ملز کے مشاعرے میں بعض پاکستانی شعرا آتے رہے مثلاً فیض، زہرہ نگاہ، سحاب قزلباش لیکن یہ پاکستان سے نہیں آتے تھے۔ کوئی لندن سے کوئی ماسکو سے اور کوئی متحدہ عرب امارات سے۔ اُس زمانے میں پاکستان یا ہندوستان میں صحیح معنی میں انڈوپاکستان مشاعرہ یا سیمینار منعقد نہیں ہُوا۔ سنہ کے آتے ہی آل انڈیا اقبال صدی تقاریب کمیٹی اور اقبال عالمی کانگرس پاکستان سرگرمِ عمل ہُوئیں اور دونوں ملکوں میں اقبال صدی تقاریب نے بچھڑے ہُوؤں کو پھر ملایا۔ میں اِسی سلسلے میں لاہور اور سیالکوٹ گیا۔ وہاں پہنچتے ہی میں نے قتیل کو ٹیلی فون کیا۔ پتہ چلا کہ راولپنڈی اور پشاور کے مشاعروں میں شرکت کے لیے گئے ہُوئے ہیں۔ اقبال عالمی کانگرس آٹھ نو دن رہی۔ قتیل اِس دوران میں واپس آگئے اور آتے ہی انٹرکانٹیننٹل لاہور میں مجھ سے ملنے کے لیے آئے کہنے لگے میں لاہور میں نہیں تھا ورنہ تمھیں یہاں انٹرکانٹیننٹل میں نہ ٹھہرنے دیتا۔ تمھیں اپنے گھر ٹھہراتا لیکن اب کانفرنس قریب الاختتام تھی اور میں عملی طور پر اپنے دوست طفیل کے گھر منتقل ہو چکا تھا۔ اب مجھے لاہور میں ایک آدھ دن رہنا تھا اور قتیل کے گھر جانے کا وقت ہی نہیں تھا۔ میں نے کہا کل میں دن میں بارہ ساڑھے بارہ بجے "نوائے وقت" کے دفتر میں ہوں گا۔ وہاں مجید نظامی، وقار انبالوی اور عطاالحق قاسمی سے ملاقات طے ہے۔ قتیل نے کہا کل کا لنچ میرے ساتھ ہوگا اور پاکستان آرٹس کونسل میں بیٹھ کے کھانا کھائیں گے چنانچہ میں "نوائے وقت" کے دفتر سے اُٹھ کے پاکستان آرٹس کونسل میں پہنچا جو قریب ہی تھی۔ مرتضےٰ برلاس اُس زمانے میں اس کے سیکرٹری تھے، وہاں کرنل شاد بھی آگئے۔ عزیزی ذوالفقار ابنِ طفیل تو میرے ساتھ تھے ہی چنانچہ وہیں محفل جمی، ہم سب نے مل کے ایک ساتھ کھانا کھایا، اس کے بعد مرتضیٰ برلاس نے آرٹس کونسل کے مختلف شعبے دکھائے۔ ناچ اور گانے کے نمونے بھی دیکھے اور قتیل کے ساتھ اتنی مدت نہ ملنے کی تلافی ہوگئی۔

سنہ ء میں یعنی گذشتہ برس میں پھر پاکستان گیا۔ اکیڈمی آف لیٹرز کی دعوت پر لیکن یہ سفر ایسا تھا کہ دس دن تھے اور سات شہروں میں جانا تھا۔ لاہور میں ڈیڑھ دن سے زیادہ بسر نہ ہُوا۔ قتیل سے ملاقات نہ ہو سکی۔ ۲۱ اپریل کا دن تھا۔ یومِ اقبال کے سلسلے میں مصروفیت زیادہ رہی۔ اِس سال میں پھر پاکستان گیا مئی میں۔ اب کے سفر صرف کراچی تک محدود تھا۔ انجمن تعمیرِ ادب کا مشاعرہ تھا اور کراچی یونی ورسٹی میں ایک لیکچر تھا۔ قتیل اس مشاعرے میں نہیں تھے اور میں قتیل سے نہ ملنے کی حسرت لے کر واپس آگیا۔ لیکن خُدا نے اس کی تلافی کی صورت چند روز ہی میں پیدا کر دی۔ جون میں یعنی اگلے ماہ متحدہ عرب امارات میں تین مشاعرے تھے، بزم ادب الامارات کی جانب سے۔ ابوظہبی، دوبئی اور شارجہ میں۔ صبح کی فلائٹ

سے میں دُبئی پہنچا، دہلی سے، اور سہ پہر کی فلائٹ سے قتیل پہنچے، کراچی سے۔ ان کے ساتھ پاکستان کے اور شعراء بھی تھے۔ احمد ندیم قاسمی، اقبال عظیم، شاعر لکھنوی، دلاور فگار، اقبال صفی پوری، رحمٰن کیانی، محسن احسان، مظفر وارثی، راغب مرادآبادی اور کلیم عثمانی۔ تمام شعراء کا قیام ایکسیلسیر ہوٹل دوبئی میں تھا۔ سات آٹھ دن کا قیام تھا گویا قتیل سے صرف ملاقات ہی نہیں ہوئی بلکہ دن رات کی رفاقت رہی۔ قتیل اپنے نشترِ طنز کو نہایت خوبصورت لفظوں میں نمایاں کرنے پر قادر ہے۔ شاید دوبئی میں ہمارا دوسرا ہی دن تھا۔ ہوٹل کے ڈائننگ روم میں قاسمی صاحب، محسن احسان، قتیل، منظور ثروت اور میں ناشتہ کر رہے تھے۔ مکھن کے پیکٹ پر لکھا تھا MADE IN SUIZAR LAND پنیر پر لکھا تھا MADE IN DEN MARK دودھ کے چھوٹے چھوٹے پیکٹوں پر لکھا تھا MADE IN NARWAY پانی کی بوتل پر بھی کسی مغربی مُلک کا نام لکھا تھا حتیٰ کہ خلال پر لکھا تھا MADE IN GERMANY اور دیا سلائی کی ڈبیہ پر لکھا تھا MADE IN U.S.A. میں نے اس پر اظہارِ حیرت کرتے ہوئے کہا کہ متحدہ عرب امارات اتنا امیر مُلک ہوتے ہوئے بھی صنعت کے معاملے میں اس قدر پس ماندہ ہے انسوس کا مقام ہے۔ قتیل نے فوراً کہا کہ خلال اور پنیر مٹی کے تیل سے تو نہیں بن سکتے۔

اس کے بعد قتیل سے ملاقات اگست میں امریکہ میں ہوئی۔ میں ایسٹ ویسٹ یونی ورسٹی کی دعوت پر شکاگو گیا تھا اور قتیل، جمیل الدین عالی، صہبا اختر، ضمیر جعفری، حمایت علی شاعر اور پروین شاکر فنا پاکستان فیڈریشن آف کینیڈا کی دعوت پر امریکہ اور کینیڈا کے مشاعروں میں شرکت کے لیے آئے تھے۔

شکاگو کے مشاعرے میں ہمارا ساتھ ہوا اور اس مشاعرے میں قتیل نے اپنا کلام سنانے سے قبل مائکروفون ہی پر میرا ذکر لاہور کے زمانے کے تعلق سے اس انداز سے کیا کہ میں آبدیدہ ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ہاں یاد آیا اس سے قبل دُبئی کے مشاعرے میں بھی قتیل نے اپنے کلام سے قبل میری اور اپنی دوستی کا خاص طور سے ذکر کیا اور جب اُس کا نام پکارا گیا تو میں نے اصرار کیا کہ میں پہلے پڑھوں گا لیکن قتیل نے میری یہ بات نہ مانی اور مجھ سے پہلے اپنا کلام پڑھا۔

شکاگو میں ہم دونوں نے اے۔ ایم۔ فردوسی اور افتخار نسیم کی ہمراہی میں سارا دن اکٹھا گزارا اور جب میں ایک ماہ بعد امریکہ سے لندن پہنچا تو قتیل شفائی کا پیغام موجود تھا کہ پرسوں برمنگھم میں مشاعرہ ہے، تمھیں پہنچنا ہے لیکن مجھے چونکہ بیٹی سے ملنے ناٹنگھم جانا تھا میں برمنگھم نہ جاسکا۔ ناٹنگھم چلا گیا۔ ناٹنگھم سے واپسی پر لندن میں بی بی سی اور ٹیلی ویژن پر میری ریکارڈنگ تھی جب میں ٹیلی ویژن کی ریکارڈنگ کے لیے بی بی سی پہنچا تو سوہن راہی نے کہا کہ قتیل برمنگھم میں آپ کے ٹیلی فون کے منتظر ہیں۔ میں آپ کو فون ملا دیتا ہوں۔ انگلستان یورپ اور لندن میں ٹیلی فون تو آدھے سیکنڈ میں مل جاتے ہیں چنانچہ ٹیلی فون پر قتیل سے بات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ مشاعرے میں تو برمنگھم نہیں پہنچے ویسے ہی آجاؤ مجھ سے ملنے لیکن مجھے دوسرے دن ہندوستان روانہ ہونا تھا اس لیے قتیل سے ملاقات کی یہ حسرت دل میں رہ گئی اور میں نے اُس سے ٹیلی فون پر یہ وعدہ کیا کہ آئندہ مارچ میں جب تین لیکچروں کے سلسلے میں پاکستان آؤں گا تو پہلے لاہور پہنچوں گا اور تمھارے یہاں چند روز قیام کرنے کے بعد کراچی روانہ ہوں گا اور اب میں اُس دن کے انتظار میں ہوں کہ یہ تین لیکچر مکمل کر کے میں لاہور پہنچوں اور قتیل کے یہاں قیام کروں کیونکہ بقولِ غالب

مرے دل میں ہے غالب شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے جب اُس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی ...

بنارس، ۲۶ دسمبر ۱۹۸۰ء

یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

خاطر غزنوی۔ پشاور (پاکستان)

آج سے کوئی تیس پینتیس برس پہلے کی بات ہے، لاہور سے ایک ہفت روزہ "سٹار" کے نام سے شائع ہوا کرتا تھا، قمر جلال آبادی اس پرچے کو مرتب کیا کرتے تھے۔ یہ پرچہ حقیقت میں نوجوانوں اور نئے لکھنے والوں کا تھا۔ ادبی اور فلمی دونوں قسم کا مواد اس میں ہوا کرتا تھا۔ اسی ہفت روزے میں ایک جدت پیدا کی گئی جس سے پرچے کی اشاعت حیرت انگیز طور پر بڑھ گئی، نئے لکھنے والوں کی ایک برادری قائم کرنے کی صورت میں وجود میں آئی۔ اس برادری کا نام "پریم لیگ" تھا "پریم لیگ" کے لئے سٹار میں دو چار صفحات وقف کئے گئے تھے اس کے رکن جو اکثر نئے لکھنے والے ہوتے تھے اپنی کچی پکی تحریریں بھیجتے جو ان صفحات میں شامل ہوتیں اراکین کے تعارف اور تصویریں شائع ہوتیں اور یوں یہ نئے لکھنے والے اپنے اپنے شہروں میں بھی مل بیٹھتے ادبی محفلیں ہوتیں اور دوسرے شہروں کے لکھنے والوں سے خط و کتابت کے ذریعے میل جول پیدا کرتے اور اس میل جول میں واقعی پریم کی لگن ہوتی تھی ——

پھر ایک دن پشاور کے محلہ خویشگی میں رسالہ نغمۂ حیات کے دفتر میں ایک خوب صورت نوجوان آیا یہ رسالہ یوسف شاد کی ملکیت اور سید فارغ بخاری کی ادارت میں شائع ہوتا تھا، یہ دونوں حضرات بھی پریم لیگی تھے اور آنے والا خوبصورت نوجوان بھی پریم لیگی —————— دنیا بھر کے ہنگاموں سے دور ایک قصبے کا رہنے والا یہ نوجوان دیہات کے فطری ماحول کی طرح رومانی جذبات اور خالص احساسات سے چھلک رہا تھا۔ اس کی آواز میں گھنگھروؤں کی موسیقی اور گلے میں سازوں کی کھنک تھی اس کا چہرہ مکھن کی طرح سفید اور چکنا تھا۔ اور اس کے گھونگھر والے بال اس کے ذہن میں خیالات کے الاؤ کا بل کھاتا ہوا دھواں بنے ہوئے تھے۔ اس قاتل اور بسمل کرنے والے نوجوان کا نام اپنی شخصیت کے برعکس قتیل شفائی تھا۔

فارغ بخاری، رضا ہمدانی اور یوسف شاد نے قتیل سے اس کا کلام اور اس کا جوان ترنم سنا اس نوجوان نے اس وقت سوائے سٹار میں چھپنے کے کسی مشاعرے میں حصہ نہ لیا تھا، جب رضا اور فارغ نے اپنا کلام سنایا اور اچھے اشعار پر داد دی، تو قتیل کو بڑی زبردست ہنسی آئی، لیکن وہ ضبط کر گیا لیکن حیرت نے اسے داد دینے سے روکے رکھا۔ اسے غصہ آ رہا تھا کہ یہ لوگ ایک دوسرے کے ہر شعر پر واہ واہ کے ڈونگرے برسا رہے ہیں محبت بھی کوئی لوگ ہیں کہ ایک دوسرے کی بے پناہ تعریف کر رہے ہیں ——— یہ پہلا موقع تھا کہ قتیل نے داد کا انداز دیکھا اور مشاعرے کے آداب سے واقفیت حاصل کی...... اور اب وہ غزل خوانی اور مشاعروں کے آداب سے اس قدر مانوس ہو چکا ہے کہ اگر اسے اس کے اچھے شعروں پر داد نہ دی جائے تو اسے داد کے پہلے دن کی طرح غصہ آئے گا اور وہ یقیناً

کہہ اُٹھے گا" عجیب بیہودہ لوگ ہیں، شعر فہمی کا مذاق ہی نہیں ان میں"!

"تو یہ تھا اس دیہاتی نوجوان کی شاعری کا ابتدائی زمانہ ۔

وادیٔ سرحد کی سرسبز و شاداب فضا میں پلے ہوئے قتیل شفائی سے میں بھی اس زمانے میں واقف ہوا، اس لئے کہ میں بھی اسی پریم نگری برادری کا ایک رکن تھا، ہم ایک دوسرے کی تازہ تخلیقات سے متعارف کراتا ــــــــــ

اس ابتدائی زمانے میں بھی قتیل شفائی کی غزل ۔ رومان انگیز اور رنگ رس کا مجموعہ ہوتی تھی ۔ پائل کے چھناکے، زلفوں کے بادل، بوندوں کا ترنم، آواز کا رچ، چہرے کا نور، آنکھوں کی کیفیت، قرب کی تمنا قتیل کی غزل کے اجزا تھے ۔ مجھے اب بھی یاد ہے ۔شمارہ میں جب اس کی غزل شائع ہوئی تھی تو اکثر لوگوں کو میں نے یہ غزل گنگناتے سُنا،

جلوہ بجلوہ آئیں گے آج نہیں تو کل سہی

قتیل شفائی سے میری ملاقات فارغ بخاری کے ہاں ہوئی ۔ وہ جب بھی پشاور آتا تھا فارغ کے پاس ٹھہرا کرتا ــــــــــ غالباً میں غلط سمجھ گیا، قتیل جب بھی پشاور آتا تو فارغ کے ہاں ٹھہرتا ہے اور اگر کسی مجبوری سے وہاں نہ ٹھہر سکے تو اس گھر کا سلام اس کے پروگرام کی پہلی شق ہوتا ہے ــــــــــ یہ قتیل کی طبیعت کی مستقل مزاجی ہے ۔ اس نے ہمیشہ اپنی روایت قائم رکھی ہے، اور یہ اس کی دوستی کی پائیداری کا ثبوت بھی ہے ۔

قتیل دوست پرست انسان ہے، اس نے ہمیشہ دوستی کی قدر کی ہے دوستی سے محبت کی ہے اور دوستی کو نبھایا ہے، میں گزشتہ ۳۸ اڑتیس برس سے دیکھ رہا ہوں کہ جو لوگ اس کے حلقہ احباب میں تھے وہ اب تک اسی طرح اسی خلوص، جوش اور محبت کے ساتھ اس رشتے میں بندھے ہوئے ہیں ــــــــــ

قتیل کی شخصیت پر اپنے سرسبز شہر ہری پور کی فضا کا بڑا اثر ہے وہ خود باغ و بہار شخص ہے، اور بے باک بھی ہے، اس میں بڑے شہر والوں کی منافقت نہیں، اگرچہ اسے بڑے شہر میں رہتے ہوئے بڑا طویل عرصہ گذر چکا ہے ــــــــــ وہ صاف گو ہے اور اس لئے کسی دوست میں کوئی خامی دیکھتا ہے یا محسوس کرتا ہے تو وہ اس کا، واضح طور پر اعلان کر دیتا ہے اور صاف صاف کہہ دیتا ہے کہ میں تم سے خفا ہوں ــــــــــ

یہی سبب ہے کہ اس کے اکثر دوست اسے زیادہ دیر ناراض نہیں رہنے دے سکتے ــــــــــ اس آزاد فضا کے باسی نے ہمیشہ شہر کی گھٹی گھٹی فضا کے تاثر کو شکست دی ہے ۔

قتیل شفائی ــــــــــ نے شفائی کا لفظ اپنے استاد حکیم شفا کی نسبت سے اپنے نام کا جزو بنایا اور اگرچہ حکیم شفا سے اصلاح کا زمانہ بہت ہی مختصر رہا ہے لیکن قتیل کی فطری فرض شناسی نے کبھی اس بات کو قبول نہ کیا کہ وہ شفا سے بے وفائی کریں، انہوں نے ایک قدیم اور مقدس رشتے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنا لیا ہے اور اس طرح اپنایا ہے کہ تاریخ بھی قتیل کو شفا سے جدا نہیں کر سکتی، ــــــــــ

اسی طرح اس کی فارغ بخاری، رضا ہمدانی، احمد فراز، جمیل ملک اور احمد ندیم قاسمی سے محبت اور پائیدار دوستی جسم و جاں کا رشتہ بن گئی ہے ــــــــــ میں جو زندگی میں قدم قدم پر دوستوں کے ہاتھوں لٹا ہوں، ہمیشہ قتیل شفائی کی دوستی پر فخر کرتا ہوں اور اپنے آپ کو اس کی دوستی کے لئے لٹانے پر بھی تیار ہوں ۔

قتیل شفائی ــــــــــ بچپن ہی میں والد کے سائے سے محروم ہو گیا۔ بچپن ہی سے اسے زندگی کے تلخ و ترش دن دیکھنے پڑے اس لئے اسے دوست اور دشمن پرکھنے کا ڈھب آگیا ہے غالباً وہ دوست چننے میں اپنے اسی تجربے سے کام لیتا ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کا حلقۂ احباب وسیع نہیں قتیل کس سے واقف نہیں اور کون قتیل سے واقف نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ قتیل کے "دوستوں" کا حلقہ واقعی بڑا محدود ہے، ہاں

یہ بات ضرور ہے کہ پرانے دوستوں کو چاہے وہ جیسے بھی ہیں اس نے بہت عزیز رکھا ہے،

بچپن میں لکھ پتی والد کا سایہ سر سے اُٹھنے کے سبب اُسے بڑی ٹھوکریں بھی کھانی پڑیں۔ اس نے چونگی کی محرری کی، ٹرانسپورٹ سروس کے ٹکٹ بیچے، ادب لطیف اور ادا کار کی ایڈیٹری کی، اور پھر ریڈیو اور فلم کے لئے لکھنا شروع کیا، آج وہ خود فلم ساز ہے۔

اپنے جوہر ذاتی، ذہانت اور اُپج کے سبب وہ ہجوم کی صفیں چیرتا ہوا آگے بڑھا اور اپنے ہمعصروں سے بہت آگے نکل گیا۔

برصغیر ہند و پاک میں جو اچھا شاعر بھی فلم میں گیا وہ ادب میں اپنے مقام سے نیچے گرتا چلا گیا، قتیل شفائی واحد شاعر ہے جو فلم میں جاکر بھی اپنے ادبی مقام اور معیار سے نیچے نہیں گرا بلکہ اس نے فلم میں بھی شاعری کا معیار بلند کر دیا ——————

● اگر یہ سوال کیا جائے قتیل کے یہاں کیا کچھ ہے تو جواب یہ دیا جا سکتا ہے کیا کچھ نہیں۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ مکمل اور بھرپور شاعری ہے۔ سوز و ساز ہے۔ تب و تاب ہے سب سے بڑھ کر اپنی مٹی کی بو باس ہے اپنی پہچان ہے۔ ●

—————— پروفیسر الطاف فاطمہ

ایک ریڈیائی گفتگو

دُور کے رشتے

پاکستان کے البیلے شاعر قتیل شفائی کے نام !

پریم وار برٹنی (مرحوم)

جیسے تمہاری شخصیت تمہارے اشعار میں ہزار رنگ اور رُوپ لے کر اُجاگر ہوتی ہے۔ اسی طرح تمہاری دوستی اور محبت اور رفاقت کے اَن گنت نقوش آج میری یادوں کے آئینہ خانے میں جلوہ گر ہیں۔ بالکل تمہارے شعروں کی طرح تمہارا تیز اور تیکھا چہرہ حافظے میں اُبھر آیا ہے۔ مگر اس چہرے کے ساتھ اور بھی کچھ چہرے ہیں۔ میرے اور تمہارے مشترکہ دوستوں کے چہرے! تمہارے مداحوں اور پرستاروں کے چہرے، کچھ ادبی اور کچھ فلمی چہرے۔ ان تمام چہروں میں ایک بہت دلچسپ، لیکن اجنبی اور مانوس چہرہ بھی ہے۔ جس کے خدوخال تم نہیں پہچانتے۔ آج اس چہرے کو دیکھو گے تو حیران رہ جاؤ گے اور سوچو گے کہ بعض دُور کے رشتے بھی کتنے حسین اور عظیم ہوتے ہیں؟ فن کار مر جاتا ہے اور فن کبھی نہیں مرتا۔ یہ بات تو دُنیا کے سبھی دانشوروں نے کہی ہے۔ لیکن ایسے دلچسپ چہرے والا شخص بہت کم لوگوں نے دیکھا ہوگا۔ جسے میں آج تم سے متعارف کراؤں گا۔

قتیل! میخانوں سے مشاعروں تک اور بے نام سڑکوں کی خاموشی سے فلم اسٹوڈیوز کے ہنگاموں تک تمہاری میری ملاقاتوں کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ تصور کے اندھیرے اجالے۔ دل و دماغ کی بے نام گلیوں میں آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں۔ کچھ پاگل یادیں گھنگھرو باندھ کر ناچ رہی ہیں تو کچھ خوابوں کے پیروں میں بھاری زنجیریں پڑی ہیں۔ آج کی رات تاریک ہے۔ چناروں کے سائے طویل ہو گئے ہیں۔ اور میں تمہیں ڈھونڈنے ماضی کے جنگل کی طرف نکل گیا ہوں۔

سوچتا ہوں تمہاری دوستی کا تذکرہ کہاں سے شروع کروں؟ پہلی ملاقات سے یا آخری ملاقات سے۔ لیکن نہیں۔ میں بھی تمہاری طرح روایت شکن ہوں۔ اس لئے گفتگو کا آغاز ایک درمیانی واقعہ سے کرتا ہوں۔ یہ میرے بن باس کے ان دنوں کا ذکر ہے جب اپنے وطن سے ہزاروں میل دور میں بمبئی میں تھا اور زندگی میرے خلاف جبر اور صبر کی ہر آزمائش پر اُتر آئی تھی۔ لیکن مجھے یہ ہرگز منظور نہ تھا کہ اپنے فن کا کشکول لئے موسیقاروں کے در پر گیتوں کی بھیک مانگتا پھروں۔ ان ہی دنوں مجھے معلوم ہوا تھا کہ تم اپنی بچی کے علاج کی خاطر لاہور سے بمبئی آئے ہو۔ اُس موذی مرض کا علاج ان دنوں پاکستان میں ممکن نہ تھا۔ بمبئی میں میرے ٹھکانے کی تمہیں خبر نہیں تھی۔ اور میں نے تمہاری آمد کی اطلاع کے باوجود تمہیں تلاش نہیں کیا تھا۔ دراصل میں اپنی غریبی کا گھاؤ تمہیں دکھانا نہیں چاہتا تھا۔ جو مجھے میری جلاوطنی نے دیا تھا۔ تم ملتے تو بغل گیر ہوتے ہی میرے سینے کا وہ گھاؤ ضرور دیکھ لیتے۔ اور پھر ہمدردی کا

مریم بھی میسر تھی۔ جو میری دوستانہ غیرت کو گوارا نہ تھا ـــــ لیکن ایک دن اچانک، اور اتفاق سے میرا ایک فلمی دوست، جو تمہارا پرستار بھی تھا۔ تمہیں فیمس مہالکشمی اسٹوڈیو میں مل گیا اور تمہیں میرے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو گیا۔ پھر اُسی دوست نے اسی شام مجھے تمہارا یہ پیغام دیا ـــ

" کل شام ٹھیک سات بجے شواجی پارک کے چوک والے ایرانی ریستوران میں ملو۔ اگر تم دس منٹ بھی لیٹ پہنچے تو میں وہاں نہیں ملوں گا اور پھر تم مجھے کبھی نہیں ملو گے "

قتیل! تمہارے اس قدر جذباتی اور محبت بھرے پیغام کے بعد یہ کیسے ممکن تھا کہ میں تمہاری حکم عدولی کرتا؟ اگلے روز میں مقررہ وقت پر وہاں پہنچ گیا۔ اور پھر تم مجھے اپنے ساتھ ایک دوست کے ہاں لے گئے۔ جہاں تمہارے اعزاز میں پہلے سے دعوت کا اہتمام تھا۔ تمہارے ادبی، فلمی اور صحافی دوستوں کی یہ پارٹی دیر تک چلتی رہی۔ سب انتہائی شوق سے تمہارا کلام سنتے رہے۔ داد و تحسین کے پھول برسائے رہے تالیاں بجتی رہیں۔ سگرٹوں کا دھواں اڑتا رہا۔ اور جب رات گئے یہ نشست برخاست ہوئی تو میں نے اداس آنکھوں سے تمہاری طرف دیکھا۔ تم میری اداسی کا مفہوم سمجھ رہے تھے۔ اس لئے تم نے میرا شانہ تھپتھپایا اور کہا۔

" فکر نہ کرو، ہم دونوں دل کی باتیں بھی کریں گے کل کی ملاقات تنہائی میں ہوگی "

پھر تنہائیوں میں بھی ملاقاتیں ہوئیں اور مختصر نہیں، ہم دونوں نے جی بھر کے خوب خوب باتیں کیں۔ اپنے اپنے دل کی باتیں۔ گھر کی باتیں۔ ہر مسئلے پر گفتگو ہوئی۔ ادب، فلم، موسیقی، مصوری، آرٹ، ثقافت، اور تہذیب و تمدن کے علاوہ ہند پاک کے نئے اور پرانے سیاسی رشتے۔ غرضیکہ کوئی موضوع باقی نہ بچا جس پر ہم نے تبادلۂ خیال نہ کیا ہو ـــ پھر ملاقاتوں کے سلسلے طویل سے طویل تر ہوتے گئے کبھی ہم کسی غریب شاعر کی تنگ کٹیا میں ملے۔ تو کبھی کسی فلم ایکٹریس کے شاندار ڈرائنگ روم میں۔ بمبئی میں تمہارے بہت سارے دوست اور پرستار تھے جو تمہارے اعزاز میں نت نئی دعوتوں کا اہتمام کر رہے تھے۔ دوستانہ نشستیں ہو رہی تھیں۔ آج تم سنیل دت اور نرگس کے ہاں مدعو تھے۔ تو کل کرشن چندر اور مہندر ناتھ کے ہاں۔ راج کھوسلہ تمہیں ڈنر پر بلانے آئے تھے لیکن تم تو اس دن کا کھانا منوج کمار کے ساتھ کھانے والے تھے۔ اسلئے راج کھوسلہ بھی تمہارے ساتھ وہیں چلے گئے۔ دھرمیندر تم سے ملنے کیلئے بے چین تھا۔ لیکن تم رنگ بھون کے مشاعرے میں اپنا کلام سنا رہے تھے۔

تم اچانک فلمستان آئے تو پاکیزہ کی شوٹنگ تھوڑی دیر کے لئے روک دی گئی۔ وہیں اسٹوڈیو میں ایک شعری نشست منعقد ہو گئی فلم یونٹ کے علاوہ ایکسٹرا لڑکوں اور لڑکیوں کا ایک ہجوم تھا۔ اور تم سب میں گھرے کمال امروہی اور مینا کماری کو اپنا کلام سنا رہے تھے۔ اور مینا کماری جو خود بھی ایک شاعرہ تھی تمہیں جھک کر سلام کر رہی تھی۔

پھر ایک مخصوص دعوت کے بعد فلمی دنیا کا سب سے مشہور شاعر اور تمہارا دوست ساحر لدھیانوی تمہیں "پرچھائیاں" پیش کر رہا تھا۔ وہ انداز پیش کش مجھے کبھی نہیں بھولے گا۔ ساحر نے کتاب کے پہلے ورق پر اپنے قلم سے لکھا تھا۔

" پاکستانی ساحر لدھیانوی کی نذر ـــ ہندوستانی قتیل شفائی کا ہدیۂ خلوص "

تم اُس تحریر سے بے حد جذباتی ہو گئے تھے اور کہا تھا " ہند پاک دوستی کے موضوع پر لکھی ہوئی سینکڑوں کہانیاں اِس مختصر عبارت پر قربان کی جا سکتی ہیں "

قتیل میں جانتا ہوں کہ تم ہمیشہ سے حساس اور جذباتی رہے ہو صرف اپنی شاعری میں نہیں بلکہ اپنی ذاتی زندگی میں بھی! اور جب سے تم بمبئی آئے تھے، فلم ڈائرکٹر اور میوزک ڈائرکٹر بھونروں کی طرح تم پر منڈلا رہے تھے اور انہوں نے تمہارے گرد ایک گھیرا سا ڈال دیا تھا۔ تمہیں

دھر ادھر گیت لکھنے کی آفریں آ رہی تھیں۔ اتنی زیادہ کہ تم بوکھلا گئے تھے۔

آخر تم نے چند بڑی فلموں کی جنٹس قبول کر لی جس میں ایک فلم (مرحوم کے آصف) کی محبت اور خدا بھی تھی جس کی موسیقی نوشاد ترتیب دے رہے تھے۔ محبت اور خدا دراصل لیلے مجنوں کی پرانی کہانی کا نیا روپ تھی۔ اس فلم کا پہلا گیت جب تمہیں لکھنا پڑا تو تم کچھ دیر اسلئے بھی کنفیوژ رہے کہ آخر اس پٹی پٹائی سچویشن کے لئے کوئی نیا زاویہ کیوں کر تلاش کیا جائے! سچویشن وہی تھی یعنی قیس گداگر کے بھیس میں لیلے کے کوچے کی خاک چھان رہا ہے اور ایک درد بھرا گیت گاتا ہے ـــــــ لیکن جب تم نے گیت کے ابتدائی بول لکھے تو نہ صرف آصف صاحب اور نوشاد میاں نے داد دی بلکہ جس نے بھی وہ مکھڑا سنا بے اختیار سر دھنا۔ بات پرانی تھی لیکن انداز نیا ہے

اے جانِ آرزو مجھے زر دے نہ مال دے
اِک پیار کی نظر مرے کاسے میں ڈال دے

لو ایک اور واقعہ یاد آ گیا۔ یہ اس راز سے بھی پردہ کشائی کرتا ہے کہ فلمی لوگ ظاہری شان و شوکت کے باوجود اندر سے کتنے کھوکھلے ہوتے ہیں! تمہارے کسی پروڈیوسر نے حوان دال ریس میں ایک بڑی رقم جیتا تھا۔ اپنے بنگلے پر ایک شعری نشست رکھی جس میں گیت کار اندیور بھی آئے تھے مینا قاضی بھی تھیں۔ اور کئی دوسرے شعراء بھی۔ شاعرات کی تواضع چائے سے کی جا رہی تھی۔ اور شاعروں کی وہسکی سے! ہم سب ڈرائینگ روم میں بیٹھے تھے۔ لیکن جام ایک ملحقہ کمرے سے بن کر آ رہے تھے۔ چیرز کے لئے جب میں نے اپنا جام ٹرے سے اٹھایا تو دیکھا کہ تمہارے اور پروڈیوسر کے جام کا رنگ تو ایک سا ہے لیکن باقی سب جام مختلف رنگ کے ہیں۔ اس پر میں نے دبے لفظوں میں احتجاج کیا تو پروڈیوسر ذرا سا رک کر بولا۔ "آپ سب کو وہسکی سوڈے کے ساتھ پیش کی گئی ہے لیکن میں اور قتیل صاحب گرم پانی کے ساتھ لے رہے ہیں۔" میں نے تمہاری طرف دیکھا تو تم مسکرا رہے تھے۔ لیکن آداب محفل کو ملحوظ رکھتے ہوئے خاموش تھے۔ پھر دوسرے پیگ کے بعد جب سرور ذرا کھلنے لگا تو میں نے بلند آواز سے کہا۔ "دیکھئے حضور! میرا گلا خراب ہے۔ لہٰذا اب میں بھی گرم پانی کے ساتھ پیوں گا۔" اس پر تم بے ساختہ قہقہہ مار کر ہنس پڑے تھے۔ اور میں بھی تمہارے قہقہے میں شامل ہو گیا تھا۔ اس کے بعد اس نشست میں دیر تک لطیفے گونجتے رہے شعر کم سنائے گئے اور لطیفے زیادہ ـــ ایک لطیفہ مجھے اب بھی یاد ہے۔ تم نے بتایا تھا کہ تمہارا صاحب زادہ آج کل ایک لڑکی سے عشق کر رہا ہے لیکن اس کی محبوبہ کا ایک خط جو غلطی سے تمہارے ہاتھ آ گیا تھا۔ اور تم نے پڑھ لیا تھا اس میں تمہارے ہی اشعار لکھے ہوئے تھے۔

قتیل! کتنے قہقہوں، لطیفوں، شعروں اور یادوں کا ذکر کروں؟ مالا کے منکے زیادہ ہیں۔ لیکن دھاگے کی ڈور کم ہے۔ بہرکیف تمہارے ساتھ بمبئی میں جتنے دن گذارے خوب گذرے۔ لیکن پھر ایک ایسی شام آئی جو بے حد سوگوار تھی۔ تم واپس لاہور جا رہے تھے۔ وہاں سے جتنے خوش ہو کر آئے تھے یہاں سے اتنے ہی مایوس ہو کر لوٹ رہے تھے۔ تمہیں الوداع کہنے کے لئے چند اور احباب بھی بمبئی سنٹرل اسٹیشن پر موجود تھے۔ سب اداس تھے۔ لیکن میں ضرورت سے کچھ زیادہ ہی اداس تھا۔ اسلئے کہ تمہاری مایوسی کا راز جانتا تھا اور مجبوری یہ تھی کہ وہ کسی کو بتا نہیں سکتا تھا۔ سب دوست تم سے گلے ملے۔ میں اپنے آنسو روکنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ریل روانہ ہو گئی۔ اپنی منزل کی جانب تیزی سے بڑھ گئی اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے ذہن میں سناٹے کی ایک گہری اور لمبی لکیر کھنچ گئی ہو۔

تم واپس چلے گئے اور میں پھر اکیلا رہ گیا اور ایک بار پھر خود سے لڑنے کی جدوجہد میں مصروف ہو گیا ـــــــ پھر بہت دنوں بعد جب میرے قدم فلمی دنیا میں ذرا جمنے لگے تو ہندوستان اور پاکستان کی جنگ چھڑ گئی۔ پھر مجھ پر فالج کا شدید حملہ ہوا اور میں بمبئی چھوڑ کر پنجاب آ گیا۔ اپنے والدین کے

پاس مالیر کوٹلہ میں۔ ۔۔۔ اور پھر جب ہندوستان اور پاکستان کے درمیان دُوسری جنگ ہُوئی تب بھی مَیں اُسی شہر میں تھا۔ وہیں میری مُلاقات اُس دلچسپ چہرے سے ہو چکی تھی جس کا ذکر مَیں نے شروع میں کیا ہے۔

یہ تمہاری شاعرانہ شخصیت کا دیوانہ ہے۔ جسے تم سے والہانہ عشق ہے۔ دیوانگی کی حد تک۔ تمہیں خود بھی اپنے اتنے شعر یاد نہ ہوں گے جتنے کہ اِس کو یاد ہیں۔ یہ شہر کے کلب اور کالج کے پروگراموں سے لے کر مقامی مشاعروں تک باقاعدگی سے شرکت کرتا ہے اور ہر جگہ مترنّم آواز میں اِس طرح تمہارا کلام سُناتا پھرتا ہے جیسے اس پر صرف اُسی کا حقِ وراثت ہو۔ مشاعروں اور محفلوں سے طوائفوں کے بالاخانوں تک اس نے تمہارے کلام کی دُھوم مچا رکھی ہے۔ یوں تو ہر فنکار کے پرستار ہوتے ہیں لیکن ایسا پرستار مَیں نے نہیں دیکھا۔ یہ اُردو کے شاعروں میں تم سے بڑا شاعر کسی کو نہیں مانتا۔ تمہارا کلام سُناتے وقت اسے جُھومتے ہوئے تو بہت لوگوں نے دیکھا ہوگا۔ لیکن مَیں نے اِسے روتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ یہ اپنی آواز اور ایکٹنگ سے ایک عجیب سماں باندھ دیتا ہے۔

ایک مرتبہ اس نے ایک مقامی شاعر کو اس لئے طمانچہ مار دیا تھا کہ وہ تمہاری شاعری پر تنقید کر رہا تھا۔ یہ کوئی افسانہ طرازی نہیں۔ بلکہ جیتی جاگتی حقیقت ہے۔ تمہارے اس قدردان کی دماغی صحت پر اِس لئے شک نہیں کیا جا سکتا کہ یہ ایک نارمل اور تعلیم یافتہ انسان ہے۔ شہر کے لوگ اِسے ہنسراج سیٹھی کے نام سے پکارتے ہیں۔ لیکن میں اُسے پیار سے ہنسراج قتیل کہا کرتا ہُوں۔ ابھی ڈیڑھ برس پہلے مالیر کوٹلہ میں میرے نام انگلستان سے ماہنامہ "گہرانہ" کا ایک پرچہ موصول ہوا جس میں تمہاری یہ غزل۔ "تُو اِک ایسا لمس تھا جس میں بدن شامل نہ تھا" شائع ہُوئی تھی۔ اِس پر مجھے ایک شرارت سُوجھی۔ ان دنوں میری مالی حالت اچھی نہ تھی۔ لہٰذا اس شرط پر کہ شام کی دعوت کا اہتمام سیٹھی کی طرف سے ہو میں نے اُسے تمہاری تازہ غزل دینے کا وعدہ کیا ۔۔۔۔ شام کو بھرپور دعوت ہُوئی۔ گہرانہ والی غزل اُس کے حوالے کرتے ہوئے مَیں نے ایک اور مذاق کیا۔ میں نے کہا ۔۔۔ "قتیل کی چار پانچ اور غزلیں بھی انگلستان سے میرے پاس آئی ہیں۔ لیکن ایک غزل اور ایک دعوت" سیٹھی میری یہ شرط بھی خوشی سے مان گیا۔ دعوتیں اُڑتی رہیں۔ اور میں اپنی غیر مطبوعہ غزلوں کے مقطعے تبدیل کر کے اُسے دیتا رہا۔ جنہیں وہ بڑی شان سے یاروں کو سُناتا پھرا۔ لیکن ایک روز جب ایک رسالے سے مجھے معقول معاوضہ وصول ہوا تو میں نے سیٹھی کے اعزاز میں جواباً ایک زبردست دعوت کی اور دست بستہ عرض کیا کہ حضور! پہلی غزل تو واقعی قتیل کی تھی مگر دوسری غزلیں میری ہیں۔" اس پر وہ خفا ہونے لگا تو مَیں نے پیار سے کہا میاں! اگر میں سیٹھی کی بجائے ہمیشہ تمہیں قتیل کہتا رہا ہوں۔ تو کیا تم تھوڑی دیر کے لئے مجھے قتیل شفائی نہیں سمجھ سکتے؟" ۔۔۔ سیٹھی مسکرا کر خاموش ہو گیا۔ پھر ایک مقامی نشست میں جہاں نشے میں دھت وہ تمہارا کلام بلا اجازت سُنائے جا رہا تھا۔ اور کسی صورت رکنے کا نام نہ لیتا تھا میں نے اُسے ذرا سا ٹوکا۔ تو وہ بپھر گیا۔ اور بولا۔" پریم صاحب! آپ اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہیں؟ زندگی میں دو چار اچھے شعر جو آپ نے کہے ہیں۔ وُہ بھی قتیل شفائی کا چربہ ہیں۔

قتیل! اگر تم میرے دوست نہ ہوتے تو مجھے اِس الزام پر یقیناً غصہ آ جاتا۔ لیکن مجھے تو تمہارے تئیں سیٹھی کے بے پناہ خلوص اور عقیدت مندی پر پیار سا آ گیا تھا۔ کیونکہ صرف وہی تمہارا گرویدہ نہیں۔ مَیں خود بھی تو ہوں۔ تمہاری زندگی، شخصیت اور دوستی سے مَیں نے بہت کچھ سیکھا ہے اور شاعری میں تمہارے البیلے اسلوب اور طرزِ نگارش کا آج بھی قتیل ہُوں۔

قتیل! ۔۔۔ اگر میری یہ بھولی بھٹکی آوارہ آواز تمہارے در تک پہنچ جائے تو اس خاک بسر کو اپنے سینے سے لگا لینا اور اس جوگن کی جھولی پیار کے پھولوں سے بھر دینا۔ کہ یہی آج تم سے میری دوستانہ درخواست ہے۔ ۔۔۔ اس دُعا کے ساتھ کہ ہم پھر بہت جلد ملیں۔ اچھا اب میرا سلام لو۔

خُدا حافظ!! ۔۔۔۔

وہ گھر پر نہیں ہیں

رام لعل

جس روز میں لاہور سے واپس آیا تو امرتسر سے لکھنؤ جانے والی گاڑی کے فرسٹ کلاس کے ڈبے میں کئی لوگ بھر گئے تھے۔ دو برقعہ پوش لڑکیاں اور ان کا بھائی جو دہلی جا رہا تھا۔ میری منزل لکھنؤ تھی۔ چار اور مسافر جالندھر تک کے تھے۔ چاروں لڑکیاں جو پنجابی تھیں۔ انہی کے درشن کرنے کے لئے چھ سات لڑکے کاریڈور میں گھوم گھوم کر تاک لیتے تھے۔ بلکہ یوں کہا جائے کہ آنکھیں سینک رہے تھے۔ لڑکیاں واقعی خوبصورت ہوں تو انہیں ضرور دیکھنا چاہیئے اور اس کے ساتھ آنکھیں بھی لڑانی چاہئیں اور موقع ملے تو انہیں --- شریفانہ انداز سے چھیڑنا بھی چاہیئے کیونکہ اس سے لڑکیاں واقعی خوش ہوتی ہیں۔ لیکن وہ لڑکیاں بس اتنے ہی میں بڑی خوش نظر آ رہی تھیں۔ انہی لڑکوں کی وجہ سے ان کی اہمیت بڑھ گئی تھی۔ ایک گاؤں کے قریب سارے لڑکے زنجیر کھینچ کر اتر گئے۔ اور لڑکیاں ہمیں --- پاکستان سے آنے والے چار مسافروں کو --- یو پی کے رہنے والے سمجھ کر پنجابی زبان میں چٹر پٹر کرنے لگیں۔ پھر وہ ایک دوسرے کے ہاتھ بھی دیکھنے لگیں۔ کس کی قسمت میں کیا لکھا ہے --- وہ یقیناً اپنے اپنے ہاتھ کی لکیروں میں ایک اچھے خصم کا دولہا، محل، گاڑی اور ان کے سارے سکھوں کے سپنے دیکھ رہی تھیں جو ہر لڑکی کو ضرور دیکھنے چاہئیں۔ چاہے حقیقت اس کے برعکس نکلے۔ میں چور نظروں سے ان سب کی آنکھوں میں لہراتے ہوئے سپنے دیکھ رہا تھا اچانک انہیں گھروں کے چوکے میں برتن مانجھتے، نل کے نیچے بیٹھ کر کپڑے دھوتے اور فرش پر گیلے کپڑے کا پوچا مارتے ہوئے دیکھنے لگا اور انہیں اپنے آدمیوں کے ہاتھوں اور ان کے ہاتھوں ان کے بچوں کو پٹتے ہوئے بھی دیکھ لیا۔

ایک لڑکی کہہ رہی تھی --- میں جب بارہ سال کی تھی تو ایک جوگی نے میرا ہاتھ دیکھ کر کہا تھا --- تیری قسمت میں سات دروازے آئیں گے تو چھ دروازوں میں مت جانا، ایک دروازے میں جانا۔ اگر تو ٹھیک دروازے میں داخل ہو گئی تو تو ہمیشہ راج کرے گی۔

خاطر غزنوی نے ایک چھوٹا سا گیت لکھا تھا ---

دھان کے کھیت کی ہر اک لڑکی
کالے کیچڑ میں لتھڑی تھی،

لیکن سب کے گیت اچھے تھے۔

لڑکیاں جب زور زور سے ہنس رہی تھیں تو میں بہت اداس ہو کر کھڑکی کے باہر دیکھ رہا تھا۔ اس اثنا میں پیلی جانے والی دونوں لڑکیوں نے اپنے اپنے برقعے اتار کر کسی ایک بیگ میں ڈال دیئے تھے۔ اور وہ پنجابی لڑکیاں انکی طرف اپنی ہنسی بھول کر بڑی حیرت سے دیکھنے لگی تھیں کیونکہ وہ دونوں بھی انہی کی مانند سڈول اور چھریری اور دلکش تھیں۔ لڑکیوں کی ذات اس لئے دلکش ہوتی ہے کہ وہ ایک دوسرے کے جسموں میں ایک ہی چیز دیکھنے کی متمنی ہوتی ہیں۔ ان کے دوپٹے ان سے کس طرح لوٹ کر پیار کریں گے۔

پھر وہ لڑکیاں جالندھر اسٹیشن پر اتر کر چلی گئیں تو ہم لوگ ایک دوسرے سے پہلی بار متعارف ہوئے۔

ثمینہ قریشی نے میرے بریف کیس کے اوپر رکھی ہوئی قتیل شفائی کی ایک کتاب گفتگو دیکھ لی تھی۔ مجھ سے متعارف ہوتے ہی اس نے وہ کتاب دیکھنے کے لئے مجھ سے مانگ لی تھی۔ جس وقت میں اور بنیاد اشرف ہندوستانی ریلوں کے بارے میں باتیں کر رہے تھے دونوں بہنیں سر جوڑ کر اس کتاب کا ایک ایک شعر پڑھ رہی تھیں۔ دوسری بہن کا نام صغرا تھا۔ کیا شعر کا اثر واقعی کسی کسی کے لئے اتنا فوری ہوتا ہے کہ چہرہ کبھی لال ہوتا ہے کبھی اچانک بالکل بجھ سا جاتا ہے! میرا جی چاہا بنیاد اشرف سے کہوں ریل کی باتیں چھوڑیں، یہاں سب ٹھیک ہے جس طرح وہاں سب ٹھیک ہے۔ اگر لڑکیاں میرا قلم لے کر اپنی پسند کے اشعار پر نشان لگاتی رہیں تو میں بھی انہی اشعار کو اطمینان سے بعد میں پڑھوں گا۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ بنیاد اشرف لدھیانہ تک ہندوستان پاکستان کی باتیں کرتا رہا اور میں سنتا رہا۔ اور پھر ان سب نے ناشتہ دان کھول کر کھانا لگایا۔ مجھے بھی شریک کر لیا۔ میں نے ان کے لئے بہت سے تازہ پھل خریدے۔ سونے کا وقت ہو گیا تو سب اپنے اپنے برتھ پر لیٹ گئے۔ ٹیوبیں آف کر دی گئیں۔ شٹر اور چٹخنیاں چڑھا دی گئیں۔ میں نے اوپر کے برتھ پر لیٹے لیٹے بیڈ لائیٹ آن کر لی اور "گفتگو" کے اوراق الٹنے لگا۔ تھوڑی دیر پہلے کون کون سے شعر پر دونوں بہنوں کی نظریں ٹکی سی رہ گئی تھیں اور ان کے چہروں پر اچانک شفق لہرائی تھی اور آنکھوں میں بجلی چمکی اور بجھی تھی۔

اس نے جھٹکا اپنی بھیگی زلف کو اور اس کے بعد
دور تک پھیلا ہوا سایوں کا اک سیلاب تھا

بر سرِ محفل سبھی نے پا لیا اعزازِ جام
ایک دیوانہ تڑا نا واقفِ آداب تھا

دشمن کے تن پہ گاڑ دیا میں نے اپنا سر
میدانِ کارزار کا پانسہ پلٹ گیا

تھی ہم آغوشی مگر کچھ بھی مجھے حاصل نہ تھا
وہ اک ایسا لمس تھا جس میں بدن شامل نہ تھا
ہم نے کاٹے پیڑ تو سایوں کی یاد آنے لگی

لیکن اب حرفِ ندامت سے بھی کچھ حاصل نہ تھا
پر لگا کر اڑ گئے آخر مری نیندوں کے ساتھ
پیار کے وہ خواب جن کا کوئی مستقبل نہ تھا

نورجہاں کوئی نہ کوئی یوں تو سب ، کی تھی
دولت سے ایک شخص جہاں گیر ہو گیا
جاتا کہاں بھلا تری محفل کو چھوڑ کر
میں آپ اپنے پاؤں کی زنجیر ہو گیا

شک ہو چلا تھا مجھ کو خود اپنی ہی ذات پر
جھانکا تو اپنے خوں کے اندر بھی میں ہی تھا
ہوں گے مرے وجود کے سائے الگ الگ
ورنہ برون در بھی پس در بھی میں ہی تھا
آخر مجھے پناہ ملی اپنے آپ ، میں
مقصاں ہو جس میں روح ، وہ پیکر بھی میں ہی تھا

کھلی تو نہیں یارو راستے کی تنہائی
کوئی ہم کو دکھلائے چل کے دو قدم تنہا

تجھے بھی ڈر ہے کسی کا تو دور سے پڑھ لے
لکھی ہوئی ہے دلوں کی پکار چہروں پر
میں تیری بزم میں کس کس کی دشمنی لیتا
لکھا تھا نام ترا بے شمار چہروں پر

سنسان یوں تو کب سے کہسار بازدید
کانوں میں گونجتا ہے برابر کسی کا نام

ہمیں گواہ بنایا ہے وقت نے اپنا
بنام عظمت کردار، آؤ سچ بولیں
سنا ہے وقت کا حاکم بڑا ہی منصف ہے
پکار کر سر دربار، آؤ سچ بولیں
بجا کہ خوئے وفا ایک بھی حسیں میں نہیں
کہاں کے ہم بھی وفادار، آؤ سچ بولیں

میں خودکشی کے جرم کا کرتا ہوں اعتراف
اپنے بدن کی قبر میں کب سے گڑا ہوا ہوں

شب الم کے بھی ہوتے ہیں کچھ نہ کچھ آداب
تڑپنے والے سحر تک تو انتظار کریں

کوئی دو ہفتے پہلے لاہور میں قتیل شفائی کیساتھ ان کے گھر پر ملاقات ہوئی تھی جب انہوں نے مجھے اور ڈاکٹر آغا سہیل کو چائے پر مدعو کیا تھا۔ وہاں طاہر تونسوی، سلیم اختر اور مشکور حسین یاد بھی موجود تھے۔ وہ خلوص و محبت سے ایک دوسرے کے دل آنکھوں کی راہ سے اترنے کا موقع تھا۔ اب میرے سامنے ثمینہ اور صغرا کی آنکھیں تھیں جن کی وساطت سے میں قتیل کے فکر و فن کے گہرے سمندر میں اترنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ دونوں محو خواب تھیں۔ ان کے ساتھ جو باتیں ہو سکی تھیں ان سے مجھے ان کی تعلیم و تربیت کا بہت تھوڑا سا اندازہ ہو پایا تھا۔ انہوں نے بصد اصرار مجھے قیمے کے جو پراٹھے کھلائے تھے اور قتیل شفائی کے ساتھ ہوئی میری ملاقات کے ذکر پر جس طرح بار بار آنکھیں جھپکائی تھیں ان کا رشتہ قتیل سے جذباتی سطح پر تو ملایا جا سکتا تھا اور یہ بھی خیال آتا تھا کہ انہوں نے اسے مشاعروں میں یا ریڈیو یا ٹی وی پر ضرور سنا ہوگا۔ کیونکہ قتیل وہاں کا بہت مقبول شاعر ہے اور چالیس سال سے زائد عرصہ سے شعر کہہ رہا ہے لیکن جدیدیت کے اس دور میں کیا وہ اسے مسترد کرنے کی بھی ذہنی سطح رکھتی ہے کہ نہیں اس کا مجھے پتہ نہیں چل سکا تھا۔ میں اس خوش فہمی میں بھی مبتلا ہونے کے لئے تیار نہیں تھا کہ ساری خوبصورت لڑکیاں شاعروں کے کلام میں خصوصاً غزلوں کے اشعار میں خود کو دیکھنے کی عادی ہوتی ہیں۔ شانتی نکیتن کی ایک نوعمر طالبہ نے جو پیرا سائیکس پر ریسرچ کر رہی ہے۔ اور شعر و ادب میں بھی بڑی دلچسپی رکھتی ہے گذشتہ سال میرے سامنے ہمارے دور کے کتنے شاعروں کو یہ کہہ کر اگلے وقتوں، کی کھائی میں دھکیل دیا تھا کہ یہ لوگ اپنی شہرت کی غلام گردشوں میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔، ان کے یہاں جن عورتوں کا ذکر ستمگر، بے وفا، عدو، زنجیر، ہرجائی بت، وغیرہ استعاروں کے حوالے سے آتا ہے وہ ہم نہیں ہو سکتیں، وہ کوئی دوسری ہی دنیا کی مخلوق ہوگی۔

لائٹ آف کرکے میں نے سونے کی کوشش کی تو مجھے وہ بحث یاد آئی جو ہم نے قتیل شفائی کے گھر سے نکل کر کرشن آباد کے چوراہے پر

ایک دکان سے سگریٹ خریدتے وقت کی تھی۔ ہماری گفتگو میں فراق، قدرت اللہ شہاب اور فیض احمد فیض کے بھی حوالے آئے تھے اور ہم سب فیض کی اس رائے سے متفق تھے کہ قتیل کا لہجہ بنیادی طور پر مطربانہ ہے لیکن اسکی فکر میں یقینی طور پر دردمندی کا بھی ایک واضح احساس موجود ہے۔

صبح چار بجے گاڑی نجیب آباد اسٹیشن پر رکی تو مجھے اچانک محسوس ہوا میرے ہمسفر یہاں اتر جانے کی تیاری میں مصروف ہیں۔ میں نے کروٹ لے کر نیچے دیکھا بنیاد اشرف میری طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ بولا۔ میں آپ کو جگانے والا تھا۔ میں اور صغرا یہیں اتر رہے ہیں۔ چند گھنٹوں کے لئے۔ کوٹ دوارہ میں ہماری رشتہ داری ہے۔ وہاں ایک غمی ہو گئی تھی۔ ثمینہ آپ کے ساتھ بریلی تک جائے گی۔ براہ کرم اس کا خیال رکھیے گا۔"

صغرا برقعہ اوڑھے، نقاب اٹھائے خدا حافظ کہتی ہوئی اس کے پیچھے پیچھے باہر چلی گئی۔ ثمینہ قریشی اپنے برتھ پر بیٹھ کر کھڑکی میں سے انہیں قلی کے سر پر سامان لدوائے ویٹنگ روم کی طرف جاتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ گاڑی چلنے کو ہوئی تو کہرے میں ڈوبی ہوئی سنسان اسٹیشن کی فضا میں چائے، گرم چائے کی آواز ابھری اور میں جلدی سے اوپر کے برتھ سے نیچے آ گیا۔ ثمینہ نے جلدی جلدی گرم گرم چائے کے جلتے ہوئے ہاتھوں سے دو کلہڑ تھام لئے اور میں نے چائے والے کو پیسے دیکر اپنا کلہڑ تھام لیا۔ بھاپ دیتی ہوئی تپی ہوئی مٹی کی خوشبو ہونٹوں سے ہو کر دل و دماغ تک پہنچی تو میں نے کہا۔ قتیل شفائی کا ایک شعر یاد آ رہا ہے۔

مجھ کو اپنے دیس کی مٹی کافی ہے
کیا رکھا ہے نسلوں اور زبانوں میں

اس نے میری طرف عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ کچھ دیر خاموش رہی چائے پی کر کلہڑ کھڑکی سے باہر پھینک چکی تو بولی۔ قتیل مجھے بھی پسند ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ آپ ان سے مل کر لوٹ رہے ہیں۔"

"کیا آپ کی بھی ان سے ملاقات ہو چکی ہے؟"

۔ جی نہیں جب کالج میں پڑھتی تھی تو ایک بار وہ ہمارے یہاں آئے تھے۔ ان سے میں نے بھیڑ میں ہاتھ بڑھا کر آٹو گراف لیا تھا"

"اچھا۔ کوئی شعر بھی لکھا تھا انہوں نے!"

وہ شرما گئی "جی نہیں۔ اتنی مہلت ہی کہاں دی لڑکیوں نے۔ بس اپنا نام لکھ دیا تھا جلدی جلدی۔"

"آپ کو ان کے کچھ شعر یاد ہیں"

وہ سر جھکا کر سوچنے لگی۔ پھر جیسے یاد کر کے بولی "

دیکھ لینا، گھر سے نکلے گا نہ ہمسایہ کوئی
اے مرے یارو، مرے درد آشنا و چپ رہو

شعر سنا کر وہ دھندلے شیشے کے پار دیکھنے لگی۔ میں نے کہا "بس!"

" دو تین شعر اور یاد ہیں ۔

داد سفر ملی ہے کسے راہِ شوق میں
ہم نے مٹا دیئے ہیں نشاں اپنے پاؤں کے
دکھلا گیا آفتاب کچھ ایسی بلا کی دھوپ
رہ جائیں گے زمیں پہ کچھ داغ چھاؤں کے

اور ـــ

کچھ سنا تم نے ؟ گئے موسم کے لوگ
پتھروں سے پھولوں کو تولیں گے آج

" بس ! "

ایک وعدہ تھا جو شیشے کی طرح ٹوٹ گیا
حادثہ کب یہ ہوا ، کیسے ہوا ، یاد نہیں

ہر سمت ہیں درد کے جزیرے
دیکھو تو ذرا نکل کے گھر سے
آئی تھی کہیں سے زرد آندھی
پھل توڑ کے لے گئی شجر سے

بس ! " وہ شرما کر بولی ۔ " آپ سنائیے اگر یاد ہوں ۔ "

میں نے جواب دیا ۔ " مجھے بہت کم شعر یاد ہیں ۔ افسانے کا آدمی ہوں ۔ پورے پورے ناول سنا سکتا ہوں ۔ دو مصرعوں شعر یاد نہیں رکھ سکتا ۔ آپ کو قتیل کی ایک اور کتاب دکھاؤں ! "

یہ کہہ کر میں نے بریف کیس کھولا ۔ یہ بھی سوچتا رہا اس لڑکی نے میرے تصور کے برعکس قتیل کے بالکل دوسرے شعر سنائے ہیں ناہید کی مانند وہ بھی روایتی شاعری کو شاید پسند نہیں کرتی چھتنار کے صفحے الٹتے پلٹتے وہ لڑکی مجھے ایک دلہن کے روپ میں بھی دکھائی دینے لگی تھی ۔ جس طرح ہر لڑکی ایک نہ ایک دن عروسی جوڑے میں پیلی اپنے سسرال چل دیتی ہے ۔

" اچھا سنیئے ۔ قتیل نے اپنے کسی دوست کی بیٹی کی رخصتی کے موقع پر یہ نظم لکھی تھی ۔

" چھوٹی سی دلہن تو ہے بڑے باپ کی بیٹی
اللہ کرے تیرے بھی اوصاف بڑے ہوں
سسرال کے آنگن میں جو اترے ، تری ڈولی
تعظیم کو خود تیرے ہی اوصاف کھڑے ہوں "

"لائیے۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر کتاب میرے ہاتھوں سے لے لی۔ اور بولی۔ قتیل نے یہاں ایک روایت پرست ہونے کا ثبوت دیا ہے جب کہ دوسری نظموں میں وہ ایک عام آدمی کی طرح سوچتا ہوا ملتا ہے۔ عام اور حقیقت پسند آدمی کی طرح۔ یہ کتاب میں پڑھ چکی ہوں۔" وہ کئی صفحات کو ادھر اُدھر پلٹ کر بولی۔ " حسیں قہقہوں کی صدا آرہی تھی

پھر آج ان کے در پر جو دی میں نے دستک

خلافِ توقع یہ آواز آئی —

وہ گھر پر نہیں ہیں

اور یہ نظم۔ کل کا رشتہ۔ آج کے وصل کی مدہوش فضاؤں سے پرے

کاش ہم ایک نظر ڈال سکیں

اپنے جذبات کی چھاؤں سے پرے

کوئی رشتہ جہاں باقی نہ رہے گا ہم میں۔ فقط اک رشتۂ ماضی کے سوا،

اور اس نظم میں۔ کل کی بات ہے۔

میں نے بھی اس دروازے پر دستک دی تھی

پہلے تو اک فانوس مارا کتا بھونکا

پھر کتے کو ڈانٹ پڑی

خاموش رہو

ہم جس عہد میں جی رہے ہیں اس میں وہ اچانک اس قسم کی نصیحتیں کرنے بیٹھ جائیں۔

چومے گی قدم تیرے تمناؤں کی منزل

ماں باپ کی دکھلائی ہوئی راہ پہ چلنا

تیرے لئے سسرال ازل بھی ہے ابد بھی

ڈولی سے چلی ہے تو جنازے سے نکلنا

وہ ڈولی میں بیٹھتی ضرور ہے۔ صرف ایک بار۔ لیکن اس کا جنازہ ہر روز نکلتا ہے۔ اس کا ایک وجود ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جاتا ہے۔ ہر ریزہ ایک جنازہ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ان پر کیوں نہیں نظر جاتی ان کی!"

وہ یکایک رک گئی۔ پتہ نہیں وہ اور کیا کیا کہنا چاہتی تھی۔ شاید ڈر گئی کہیں آنسو نہ نکل پڑیں۔ اٹھ کر اپنا سامان سمیٹنے لگی۔ میں نے اس کا بستر باندھ دینے کی پیش کی تو وہ شکریہ کہہ کر باتھ روم میں چلی گئی صابن تولیہ اٹھا کر۔ میں کمپارٹمنٹ میں تنہا ہو کر دیپالی اور رچنا کے بارے میں سوچنے لگا۔ دیپالی سین گپتا بھی ایک روز دلہن بن کر بال اوی نیو کے ایک شاندار بنگلے میں سے جائی گئی تھی۔ لیکن وہ اپنے ماضی سے اپنا رشتہ منقطع نہ کر سکی۔ چاہتی تھی انل کپور اس کے ایک اچھے۔ بہت اچھے دوست کی حیثیت سے آیا

جایا کرے۔ سین گپتا یہ گوارہ نہ کر سکا۔ ان کے دو بچے بھی ہو چکے تھے لیکن حسد کی آگ نے ان کی ازدواجی زندگی کو راکھ بنا کر چھوڑا۔ رچنا سبھراون کو اس محلے میں رہنا منظور نہ تھا جس میں کبھی رنڈیاں آباد تھیں۔ وہ ذہنی طور پر خود کو ویسی ہی ایک عورت تصور کرنے لگی تھی۔ جس کے جسم کا مال و دولت کے عوض اس کا شوہر ہر روز سودا کیا کرتا ہو! اسے نہرو یونیورسٹی میں فیلوشپ مل چکی ہے اور بظاہر اپنی ریسرچ میں بے حد مصروف ہے اور مطمئن بھی لیکن کبھی کبھی وہ بہت دکھی ہو کر ان بائیس دنوں کو بے طرح یاد کر کے سہم اٹھتی ہے۔ جب اس کا شوہر ہر روز اسکی عصمت لوٹتا تھا۔

قتیل شفائی ایک اچھا، سچا اور خوبصورت

شاعر ہے اور ترقی پسند شعری روایت میں ایک

زندہ رہنے والا نام ہے۔

ــــــــــ ڈاکٹر تبسم کاشمیری

قتیل شفائی کی ابتدا

قمر جلال آبادی

قتیل شفائی نے جب ہری پور ہزارہ کی غیرادبی اور سنگلاخ زمین میں شعروادب کے پھول کھلانے شروع کئے اس وقت میں لاہور سے اردو کا ہفتہ وار رسالہ "سٹار" نکال رہا تھا، قتیل شفائی کی پہلی غزل "سٹار" میں شائع ہوئی ان کی ابتدا میں انتہا کی جھلک تھی۔ ہماری خط و کتابت شروع ہوئی پھر ہری پور ہزارہ اور پشاور کے مشاعروں میں ان سے ملاقاتیں ہوئیں۔ خطوط کے ذریعے "نصف" ملاقاتیں ہوتی رہیں پھر بمبئی میں ملاقاتیں ہوئیں۔ حال ہی میں ایک بار پھر قتیل سے بمبئی میں ملاقات ہوئی، وہ میرے ہاں تشریف لائے۔ پھر ان سے بابا بہادر شاہ کے ہاں اور محترم دوست گوسوامی ہربنس لال خضر اور ان کے بیٹے منوج کمار کے ہاں ملاقاتیں ہوئیں، ذاتی ملاقاتیں کم بھی ہوں تو کیا ہوا، ؟

؎ روز ملنے پہ نہیں نسبتِ عشقی موقوف

عمر بھر ایک ملاقات چلی جاتی ہے

اردو ادب کے شیدائی ایک مشہور شاعر کے بارے میں کیا جاننا چاہتے ہیں۔؟ ان کا نام؟ ان کا نام ہے محمدؐ اورنگ زیب خاں۔ تاریخ پیدائش ہے ۲۴ر دسمبر ۱۹۱۹ء۔ ان کے والد کا نام فیروز خاں، والدہ کا نام منور سلطانہ۔ قتیل تخلص کیوں رکھا؟ حضرت حسن حسین کی شہادت کے تذکرے سننے، شدید اثر ہوا۔ دل پر رقت طاری ہوگئی۔ اسی عظیم المیئے کی یاد میں قتیل تخلص رکھا، شفائی کیوں؟ ان کے شاعری کے استاد ہری پور ہزارہ کے عالم فاضل اور شاعر محمد یحییٰ شفا ہیں، ان کی نسبت سے قتیل شفائی ہوگئے، یہ پہلو قتیل کے وفادار مزاج کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ قتیل کے والد سخن فہم تھے اور ہزارہ کی زبان "ہندکو" کے شاعر بھی تھے۔ ایک دن وہ "الف لیلیٰ" لے آئے اور قتیل سے کہا۔ پڑھ کر سناؤ پھر "حاتم طائی" اور "فسانۂ عجائب" لائے اور قتیل سے سنتے رہے۔ قتیل کے دل میں مطالعہ کا شوق پیدا ہوا۔ اپنے والد کی شاعری اور سنیما کے ریکارڈ شدہ کردہ خود شعر کہنے لگے سکول میں وہ بزمِ ادب کے سکریٹری چنے گئے، ایک ادبی بزم کی نشستوں میں شامل ہونے لگے۔ بزم کی ایک نشست میں بہترین غزل کہنے پر انہیں ایک کتاب "سوزِ بیدل" انعام میں ملی۔ قتیل نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ اپنے والد کے مذہبی خیالات کا ان پر گہرا اثر ہوا۔ وہ خدا اور رسول کو مانتے ہیں

والد کے انتقال کے بعد قتیل کے مذہبی خیالات نے انہیں ڈانواں ڈول ہونے نہیں دیا۔ تعلیم بند کرکے قتیل نے سپورٹس کی دکان کھولی نہیں چلی گراموفون ریکارڈز کا کام شروع کیا تاکامی ہوئی بزازی کی دکان شروع کی۔ وہ بھی بند کرنا پڑی آخر تلاش معاش میں ہری پور ہزارہ چھوڑ کر راولپنڈی چلے گئے وہاں مری ٹرانسپورٹ کمپنی میں ۶۰ روپے ماہوار پر ملازم ہوئے بطور شاعر ان کی شہرت پھیل رہی تھی اس لئے سب لوگ عزت کرتے تھے کمپنی نے انہیں برانچ منیجر کا عہدہ دے کر مری بھیج دیا اور ۱۲۰ روپے تنخواہ کردی۔ ۱۹۴۶ء میں ماہنامہ "ادب لطیف" کے چوہدری نذیر احمد نے قتیل کو لاہور بلوایا اور آپ "ادبِ لطیف" کے اسسٹنٹ ایڈیٹر مقرر ہوگئے سینئر اسسٹنٹ ایڈیٹر فکر تونسوی کی تنخواہ ۷۵ روپے ماہوار تھی چونکہ آپ نئے تھے آپ کی تنخواہ ۶۰ روپے مقرر ہوئی۔ چار مہینے کے بعد واپس راولپنڈی چلے گئے اب ان کا کلام چوٹی کے ادبی رسائل "ساقی"، "ادب لطیف"، "ہمایوں"، اور "نیرنگِ خیال" میں شائع ہونا شروع ہوگیا انہی دنوں میں لاہور کے ایک فلم ساز راولپنڈی میں ان کے پاس آئے اور ایک فلم کے گانے لکھوانے کے لئے انہیں لاہور چلنے کی دعوت دی یکم جنوری ۱۹۴۷ء کو قتیل لاہور میں پہنچے۔ پاکستان بن گیا اور پھر وہ لاہور کے ہو رہے۔ آج کل پاکستان کی فلمی دنیا میں وہ چوٹی کے نغمہ نگار ہیں۔ اور ادبی دنیا میں ان کا نام مقبول ترین شعرا کی صفِ اوّل میں ہے، ان کی فلموں کو بیس کے قریب ایوارڈ مل چکے ہیں اور کتابوں کو بھی۔ آدم جی پرائز وہاں کا سب سے بڑا انعام ہے جو انہیں ان کی شاعری کی کتاب "مطربہ" پر ملا ہے۔ ان کی شاعری کے دس مجموعے شائع ہوکر عوام و خواص سے پسندیدگی کی سند حاصل کرچکے ہیں، وہ مشاعروں کے کامیاب شاعر ہیں تیس برس تک وہ ترنم سے پڑھتے رہے اب بارہ سال سے تحت اللفظ پڑھتے ہیں، انہوں نے ہر محاذ پر اپنی شاعری کو اجاگر کیا ہے۔ ادب۔ فلم۔ ریڈیو۔ ٹیلی وژن، ریکارڈنگ کمپنیاں، مشاعرے، قوالوں غزل نوازوں اور مغنّیوں کی محفلیں غرض جہاں جہاں شاعری کی پہنچ ہے کوئی قتیل کو نظرانداز نہیں کرسکتا ـــــــــ

قتیل ملنسار ہیں۔ خوددار ہیں۔ مغرور نہیں، سب سے بنا کے رکھتے ہیں، انہیں دوستی کے اچھے تجربے ہوئے ہیں (احمد ندیم قاسمی) اور بُرے تجربے بھی (نام دینے کا کوئی فائدہ نہیں) وہ اصولوں کے پابند ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے ہندوستان اور پاکستان کے ادب پر جب کمیونزم کا گہرا اثر تھا (اور آج بھی ہے) بہت سے شاعر اور ادیب اعتقادات کی وجہ سے کمیونزم کے قائل تھے۔ اور بہت سے وقت کا فائدہ اٹھانے کے لئے ہو لگا کے "سرخوں" میں نام کرنا چاہتے تھے لیکن قتیل کی انفرادیت دیکھئے، وہ ان سب سے الگ کھڑے ہیں۔ قتیل کی ایک کتاب کا پیش لفظ مشہور اشتراکی شاعر فیض احمد فیض نے لکھا ہے، لیکن وہ کتاب قتیل کے ان شعروں سے شروع ہوتی ہے،

ؔ　سب حمد و ثنا تیرے لئے ہے مرے مولا
تو وہ ہے کہ جس نے مجھے توفیقِ ہنر دی
ممنون مرا دیدۂ بینا ہے کہ تو نے
دنیا کو دیا حسن تو مجھ کو بھی نظر دی

اولاد کے معاملے میں قتیل خوش نصیب ہیں، ان کا لڑکا تنویر قتیل پنجابی زبان کا شاعر ہے اور ریڈیو پر گاتا ہے ان کی لڑکی ثمینہ کی شادی ہوچکی ہے وہ اردو اور پنجابی کی شاعرہ ہیں۔

قتیل پاکستان رائٹرز گلڈ کے وفد میں ماسکو جاچکے ہیں۔ تین بار انگلستان کے مشاعروں میں شرکت کرچکے ہیں

اب جبکہ ہر محاذ پر وہ کامیاب ہو چکے ہیں ان کی ایک ہی آرزو ہے کہ وہ مالی طور پر اتنے آسودہ ہو جائیں کہ معاش کے لئے مزید تگ و دو نہ کرنا پڑے ہری پور ہزارہ میں واپس چلے جائیں اور اطمینان سے وہاں شعر و ادب کی خدمت کریں۔

قتیل کی شاعری بحث سے بلند ہے۔ تنقید سے بالا تر ہے۔

پوری ادبی دنیا فیض احمد فیض کی اس رائے سے اتفاق کرتی ہے

"قتیل صاحب ایک زمانے سے تعریف و توصیف کے محتاج نہیں ایک زمانے سے ان کا شمار ملک کے معتبر شعرا میں ہوتا ہے اور ان کے کلام پر قبول عام کی مہر ثبت ہے"

اور فراق گورکھپوری کی اس رائے کو عوام و خواص کی پوری تائید حاصل ہے۔

"اس دور میں بہت کم شاعروں کو بھرپور کامیابی نصیب ہوئی ہے ان میں قتیل شفائی کا نام قابل رشک حیثیت کا مالک ہے"

قتیل مجسم محبت ہیں۔ آپ نے جب بھی محبت کی ہے ٹوٹ کر محبت کی ہے آج کی صحبت میں میں قتیل کی محبت کی کہانی ان کی شاعری کی زبانی سناتا ہوں۔ ان کی شاعری کے دوسرے پہلوؤں پر پھر کبھی لکھوں گا قتیل کی محبوبہ نے ان کے ساتھ نباہی نہیں وہ ان کی زندگی سے چلی گئی اور شاعری ان کی زندگی میں آ گئی۔

داؤ فرماتے ہیں ؎

جیت لے جائے مجھے کوئی نصیبوں والا
زندگی نے مجھے داؤ پہ لگا رکھا ہے

محبت کا آغاز

برہم ہوا تھا میری کسی بات پر کوئی
وہ حادثہ ہی وجہ شناسائی بن گیا!

ضرورت

چاندنی رات۔ فکر شعر و سخن
میں نے چاندی کے بت تراشے ہیں
ان میں تم روح پھونک دو ورنہ
میرے افکار سرد لاشے ہیں

پہلی ملاقات

سہما سہما سا اک سایہ ہلکی ہلکی سی اک چاپ
پچھلی رات مرے آنگن میں آ پہنچے وہ اپنے آپ

احساسِ محبت

یوں مجھ میں ترے لمس کا احساس رچا ہے
اپنے ہی بدن سے تری آجاتی ہے خوشبو

یک رنگی

یہ معجزہ بھی محبت کبھی دکھائے مجھے
کہ سنگ تجھ پہ گرے اور چوٹ آئے مجھے

شبِ وصال

اک برقِ سیم تن کی یہ قربتِ فراواں
شعلوں میں آ پڑی ہے کہ رات شبنمی کی
یہ لمسِ لب بہ لب میں کہ بے خودی کا عالم
رفتارِ دو جہاں ہو جیسے تھمی تھمی سی
احساس کی حدوں میں سہلا رہی ہے دل کو
اک پرتوِ صبا کی آواز ریشمی سی

ڈالیاں لدگئی ہیں پھولوں سے — خوشبوؤں سے مہک اٹھے سائے
جیسے گرکر دلہن کے ہاتھوں سے — ناگہاں عطر داں الٹ جائے

گر تم کہو تو شب کو بڑھادوں کچھ اور بھی — اپنے کہے میں صبح کا تارا ہے ان دنوں

محبوبہ کی بے رخی

دور تک چھائے تھے بادل اور کہیں سایہ نہ تھا
اس طرح برسات کا موسم کبھی آیا نہ تھا

وہ خط رقیبوں کے ہاتھ آیا لکھا تھا جو میرے نام تونے
کہاں کہاں کرچکی ہے رسوا تری یہ چھوٹی سی بھول مجھ کو

ہرجائی حسن

میں تیری بزم میں کس کس سے دشمنی لیتا
لکھا تھا نام ترا بے شمار چہروں پر
کس کس کا نام لاؤں زباں پر کہ تیرے ساتھ

ہر روز ایک شخص نیا دیکھتا ہوں میں
ڈرتے ہیں ان میں بھی نہ ہو اپنا کوئی رقیب
لیتے ہیں دوستوں سے بھی چھپ کر کسی کا نام
مجھ سے تو پوچھنے آیا ہے وفا کے معنی
یہ تری سادہ دلی مار نہ ڈالے مجھ کو
تو نے دیکھا نہیں آئینے سے آگے کچھ بھی
خود پرستی میں کہیں تو نہ گنوا لے مجھ کو

دھوکہ

کیسے کیسے بھید چھپے ہیں پیار بھرے اقرار کے پیچھے
کوئی پتھر تان رہا ہے شیشے کی دیوار کے پیچھے
ہونٹوں پہ مسکراہٹ آنکھوں میں ہے نمی سی
وہ سامنے ہیں پھر بھی باقی ہے کچھ کمی سی
وہ اُن کا ملانا مجھے اک صاحب زر سے
اوقات مری یاد دلا دی گئی مجھ کو
کچھ نام ہی لکھے تھے ابھی میرے قلم نے
کاغذ کی طرح آگ لگا دی گئی مجھ کو
سب سے ہنس کر ملنے والی کس نے تجھ کو سمجھا ہے!
ماپ رہے ہیں مفت میں لوگ سمندر کی گہرائی کو
پاگل پن تو دیکھو جس دن ڈولی اُٹھنے والی تھی
اپنے ہاتھ سے توڑ دیا اک دلہن نے شہنائی کو
دشمنی مجھ سے کیے جا مگر اپنا بن کر
جان لے لے مرے صیاد مگر پیار کے ساتھ
یار و کسی قاتل سے کبھی پیار نہ مانگو
اپنے ہی گلے کے لئے تلوار نہ مانگو
نہ ہوگا اور جب کوئی تو آ بیٹھے گا پہلو میں
وہ دُنیا کو دکھانے کے لئے بیگانہ بنتا ہے

کھلے رہے ہیں ہزاروں آغوش صبح ہونے کے بعد تک بھی
مگر ترے حسن نے کسی دل کے ہاتھ میں ہاتھ بھی دیا ہے

اپنی وفا کے ساتھ ہے ان کی جفا کا ذکر
کانٹے سے لکھ رہے ہیں گل پر کسی کا نام

ترا جمال زر پرست کچھ تو کام کر گیا
ترا غرور بک گیا مرا خلوص مر گیا
کیسے منا رہی ہے تو،

دیکھ مری انمول شرافت لٹ کر بھی شرمندہ ہوں میں
جیت بھی لی اخلاص کی بازی ہار بھی اپنی مان رہا ہوں

بے وفائی

تھی ہم آغوشی مگر کچھ بھی مجھے حاصل نہ تھا
وہ اک ایساس تھا جس میں بدن شامل نہ تھا

مجھ میں رچی ہوئی تری خوشبو تھی اس لئے
بڑھ کے عدو بھی مجھ سے بغل گیر ہو گیا

کرتا رہا جو روز مجھے اس سے بدگماں
وہ شخص بھی اب اس کا تمنائی بن گیا۔

میرے بعد وفا کا دھوکہ اور کسی سے مت کرنا
گالی دے گی دنیا تجھ کو سر میرا جھک جائے گا

مانا جیون میں عورت اک بار محبت کرتی ہے
لیکن مجھ کو یہ تو بتا دے کیا تو عورت ذات نہیں

جدائی

اگرچہ مجھ کو جدائی تری گوارا نہیں
سوائے اس کے مگر اور کوئی چارہ نہیں
خوشی سے کون بھلاتا ہے اپنے پیاروں کو
قصور اس میں زمانے کا ہے تمہارا نہیں
منکر نہیں کوئی بھی وفا کا مگر قتیل

دنیا کے سامنے مرا انجام بھی تو ہے
اجڑ گیا تھا کسی زلزلے میں شہرِ وفا

نہ جانے پھر اُسے ہم نے بھی کیوں بسایا نہیں
قتیل کیسے کٹے گی یہ دوپہر غم کی

مرے نصیب میں ان گیسوؤں کا سایہ نہیں
ہم اُسے یاد بہت آئیں گے

جب اُسے بھی کوئی ٹھکرائے گا
باندھ کر سنگِ وفا کر دیا تو نے غرقاب

کون ایسا ہے جو اب ڈھونڈ نکالے مجھ کو
کبھوں شریک غم بناتے ہو کسی کو اے قتیل

اپنی سولی اپنے کاندھے پر اٹھاؤ چپ رہو
اس کی تصویر لئے بیٹھا ہوں آنکھوں میں قتیل

جس سے ملنے کی کوئی آس نہیں ہے یارو

واقعی قتیل کی ابتدا میں انتہا کی جھلک تھی۔

(قمر جلال آبادی)

قتیل ـ فن اور شخصیت کے حوالے سے

قمر اجنالوی، لاہور پاکستان

برنارڈ شا اپنی تعریف کرنے کے لئے کسی دوسرے آدمی کی ضرورت محسوس نہیں کرتا تھا بلکہ قلم اٹھا کر یہ فرض بھی خود ادا کرنے لگتا اور اپنے نقادوں کو بتاتا کہ وہ کیا ہے۔ مگر یہاں معاملہ کچھ مختلف ہے کیونکہ یہاں نقاد، مبصر اور اہل قلم حضرات قتیل شفائی کو بتا رہے ہیں کہ وہ کیا ہے۔ اگر نقاد حضرات میری جاں بخشی کر دیں تو یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ کوئی نقاد کسی شاعر کو بڑا نہیں بناتا۔ شاعر کا اپنا کلام اسے عظمت کے مقام پر فائز کرتا ہے اور اس کی اپنی اثر انگیز تخلیقات ہی اُسے بڑا شاعر بناتی ہیں۔ کولرج کے بارے میں نقادوں نے لکھا ہے کہ وہ اعلیٰ تخلیقی صلاحیت رکھتا تھا مگر اُسے نقادوں نے نہیں اس کی اپنی تخلیقی صلاحیتوں نے کولرج بنایا تھا۔

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ بڑا شاعر، بڑا ادیب کیسے بنتا ہے اور شیکسپیئر، گوئٹے، غالب، ٹیگور، اقبال، جوش کیوں بڑے ہیں؟ اس کا ایک جواب تو تخلیقی صلاحیت کے سلسلے میں اوپر گزر چکا ہے اور دوسرا مختصر ترین جواب یہ ہے کہ بڑے شاعر صرف اپنے دور کو نہیں بلکہ بعد میں آنے والی نسلوں کو بھی متاثر کرتے ہیں، ان کا وجدان اپنے ہی گرد و پیش کو نہیں دیکھتا بلکہ مستقبل کے دریچوں میں بھی جھانک لیتا ہے۔

بلیک مور ایک جگہ لکھتا ہے کہ ادب معروضی حقیقتوں میں اضافہ کا نام ہے، مگر یہ اضافہ اسی صورت میں ممکن ہے جب ادیب اور شاعر معروضی حقیقتوں کا بہتر شعور رکھتا ہو اور ان سے نتیجے بھی اخذ کرتا ہو۔ کسی طے شدہ پٹری یا لائن پر چلتے رہنے کا نام ادب نہیں۔ ہر بڑے شاعر اور ادیب کو اپنے ارد گرد رونما ہونے والے واقعات کا گہرا مطالعہ کرنا پڑتا ہے اور ان واقعات کے اچھے برے پہلوؤں سے کوئی حقیقت ترتیب دینے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ عام لوگوں کے نزدیک تخریب محض خرابی کی ایک صورت ہے مگر اہل نظر اسی خرابی میں ایک نئی تعمیر کا نقشہ دیکھ لیتے ہیں۔ پکاسو اپنے وقت کا بڑا مصور تھا مگر اس کی عظمت یا انفرادیت یہی ہے کہ وہ بدصورتی میں بھی رمز جمال تلاش کرتا ہے

(شاعری ہر دور کے معروضی حالات سے ابھرتی ہے اور شاعر اور شاعر زندگی اور اس کے مظاہر پر تنقید یا خیال آرائی کر کے اسے مزید نکھارتا سنوارتا ہے۔ وہ جدید شاعری جس کی راہیں جی ایم ہوپکنز نے اٹھارہویں صدی کے آخر میں ہموار کی تھیں اور جس کا آغاز ہمارے یہاں انیسویں صدی کے

آخر میں ہوا کتنی ہی حسین منزلوں سے گزرتی ہوئی سفر کرتی ن۔ م۔ راشد، فیض، فراق، ندیم، ساحر اور قتیل تک پہنچی ہے۔ اس وقت موضوع بحث صرف قتیل شفائی کی شاعری اور شخصیت ہے اس لئے جب میں معروضی حالات اور تخلیقی صلاحیتوں کے آئینوں میں قتیل کو دیکھتا ہوں تو اس کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کئے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ قتیل نے جس گہری نگاہ سے اپنے گرد و پیش کا مطالعہ کیا، معروضی حالات سے جو نتائج اخذ کئے اور جس فنی مہارت سے زندگی کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے اس کے حوالے سے وہ اس دور کا ایک بڑا شاعر بن کر ابھرا ہے۔

شاعری ہو یا افسانہ نگاری اس کے ارتقا کے لئے الفاظ، جذبوں اور اسلوب کی رسد پہنچنا بہت ضروری ہے۔ ہر بڑا شاعر اور بڑا ادیب اپنے مشاہدات و واردات کو یہ رسد مہیا کرتا ہے۔ قتیل کی شاعری کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت بڑی شدت کے ساتھ سامنے آتی ہے کہ وہ اپنی سپلائی لائن کا خاص خیال رکھتا ہے بلکہ اس کے لئے نئے نئے فنی ذرائع اختیار کرتا ہے۔ کبھی وہ نئے لفظ تراشتا ہے، کبھی نئے جذبے فراہم کرتا ہے اور کبھی نئے اسلوب کی تلاش میں تاثر کو وجد کرنے کے لئے مروجہ بحروں میں کاٹ چھانٹ کرتا ہے۔ کانٹ چھانٹ سے میری مراد یہ ہے کہ کسی مصرعہ کا ایک رکن حذف کر کے شعر میں نیا ردھم اور آہنگ پیدا کرنا قتیل کا ادبی اجتہاد ہے۔ مثلاً

گنگناتا ہے لہو یوں مری شریانوں میں
جیسے قیدی کوئی زندانوں میں

کوئی بڑا اور سچا شاعر کلاسیکی ادب، روایت اور اس کی عظمت سے انکار نہیں کرتا۔ اس کا روایت اور اس کے عرفان سے آگاہ ہونا ضروری ہے کیونکہ خود اس کا کلام کلاسیکی ادب کا حصہ ہو کر اس میں اضافہ کرتا ہے۔ قتیل کے متعدد اشعار اس معیار پر پورے اترتے ہیں جو صرف لوگوں کو یاد ہی نہیں بلکہ حوالوں کے کام آتے ہیں۔

حسن و جمال کا وجود اور اس کی مختلف کیفیتوں کا ادراک شاعر، ادیب اور مصور حضرات کو عام انسانوں کی بہ نسبت کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ حسن تو وہی ہے جسے لوگ صدیوں اور قرنوں سے دیکھتے چلے آ رہے ہیں اس کے بارے میں محسوس بھی کرتے ہیں مگر ہر شخص اپنے محسوسات کے اظہار پر قادر نہیں ہوتا، قدرت یہ فن شاعروں، ادیبوں، مصوروں کو ودیعت کرتی ہے۔ مگر یہاں بھی اس کے اظہار کے پیرائے مختلف اور شدت بیان کے درجے الگ الگ ہیں اور جو شاعر حسن و جمال کے لطیف احساسات کو معروضی حالات، نفسیاتی تقاضوں اور معاشرتی زاویوں سے پیش کرتا ہے۔ وہ اپنے عہد کے لوگوں کا ترجمان بن جاتا ہے۔

فرائڈ نے نفسیات کا علم بہت بعد میں دریافت کیا مگر اس سے صدیوں پہلے شاعر انسانی دکھوں کو زبان عطا کر چکا تھا، ہمارے یہاں کبیر، امیر خسرو اور مختلف زبانوں کے صوفی شعراء کے کلام میں زندگی کا ایسا نفسیاتی مطالعہ ملتا ہے کہ ان کی قوت مشاہدہ اور شعری اپروچ پر حیرت ہوتی ہے۔ مگر عہد بعہد کے معروضی حالات سے گزرتا ہوا جب زندگی کا یہ گہرا مطالعہ فیض احمد فیض تک پہنچتا ہے تو وہ اس حسین ترین اعتراف کے باوجود کہ ع

"تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے"

اپنے عہد کے معروضی حالات میں پکار اٹھتا ہے ؎

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا

اور جب قتیل اپنے گرد وپیش کو دیکھتا ہے، حسن ومحبت کے ہنگاموں سے گذرتا ہے۔ طبقوں کی نیلامی اور عورت کی شکست ومحرومی کا نظارہ کرتا یا سمجھتا ہے کہ دنیا کی اس منڈی میں حسن کے ساتھ پیار اور وفا کا بھی سودا ہوجاتا ہے تو اپنے احساس کا برملا اظہار کرتا ہے ؎

مجھے خبر ہے کہ ہر شام تیرے ہونٹوں نے
ہزار گیت بکھیرے ہیں اہلِ زر کے لئے
مجھے خبر ہے کہ مہکا ہوا بدن تیرا
بنا ہے دعوتِ نظارہ ہر بشر کے لئے
بُرا نہ مانے تو کہہ دوں، خدا کے گھر کی طرح
کھُلا رہا ہے ترا در بھی ہر بشر کے لئے

*

مجھے خبر ہے کہ میں وہ رئیس شہر نہیں
کہ جس کی جیب میں ذلّت کھنکتی رہتی ہے
وہ جس کے حجلۂ عشرت کی بے طلب اولاد
خود اپنے باپ کے دل میں کھٹکتی رہتی ہے

*

پھر وہ اس " دردِ مشترک " کا علاج تلاش کرتا ہے۔ اس کے نزدیک دولت ہی وہ " کھنکتی ہوئی ذلّت " ہے جس سے انسانی جذبوں کا بیوپار ہوتا ہے۔ اس لئے وہ سرمایہ پر وار کرتا ہے اور کہتا ہے ؎

یہ محبت، یہ وفائیں، یہ مروّت، یہ خلوص
ان کو سرمائے نے بے کار بنا رکھا ہے
حسن اور حسن کے ہر ایک صنم خانے کو
زر پرستوں نے جفا کار بنا رکھا ہے
آکہ اس دور کا معیار بدلنا ہے ہمیں
جس نے ہر ذہن کو بیمار بنا رکھا ہے

آ کہ اس جنسِ گراں قدر کو پیدا کریں
جس نے ہم سب کو خریدار بنا رکھا ہے
آ کہ اس فتنۂ زر پوش کو عریاں کر دیں
جس نے آفاق کو بازار بنا رکھا ہے

×

رچرڈ سن لفظ و معنی میں جو نفسیاتی تعلق ڈھونڈتا ہے، ہمارے یہاں یہ فن قتیل میں سب سے نمایاں نظر آتا ہے۔ وہ چونکہ خود تجربات کی کٹھالی سے کندن بن کر نکلا ہے، اس لئے اس کے الفاظ و معنی میں نفسیاتی ہم آہنگی بڑی شدید ہے چنانچہ میں نے "مطربہ" اور "گجر" سے جن اشعار کا حوالہ دیا ہے ان میں لفظ و معنی کا یہ گہرا تعلق بالکل واضح ہے۔ یہ نفسیاتی اپروچ ترقی پسند تحریک کے نتیجہ میں حاصل ہوئی جس نے نصف صدی اُدھر برصغیر کے تمام باصلاحیت شاعروں اور ادیبوں کو متاثر کیا۔ یہ دور ادب کے ساتھ ادیب اور معاشرہ کے بنیادی مسائل پر توجہ دینے کا دور تھا، یہی وجہ ہے کہ ترقی پسند تحریک نے وہ سوال اٹھائے جنہیں ماضی کے اہلِ قلم اکثر نظر انداز کرتے رہے۔

قتیل اس دور کے اُن باصلاحیت اور ذہین شاعروں میں شمار ہوتا ہے۔ جنہوں نے زندگی کے تقاضوں کو اپنے معروضی حالات کے پس منظر میں سمجھا اور مختلف طبقوں اور قبیلوں میں بٹی ہوئی انسانیت کے دکھ درد کو سماجی اذیتوں کے حوالے سے محسوس کیا۔ وہ شعر کو تجریدی آرٹ کا نمونہ نہیں بناتا۔ ساتر تزاد اور اس کے پرستار وجودیت کا نقشہ کھینچتے ہوئے کسی اور طرف نکل جاتے یا خود گم ہو جاتے ہیں مگر قتیل اسٹیج پر موجود رہتا ہے اور اپنی موجودگی کا احساس دلاتا رہتا ہے۔ اس کے اشعار حالات کی بہترین تصویر کشی کرتے ہیں مگر وہ جوائس کی مصوری کا کوئی خوابیدہ شاہکار نہیں جسے دیکھ کر انسان طلسم و خواب کے دھندلکوں میں گم ہو جائے بلکہ اس کی شاعری انسانی جسم در وح کی بھڑکتی تڑپتی پکار ہے جو سوئے ہوئے انسانوں کو بھی جھنجھوڑ کر بیدار کر دیتی ہے۔

قتیل شفائی کا دور ترقی پسند تحریک کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا ہے اور یہ دور اس لئے طویل اور دور رس ہو گا کہ اس دور کے شاعر نے کائنات کی بہت سی حقیقتوں کا ادراک ہی نہیں کر لیا بلکہ انہیں اپنے فکر و خیال کے سانچوں میں ڈھال کر اپنے پڑھنے والوں کو بھی ایک نیا شعور عطا کیا ہے، وہ عوام سے الگ تھلگ کسی حجلۂ عشرت میں نہیں بلکہ ان کے درمیان کھڑا کہہ رہا ہے ؂

مرا قلم مرے جمہور کی امانت ہے
اسے عوام کی بے چارگی ستاتی ہے
مرے قلم کی زباں کاٹ دی گئی لیکن
مرے قلم کی خموشی بھی گنگناتی ہے
مرے قلم کی رگوں میں وہ خون جولاں ہے
کہ جس سے عظمتِ انساں کی آنچ آتی ہے

کہ جس سے عظمتِ انساں کی آنچ آتی ہے
مرا قلم وہ مؤرخ ہے جس کے سینے میں
غمِ حیات کی تاریخ سرسراتی ہے
مرے قلم کو زمانہ تو کیا خریدے گا
کہ اکثر اس سے مشیت شکست کھاتی ہے

*

میں خود اسیر سہی، مرا فن اسیر نہیں
مرا قلم کسی جلّاد کا ضمیر نہیں

*

ماؤزے تنگ ایک ادبی نقاد بھی تھا۔ وہ کہتا ہے عوام شعر اور فن کو سمجھنے کا بہتر شعور رکھتے ہیں، کیونکہ انہیں زندگی کے حالات کا بہتر تجربہ ہوتا ہے، کوئی ادبی شہ پارہ یا عظیم شعر وہ نہیں جسے صرف چند خواص یا بڑے بڑے اہلِ علم ہی سمجھ سکیں بلکہ عظیم شعر وہ ہے جو شاعر کی زبان سے نکلے اور سننے والوں کے دلوں میں اتر جائے۔ لوگ پکار اٹھیں کہ یہ تو انہی کے دل کی بات ہے، مگر اس قسم کے اشعار کہنے کے لئے شاعر کو خود بھی انہی حالات سے گذرنا پڑتا ہے۔

قتیل کی شاعری نے شروع ہی سے ایک واضح اور عوامی رخ اختیار کر لیا تھا۔ اسلوب و لہجہ کے اعتبار سے بھی اور فکر و فلسفہ کے لحاظ سے بھی، مگر جس طرح اس کا اسلوب سادہ و رنگین ہے اسی طرح اس کا لہجہ بھی بڑا عام فہم بلکہ عوام پسند کہنا چاہیئے ایسا کہ اِدھر بات کہی اُدھر دل میں اتر گئی

کیا مصلحت شناس تھا وہ آدمی قتیل
مجبوریوں کا جس نے وفا نام رکھ دیا

*

ایک ذرا سا دل ہے جس کو توڑ کے بھی تم جا سکتے ہو
یہ سونے کا طوق نہیں یہ چاندی کی دیوار نہیں ہے

*

چلو اچھا ہوا کام آ گئی دیوانگی اپنی
وگرنہ ہم زمانے بھر کو سمجھانے کہاں جاتے

*

پربت پربت گھوم چکا ہوں، صحرا صحرا چھان چکا ہوں
ہر منزل کے حق میں لیکن کافر کا ایمان رہا ہوں

*

نہیں کرتی یہ کسی سے بھی وفا
زندگی ہے کہ طوائف کوئی

*

حالات کے قدموں پہ قلندر نہیں گرتا
ٹوٹے بھی جو تارا تو زمین پہ نہیں گرتا

*

ڈرتے نہیں زخموں سے ہم دار و رسن والے
پتھر نہ اٹھا ہم پہ شیشے کے بدن والے

*

چہرے پہ لکھی ہے پیاس لوگو!
پڑھ لو مجھے غم شناس لوگو!
میں عام سا ایک آدمی ہوں
اس شہر کے خاص خاص لوگو!

*

جب بھی آتا ہے مرا نام ترے نام کے ساتھ
جانے کیوں لوگ مرے نام سے جل جاتے ہیں

*

بنا دیئے گئے زندان قتیل ان اینٹوں سے
کہ جن کو شہر انا کی فصیل ہونا تھا

*

میں نے قتیل کو ہمیشہ ایک بڑا شاعر بھی اور ایک بڑا آدمی بھی سمجھا ہے۔ شاید دوسرے لوگ اس کی شاعری پر مجھ سے بہتر اظہارِ خیال کریں اس لئے میں شاعری کا ذکر چھوڑ کر اب اس کی شخصیت کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

جس طرح پھول کو خوشبو اور شمع کو روشنی سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح شاعر کو بھی اس کی ذات سے علیحدہ کرنا ممکن نہیں، وہ اپنی ذات میں ایک کائنات ہوتا ہے۔ قتیل کی شاعری کے ساتھ جب میں نے اس کی شخصیت پر غور کیا تو یہاں جناب فراق گورکھپوری نے میری رہنمائی کی جو کہتے ہیں کہ شاعر اپنی شاعری سے بڑا ہوتا ہے یا اسے بڑا ہونا چاہیئے۔ میں قتیل کو اسی حوالے سے بڑا کہتا ہوں۔

اسے ایک اتفاق یا پھر عام روایتی بات سمجھئے کہ میں قتیل کی شاعری سے پہلے اور قتیل سے چار پانچ سال بعد متعارف ہوا۔ قانونِ قدرت بھی یہی ہے۔ پہلے شفق کی سرخی نمودار ہوتی ہے پھر آفتاب طلوع ہوتا ہے۔ مگر اس بات کو محض اتفاق کہوں یا کوئی غیبی تعلق کہ قتیل کی شاعری کی طرح اُس کا نام بھی شروع ہی سے ایسا لگا جیسے وہ میرا قریبی دوست ہو۔

یہ قصہ یوں ہے کہ آج سے ۴۹ ، ۵۰ سال قبل جب کسی رسالہ کے لکھنے والوں کی فہرست میں قتیل شفائی کا نام نظر آتا تو سب سے پہلے وہی صفحہ نکالتا جس پر وہ کسی گیت، نظم یا غزل کے روپ میں ملتا اور میں مطالعہ کا آغاز اسی سے کرتا۔ وجہ؟ بس یہی کہ اس کے نام سے ایک لگاؤ تھا۔ اس نام سے قربت کا دوسرا سبب یہ تھا کہ اس کے اشعار میں فراق گورکھپوری، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، سیف الدین سیف اور ساحر لدھیانوی کی طرح ایک نیا پن، ایک انفرادیت، ایک جدت کا رچاؤ تھا۔

یہ جو میں نے ابھی ابھی فراق کی رہنمائی کا حوالہ دیا ہے تو بے وجہ نہیں۔ اس دور میں فراق نے عام روایت سے ہٹ کر غزل کو ایک نیا لہجہ عطا کیا تھا اور عربی فارسی الفاظ کے پہلو میں ہندی الفاظ کو اس قرینے سے لا بٹھایا کہ عروسِ غزل کا روپ کچھ اور نکھر آیا۔ غزل کا یہ گنگا جمنی لہجہ بڑا سندر، بڑا دلکش تھا۔ قتیل شفائی بھی چونکہ گیت کی زبان کا رمز شناس اور اردو ہندی کے حسین امتزاج کی جادوگری کا ماہر بلکہ ساحر تھا اس لیئے اس کی نظم اور غزل میں بھی یہی لہجہ گھلا ملا سا تھا مگر قتیل کے یہاں ایک خوبی اور بھی تھی کہ وہ غزل کے اسی حسین لہجے میں عوام کی بات کہتا تھا۔

اُس نے بادشاہوں، راجوں، مہاراجوں، نوابوں، جاگیرداروں، دھنوانوں، سرمایہ داروں کی بجائے غریبوں، مزدوروں، کسانوں، محنت کشوں، زمانہ کے ٹھکرائے اور سماج کے روندے ہوئے افراد کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ یہ تھا قتیل کی شاعری کا وہ خاص رنگ یا شفق کی وہ سرخی جسے دلیلِ آفتاب کہا جاتا ہے۔

میں ۱۹۳۹ء - ۴۰ سے لاہور میں مقیم اور شبلی بی کام مرحوم کے ساتھ "عالمگیر" اور "خیام" سے وابستہ تھا، قتیل غالباً ۱۹۴۷ء میں لاہور پہنچا۔ میری اس کی ملاقات اگست ۱۹۴۷ء کے بعد ہوئی، ذہنی رابطہ تو پہلے ہی تھا۔ ہم ملے اور دوست بن گئے۔ پہلی ہی ملاقات میں معلوم ہو گیا کہ قتیل کی طبیعت میں بناوٹ، تکلف، تصنع کا کوئی پہلو نہیں وہ پاسے کے سونے کی طرح کھرا آدمی ہے۔

میرے اور قتیل کے درمیان بہت سے درد مشترک، بہت سے رابطے یکساں ہیں۔ انہی رابطوں اور تعلقات کی وجہ سے مجھے اس کی ذات کو سمجھنے اور یہ فیصلہ کرنے میں مدد ملی کہ وہ اپنی شاعری سے بڑا آدمی ہے۔ اگر قتیل سے یارانہ نہ ہوتا تو شاید میں اس کی شخصیت کے اس پہلو سے ناآشنا ہی رہتا۔

۱۹۴۸ء میں وہ ہفت روزہ " اداکار" سے ماہنامہ" ادبِ لطیف " میں چلا گیا تو " اداکار" کی ادارت میں نے سنبھالی اس ہفت روزہ کے مالک سید عطاء اللہ شاہ ہاشمی کی ذات جو ایک فلم پروڈیوسر بھی ہیں ہمارے درمیان رابطے کا ایک بہترین ذریعہ رہی ۔ قتیل " اداکار" سے تو چلا گیا مگر میرے اور شاہ جی کے ہمیشہ قریب رہا ۔ قریب کیا ، وہ ہمارے دلوں میں رہا ۔ میں " اداکار" کو ایڈٹ کرتا تھا ۔ قتیل شاہ جی کی فلموں کے گیت لکھتا تھا ، اس طرح ہماری اکثر ملاقاتیں رہتی تھیں مگر ملاقاتوں کے اور بھی کئی ذریعے تھے ۔ ہم دونوں انجمن ترقی پسند مصنفین کی ہفتہ وار میٹنگوں میں ملتے ۔ مشاعروں میں ملتے ، ہوٹلوں میں بیٹھتے ، اکٹھے آوارہ گردی کرتے اور کبھی کبھی اکٹھے جھک بھی مار لیتے تھے ۔ ادب و شعر اور صحافت کی کوچہ گردی کے علاوہ کسی فلم کمپنی کے دفتر یا کسی فلم اسٹوڈیو میں بھی ملاقات ہو جاتی تھی ۔ قتیل فلمی گیت لکھتا ، میں کہانی مکالموں کا دھندا کرتا تھا ۔ خاص طور سے سید عطاء اللہ شاہ ہاشمی اور انور کمال پاشا کی بعض فلموں میں ہم دونوں کو اکٹھے کام کرنے کا موقع بھی ملا ۔

سب سے اہم اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ حالات ، خیالات ، غموں اور جذبوں کی طرح ہمارے دوست بھی مشترک تھے ۔ ساحر لدھیانوی ، ابراہیم جلیس ، ابن انشاء ، سید عبدالمجید عدم ، سعادت حسن منٹو ، تنویر نقوی ۔ ان دوستوں کا ذکر اس لئے کر رہا ہوں کہ یہ لوگ ہمیں داغِ مفارقت دیکر چلے گئے اور بہت کچھ اپنے ساتھ لے گئے ۔ ہم دونوں عمر کی اس منزل پر ہیں جس کے پیچھے ایک طویل سفر ، حسین راستے ، مشترک نظریے ، جہدِ للبقا کی کشمکش اور گزرے دنوں کا غبار دکھائی دے رہا ہے تو آگے ایک نیا اور خوشگوار مستقبل ہے جس کی طرف نئی نسل نئے جذبوں کے ساتھ بڑھ رہی ہے ۔ دراصل ہمارا دور پرانی اور نئی نسلوں کے درمیان رابطے کا دور ہے اور قتیل شفائی نے فن اور شخصیت کے ذریعہ اس رابطے کو مضبوط تر کر دیا ہے ۔

قتیل نے اپنی خوبصورت شاعری سے اردو کے شعری ادب میں جو گراں قدر اضافہ کیا ہے وہ تو کسی تعارف کا محتاج نہیں لیکن اسکے گیتوں نے فلمی دنیا کو بھی ایک نیا رجحان بخشا اور فلمی شاعری کا رُخ تبدیل کر دیا ۔ اس تبدیلی کا آغاز تنویر نقوی اور ساحر لدھیانوی سے ہوا تھا مگر قتیل نے اپنی خداداد صلاحیتوں سے اس شاعری میں بھی ایک انقلاب پیدا کر دیا ۔

فلمی شاعری کی بات چھڑی ہے تو یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ سیف الدین سیف نے عطاء اللہ شاہ ہاشمی اور خود مجھ سے کئی بار شکایت کی کہ شاہ جی اپنی فلم کے لئے شاعر تو اے کلاس لیتے ہیں مگر میوزک ڈائریکٹر کا انتخاب صحیح نہیں کرتے ، پھر بھی قتیل کا کمال ہے کہ اُسکے گانے میوزک کو چلا دیتے ہیں ۔

یہ ایک شاعر کی فنی عظمت کا ایسا اعتراف ہے جسے محض رسم و رواداری سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا ۔ میں ذاتی طور پر سیف الدین سیف کو شعر و سخن کی میزانِ معیار بلکہ " میزانِ عدل" سمجھتا ہوں ۔ میرے نزدیک جو شاعر اس میزان میں تُل کر پورا اُترا اس کی شاعرانہ عظمت میں کوئی کلام نہیں کیونکہ سیف کے یہاں اس معاملے میں رد رعایت کا دخل نہیں ۔ قتیل کی فلمی شاعری کا ذکر ضمناً آگیا ورنہ جہاں تک میں جانتا ہوں ۔ سیف نے ہمیشہ قتیل کو ایک بڑا شاعر تسلیم کیا ہے ۔

قتیل سے میرے یارانے کی عمر ۴۴ سال کو پہنچ چکی ہے ۔ اس عرصہ میں میں نے اسے بہت قریب سے دیکھا ۔ اس کی شعلہ

خوبیوں کے ساتھ ساتھ بعض "کمزوریاں" کو بھی جانتا ہوں۔ میں نے "کمزوریوں" کا لفظ عام لوگوں کے نقطۂ نظر سے استعمال کیا ہے ورنہ میرے نزدیک تو "کمزوریاں" ہر بڑے آدمی کی ذات کا حصہ ہوتی ہیں جن کے بغیر اس کی تکمیل ذات نہیں ہوتی۔

۱۹۴۸ء میں قتیل کے دو گھر یا دو ٹھکانے تھے۔ ایک مصری شاہ (لاہور) دوسرا رائل پارک میں۔ مصری شاہ کا گھر ہماری عقیدت کا مرکز تھا، وہاں جانا رہتی نہیں۔ رائل پارک کا کمرہ قتیل کے شاعرانہ جذبوں کا محور تھا۔ اس کا کائنات اسی کمرے میں نظر آتی تھی۔ میں کئی بار اس صنمکدے کے قریب سے گزرا مگر اندر کی زیارت صرف ایک بار ہوئی جب قتیل ایک دن مجھے چائے پلانے کے لئے ساتھ لے گیا تھا۔ یہ نقشہ زیادہ عرصہ نہ چل سکا۔ "دیوی" نے شاعر کے دل پر ضرب لگائی اور اسے نئے تجربوں سے دوچار کر گئی۔

چند سال کے بعد اقبال بانو کا قصہ مشہور ہوا۔ قتیل بہترین شاعر تھا۔ اقبال بانو بہترین مغنیہ تھی۔ ان کے درمیان گویا شعر و نغمہ کا تعلق تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے فن اور شخصیت میں کھو گئے۔ اس ضمن میں قتیل کی ایک معنی خیز نظم "سانولی سی اک عورت" سے چند اشعار:

بھیج رہی ہے اب تک مجھ کو چاہت کے پیغام
سانولی سی اک عورت جس کا مردوں جیسا نام
وہ عورت جس کے ہونٹوں پر ناچیں میرے گیت
جس کی بڑھتی شہرت کو میں سمجھوں اپنی جیت
سب دنیا کو چھوڑ کے جس نے مجھے بنایا میت
سنتا ہوں دن رات میں جس کے سانسوں کا سنگیت
اپنے ساتھ لیے پھرتی ہے وہ میرا انجام
سانولی سی اک عورت جس کا مردوں جیسا نام

میں انور کمال پاشا کی ایک فلم لکھ رہا تھا۔ گانوں کے لئے قتیل سے فرمائش کی گئی تھی۔ ایک دن قتیل اور اقبال بانو اکٹھے وہاں پہنچ گئے۔ گانا اقبال بانو کی آواز میں ریکارڈ ہونا تھا۔ دونوں کچھ دیر بیٹھے پھر چلے گئے۔ پاشا صاحب جانتے تھے۔ میرے قتیل کے ساتھ کیا مراسم ہیں۔ سگریٹ کا ایک کش لے کر مجھ سے کہنے لگے۔

"قتیل صاحب کو کیا ہو گیا ہے؟"

مطلب یہ تھا۔ اقبال بانو کو ساتھ کیوں لیے پھرتے ہیں۔ میں نے اس بحث کو بڑھانا مناسب نہیں سمجھا اور یہ کہہ کر بات مختصر کر دی کہ۔

"شمیم کو دیکھ کر آپ کو کیا ہو گیا تھا؟"

بات یہیں ختم ہو گئی حالانکہ پاشا صاحب کہہ سکتے تھے کہ میں نے تو شمیم کے ساتھ شادی کر لی اسے گھر کی عزت بنا لیا،

مگر اکثر لوگ نہیں جانتے ۔ قتیل اور اقبال بانو کا معاملہ بھی اس مرحلے تک آ پہنچا تھا ۔ دلہن سمیت برات تیار تھی مگر دولہا ہی نہ پہنچا ۔ یہ بات قتیل نے مجھ سے چھپائی البتہ سید سبطین نقوی نے اپنے رو انی انداز میں نمک مرچ لگا کر سنائی بعدازاں ایک دن میں نے قتیل سے "برات والا قصہ" پوچھا تو جواب دیا ۔

"کسی زبردست طاقت نے میرے قدم روک لیئے تھے ۔"

اور میں سمجھتا ہوں وہ" زبردست طاقت "قتیل کا ضمیر تھا جس نے اس کے دل میں بیوی کی محبت اور اولاد کی شفقت دوچند کر دی ۔ قتیل صرف شاعر ہی نہیں بلکہ ایک محبت کرنے والا شوہر اور شفقت سے بھرپور باپ بھی ہے ۔

میں نے قتیل کی زندگی کے یہ دو واقعات صرف اس لیئے بیان کیئے ہیں تاکہ اسے پڑھنے اور سننے والے بھی جان لیں کہ ایک بڑا شاعر کس طرح زندگی کی مختلف کیفیتوں، رعنائیوں، دل چسپیوں، ناکامیوں، تلخیوں سے دوچار ہوتا ہے اور یہ تجربات اسے کس طرح شعور و آگہی یا عرفانِ ذات کے اس مقام پر لے جاتے ہیں جہاں وہ زمانے کے جھوٹ سچ، محبت، وفا، فریب اور وصال و ہجر کی کیفیات سے دوچار ہو کر ملہمانہ باتیں کرتا ہے ۔ یہی زینۂ الہام اسے لافانی رفعتوں کی طرف لے اڑتی ہے اور وہ اپنے خالق سے کہتا ہے کہ اے خدا میں نے تیری دنیا کو دیکھ لیا ۔ گھر ہو یا باہر، قتیل ہر جگہ بے پناہ محبت کرنے والا انسان ہے ۔ اور اسی فطری جذبہ نے اسے عوام کی لازوال محبت بخشی ہے ۔ بعض لوگ اس کی دوستی میں "ریاکاری کے پہلو" تلاش کرتے ہیں لیکن یہ تو ان کی اپنی نظر کا قصور ہے، البتہ میں اس حقیقت کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ دوستوں کا بہترین دوست تو ہے ہی مگر کبھی کبھی دشمنوں کو بھی اپنے اعلیٰ انسانی رویّہ سے حیران کر دیتا ہے ۔ اور یہی اس کی عظمت کی دلیل ہے ۔ میں نے قتیل کی زندگی کے یہ تمام روپ دیکھے ہیں ۔ شاعری سے لیکر اس کی ذات اور عرفانِ ذات کے وہ سب مراحل میری نظر سے گزرے ہیں جن سے گزر کر اسداللہ خاں ۔ غالب بن گئے اور اورنگ زیب خاں ۔ قتیل شفائی بن گیا ۔ وہ عوام سے پیار کرنے اور انسانی دکھوں کو سمجھنے والا شاعر ہے ۔ وہ گداگری کو انسانیت کی توہین قرار دیتا اور ہر انسان کو اس کا جائز حق دلانا چاہتا ہے ۔ کسی کو کاسۂ گدائی پھیلاتے دیکھ کر اس کا دل مجروح ہو جاتا ہے، وہ ہر شخص کو محنت اور اس کے ساتھ ساتھ زندگی کی آسائشوں سے ہمکنار کر دینا چاہتا ہے ۔ شاعروں، ادیبوں، فنکاروں کے بارے میں اس کا فیصلہ ہے کہ انہیں لباس، طرزِ معاشرت اور قول و فعل کے معاملے میں صاف ستھرا ہونا چاہیئے ۔ جب وہ بعض شاعروں کو بدوضع لباس پہنے، گریباں کھولے، بال بکھرائے، ازار بند گھٹنوں تک لٹکائے اور کپڑوں کو پان کی پیک سے داغدار بنائے دیکھتا ہے تو انہیں مخلصانہ مشورہ دیتا ہے ۔

"جناب پہلے آپ انسان تو بنیں شاعری بعد کا شے ہے ۔"

ہم دونوں روزگار کے کٹھن مراحل سے بھی گزرے ہیں ۔ کبھی کبھی تو گھر تک پہنچنے کے لیئے جیب میں کرایہ بھی نہیں ہوتا تھا مگر میں نے قتیل کو کبھی مایوس ہوتے نہیں دیکھا ۔ جس طرح " ناممکن " کا لفظ نپولین کی ڈکشنری میں نہیں تھا اسی طرح " مایوسی " کا لفظ قتیل کی لغت میں نہیں ۔ تو یہ ہے قتیل شفائی کے فن اور شخصیت کا وہ خاکہ جسے میں نے ۲۵ سال کے مطالعہ کے بعد ترتیب دیا ہے ۔ وہ کل بھی بڑا آدمی تھا ۔ آج بھی بڑا آدمی ہے ۔

قتیل شفائی — قاتل بھی، مسیحا بھی

بلراج ورما

قتیل کی شاعری کے اسلوب کا رنگ روپ اور تانا بانا اردو ادب کی بہترین روایات کا آئینہ دار ہے۔ فیض اور ساحر کی طرح قتیل نے بھی اپنے آبائی کلاسیکیت کے ساتھ ساتھ اپنے روزمرہ کی زندگی کے عام اور وارداتی جذبات کا بھی احترام کیا ہے۔ وہ عام چھوٹی چھوٹی مگر اہم باتیں جن کا ہم سب کی زندگی میں خاصا دخل رہتا ہے مگر جن سے ہمارے اکثر شعراء عموماً بے نیاز رہتے ہیں، قتیل نے اپنائی بلکہ سینے سے لگائی ہے اور انھیں سے ہمدردانہ اظہار کو اپنا موضوع بنایا ہے۔

ہر معقول شاعر زندگی کے احساسات کا بار اپنی تخلیقات کے توسط سے اتارتا ہے۔ قتیل جو انسانی زندگی کے ابواب پڑھنا اور سمجھنا بطور شاعر اپنا فرض سمجھتا ہے ان ابواب کے تذکروں سے ہی اپنی شاعرانہ ارتقا کو بتاتا، سنوارتا اور آگے بڑھاتا ہے۔ اس کی اکثر نظمیں اور غزلیں اس کی اپنی سوانح ہی کا کوئی نہ کوئی باب ہوتی ہیں۔ یہ اتباق خوبی اس فنکار کی انفرادیت اور شناخت کی کنجی ہے۔

وہ ترقی پسندوں کے ساتھ بھی چلا اور جدیدیوں کے ہمراہ بھی مگر اس نے نہ اُن کی ڈگر اپنائی نہ اِن کی۔ راہِ ادب میں بکھرے ہر پھول اور کانٹے سے اس نے نباہ کیا ہے۔ مگر کسی مخصوص طریقِ زندگی یا آئیڈیالوجی کو نہیں اپنایا۔

اس نے اپنے ذہن کی کھڑکیاں ہمیشہ کھلی اور کشادہ رکھی ہیں تاکہ انسانی تہذیب کے مختلف دھارے آزادانہ طور پر ان میں سے آتے جاتے رہیں مگر کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی ایک دھارے کے سیلاب میں وہ خود بھی بہہ جاتے۔

قتیل کا تخلیقی سفر پچھلے چالیس سال سے جاری ساری ہے۔ اس اثنا میں وہ کتنے ہی پر پیچ مراحل سے گزرا ہے۔ یہ راستے ہموار کھلے میدانوں، بلند و بالا برف پوش پہاڑوں خاموش چمکتے دہکتے ریگستانوں اور کھلنڈرے سمندروں بلکہ زمین دوز پاتالوں میں سے ہو کر گزرے ہیں۔ بے رحم بوجھل علمی دلائل، غیر ضروری متفکرانہ احساسات کی بجائے اُس کے ذہن نے ان راستوں کی چلبلی گدگدانے اور بہلانے والی ست رنگی آن بان ہی کو دیکھا اور اپنایا ہے۔ اس کے لہجے کی نرمی، شوخی اور گداذیت بھی ظاہر ہے کہ انھیں شوخیوں سے مستعار ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ اس کا قاری بھی مسرت اور انبساط کی ان چہکتی مہکتی نشاط کھٹ پھواروں میں شرابور اور مسرورستی سے آنکھیں موندے انھیں شوخیو

کا حصہ بن جاتا ہے۔

قتیل مسکراہٹوں اور مستیوں کا ہی نہیں آنسوؤں اور آہوں کا بھی شاعر ہے۔ اپنی شخصی زندگی کی کوتاہیوں اور کمزوریوں کو بلا حجاب و تعصب آشکار کرنے کی اخلاقی جرأت بھی اس کے ہاں نمایاں ہے۔ محبت اور دوستی ہو یا نفرت اور دشمنی، آدمی کا شعور جو سماجی پابندیوں کی ان پُرخار داریوں کا اسیر ہے کھلم کھلا اپنے صحیح جذبات کا اظہار نہیں کرتا۔

رنج و غم سے اضطراب کی نوعیت ذاتی ہو یا پوری قوم کی اجتماعی داستان جب جب اور جہاں جہاں بھی اس شاعر کے ذہنی اور جذباتی اظہار میں ابھری ہے ہر پڑھنے والے کے دل و دماغ پہ پہلے ہی اسے شاعری سے کبھی دور کا لگاؤ بھی نہ رہا ہو اس کی فنی صلاحیتوں اور فکری شخصیت کا اثر چھوڑ گئی ہے۔

اس کی اکثر شاعری اس کے روز و شب کی چھوٹی چھوٹی داستانوں سے بھرپور ہے وہ اپنے آپ سے ہمکلام یا بیوی و محبوبہ سے اس کے فن کی بلاغت نظری بچوں ایسی توتلی زبان میں بھی کبھی کبھی ایسی پر پیچ حقیقتیں آشکار کر جاتی ہے جن کا رنگ ورس پنچ تنتر کی کہانیوں ایسا ہوتا ہے۔

شعر و سخن کا ذوق قتیل کو ورثہ میں ملا تھا۔ اس کی فطرت نے اسے اپنا اور سالوں کے ریاض نے بلند و بالا کر دیا۔

قتیل کی ادبی شخصیت اس کے سماجی قد سے کہیں اونچی اور اہم ہے۔

قتیل نے فلمی نغمے لکھے تو بھی جوہر کو نہیں چھوڑا۔

الفاظ اس کے منہ سے بڑی متانت سے نکلے ہیں۔ ان میں سمندر کا سا ٹھہراؤ اور وقار ہوتا ہے۔ ایک جملہ خاموشی، توجہ، دلچسپی اور عقیدت سے سنے جانے کے لائق ہوتا ہے۔

اس کا علمی پس منظر کیسے ہی قدرے محدود رہا ہو، مشق اور مطالعہ نے اس کی جمالیاتی اڑانوں کو اسی وسعت اور گہرائی سے سجایا سنوارا ہے جو لامحدود علم و تفکر سے ہی ممکن ہوئی ہے۔

قتیل روایت کی عزت کرتا ہے۔ مگر اس جانی مانی سیاؤں کو زنداں نہیں بننے دیا۔ جب کبھی بھی اس نے روایت سے انحراف کیا ہے کسی مخصوص خفگی یا جھنجھلاہٹ کی وجہ سے نہیں بلکہ اس لئے کہ وہ روایت اس کی انا اور انفرادیت پر ضرب لگانے کو تُلی بیٹھی تھی۔ اس طرح اس نے روایت کو نہ زخمی کیا نہ کبھی اس کی شان میں کوئی ایسی گستاخی ہی کی جو اس کی عظمت کو کم کرتی ہے۔ اس کے ہر ایسے انحراف نے روایت کو سجایا سنوارا اور نئے جاموں میں اتارا ہے تاکہ روایت جوان و خوبرو رہے۔

قتیل کی شاعری پر کوئی لیبل چسپاں نہیں ہوتا۔ یہ سردار جعفری یا کیفی اعظمی کی وہ ترقی پسند شاعری نہیں جو سرخ انقلاب اور مقدس باب کو خوش آمدید کہنے کے لئے گڑھی گئی تھی۔ یہ نئے کھلنڈرے جدیدیوں کی شاعری بھی نہیں۔ یہ سراسر روایتی یا کلاسیکی شاعری بھی نہیں۔ سماجی یا سیاسی شاعری بھی نہیں ہے۔ یہ ایک حساس دل، روشن ضمیر اور صحت مند مغز کی اپج ہے۔

اس کے شاعرانہ افکار کے تناظر میں جو جذبات ابھر کر سامنے آتے ہیں وہ ہیں اس کی وطن سے محبت، مذہبی فلسفہ کا احترام اور اسلامی تہذیب و ثقافت کا تحفظ۔ عالمی امن اور بے پناہ احسان دوستی۔ عورت سے محبت بھی اسی دوستی کی ایکسٹینشن ہے۔

انسان دوستی میں آدمی اور سماج کے سبھی وہ مسائل شامل ہیں جنھوں نے اس خطۂ زمین کی صورت بگاڑ رکھی ہے ۔

وہ محبت کا بندہ ہے ۔ اسے نفرت ہے تو اوہام سے تعصب اور جہالت سے ۔ خود غرضی اور غلامی سے ۔ ظلم، تشدد سے ، فرسودہ و مردہ روایات سے ۔ سامراج سے جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام اور رویوں سے وہ مذہبی ہوں یا سیاسی ۔ پیار اور ایثار کا یہ بندہ جانتا ہے کہ نفرت بُری شے ہے اور نفرت کرنے والا نفرت کئے جانے والے کی نسبت کہیں زیادہ اذیت کا شکار ہوتا ہے ۔

اس کی اس نفرت میں جو پاکیزگی اور خوشبو ہے اس سے اس کا ذہن سکون ہی پاتا ہے اذیت نہیں ۔ وہ اس نفرت کے نہرے خوشبودار اور لنگی پہلوؤں سے واقف ہے یہ نفرت کھلی کھلی انسانیت سے اس کی ان کھوکھلا ہٹ رویوں کا ردعمل ہے جو اسے اپنی ذات سے بھی زیادہ عزیز ہیں ۔

قتیل نے زندگی کے ان مسائل کو اپنی ذات میں کچھ اس طرح سمو دیا ہے کہ وہ اس کی سوچ و شخصیت کا جزو اور اس کی مخصوص و منفرد جمالیات کا انگ اور رنگ بن گئے ہیں ۔

جب ترقی تحریک زوروں پر تھی تو ادب کے پارکھی معترض تھے کہ سارے ترقی پسند ہر مسئلہ کو ایک ہی نظر سے دیکھتے اور بیان کرتے ہیں آج کا نام نہاد کا جدید ادب بھی اسی قسم کی یکسانیت کا شکار ہے ۔

قتیل کی شاعری میں جو شدت ، گرمی اور بغاوت کا آہنگ محسوس ہوتا ہے اُس کی گونج کسی ماڈرن توپ کے گولے سے مشابہ نہیں ایک پیار بھرے دل کی دھڑکن ہے ۔ سوتے ہوئے ضمیروں کو سُکوں کی مدھر دھنوں سے جھنجھوڑ کر جگا دینے والی یہ آواز امن کا کھوکھلا نعرہ نہیں امن کے لئے التجا ہے ۔

یہ نظریاتی شاعری نہیں منظریاتی اور تصوریاتی شاعری ہے جو آدمی کے عصری احوال کی مصورانہ منظر کشی کرتی ہے ۔

قتیل کا آزادی کا تصور کسی مخصوص جغرافیائی سیما تک ہی محدود نہیں ۔ وہ ساری دنیا کو آزاد اور شادماں دیکھنا چاہتا ہے قومی اور بین الاقوامی یکجہتی اور صالح عالمی اقدار کی پاسداری اور تعمیر و تشکیل جو ہر پس ماندہ کو اپنے ہمسائے کی طرح رہنے کا حق دے سکے ۔

اپنے تصورات کو پیش کرنے کے لئے اس نے کبھی کسی بڑی شخصیت کو حوالے کے طور پر استعمال نہیں کیا کیوں کہ دنیا کی بڑی شخصیتوں سے اس کا ایمان اٹھ چکا ہے ۔ ہر بڑا آدمی دنیا کو اپنے طور پر چلانا چاہتا ہے ۔ زندگی کو اپنی سہولیت اور اپنے نجی نقطۂ نظر کے مطابق ڈھالنا چاہتا ہے ۔ اسے یقین ہے کہ اتنے بڑے کرۂ ارض کے لئے کوئی ایک فارمولا کوئی ایک طرزِ زندگی نہ مناسب ہے نہ ممکن ۔ ہر آدمی کو اپنے طور پر جینے کا حق ہے ۔ ضرورت یہ نہیں کہ ہر ایک کو ایک سا کر دیا جائے ، ضرورت یہ ہے کہ ہر کسی کو اپنے ڈھنگ سے رہنے ، کھانے پینے ، پہننے اور سوچنے کی آزادی ہو ۔

شاعرانہ لطافتوں کو بلا وجہ الجھا کر ان کے اصلی مفہوم چھپانے کی شعبدہ بازی جو ہمارے جدیدیوں کا مخصوص رویہ ہے ۔

قتیل نے جو اسی دور میں رہتا اور جیتا ہے ، پڑھتا ہے اور لکھتا ہے کبھی نہیں اپنایا ۔ وہ نو عمر تھا تو ترقی پسندوں کے چنگل میں نہ پھنسا تھا وہ اب بالغ نظر بزرگ ہے تو نام نہاد کے جدیدیوں کے چکر میں کیسے آ سکتا تھا ۔

اُس کا نظریہ ہے کہ شعر کی ایپریسی ایشن ایک ایسی لسانیاتی حس ہے جس سے ہر ذی ہوش قلب و جگر آسودہ ہوتا ہے ۔ اگر اس کا قاری اُس

کے محسوسات و جذبات اور حسنِ بیان سے متاثر اور آسودہ نہیں ہوتا تو اس کی شاعری بیکار ہے۔

وہ ترقی پسندوں اور جدیدیوں کے تالوں میں شامل ہوتے بغیر بھی عزت و احترام سے جانا پہچانا جاتا ہے۔ جہاں تک کہ دونوں گروہوں کے ناقدوں نے اس کے کلام میں اپنے رنگ دیکھے ہیں۔

وہ کسی دقیانوسی ناصح کی طرح یہ دعویٰ کبھی نہیں کرتا کہ صداقت وہی ہے جس کا درس اس نے پایا ہے اور تجربہ بھی وہی سچا ہے جس سے وہ خود گزرا یا دوچار ہوا ہے۔

وہ کسی نئی چیز یا نئی کھوج کو بغیر پرکھے محض ذاتی تعصب کی بناء پر رد کرنے کے حق میں نہیں ہے۔

اپنے کسی بھی پیشرو شاعر پر رائے دینا مشکل کام ہے اور پھر قتیل شفائی پر رائے دینا اور بھی مشکل کہ گرمیٔ حسرت ناکام سے زیادہ ان کے یہاں گرمیٔ محبت ہے اور خو بو میں خالص پٹھان ہیں۔ قتیل شفائی کی شاعری کا مطالعہ اس رومانی تحریک کے پس منظر میں کرنا چاہیئے جو اختر شیرانی سے شروع ہوئی اور شاید ساحر لدھیانوی پر ختم ہو گئی اور اس میں بہت سے اسلوب اور رویے پیدا ہوئے ان ہی میں سے ایک رویے کا نام قتیل شفائی ہے۔

عبید اللہ علیم

فاصلوں کی گواہی

الطاف پرویز۔ راولپنڈی۔ پاکستان

میرا قتیل شفائی کے ساتھ فاصلوں کا تعلق ہے۔ ہم دونوں ایک ہی اسکول میں پڑھے لیکن فاصلوں کے درمیان۔ میں دوسری جماعت میں داخل ہوا تو قتیل ساتویں درجے میں پڑھ رہا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب قتیل قتیل نہیں اورنگ زیب تھا اور پرواز پرواز نہیں الطاف حسین تھا۔

یوں تو اسکول میں سیکڑوں لڑکے پڑھتے تھے لیکن اورنگ زیب' ان سب میں نمایاں تھا۔ اپنی خوش پوشی' البیلے پن اور محفل آرائی کی وجہ سے عام طور پر دوسری جماعت اور ساتویں جماعت کے طلباء میں کوئی تعلق نہیں ہوتا لیکن اورنگ زیب اپنی محبوبیت کے سبب سب کی توجہ کا مرکز تھا۔ چھوٹے بڑے سبھی اس سے ملنے اس سے بات کرنے میں خوشی محسوس کرتے۔ وہ پورے اسکول بلکہ پورے شہر کے لڑکوں میں مختلف اور ممتاز تھا۔ وہ ہری پور کے ایک خوشحال گھرانے میں پیدا ہوتا تھا اور بڑے ناز و نعم سے پل رہا تھا اس کے حاشیہ برداروں میں روز افزوں اس کی خوش حالی بھی تھی۔ وہ اپنے حلقہ بگوشوں پر باپ کی دولت فراخ دلی سے لٹاتا تھا۔ شاید اسے معلوم نہیں تھا کہ ماں باپ کا سایہ کتنا ہی گھنا ہو بہرحال ڈھلتا سایہ ہوتا ہے۔ اور ایک دن اچانک یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ اورنگ زیب کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا ہے۔ ملک فیروزالدین کی حادثاتی موت ہری پور اور مضافات کے لئے یکساں موضوع بن گئی تھی۔ میں بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ اپنے گاؤں درویش سے صبح صبح ہری پور پہنچا جہاں لوگوں کے ہجوم میں اپنے خوبصورت ہم مکتب کو میں نے غش پر غش کھاتے ہوئے دیکھا اور میں بار بار چاہنے کے باوجود اُسے تسلی نہ دے سکا اورنگ زیب کی تعلیم کا سلسلہ شائد اسی دوران منقطع ہو گیا تھا کیونکہ اسکے بعد پھر وہ کبھی اسکول یا اسکول کے باہر نظر نہیں آیا۔

سنا تھا کہ وہ راولپنڈی میں اپنے عزیزوں کے پاس چلا گیا ہے۔

درویش اور ہری پور کا فاصلہ میرے اور اورنگ زیب کے درمیان اس وقت نمایاں ہوا جب میں نے اسے ہری پور کی ایک چوکی چنگی پر بیٹھے دیکھا۔ معلوم ہوا کہ وہ چنگی محرر ہو گیا ہے۔ اس وقت چنگی محرر کو سات یا نو روپے ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ وہ چنگی پر آنے والے اپنے دوستوں پر لٹا دیا کرتا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میں بھی کنوئیں سے باہر کی دنیا دیکھ آیا تھا۔ روہڑی، سکھر اور کراچی وغیرہ کی خاک چھاننے کے بعد گاؤں لوٹا تھا۔ گھر سے دور گھر کی فضاؤں کا دھیان شعور کی بیداری کا سبب بنا اور میں جذبات و مشاہدات کو ہم آہنگ کرنے کے لئے الفاظ کا تانا بانا بننے لگا تھا۔

جس دن ہم دونوں پہلی بار ایک دوسرے سے ہمکلام ہوئے وہ ایک یادگار دن تھا۔ ہم دونوں علی الصبح ہری پور پوسٹ آفس کی ڈاک کھڑکی کے سامنے کھڑے تھے۔ دونوں کے ہاتھوں میں لاہور سے آئے ہوئے مختلف پرچے تھے۔ پھر یہ انکشاف ہم دونوں کے لئے ربطِ باہم کا سبب بن گیا کہ ہم دونوں شاعر ہیں اور لاہور کے پرچوں میں چھپتے بھی ہیں۔

یہ ۱۹۳۸ء کی بات ہے اس جان پہچان کے بعد ہماری ملاقاتیں ہونے لگیں۔ میں کوئی نئی چیز کہتا تو سنانے کے لئے سب سے پہلے قتیل کے پاس پہونچتا چاہے اس کی ڈیوٹی کسی بھی چنگی پر ہوتی اور ہم ایک دوسرے کو اپنی شاعری (کلام) سنا کر خوب خوش ہوتے۔

میں اس زمانے میں الطاف حسین برباد کے نام سے چھپتا تھا اور اورنگ زیب قتیل شفائی کے نام سے۔ اس نے میرے نام پر اعتراض کیا اور ایک دن بڑے غور و فکر کے بعد اس نے مجھے مشورہ دیا کہ نام مختصر کر کے "الطاف پرواز" رکھ لو۔ یہ قتیل کا میرے لئے سب سے پہلا ابدی تحفہ تھا۔ میں آج بھی اس تحفے کے ساتھ جانا پہچانا جاتا ہوں۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو شاید میں مدتوں پہلے "برباد" ہو چکا ہوتا۔

ہمارا یہ زمانہ مشق کا تھا۔ روزانہ اساتذہ کے مصرعوں پر سیکڑوں گرہیں لگاتے شعر کہتے اور پھر ایک دوسرے کو سنا کر انتخاب کر لیا کرتے۔ اُن دنوں ہمارے رفیقانِ مشق میں حفیظ اثر، شفیع شوخ اور رحیم بخش شاد بھی ہوا کرتے تھے۔ شوخ اور شاد تو جلد ہی ہم سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ کر رہ گئے البتہ ہم دونوں بلکہ تینوں یعنی حفیظ اثر بھی شاعری کرتے اور چھپتے چھپاتے رہتے تھے۔

قتیل شفائی ان دنوں راولپنڈی کے معروف طبیب اور عالم دین جناب حکیم محمد یحییٰ خاں شفا سے اصلاح لیتے تھے اسی نسبت سے شفائی تخلص کا حصہ بنا ـــــــــ حکیم شفا سے اصلاح شدہ کلام پر قتیل احمد ندیم قاسمی سے بھی اصلاح لیا کرتے تھے۔ اُن دنوں ندیم ساہیوال (منٹگمری) میں بطور ایکسائز انسپکٹر ہوا کرتے تھے البتہ میں اب تک کسی سے شرف تلمذ حاصل نہ کر سکا تھا البتہ لاہور کے زمانے میں مولانا تاجور نجیب آبادی اور مولانا عبدالمجید سالک سے فیض حاصل کیا۔

درویش اور ہری پور کا فاصلہ ہم دونوں کے درمیان زندگی کے ہر شعبے ہر موڑ پر موجود رہا بلکہ ہے۔ عمر، تعلیم، شاعری، شہرت، اور مقبولیت میں قتیل مجھ سے اتنا ہی سینئر ہے جتنا درویش سے ہری پور۔ پھر جب ہم نے ہری پور کو چھوڑا تو لاہور کو وطن بنانے میں بھی یہ فاصلہ قائم رہا اور ہم دونوں مختصر وقفے کے ساتھ آگے پیچھے لاہور پہنچے اور اس دیارِ ادب کی گھما گھمیوں میں کھو گئے میرا تعلق صحافت و سیاست سے قائم ہوا جبکہ قتیل فلم سے وابستہ ہو گئے۔

قتیل لاہور میں ابتدا میں کچھ عرصہ ادب میں دو حریف گروہوں سے بھی وابستہ رہے لیکن جب یہ دیکھا کہ ہری پور کی تاریخِ ادب کے حوالے سے ہم دونوں کا نام ایک ساتھ آتا ہے تو خود کو حالات سے سمجھوتہ کرنے پر مجبور کر لیا اور اپنے اپنے محاذ پر مصروفِ عمل ہو گئے ۔

قتیل کو قدرت نے اضطرابی کیفیت عطا کر رکھی تھی ۔ وہ زندگی کی تمام تر رعنائیوں سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کی جدوجہد کر رہا تھا ۔ شادی اور محبت اس کے نزدیک دو مختلف مقدرات کا نام تھا اور ان دونوں سے اس کی والہانہ وابستگی رہی جس طرح لڑکپن میں اس کے گرد حلقے بنا کرتے تھے اب بھرپور جوانی میں بھی لاہور کی فضائیں اُس پر پھول برسانے لگیں ۔ معاشی حالات کی ناہمواری کے باوجود اُس پر حُسن و رومان کی رنگینیاں برس رہی تھیں ۔ ان رنگینیوں میں کبھی کبھی حسد و رقابت کے پتھر بھی شامل ہو جاتے تو اس وقت قتیل کو اپنی غریب الوطنی کا بُری طرح احساس ہوتا ۔ وہ جس ماحول میں زندگی بسر کر رہا تھا وہ خالص "فلمی شکروں" کا ماحول تھا ۔ مجھ ایسا شخص اس ماحول میں گذر نہیں پا سکتا تھا پھر بھی جب ضرورت پڑتی مجھے موقع ملتا میں خاموشی سے اس کے احساس تنہائی کو کم کرنے کی کوشش کرتا ۔ مجھے "سیاسی یلغار پسندوں" کے گروہ کی حمایت حاصل تھی ۔

(قتیل ایک خوبصورت انسان خوبصورت دوست اور خوبصورت شاعر ہے ۔ اس کی زندگی میں حُسن و عشق کی ابدی رعنائیاں رچی بسی ہیں ۔ وہ ایک سچا شاعر ہے اس کے کلام میں منافقت کی ملاوٹ مطلقاً نہیں ہے ۔ وہ زندگی کو جس زاویۂ نظر سے دیکھتا ہے اس میں تشکیک کا پہلو کہیں نہیں ملتا ۔ اُس نے ترقی پسند تحریک میں ایک قومی آواز کے ساتھ نمائندگی کی لیکن ذہنی طور پر ہمیشہ حب وطن سے لو لگائے رکھی ۔

قتیل کے کئی مجموعے چھپ چکے ہیں لیکن ان میں سے بیشتر مجھ تک نہیں پہنچ سکے اس لئے میں ان کے کلام کے محاسن پر گفتگو کرنے سے قاصر ہوں البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ قتیل جسمانی طور پر چاہے بوڑھا ہو جائے فکری اور ذہنی طور پر جوان ہے اور ہمیشہ جوان رہے گا اسکی شاعری کے تیور آج بھی وہی ہیں جو آج سے چالیس برس پہلے تھے البتہ اس کا وہ ترنم ماضی کی گپھاؤں میں کہیں کھو گیا ہے جو مشاعرے لوٹ لیا کرتا تھا لیکن اس کا کلام تحت اللفظ بھی اسی طرح پسند کیا جاتا ہے ۔ مشاعروں میں اس کی مقبولیت پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑا ۔ موسیقیت کا اس کی شاعری کے ساتھ غیر فانی رشتہ ہے اسی بدولت اس نے اردو اور پنجابی فلموں کے لئے اتنے بے شمار گیت لکھے ہیں کہ اگر انھیں یکجا جائے تو کئی ضخیم مجموعے بن سکتے ہیں ۔

میں ۲۷ برس لاہور میں بسر کرنے کے بعد راولپنڈی اسلام آباد منتقل ہو گیا جہاں صحافت کی طویل رفاقت چھوڑ کر مجھے ریڈیو کی ملازمت میں آنا پڑا جہاں اب مجھے بائیس برس ہوتے ہیں اس دوران قتیل سے میری ملاقاتیں گاہے گاہے جاری رہتی ہیں اب ہماری ملاقاتیں عیال و اطفال کی خیر خبر پوچھنے پر مبنی ہوتی ہیں اگرچہ ہم دونوں شاعر ہیں کئی کئی کتابوں کے مصنف ہیں اپنے اپنے فن میں اچھا بُرا مقام رکھتے ہیں لیکن زندگی ہیں اب اس موڑ پہ آئی ہے کہ ایک دوسرے کو پہچان لینا ہی غنیمت معلوم ہوتا ہے ایک دوسرے کو صحتمند دیکھ کر ایک اچھی غزل سُن لینے کے مزے آ جاتے ہیں ۔ ورنہ سہ

کون ایسا ہے کہ ہر حال میں ہمراہ چلے
بارہا سایہ مرا چھوڑ گیا ہے مجھ کو

قتیل شفائی نمبر

کے لئے

نیک خواہشات

بابا بہادر شاہ





نگہِ انتخاب

نہ میں شیفتہ ہوں نہ قتیل شفائی غالب ہیں۔ نہ غزل صرف غالب کا دیوان ہے، اور نہ شیفتہ کا مذاقِ سخن حرفِ آخر ہے ـــــ غزل ـــ کیا ہے، کیا نہیں ہے۔ اس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ میں غزل کی ان تعریفوں کو دہرانا نہیں چاہتا۔ ان تعریفوں نے غزل کو محدود کرنے کی کوشش کی ہے۔ غزل اُن سب تعریفوں سے ماورا اور ماسوا بھی بہت کچھ ہے۔ اسی لیے غزل اُردو کی مقبول ترین صنفِ سخن ہے اور ہزار مخالفتوں کے باوجود مقبول رہے گی۔ یہ سچ ہے کہ مقبولیت بھی دو دھاری تلوار ہے۔ قبولِ عوام کی للک کبھی کبھی شاعر کو عامیانہ پسند کا پابند بنا دیتی ہے۔ لیکن مقبولیت ـــــ جو عوام اور خواص دونوں میں معتبر ہو ـــــ وہ تخلیق کار کی درازیٔ عمر کی ضمانت ہے۔

قتیل شفائی کے اشعار ـــ خواص اور عوام دونوں میں مقبول ہیں۔ قتیل شفائی نے اُس دور میں شاعری شروع کی جب اُردو کے مقبول شعرا اپنے محبوب (محبوبہ) سے معذرت کر رہے تھے کہ وہ محبت کے تقاضوں کو کسی اور وقت کے لئے اٹھا کر رکھے، اس وقت وہ انقلاب کے لئے سرگرداں ہیں۔ اس دور میں قتیل نے محبت کے گیت چھیڑے۔ ایسی زمینی محبت کے گیت جو ہریالی، شفق، چاند ستارے، پہاڑ، وادی، جنگل ـــ اور کسی حسنِ سادہ و معصوم کے تقاضوں اور رعنائیوں سے بھرپور تھی۔ اور یہی گیت اور پیار کا رس ان کی غزلوں میں اتر آیا۔

اُڑتے اُڑتے آس کا پنچھی .....
ستارو تم تو سو جاؤ .....
چلو اچھا ہوا کام آگئی دیوانگی اپنی .....
دے جام میں بھر کر بھولی کہ ساقی ....

اور کتنی ہی زمینیں، کتنے ہی پیرایۂ اظہار، کتنی ہی تشبیہیں اور استعارے، کتنی ہی نازک تلمیحیں اور لفظ قتیل شفائی کی شناخت بن چکے تھے۔ اس مقبولیت کے پیچھے کوئی "غیر شاعرانہ" وجہ نہیں تھی ۔ شعریت ۔ رس ۔ سلاست ۔ بے ساختگی البیلاپن ۔ غنائیت ۔ بحروں کا لوچ ۔ آواز وں کا سُریلا آہنگ ۔ اس کے اسباب تھے۔

قتیل شفائی کی شاعری کو ۔ کوئی، کسی بھی درجے کی شاعری قرار دے اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ قتیل شفائی منفرد ہے۔ اس کا اسٹائل اس کا اپنا ہے، اس کے ہر شعر پر، ہر نظم، گیت اور غزل پر اس کی مُہر لگی ہوتی ہے۔ اور شاعروں کی اس بھیڑ میں ۔ غزل کے شاعر کے جمِ غفیر میں خاص طور پر ۔ قتیل شفائی اپنے لہجے، اپنی آواز اور اپنے مزاج کے اعتبار سے الگ پہچانا جاتا ہے۔ اور کسی بھی فن میں صاحب طرز ہونا، بہت بڑی بات ہے۔ یہ ادبیات ہے کہ کسی کی طرز مقبول ہوتی ہے، کسی کی نامقبول، کبھی کبھی مقبول شاعر اپنی ہی طرز اپنی ہی ادا کا اسیر ہو کر تکرار بیاں کا شکار ہوتا ہے۔ لیکن قتیل شفائی کی "طرز" مقبول بھی ہے اور معانی کی وسعتوں کا احاطہ کئے ہوئے بھی ہے۔ اس کی تخلیق کے سوتے ایسے جھرنوں کی طرح ہیں، جن کا پانی شفاف اور خنک ہے۔ جس کے قطروں کی شفافی منشور کی طرح سات رنگ بکھیرتی ہے۔ یہ جھرنے جاری و ساری ہیں۔ ان کا آہنگ دل نشیں، ان کی رفتار سبک اور ان کا پھیلاؤ ایک جھلکتی جھلملی جھیل بن گیا ہے جو چاند اور سورج کی روشنی کے ساتھ اپنا رنگ بدلتی رہتی ہے۔ جم

میں نے قتیل شفائی کی غزلوں سے اشعار کا انتخاب کسی نقاد کی حیثیت سے نہیں کیا ہے، کیوں کہ میں ان کو میر، غالب اور اقبال ثابت نہیں کرنا چاہتا۔ دوسرے غالب، اقبال اور میر کوئی ہو بھی کیوں ؟ یہی بہت ہے کہ قتیل شفائی، قتیل شفائی ہے۔ میں نے یہ انتخاب ایک باذوق، طرحدار اور شعر فہم قاری کی حیثیت سے کیا ہے۔ نقاد تو قاری اور سامع کو ۔ اپنی "میزان و معیار" سے ساقط کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ میں ان سے رائے لینا نہیں چاہتا۔ اُردو کے بیشتر نقاد (　　　　) ہیں۔ وہ خود ایک اچھا شعر تخلیق نہیں کر سکتے، وہ چاہے جامعات کے پروفیسر ہوں یا السنہ و ادبیات کے شعبوں کے صدر ۔ کسی رسالے کے مدیر ہوں یا کسی سیاسی گروہ کے ترجمان، کسی تہذیبی ادارے کے سربراہ ہوں یا کسی سیاسی گروہ کے یا فرد کے "طرفدار" ۔ وہ اپنی خود ساختہ، خود آفریدہ ہمہ دانی، ناموری، شہرت اور مرتبے کے بل بوتے پر۔ کسی تخلیق کے اعلیٰ اور ادنیٰ ہونے کی سند دے دیتے ہیں۔ لیکن خود ادنیٰ سے ادنیٰ تخلیق پر بھی قادر نہیں ہوتے۔

فنکار جس کے ہاتھ میں تخلیق کی زمام ہے۔ جو ادب اور فن کا پروردگار ہے ۔ وہ ان "نامور اور ذی مرتبہ" لوگوں کی رائے کے لئے کاسہ لئے کھڑا ہوتا ہے۔ یہ ہمیشہ سے ہوتا رہا ہے کہ تخلیق کار اپنی تخلیق کی اپنی "خلاقیت" کی اہمیت سے واقف نہیں ہوتا۔ اس کا ذہن تجزیاتی نہیں ہوتا۔ وہ جوڑ توڑ اور مصلحتوں سے بے نیاز ہوتا ہے۔ اور اس کی اسی کمزوری کا ۔ کچھ ذہین لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ خاص طور سے ترقی پسند تحریک کے آغاز سے "تنقید" ادب کی ایک اہم صنف بن کر ابھری ۔ ترقی پسندوں نے تو "نظریات" اور "گروہ بندی" کی میزان پر ادیبوں اور شاعروں کو تولا لیکن ترقی پسندی کے ردِ عمل میں جو "تنقید" لکھی جا رہی ہے۔ اس کے پاس تو کوئی میزان ہی نہیں ہے۔ اب "مصلحتیں" "انفرادی" اور ذاتی ہو گئی ہیں۔ ہر تنقید نگار کا اپنا ایک عظیم ادیب اور عظیم شاعر ہے اور ہر رسالے کا ایک "عہد ساز" ادیب اور شاعر پیدا ہو گیا ہے۔ یہ بد نصیبی ہے ہمارے شاعروں اور ادیبوں کی ۔۔ کہ انہوں نے اپنے ذہن کی تنہائی میں

جو آزاد اور منزہ تھی۔ تنقید نگاروں کو نہ صرف قدم رکھنے کی اجازت دی بلکہ ان کے DICTATES پر ادب تخلیق کرکے اپنی شاعری اور ادب کم سواد کر دیا۔

قتیل شفائی۔ ان گنے چنے شاعروں میں ہے جو تنقید نگاروں سے بالکل بے نیاز نہ سہی۔ ان کا کاسہ لیس بھی کبھی نہیں رہا۔ اس کے ذہن نے جو کہلوانا چاہا کہا ہے۔ یہ تو خیر ممکن نہیں کہ کوئی بھی تخلیق کار اپنے زمانے کے، مطالبات کو یکسر نظر انداز کرے اور اپنے "عصر" کے تنقیدی معیارات یکسر ٹھکرا دے۔ شعوری طور پر ایسا دہ کرنا بھی چاہے تو کہیں نہ کہیں۔ زمانے کا شور۔ اس کے ذہن کی خلوت میں در آتا ہے۔ قتیل شفائی کی غزلوں میں بھی یہ شور کہیں کہیں گونجتا ملتا ہے۔ لیکن اس کی بیشتر شاعری۔ اس کے اپنے تخلیقی محرکات کی آفریدہ ہے۔ اور اس کے اپنے ذہن و مزاج کی مظہر ہے۔

میں نے یہ انتخاب اپنے ذہن کے دروازوں کو کھلا رکھ کر کیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ غزل کا فن، نہ تو صرف عاشق معشوق کی گفتگو ہے۔ نہ تصوف کی چاشنی۔ نہ صرف ریزہ کاری اور مینا کاری کا فن ہے نہ تصریح و وضاحت کا۔ نہ صرف بیانیہ نہ صرف ایمائیہ۔ نہ یہ مہذب فن ہے نہ وحشی۔ نہ صرف خارجی ہے اور نہ صرف داخلی۔ نہ کرب ذات کا اظہار نہ شکست اقدار کا نوحہ۔ نہ صرف IMAGES اور تشبیہ، علامت اور استعارے کا فن ہے۔ غزل یہ سب کچھ ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مندرجہ ذیل شعر جو میرے ذہن میں ایسے ہی آ گئے ہیں مشہور و مقبول اور معتبر نہ ہوتے۔

چشمۂ وقت ہے بہتا ہوا دریا ٹھہرا
صبح سے شام ہوئی دل نہ ہمارا ٹھہرا

٭

جنوں پسند ہے مجھ کو ہوا بگولوں کی
عجب بہار ہے ان زرد زرد پھولوں کی

٭

تکلف سے بری ہے حسن ذاتی
قبائے گل میں گل بوٹا کہاں ہے

٭

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مر گیا آخر کو، ویرانے پہ کیا گزری

٭

لائی حیات آئے، قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

٭

میر ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

٭

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

٭

اس دور میں زندگی بشر کی
بیمار کی رات ہو گئی ہے

٭

یہ سب شعر (اور نہ جانے کتنے) اُردو غزل کے زندہ و جاوید شعر ہیں۔ ان اشعار میں تہہ داری، بوقلمونی، داخلیت، جہاں معنی اور محشر خیالی کچھ بھی نہیں۔ کوئی شعر اس لئے زندہ ہے کہ اس میں محاورے اور روزمرہ کا استعمال انگوٹھی میں نگینے کی طرح کیا گیا ہے۔ کوئی شعر کسی مشہور سیاسی واقعے کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ کوئی کسی شاعر کی ذاتی زندگی کے کسی "سانحے" کا تذکرہ ہے۔ کوئی زندگی موت کے بارے میں سیدھا سادہ بیان ہے۔ کسی میں کوئی بیش پا افتادہ تشبیہ ہے، کسی میں استعارہ لیکن ان سب میں ایک خوبی ہے دل میں اتر جانے والی تاثیر ـــــ ان معیارات پر قتیل کے ذیل میں درج شعر دیکھئے۔

اونگھتا ہے اداس پیڑوں پر
چاندنی کا غبار ـــ سونے دے

٭

پیار کو روگ بنانے والے پیار کو سمجھا تو نے کھیل
ہو جاتی ہے چلنی پیارے کیکر پر انگور کی بیل

٭

چاندی جیسا رنگ ہے تیرا سونے جیسے بال

اک تو ہی دھنوان ہے گوری باقی سب کنگال

دہک رہا ہے کچھ ایسے وہ مرے بازوؤں میں
کسی کٹھالی میں سونا جیسے گلا ہوا ہے

*

دل کو یوں تھپکیاں دیتا ہوں جیسے کوئی ماں
اپنے روتے ہوئے بچے کو سُلانا چاہے

*

قتیلؔ اہلِ نظر میں نظر جھکائے ہوئے
کس احترام سے بیچا گیا ہے یزداں کو

*

جو بھی آتا ہے بتاتا ہے نیا کوئی علاج
بٹ نہ جائے ترا بیمار مسیحاؤں میں

*

سارے شہر کو چونکایا یہ کام دکھا کر ہم نے
شہرت پائی دیواروں پر نام لکھ کر ہم نے

*

سازش کے اس دور میں لیتا جنم قتیلؔ اگر وہ
مار دیا ہوتا غالب کو آم کھلا کر ہم نے

*

آنے والی فصل سے پہلے گر گئے نرخ ضمیروں کے
پہلا سا ہے قحط نہ اب وہ پہلی سی مہنگائی ہے

*

دل جان کے واعظ نے جسے توڑ دیا ہے
آجائے مزہ وہ بھی جو اللہ کا گھر ہو

*

اپنے ہونٹوں پر سجانا چاہتا ہوں
آ تجھے میں گنگنانا چاہتا ہوں

کب سُننے دیتی ہے شور سمندر کا
پانی کی وہ بوند جو میرے کان میں ہے

معذرت کی زحمت سے محفوظ کیا یاروں کو
اپنے ساتھ اکیلے اپنی شام منا کر ہم نے

سب نے پہنا تھا بڑے شوق سے کاغذ کا لباس
جس قدر لوگ تھے بارش میں نہانے والے

مل جل کے برہنہ جسے دنیا نے کیا ہے
اس درد نے اب میرا بدن اوڑھ لیا ہے

ہجر ایک طویل رتجگا ہے
بہتر ہے کہ تھوڑی دیر سو لیں

سدا جیے یہ مرا شہرِ بے مثال جہاں
ہزار جھونپڑے گرتے ہیں اک محل کیلئے

میں نے قتیل کی غزلوں سے ایسے ہی اشعار چنے ہیں جن میں کوئی نہ کوئی تاثیر دل میں اتر جانے کی ہے۔ کوئی غزل میں لئے انتخاب کی ہے کہ اس کی زمین نئی ہے۔ کوئی اس لئے کہ وہ پہلے سے مقبول ہے۔ کوئی شعر زمانے پر طنز ہے۔ شاید، کوئی غزل باذوق قاری کے دل کو چھونے والی ہے۔ کوئی سُر تال کے رسیا کانوں کو۔ کسی میں کوئی اچھوتی تشبیہ کوئی استعارہ ہے۔ کوئی دل نشین اور حسین پیرایۂ اظہار ہے۔ کہیں ردیف اور قافیہ دست و گریباں ہیں۔ کہیں قافیہ ہے۔ کہیں کوئی لفظ نگینہ ہے۔ کہیں کوئی فقرہ نشتر۔ یہ سب ہے اور اس کے علاوہ بھی کچھ ہے...

ماورائے سخن بھی ہے کوئی بات

—— عزیز قیسی

قتیل شفائیؒ

پروفیسر محمد حسن

جب سے شاعری کے چھپنے چھپانے کا چلن ہوا لفظ کی طرف شاعر کا رویّہ کچھ بدل سا گیا ہے یا تو شعر میں لفظ کو معنی کی کلید سمجھنے لگا ہے یا پھر اسے بصری تمثال گرداننے لگا ہے سچ تو یہ ہے کہ لفظ گنجینۂ معنی کا طلسم بھی ہے اور اس کی بصری شکل و ہیئت بھی ہے مگر ایسے ممالک میں جہاں تعلیم کیا خواندگی تک کم ہے شاعری کی برکت سے لفظ کی صوتی اکائی مجروح نہیں ہوتی۔ حالیؔ نے یورپی نقاد کے حوالے سے شاعری کو میجک لینٹرن کہا تھا جتنا اندھیرا زیادہ ہوگا اتنا ہی اس میں تماشا زیادہ دکھائی دے گا۔ اب زمانے نے ورق الٹ دیا اندھیرے کے معنی بدل گئے مگر اس سے کیسے انکار ہوگا کہ ہماری بہترین شاعری اور بہترین ڈرامے یونان کی یادگار ہیں جہاں تعلیم اور خواندگی اور تہذیبی ارتقا موجودہ دور کے مقابلے میں پسماندہ کہا جائے گا مگر شاعر اور اس کا نغمہ اس کے گرد و پیش سے اور اس کے اپنے لوگوں سے کتنا جڑا ہوا تھا۔ قتیلؔ کے ہاں کچھ وہی کیفیت ہے۔ ان کے شعر پڑھنے اور جھومنے۔ گجر میں زیادہ گفتگو میں کچھ کم۔

دوسری خوبی مجھے ان کے ہاں نرمی اور نزاکت احساس کی نظر آئی۔ وہ بلند آہنگی کے شاعر نہیں ہیں گیت اور گفتگو کے شاعر ہیں۔ اس لئے ان کے شعروں میں خوشبو، شبنم، رنگ، بادل، اور چاند کے جلوے زیادہ ہیں جیسے جو کچھ کہا جا رہا ہو وہ انہیں کی زبانی ہو اور شاعر صرف تماشائی رہ گیا ہو چند شعر:-

تخئیل پہ اتری ترے انوار کی شبنم
میں رات کا راہی تھا مجھے تو نے سحر دی

اپنے قریب پا کے معطر سی آہٹیں
میں بارہا سسکتی ہوا سے لپٹ گیا

جس کے ہاتھ میں خنجر ہو گا وہی بنے گا منصف
یعنی ہم اپنی فریادوں کا جگتیں گے خمیازہ

پہنائیں گے ملّا قاضی حرفِ اعتذ(؟) زنجیریں
جس کے تن پر زخم نظر آئے گا تازہ تازہ

رات کا پتھر نہ پگھلے گا شعاعوں کے بغیر
صبح ہونے تک نہ بولو ہم نواؤ چپ رہو

باہر تو ہر سو ہے راج درندوں کا
امن کا ہے ماحول فقط زندانوں میں

قتیل اپنے تصورات اور عصری تجربات کو ایک ایسی نغمہ آفریں، رنگین، نرم اور نازک گھلاوٹ سے شعری پیکر میں ڈھال کر پیش کرتے ہیں جس میں قبائلی زندگی کا لوچ اور اجتماعی احساس کی سجاوٹ موجود ہے۔
قتیل نے اپنی شاعری میں ایک نئی لسانی تشکیل کی کوشش کی ہے جس میں آزادی کے ساتھ ہندی اور برج کے شستہ اور رواں الفاظ روزمرہ کی بولی ٹھولی کے فقرے بڑی دلکشی سے استعمال ہوتے ہیں۔ مندرجہ ذیل غزلوں میں اس کی مثالیں واضح طور پر موجود ہیں۔

چاندی جیسا رنگ ہے تیرا سونے جیسے بال
اک تو ہی دھنوان ہے گوری باقی سب کنگال
سہما سہما سا اک سایا مہکی مہکی سی اک چاپ
پچھلی رات مرے آنگن میں آ پہنچے وہ اپنے آپ

گم تھی اپنے دھیان میں گوری کان میں ایسی بھنک پڑی
کھڑے کھڑے اس کے پیروں میں چھن چھن پائل چھنک پڑی

سنا ہے گاندھی جی نے حالی کی نظم 'مناجات بیوہ' کی زبان کو ہندوستان کی قومی زبان کا معیاری نمونہ قرار دیا تھا اس روایت کی توسیع قتیل شفائی کے ہاں ہوئی ہے اس نئے شعری لہجے میں قتیل نے نئی وسعت گہرائی اور پہنائی پیدا کی ہے جس کی اہمیت کا اعتراف ضروری ہے۔ اس لحاظ سے قتیل کی ادبی خدمات قابل لحاظ ہے اور اردو کے لئے ہی نہیں ہند اور پاکستان کی ادبی روایت میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

پھینکا تم سوچ کر لفظوں کا یہ کڑوا گلال
پھیل جاتا ہے کبھی صدیوں پہ بھی اک پل کا رنگ

جن شاعروں کے ہاں نغمگی اور نزاکت احساس ہو ان کو رومانویت کا مرض لاحق ہونے کا خطرہ زیادہ شدید ہوتا ہے ویسے رومانویت فی نفسہٖ کوئی مرض نہیں البتہ جب اس کا رشتہ سماج سے ٹوٹ جائے اور شاعر حقیقت کی جگہ تخیل کی زد میں آ جائے تو نظریہ قلم زدہ ہو جاتی ہے اور اصلیت کا رشتہ فن سے ٹوٹ جاتا ہے۔ قتیل شفائی نے رومانویت کا رشتہ عصری آگہی سے قائم رکھا ہے۔ قتیل نے رومانویت اور داخلی رنگ و آہنگ کے ساتھ معاصر زندگی کے تجربات کو اپنی غزلوں میں ڈھالا ہے مثلاً اس قسم کے اشعار۔

میں ریت کے دریا پہ کھڑا سوچ رہا ہوں
اس شہر میں پانی تو بڑے بیعطے نے پیا ہے

بند ہے زندگی جبر کے محل میں، کیا جئیں ہم قتیل ایسے ماحول میں
جس قدر چھوٹے تھے ان کو دولت ملی جتنے کم ظرف تھے معتبر ہو گئے

شہروں میں وہ گھٹن ہے اس دور میں کہ انساں
گمنام جنگلوں کی پُروائی چاہتا ہے

قتیل آزادیاں جن کو نہ بھائیں
انہی قوموں کے ہم بھی فرد نکلے

تھوڑا سا بھی جن لوگوں کو عرفان مذاہب تھا وہ بھی کر
کعبوں سے شوالوں سے کلیساؤں سے آگے نکل آئے

آگ جذبوں کی جس میں ہے شامل جو دکھائے مرادوں کی منزل
وہ دھواں محنتوں کے سہارے چمنیوں سے نکلتا رہے گا

میں چاندنی میں گوندھ کے لایا ہوں رات کو
اب آپ اس سے کوئی سویرا بنائیے

منفرد رنگ کی منفرد مثال

فیض احمد فیض

قتیلؔ صاحب ایک زمانے سے تحسین و توصیف کے محتاج نہیں ——— ان کا شمار ملک کے معتبر شعراء میں ہوتا ہے۔ اور ان کے کلام پر قبولِ عام کی مہر ثبت ہے۔

یوں تو انہوں نے بہت سے اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن اس قبولِ عام کا سہرا غالباً اُن کی غزل ہی کے سر ہے۔ ہمارے دور میں اس ہزار شیوہ عروسِ سخن کے کئی رنگ دیکھنے میں آئے ہیں (عاشقانہ۔ فاسقانہ۔ فلسفیانہ۔ صوفیانہ۔ ظریفانہ۔ سیاسی۔ روایتی۔ تجرباتی وغیرہ وغیرہ) ان میں قتیلؔ صاحب ایک ایسا منفرد رنگ رکھتے ہیں جس میں قریب قریب سب رنگوں کی جھلکیاں ملتی ہیں لیکن رنگارنگی کے باوجود ان کا کلام یک رنگ ہے۔ اس یک رنگی میں لہجے کو بھی دخل ہے، معانی کو بھی ——— ان کا لہجہ ہمیشہ سے مطربانہ ہے۔ اور ان کی فکر ہمیشہ سے دردمندانہ۔ طرب اور درد کے درمیان جو بہت سے مقامات پڑتے ہیں۔ کوئی رنگین کوئی ویران، کوئی بارونق، کوئی اداس، قتیلؔ صاحب نے مختلف پیرایوں میں انہی کی منظر کشی کی ہے۔ اور اس کاوش میں انسان دوستی اور امیدِ فردا کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا۔ "گفتگو" سے انتخاب اُن کے اسی منفرد رنگ کی منفرد مثال ہے۔

قتیل شفائی

سردار جعفری

پہاڑی کے خشک سینے سے ابلتا ہوا ایک چشمہ ہری بھری وادیوں سے گنگناتا ہوا گذر رہا ہے۔ اور اس کا نغمہ سن کر کلیاں آنکھیں کھول رہی ہیں۔ اس چشمے کا نام قتیل شفائی ہے۔ اس نام کے ساتھ تین اور چشموں کی یاد آتی ہے۔ جو ساتھ ساتھ رقصاں اور غزل خواں گذر رہے ہیں۔ ساحر لدھیانوی ابن انشا اور جمیل الدین عالی یہ چاروں دوست اور ہم عصر شاعر ہیں۔ ایک ہی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس قبیلے کی خصوصیت نغمگی اور غنائیت ہے۔ ایک بانکا اور البیلا انداز ہے۔ لیکن ہر ایک کی اپنی پہچان الگ الگ ہے۔ یہ بہت بڑی بات ہے کہ ان کے اشعار سن کر یہ بتایا جا سکتا ہے کہ کون سا شعر کس شاعر کا ہے۔

قتیل حسن و عشق کی ہلکی پھلکی مہک لطیف کیفیات کے شاعر ہیں۔ ان کا آہنگ نرم اور نغمہ ریز ہے۔ الفاظ تتلیوں کی طرح اڑتے ہیں ان کے حسن کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی جائے تو تتلیوں کے پروں کا رنگ انگلیوں میں آجائے گا۔ اس لئے قتیل کا کلام لطف اندوز ہونے کا مطالبہ کرتا ہے۔ انھوں نے تجارت بھی کی اور ملازمت بھی لیکن قبل اس کے کہ ان کے وجود میں چھپا ہوا شاعر دم توڑ دیتا وہ ان جھمیلوں سے باہر نکل آئے اور تقریباً چالیس سال سے دلوں میں مسرت کا چراغ روشن کر رہے ہیں۔

قتیل کی محبوب اصناف میں ہیں گیت، غزل اور نظم اسی ترتیب سے ان کی اہمیت ہے۔ حفیظ جالندھری کے بعد اردو زبان کو سب سے دلفریب گیت قتیل نے عطا کئے ہیں۔ یہ اردو زبان کی نئی دولت ہے۔ غزلوں اور نظموں میں قتیل حسن و عشق کی منزلوں سے گذر کر سیاسی اور سماجی مسائل کی دنیا میں بھی داخل ہو جاتے ہیں۔ لیکن اپنے البیلے انداز کے ساتھ غزل کی پہلی کیفیت کا اندازہ ان اشعار سے کیا جا سکتا ہے۔

چھپ گیا جب سے وہ پھول چہرہ ــــ شہر کا شہر مرجھا گیا ہے
کس نے دی یہ دربدل پہ دستک ــــ خود بخود گھر مرا بج رہا ہے

پوچھتا ہے وہ اپنے بدن سے
چاند کھڑکی سے کیوں جھانکتا ہے

اور دوسری کیفیت ان اشعار سے ظاہر ہوتی ہے۔

درد کے زیر اثر تار سحر بولیں گے
میں رہا چپ تو میرے زخم جگر بولیں گے
کر رہی ہے شب ناخواستہ سامان سکوت
لیکن ایسے میں بھی کچھ اہل نظر بولیں گے
اے خدا آج بھی اس موت کے سناٹے میں
تیری آواز نہ آئی تو بشر بولیں گے
تو قتیل آ تو سہی ان کا مسیحا بن کر
حرف گونگے نظر آتے ہیں مگر بولیں گے

ان غزلوں کی خصوصیت پیچیدہ ترکیبوں سے دور ایک آسان اور سبک زبان ہے۔ قتیل کی اسی ادا نے ان کو سب کا محبوب بنا رکھا ہے۔ اس زمانے میں کچھ شعراء نے آزاد غزل کا تجزیہ کیا۔ زیادہ تر ٹوٹے ہوئے مصرعوں کو شاعری کا نام دیا گیا۔ اس میدان میں بھی قتیل نے اپنی راہ نکالی ہے۔

اجلے اجلے روشن روشن چہروں کی قندیلیں
آنکھوں سے ان کی روشنیاں پی لیں
جنم جنم لیں گے ان سے پیارے پیارے پریت کنول
بانجھ ہیں وہ نیلے نینوں کی جھیلیں

قتیل کی تازہ ترین کتاب " آموختہ " میں ایک شعر ہے۔

یا مرا دل پتھر کر دیجیے   یا دھرتی کے زخموں پر مرہم رکھ دے

یہ شاعر کی انسانی دوستی کی پہچان ہے۔

قتیل کا ایک رشتہ سرحد سے ہے۔ جس کی سنگلاخ زمین میں پھول نکلا دوسرا رشتہ پنجاب سے ہے۔ جہاں انھوں نے اپنی جوانی سے آج تک زندگی گزاری اور تیسرا رشتہ میرے وطن شمالی ہندوستان سے ہے۔ انھوں نے شفا کانپوری(۱) سے شروع شروع میں اصلاح لی اور اپنا قلمی نام قتیل شفائی رکھا۔ وہ مجھے تینوں رشتوں سے عزیز ہیں۔

(۱) قتیل نے حکیم محمد یحییٰ خاں شفا سے اصلاح لی تھی جو راولپنڈی کے ساکن ہیں (مدیر)

قتیل شفائی ۔ شخصیت اور فن کا "پیراہن"

ڈاکٹر سلیم اختر لاہور (پاکستان)

آخر دم تک پتھر کاٹوں دودھ کی نہر بہانے کو
تیشہ کند نہ ہونے پائے ساری عمر مرے فن کا
شہرت ہو بے داغ مری تو غربت ہو خود دار مری
سچ کا پرچم بن جائے ہر پرزہ میرے دامن کا

("ابتدائیہ")

جو اپنی اولاد سے بڑھ کر سمجھے پودوں پیڑوں کو
آنے والے موسم میں اس باغ کو ایسا مالی دے
آخر بڑا نہ بن بیٹھے وہ چھوٹے چھوٹے لوگوں میں
جس کو رتبہ دیا ہے تو نے ظرف بھی اس کو عالی دے

("دعا")

سخن بریدہ زباں کا بدل ہی باقی ہے
وضاحتوں کے لئے اب غزل ہی باقی ہے

قتیل شفائی نے تازہ مجموعۂ کلام "پیراہن"¹ کا آغاز جن اشعار سے کیا ہے ان میں معانی کی تہ در تہ جہات ملتی ہیں۔ "ابتدائیہ" اس کے فن کا پرچم ہے تو تخلیقی شخصیت کا منشور۔ "دعا" اس نے اپنے ملک اور اس میں بسنے والے "چھوٹے چھوٹے لوگوں" کے لئے مانگی

---

¹ "پیراہن" (لاہور : ۱۹۸۱ء)

ہے۔ جب کہ پہلی غزل کے مطلع کی صورت میں اس نے غزل اور اس سے وابستہ فنی امکانات کی طرف بلیغ اشارہ کیا ہے۔ یہ ان اشعار کے آشکار معانی ہیں لیکن انھیں محض یہیں تک محدود ہی نہ رکھنا چاہیئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قتیل شفائی ان شعرا میں سے ہیں جن کے اشعار اچھے ہونے کے باوجود یک جہت معنی کے حامل ہوتے ہیں۔ طویل تخلیقی زندگی اور فنی ریاضت نے قتیل شفائی کو فن کے اس مقام پر پہنچا دیا ہے جہاں اسے بات کہنے کے سلیقے کے ساتھ ساتھ بات کی پرکھ کا گُر بھی آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نسبتاً کم کہنے کے باوجود وہ اپنے بیشتر معاصرین کے مقابلے میں زیادہ بہتر شعر کہہ گیا ہے۔ اور اسی لئے مقبول عام ہے۔ میں اس مقبولیت کو موسیقاروں کی دین نہیں سمجھتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قتیل کے فن میں اتنی پختگی، اس کے لہجے میں اتنی ندرت اور اس کے اسلوب میں اتنی تازگی ہے کہ اس کی شاعری اپنے اظہار کی داخلی توانائی کے بل پر بھی زندہ رہ سکتی ہے اس کے لئے اگر وہ یہ دعویٰ کرتا ہے:

برباد ہوئی فن میں اک عمر قتیل اپنی
ملتے ہیں کہاں ہم سے فنکار لگن والے

تو یہ "مستند ہے میرا فرمایا ہوا" قسم کی خفگی کے برعکس ایک ایسے فن کار کا دعویٰ ہے جس نے اپنی ذات کے PERSONA اور تخلیقی شخصیت کو زندگی کے دوکرداروں کی طرح الگ الگ نہ رکھا بلکہ ان دونوں کے فنکارانہ امتزاج نے اس کی تخلیقی شخصیت میں وہ گہرائی پیدا کر دی جو کسی بھی اعلیٰ تخلیق کی ضامن ہوتی ہے۔ اور جس کے بغیر تخلیق کار اس شعری آگاہی سے محروم رہتا ہے جو اسے افراد کی پسل کے ٹیڑھے پن، معاشرے کے تضادات اور صورت حال کے سطحی کی پہچان سکھاتی ہے۔ یہ شعری آگاہی اگرچہ سرمۂ نور نظر ہے لیکن پھر بھی لوگ اس سرمے کے استعمال سے گھبراتے ہیں کہ یہ سرمہ آنکھ میں لگتے ہی سب سے پہلے تو اپنی کم نگاہی آشکار کرتا، انھیں نظروں کا بھینگا پن رکھاتا اور اپنی پتلیوں میں ماتھے کے اجالوں کی تاریکی واضح کرتا ہے۔ اسی لئے افراد کی اکثریت تیز روشنی سے گھبراتی ہے کہ اس میں تضادات اپنی مکمل برہنگی کے ساتھ اجاگر ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے تو قتیل کہتا ہے:

وہاں لایا گیا اہلِ نظر کو
جہاں نقصانِ بینائی بہت ہے

افراد میں یہ نقصان بینائی گوارہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کی زندگی میں کوئی آدرش نہیں۔ بجز صبح کرنا شام کا۔ گھر، ملازمت، کاروبار اور بیوی بچوں کے کھونٹے سے بندھے لاکھوں لوگ حسنِ معنی سے عاری زندگی کو ہنسی خوشی گذار دیتے ہیں مگر حساس شاعر اس طرح پر نہیں آسکتا اور اگر وہ شاعر قتیل شفائی جیسا حساس ہونے کے ساتھ ساتھ واقعی دیکھنے والی آنکھ بھی رکھتا ہو تو اس کے لئے "دیکھنے" کو "نہ دیکھا" کر لینا اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ تخلیقی فن کار آنکھ کے معاملے میں بالکل بچہ ہوتا ہے کہ بے اختیار چلا اٹھتا ہے "ارے ہو! بادشاہ تو ننگا ہے۔"

سو یہی عالم قتیل شفائی کا بھی ہے جو اپنی "کمزور بینائی" کا یوں اعتراف کرتا ہے:

سب کہتے ہیں اک جنت اتری ہے میری دھرتی پر
میں دل میں سوچوں شاید کمزور مری بینائی ہے

ادھر قتیل شفائی کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ زندگی میں حسن و رعنائی دیکھنے کا متمنی ہے تو پھر اس نے کس سوچے سمجھے منصوبے کے تحت "کمزور

بینائی" کی توقع تو کجا وہ تو دوسروں میں بھی اسے برداشت نہیں کر سکتا۔ قتیل شفائی اگر اپنے لئے یہ طلب کرتا ہے :

شہرت ہو بے داغ مری تو غربت ہو خوددار مری

تو وہ اپنے قلم قبیلہ کے دوسرے لوگوں میں بھی شاعرانہ کردار کی اسی بلندی کو دیکھنے کی آرزو رکھتا ہے۔ تخلیق کے کشکول لیکر بلند دروازوں پر جھکنے والے شعراء ہر عہد میں ملتے ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ شاعر وہی ہوتے ہیں رتبہ جنہیں بھر کے اشاروں کو سمجھتے ہوئے اپنی لے اور آہنگ میں تبدیلیاں پیدا کرتے جاتے ہیں قتیل شفائی نے نہ کبھی ایسی قصیدہ خوانی کی اور نہ اسے ہر عہد کے پیشہ ور مدح سرا پسند ہیں :

انعام کے لالچ میں لکھے مدح کسی کی
اتنا تو کبھی کوئی سخنور نہیں گرتا

پچھلی تحریروں کو بھول کے اے شاعر
تیرا اپنا قصیدہ کس کی شان میں ہے

قتیل شفائی کو فطرت نے اعلیٰ اور شاعرانہ صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ وہ آنکھ بھی عطا کی جو منافقت کے زریں پردے چاک کر کے معاصرانہ کے گھناؤنے پن کو دکھاتی ہے۔ سو بقول قتیل :۔

آنے والی نصل سے پہلے گر گئے نرخ ضمیروں کے
پہلا سا ہے قحط نہ اب وہ پہلے سی مہنگائی ہے

قتیل شفائی اپنی شخصیت میں کھرا انسان ہے تو اپنے فن میں ایماندار۔ اس لئے جب وہ اپنے عہد کی ادبی سازشوں کو دیکھتا ہے کہ مانگے کی بیساکھیوں پر PYGMIES کیسے قدآور شخصیات کا تاثر دیتے ہیں، دولت اور سازش سے کیسے شہرت کی پتنگ اڑائی جاتی ہے اور پالتو نقادوں کی فوج جمع کر کے کیسے دوسروں کی کردار کشی کی جاتی ہے۔ جب قتیل یہ سب کچھ دیکھتا ہے تو وہ اس پر احتجاج کئے بغیر نہیں رہ سکتا :۔

سازش کے اس دور میں لیتا جنم قتیل اگر وہ
مار دیا ہوتا غالب کو گمنام کہلا کر ہم نے

اس کے ساتھ ہی یہ تلخ شعر بھی ملاحظہ ہو :۔

سن رہے تھے کل مری تقریر کچھ بونے قتیل
یوں لگا جیسے بہت اونچا مرا قد ہو گیا

ہم قتیل شفائی کی شخصیت اور تخلیقی شخصیت دونوں سے آگاہ ہیں اور اس کے دوست دشمن سبھی اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ اس کے قول و فعل میں تضاد نہیں۔ اس لئے اس طنزیہ شعر کے باوجود :

رہا زندگی کا شکار بھی مجھے زندگی سے ہے پیار بھی

مرا اعتبار کرو نہ تم اک تضاد قول و عمل ہوں میں

اس نے زندگی کی سطح پر جو محسوس کیا، فن کی سطح پر اس کا ابلاغ کیا۔ قتیل کے سادہ اسلوب میں دامنِ دل کو کھینچ لینے والی جو ایک کشش ملتی ہے تو اس کا ایک بہت بڑا سبب یہ ہے کہ اس کے ظاہر اور باطن میں منافقت نہیں۔ اس لئے اس کی شخصیت اور تخلیقی شخصیت مل کر تخلیق کے مختلف شیشے پر مرتکز ہوتی ہے تو یہی اشعار آنچ دینے لگتے ہیں۔ اشعار کے اس آگ سے قتیل شفائی نے بہت کام لیا ہے۔ کیوں کہ اس کا ہدف معاشرہ اور اس کے تضادات، افراد اور ان کی منافقتیں ہیں اس لئے اس کے اشعار میں معانی کی سلگتی آگ کچھ زیادہ ہی جلانے والی محسوس ہوتی ہے۔ چند مثالیں پیش ہیں۔

ان کی محفل میں جب کوئی جاتے پہلے نظریں اپنی جھکاتے
وہ صنم جو خدا بن گئے ہیں ان کا دیدار کرنا منع ہے

آپ اپنے جرموں کا بن گئے ثبوت آخر
ہاتھ جو معطر تھے پھول کو مسلنے سے

پرانے جوہڑ سا کا ہے یہ عالم
کہ پانی کم ہے اور کائی بہت ہے

جب بھی دریا بارشوں کے پانیوں سے بھر گئے
تیرنے ہم بھی بدن سے باندھ کر پتھر گئے

کب سننے دیتا ہے شور سمندر کا
پانی کی اک بوند جو میرے کان میں ہے

اس لئے کی ہے تڑپنے کی تمنّا
رقص کرنے کا بہانا چاہتا ہوں

ہم آگ میں جل کے بھی تجھے دے رہے ہیں خوشبو
قتیل ہم نے بدن پہ صندل ملا ہوا ہے

سکونت بار جب بن جائے بنیادِ رفاقت پر
مکاں تقسیم ہو جاتے ہیں خود اپنے مکینوں میں

جب کنول ہاتھ میں کسی کے نہ آ سکا
تو میں کائی چرا لایا جھیل کی

جو بھی آتا ہے بتاتا ہے نیا کوئی علاج
بٹ نہ جائے ترا بیمار مسیحاؤں میں

دے دو اسے اپنی اپنی شبنم
دریا کو لگی ہے پیاس لوگو

آئیں گے اپنے بعد بھی کچھ رہروانِ شوق
رستے میں گاڑ دو کہ نہیں سنگ میل ہم

جس میں سورج کا طرفدار ہر اک سایہ ہے
میں نے اس شہر میں گھر موم کا بنوایا ہے

ہوتے ہوتے گھر مرا سایوں کا معبد ہو گیا
صحن میں جو بیج بویا تھا وہ برگد ہو گیا

تہ خانے میں بند تھا میں اور مجھ پر یہ الزام لگا
سورج کس میں جھانک رہا تھا روشندان کی جالی سے

میری اونچائی تو میرے سر سے ہوتی ہے شروع
میرے قد میں ڈھونڈتے ہیں لوگ میرے آپ کو

سارے شہر کو جو چونکایا یہ کام دکھا کر ہم نے
تیرے شہر کی دیواروں پر نام لکھا کر ہم نے

یہ اشعار کسی شعوری انتخاب کا نتیجہ نہیں بلکہ "پیراہن" کو کہیں سے بھی کھول لیں آپ کو ریشم غزلیں اور رلو دیتے اشعار مل جائیں گے۔

جہاں تک غزل کی فنکارانہ اہمیت، اس کے تخلیقی تصرف اور اس سے وابستہ فنی امکانات کا تعلق ہے تو قتیل اس عہد میں غزل کے تخلیق کاروں میں سرفہرست ہے جس میں ہر طرح کے نئے تیور سے آزاد ہونے کا رجحان غالب نظر آتا ہے۔ مگر قتیل کا معاملہ برعکس ہے کہ اس کی تخلیقی تربیت میں اسلوب کی ایمائیت، اظہار کی رمز، لہجے کی نرمی اور سب سے بڑھ کر غزل کی کلاسیکیت اور اس سے وابستہ تخلیقی کیفیات نے بہت اہم اور بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ اس لیے تو نثری نظم کے دور میں وہ جب غزل سے اپنی وابستگی کا اعلان کرتا ہے تو اس کی وجہ بھی بتاتا ہے۔

ایک سے حالات لیتے ہیں جنم ہر دور میں
یوں کہتا ہے قتیل اپنی غزل تازہ نہیں

ویسے ایک اور بات بھی ہے کہ قتیل شفائی نے غزل کو مخصوص معانی دے رکھے ہیں۔ یعنی سچ کہنا مقصود ہو تو غزل لکھو، جب جھوٹ بولنا ہو تو افسانے سناؤ۔

قتیل اس بار اپنے شعر پر تکیہ نہ کر بھائی
غزل کا یہ نہیں موسم یہ افسانے کا موسم ہے

اس شعر میں قتیل نے عام روش کے برعکس بات کی ہے کہ غزل کے استعارات میں ایمائیت کے جو تلازمات ملتے ہیں وہ پردہ پوشی کا کام کرتے ہیں۔ ویسے اسے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ جس طلسمی موسم میں غزل کے استعارات، ایمائیت اور تلازمات بھی اخفا نہ کر سکیں تو پھر واقعی وہ افسانوں سے جی بہلانے ہی کا موسم ہے۔ سو بقول قتیل:۔

آج کے یہ سچ لکھنے والے
لکھتے ہیں افسانہ اچھا

مکاں بچا نہ کوئی بارشوں کی شدت سے
کہیں کہیں کوئی اونچا محل ہی باقی ہے

سو گئے ہیں وہ تو چادر پتھروں کی تان کر
ڈھونڈتے تھے جن خداؤں کو صنم خانوں میں تم

جب کوئی کرتا ہے تمھارے رنگ و بو پر احتجاج
پھول کاغذ کے سجا لیتے ہو گلدانوں میں تم

یوں لگتا ہے سوتے جاگتے اوروں کا محتاج ہوں میں
آنکھیں میری اپنی ہیں پر ان میں نیند پرائی ہے

جب وہ پنچھی نکلے تو پانی میں مجھے پھینک دیا
کوڑے کرکٹ نے جو دریا میں بہائے کچھ لوگ
کام کے لوگ وطن میں بھی نہیں تھے کیا ہے
پھر بھی کچھ لوگوں نے باہر سے منگائے کچھ لوگ
لے کے ریزہ ریزہ کی چھتری ڈال کے ریشم کی کیل
کتنی مشکل سے تلندروں نے سدھائے کچھ لوگ...

نیک بندوں کے ہاتھ آ گئے ہیں
قیمتیں جاگ اٹھیں پتھروں کی

دن کو پیڑوں میں چھپی آگ دکھائے کوئی
وہ جو بیٹھے ہیں چناروں کی گھنی چھاؤں میں

ہر دور نے تولا اسے کانٹوں میں قتیل
جس شخص کو شوقِ چمن آرائی ہے

بند ہم پر ہوئے سوچ کے در بھی
ہو رہے ہیں بسر خوب سے خوب تر
عہد ماضی سے لے کر قتیل آج تک
ہر پیامِ سحر خوب سے خوب تر

چند اشعار میرے، آپ کے اور قتیل کے عمر کی مختلف زاویوں سے کھینچی تصویر پیش کرتے ہیں۔ ان میں طنز، تلخی بھی، شکست خواب کا احساس بھی ہے اور رسائیوں سے گھرے انسان کے وسوسے بھی۔

دھندوں کے ہجوم میں کھڑا ہوں
بکھرے ہیں مرے حواس لوگو

اور سب سے بڑھ کر یہ تمنا :

میں بھی ہوں اسی دور کا سہما ہوا انسان
تھوڑے سے تبسم کی ضرورت ہے مجھے بھی

کیا ہمیں قتیل شفائی کی اس "ضرورت" کا احساس کرتے ہوئے اس کے تبسم کے لئے "آمین" کہہ دینی چاہیئے؟ جی نہیں! اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ قتیل کو غالباً خواہ مخواہ ہی سہمے رہنے کی عادت پڑ گئی ہے حالانکہ ایسی تو کوئی بات نہیں جس کی وجہ سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت محسوس ہو۔ آخر جب باقی خیریت ہے تو قتیل کو کس بات کی پریشانی لاحق ہے، بفرضِ محال اگر اسے کوئی پریشانی ہے بھی تو یہ خود ساختہ ہے۔ آخر اسے کس حکیم نے یہ مشورہ دیا کہ معاشرہ کے مسلمات سے بغاوت کرے[1]، پینے پلانے کی باتیں کرے[2]، قحط ستم کی دعائیں مانگے[3]، اہل ایمان پر طنز کرے[4]، پیٹ کی بات کرے[5]، فرار کی بات کرے[6]، اور خواہ مخواہ روشنی کے محاذ پر ڈٹا رہے[7]، جب وہ یہ سب کچھ کرے گا تو پھر زخم بھی کھائے گا اور جب زخم کھائے گا تو پھر یہ شکایت غیر ضروری ہے :

جب زخم لگے، رقص کے انداز میں تڑپوں
قاتل کی طرف سے یہ ہدایت ہے مجھے بھی

---

[1] میں نے آواز اٹھائی تھی رواجوں کے خلاف • برچھیاں لے کے گھروں سے نکل آئے کچھ لوگ

[2] کرتے رہے تم ثنائے ساقی • خالی ہے مرا گلاس لوگو

[3] دینے والے میرے دیس کی دھرتی کو خوشحالی دے
باغوں کو پھل پھول عطا کر کھیتوں کو ہریالی دے
صدیوں جھلسایا ہے جس کو پیلی گرم دوپہران نے
اس دہقان کے چہرے کو اب شگفتہ بیر لالی دے
آخر بُرا نہ بن بیٹھے تو وہ چھوٹے چھوٹے لوگوں میں
جس کو رتبہ دیا ہے تو نے ظرف بھی اس کو عالی دے

[4] اہل ایماں میں دست و گریباں • اب ضرورت نہیں کافروں کی

[5] سوچ لو عشق سے پہلے عاشقو • پیٹ بھرنے کی بھی کچھ سبیل کی؟

[6] تم کو بچنا ہے جو توہینِ سماعت سے قتیل • شہر کو چھوڑ کے بس جاؤ کسی گاؤں میں

[7] کبھی نہ ختم کیا میں نے روشنی کا محاذ • اگر چراغ بجھا دل جلا لیا میں نے

قتیلؔ شفائی اور غمِ دوراں

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید

۱۹۳۶ء کے آس پاس کا عہد سیاسی اعتبار ہی سے نہیں، معاشی، معاشرتی اور ادبی ہر شیوہ و رنگ سے ہندوستانی عوام کی زندگی میں ناقابلِ فراموش ہے۔ جہاں تک ادب کا تعلق ہے، ہندوستان کی کونسی زبان کا ادب حالات کی اس پیش رفت اور عمل اور ردِ عمل سے گریزاں نہیں تھا۔ زندگی کا دھارا تبدیل ہو رہا تھا۔ شعری اور ادبی قدریں بھی بدل رہی تھیں۔ ادب کا زندگی سے رشتہ پہلے بھی تھا لیکن کم اور دور کا۔ اور اب یہ رشتہ بھرپور، محکم اور قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔ آزادی کی جدوجہد اور تیز ہوتی جا رہی تھی۔ انقلاب کی آہٹیں واضح تھیں۔ ترقی پسند رجحانات ادب پر چھائے جا رہے تھے۔ اور ترقی پسند تحریک ایک اہم تحریک کے طور پر تقریباً تمام ہندوستانی زبانوں اور خاص طور پر اردو میں اپنی جگہ بنا رہی تھی۔ اسی کے ساتھ یہ بھی امرِ واقعہ ہے کہ اردو شاعری ابھی غمِ ذات اور غمِ محبوب سے چھٹکارا نہیں پا سکی تھی۔ رومانی فضا اور جذباتیت ہماری زندگی پر محیط تھی۔ اور ہمارے ادب پر بھی۔ اخترؔ شیرانی اس دور کے ایک اہم اور نمائندہ رومانی شاعر ہیں۔ نیز ترقی پسند شاعروں میں بھی تقریباً سب کے ہاں کم یا زیادہ انقلاب کے ساتھ رومانیت کی چاشنی ملتی ہے۔ مجازؔ، ساحرؔ، جذبیؔ، مجروحؔ، مخدومؔ اور فیضؔ سب کی شاعری رومان اور انقلاب کا امتزاج ہے۔ کمیت اور کیفیت کا فرق ہو، یہ اور بات ہے ۔۔۔ قتیلؔ شفائی بھی اس دور کے انہی شاعروں میں ہیں جن کے یہاں رومان اور انقلاب کا امتزاج ہی نہیں ملتا بلکہ رومانی عناصر افزوں، شدید اور گہرے پائے جاتے ہیں۔ یہ صحیح ہے قتیلؔ شفائی بنیادی طور پر رومانی شاعر ہیں لیکن ان کی رومانیت اخترؔ شیرانی اور ہمارے بعض غزل گو شاعروں جگرؔ، اصغرؔ، فراقؔ اور حسرتؔ کی رومانیت سے قطعی جداگانہ بآسانی تمیز کی جا سکتی ہے۔ البتہ مجازؔ، عدمؔ، ساحرؔ اور قتیلؔ کی رومانیت کی بعض قدریں مشترک ہیں قتیلؔ کے لہجہ کی گھلاوٹ، اندازِ بیان کی بے ساختگی، نرم و نازک الفاظ کا انتخاب، جمالیاتی احساس، اسلوب کی شیرینی، سوز و گداز، مترنم بحریں اور مجموعی طور پر خنکی، شگفتگی، حلاوت اور دھیما پن ان کی شاعری کو طرحداری کا حامل بنا دیتا ہے۔ یہ درست ہے کہ جب ہم قتیلؔ کے ایسے اشعار کا مطالعہ کرتے ہیں ؎

ریشم جیسے بال تمہارے، چال سسکتی پروائی

تم آئے تو بگیا بن کر مہکی اپنی تنہائی

یہ گورے گورے بدن کا جادو یہ خوشبو پیراہن کی
اپنے موسم سے پہلے اب کی بار بہار آئی
جان کے اس گھونگھٹ سے یہ پھول سا چہرہ کیا کہنا
اصل میں تم کو دیکھ کے بھونرے ہو جاتے ہیں ہرجائی

ترے گلے میں اگر موتیوں کی مالا ہے
یہ سوچ کس نے مکاں اپنا بیچ ڈالا ہے
کتاب عمر میں چھپوا سکا نہ آج تلک
کہ ہر ورق پہ ترے نام کا حوالا ہے

تو وہ ٹھیٹھ ایک رومانی شاعر محسوس ہوتے ہیں جس نے سطحی جذبات کی گرفت سے ابھی خود کو آزاد نہیں کر پایا ہے اور ساحر لدھیانوی کے "تم میں ہمت ہے تو دنیا سے بغاوت کر لو۔ ورنہ ماں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کر لو" جیسے اشعار یاد آتے ہیں جو بہرکیف کچھ ایسی گہرائی کے حامل نہیں۔ یہی نہیں قتیل کی "مطابقت" "سندیسہ" "ایک نظم" اور "مغویہ" بلکہ ان کے مجموعۂ کلام "جلترنگ" کی کئی منظومات ساحر سے ان کے شعری مزاج کی ہم آہنگی کا احساس دلاتی ہیں ——— قطع نظر اس کے ساحر اور اپنے بیشتر رفقاء کی طرح قتیل کی نظریں زمانے کے سرد و گرم، زیست کے خوب و خراب حالات کے پیچ و خم، رسم و رواج کی تحدیدات، جابرانہ نظام، طبقاتی کشمکش، سرمایہ داروں کے ظلم و ستم زمینداروں کے استحصال، کمزور طبقات کی بے بسی و بے چارگی، ان کی مظلومیت اور ناداری پر بھی گہری ہیں۔ قتیل کو اپنے بیشتر ہمعصروں کی طرح زمانے کی نیرنگیوں کا کما حقہٗ احساس ہے اور یہ احساس بسا اوقات اس قدر شدت اختیار کر جاتا ہے کہ جھکتے جھومتے، مہکتے مہکاتے، فضا میں نرمی و خنکی بکھیرتے اور ہر دل میں رنگ و نور کی دنیا بسائے نغمے لکھنے والا شاعر بھی تڑپ اٹھتا ہے۔ اور ایسی کربناکی سے گزرتا ہے کہ اس کو اپنا وجود بھی اپنا وجود نہیں لگتا۔ غم ذات، جو ان کی شاعری کے معتد بہ حصے کا حقیقی رنگ ہے۔ شاعر اس سے بھی اپنا دامن چھڑانا چاہتا ہے اور اس کا رخ ہوتا ہے غم حیات کی سمت سے

میں اپنی ذات میں نیلام ہو رہا ہوں قتیل
غم حیات سے کہہ دو، خرید لائے مجھے

یہ اور بات ہے کہ قتیل کی شاعری مکمل طور پر موڑ نہیں لیا کہ غم حیات ہی کی ہو کر رہ گئی ہو چنانچہ قتیل کی شاعری کا بالاستیعاب اور عمیق مطالعہ کیجئے تو یہ امر واضح ہوگا اور سب سہی لیکن انہوں نے نہ غم جاناں اور غم ذات سے پورے طور پر چھٹکارا حاصل کیا ہے اور نہ پورے طور پر غم روزگار اور غم حیات کے ہو سکے ہیں۔ کبھی تو ان کے ہاں اس نوع کے اشعار بھی مل جاتے ہیں سے

غم ذات میری زندگی۔ غم کائنات میں ڈھل گئی
کسی بزم ناز میں کھو کے بھی مجھے کائنات سے پیار ہے

اور کبھی کچھ ایسے بھی

درد عشق بھی مزے کی چیز ہے قتیل
گر غم حیات سے فراق مل سکے

کتنی مایوسیوں پہ چھایا ہے
اک چھناکا تمہاری پائل کا

لیکن کچھ ہو، غم عشق اور غم روزگار، دونوں سے قتیل کی شاعری عبارت ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ انہوں نے اپنی دنیا آپ بسالی ہو، دنیا سے قطع تعلق کر لیا ہو اور ہائے ملا ہائے، کہتے رہ گئے ہوں اور نہ ایسا ہوا کہ انہوں نے فیشن کے طور پر غم زمانہ کو اپنا لیا ہو اور غم محبوب سے نجات حاصل کر لی ہو۔ ایسا شاید ممکن بھی نہیں تھا اس لئے کہ زندگی عبارت ہے دل اور ذہن، دونوں سے! غم عشق اور غم روزگار سے! — ایک معتدل مزاج اور متوازن ذہن انسان کی شخصیت، انہی دونوں سے ترکیب پاتی ہے۔ قتیل کی شخصیت، ان کی شخصیت کا کرب اور عصری شعور بھی ان دونوں غموں کے ایسے ہی امتزاج سے تکمیل و تہذیب پاتا ہے۔ اور ہر دور میں زیست کا یہی تقاضہ، فن کا منصب اور فن کار کا یہی مقصد رہا ہے۔ قتیل کی نظم "کچھ غم جاناں اور کچھ غم دوراں" کا آخری شعر پڑھیئے۔ ان کے موقف کی وضاحت ہوگی

دم بدم پیار کے گلزار بھی مہکے لیکن
دل میں کانٹے غم دوراں کے کھٹکتے ہی رہے

اسی طرح غزلوں کے یہ اشعار

کچھ محبت کے غم، کچھ زمانے کے غم
یوں بھی ناشاد ہم، یوں بھی ناشاد ہم

غم زمانہ، غم عاشقی، غم فردا
ہم اہل کے لئے ہیں ہزار تعزیریں

سچ پوچھیئے تو اہل دل ہونا فرد کے لئے ایک سزا ہے۔ اسی دل نے قتیل کو غیر معمولی حساس بنا دیا ہے اور وہ پس ماندہ، بے زبان مظلوم، مجبور اور مقہور طبقات کا ہمصفیر بن جاتا ہے۔ ان کے حقوق کے لئے آواز بلند کرنے والا۔ ان کے استحصال کے خلاف احتجاج بر لب اور احتجاج بر قلم! — اس سلسلے میں قتیل کی معرکہ آرا نظم ہے "میرا قلم"۔ جس سے ان کی شعری مزاج اور فکری رویے پر خاطر خواہ روشنی پڑتی ہے۔ یوں تو یہ ساری نظم یہاں نقل کی جانی چاہیئے لیکن طوالت کے خیال سے صرف آخری بند درج کرتا ہوں

مرا قلم، مرے جمہور کی امانت ہے
اسے عوام کی بے چارگی ستاتی ہے
مرے قلم کی زباں کاٹ دی گئی لیکن

میرے قلم کی زبان کاٹ دی گئی لیکن
مرے قلم کی رگوں میں وہ خون جوش ہے
کہ جس سے عظمت انساں پہ آنچ آتی ہے
مرا قلم وہ مورخ ہے جس کے سینے میں
غم حیات کی تاریخ سرسراتی ہے
مرے قلم کو زمانہ تو کیا خریدے گا
کہ اکثر اس سے مشیئت شکست کھاتی ہے
میں خود اسیر سہی، میرا فن اسیر نہیں
مرا قلم کسی جلاد کا ضمیر نہیں

یہ ہر دور میں اور اس دور میں بھی کئی فنکاروں کا رویہ رہا ہے۔ ان فنکاروں کا بھی جو کسی تحریک اور ازم سے وابستہ رہے اور ان فنکاروں کا بھی جنہوں نے اپنے طور پر آواز بلند کی۔ یہ کچھ ضروری بھی نہیں کہ فنکار کسی تحریک کا رکن اور کسی ازم سے وابستہ رہے۔ فنکار کا انساں دوست اور انسانیت دوست ہونا ضروری ہے اور قتیل کی انسان اور انسانیت دوستی، کسی بھی شک و شبہہ سے بالاتر ہے۔ یوں قتیل نے اپنی شاعری کو نہ صرف نکھار دیا بلکہ اس انسان اور انسانیت دوستی سے ان کی شاعری اور وقیع اور عالی مرتبت ہو جاتی ہے۔ "دردِ مشترک" کا موضوع بنیادی طور پر غم عشق ہے لیکن یہ نظم ختم ہوتے ہوتے وہ موڑ لیتی ہے کہ شاعر غم حیات سے آنکھیں ملاتا اور زمانے کو نئے انداز سے بدلنے کے عزم کا اظہار کرتا ہے۔ اس کی انسان دوستی پروقار انداز میں سامنے آتی ہے۔ جذبات کی سادگی اور شدت، دونوں لائق غور ہیں ؎

آ کہ اس دور کا معیار بدلنا ہے ہمیں
جس نے ہر ذہن کو بیمار بنا رکھا ہے
آ کہ اس جنس گراں قدر کو بیدار کریں
جس نے ہم سب کو خریدار بنا رکھا ہے
آ کہ اس فتنۂ زرپوش کو عریاں کر دیں
جس نے آفاق کو بازار بنا رکھا ہے

ممکن ہے یہ کہا جائے کہ قتیل نے اس خصوص میں گہرائی سے کام نہیں لیا ہے۔ ان کے ہاں اپنائیت لیا ہوا، چلتا چلاتا اور سیدھا سادا انداز ملتا ہے۔ کسی بنیادی طور پر رومانی شاعر سے زیست اور زمانے کے تعلق سے کچھ اور توقعات وابستہ بھی نہیں کی جانی چاہئیں لیکن شاعر چونکہ حساس ہے اس لئے وہ حالات کے جبر کو محسوس کرتا ہے۔ مسائل اور مصائب سے دوچار بھی رہا ہے۔ ان کی حقیقت سے آشنا بھی ہے۔ رومانی شاعر بسا اوقات ان اور ایسے پیچ و خم سے بے تعلق گزر جاتے ہیں گویا جو کچھ ہو رہا ہے ٹھیک ہو رہا ہے

یا ایسا تو ہوتا ہی ہے یا جیسے کچھ ہو ہی نہیں رہا ہے یا یہ سب مقدرات ہیں ان سے کس کو مفر ہے ۔ اس کے برعکس قتیل نے ان سب کو بلا کسی آسمانی کے بطور قبول نہیں کیا بلکہ منظر سے ہٹ کر ان کی نگاہ پس منظر پر بھی جاتی ہے، ان عوامل اور محرکات پر بھی اور اس طبقاتی نظام پر بھی جو استحصال کی اساس پر قائم ہے ۔ غریبوں ، بے کسوں اور بے بسوں کا استحصال ۔ ،، ردّ عمل ،، کے ان اشعار کا مطالعہ کیجئے ؛

دیکھ کر ان شنگرفی چہروں کے شفق رنگ خطوط
جن سے مجبور گھرانوں کا لہو بہتا ہے
دیکھ ان اونچے مکانات کے تہہ خانوں کو
جن کی ہر سانس میں اب زہر گھلا رہتا ہے
دیکھ ایمان کی گرتی ہوئی دیواروں کو
جن کی تعمیر میں انسان ستم سہتا ہے

اس طبقاتی نظام کی تصویر کشی ، اس دور کے کئی شاعروں کے یہاں ملتی ہے ۔ فیض ، مجاز اور ساحر کے یہاں بہت زیادہ دراصل یہ طبقاتی نظام ، یہ اونچ اور تضاد و تفریق ہی معاشرے کی بیشتر الجھنوں اور المناکیوں کی ذمہ دار ہے ۔ فنکاروں نے اس کا ادراک کیا ۔ اس کی تشخیص کی اور معاشرے کو اس سمت متوجہ کرنا چاہا ۔ شائد ہی کوئی شاعر ہوگا جس نے اس باب میں چپ سادھ لی ہو جگر جیسے کٹھیٹ غزل گو شاعر کے ہاں بھی فکر جمیل خواب پریشاں ہے آجکل ، والی غزل کے علاوہ چند ایک غزلیں اور نظمیں ایسی مل جاتی ہیں یہ اور بات ہے کہ شاعروں کے لب و لہجہ ۔ رنگ و آہنگ اور اسلوب و انداز کے باعث اردو شاعری متنوع اور ہمہ رنگ ہو چکی ہے ۔ ترقی پسند شاعروں میں سب نے اس انداز اور رنگ کی شاعری کی ہے ۔ قتیل بھی اپنے اطراف و اکناف کا احساس و ادراک کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں ۔ نظم کا عنوان ہے ،، آپ بیتی ،، یہ اشعار خصوصیت سے توجہ کے لائق ہیں ؎

تم نے راتوں میں ستارے تو ٹوٹے ہوں گے ،
میں نے راتوں میں اندھیرے ہی اندھیرے دیکھے
تم نے خوابوں کے پرستاں تو سجائے ہوں گے
میں نے ماحول کے شب رنگ بسیرے دیکھے
تم نے اک تار کی جھنکار تو سن لی ہو گی
میں نے گیتوں میں اداسی کے بسیرے دیکھے

میرے غم خوار مرے دوست ، تمہیں کیا معلوم
زندگی ، موت کے مانند گزاری میں نے !
ایک بگڑی ہوئی صورت کے سوا کچھ بھی نہ تھا !
جب کبھی حالات کی تصویر اتاری میں نے

کسی افلاک نشیں نے مجھے دھتکار دیا
جب بھی روکی ہے مقدر کی سواری میں نے

میرے غمخوار، مرے دوست تمہیں کیا معلوم!

قتیل شفائی کی انسان دوستی، دو سمتوں اور دو سطحوں پہ آگے بڑھتی ہے۔ ایک سمت اور سطح وہ ہے جب کہ انسان دوستی کا یہ جذبہ، دائرہ در دائرہ پھیلتے ہوئے خاصا وسیع، عالمگیر اور آفاقی حیثیت اختیار کر لیتا ہے کہ بلا تخصیص علاقہ، رنگ، نسل اور مذہب قتیل ہر فرد کے دکھ کو اپنا درد محسوس کرنے لگتے ہیں۔ مذہبی رہنما ایک خاص مذہب اور عقیدے تک محدود ہوتے ہیں۔ سیاستدان کسی ملک یا قوم کے مفادات سے بڑھ کر سوچ ہی نہیں سکتے لیکن فنکار کے جہاں کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ وہ ماورائے رنگ ونسل ہی نہیں۔ ماورائے زمان و مکان بھی ہوتا ہے۔ قتیل کے ہاں بھی ایسے اشعار کی کمی نہیں جہاں انہوں نے انسان کو صرف انسان کی حیثیت سے دیکھا ہے اور اس کے دکھ درد کو اپنا سمجھا ہے۔

شب آخر فلک پر ٹمٹما کر دو جتے تارے
میں اپنے ساتھ تیرا درد بھی محسوس کرتا ہوں

بارش خون شہیداں سے وہ آئے گی بہار
ساری دھرتی ہمیں گلرنگ دکھائی دے گی

اور یہ اشعار جو غیر معمولی تعمیم کے حامل ہیں، ان کی تاثیر بھی اہمیت رکھتی ہے:

پڑنے کو ہے قحط آنسوؤں کا
ہم وقت سے پہلے کیوں نہ رو لیں

ہم رقص قتیل زندگی ہے
ڈرتا ہوں کہیں قدم نہ ڈولیں

پھر وہی ویرانیاں آئیں گی اپنے سامنے
اس نگر سے بھاگ کر ہم جس نگر کو جائیں گے

آنکھوں میں سوال ہو گئی ہے
اب زیست وبال ہو گئی ہے

قتیل اپنا مقدر غم سے بیگانہ اگر ہوتا
تو پھر اپنے پرائے ہم سے پہچانے کہاں جاتے

قتیل شفائی کی انسان دوستی کی دوسری سمت اور سطح سمٹتے ہوئے عورت کی ذات تک محدود ہو جاتی ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ انہوں نے عورت کو معاشرے کے مظلوم و مقہور طبقات کے نمائندے کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ ایک اشارے کے طور! اردو شاعری تو عورت کے تصور اور تذکرے سے بھری پڑی ہے لیکن قتیل کا انداز جدا ہے۔ انہوں نے عورت کی مظلومیت کو سمجھا، اس کے جذبات

واحساسات کو پہچاننے، اس کے تخیلات واحساسات کی دنیا کا جائزہ لینے اور اس کے رنج اور درد کا مطالعہ کرنے کی سعی کی ہے۔ اس کے حقوق کی پامالی اس کے استحصال، اس کی بے بسی اور بے چارگی، اس پر معاشرے کے جبر، اس کی بربادیوں اور ویرانیوں، اس کے بے منزل خوابوں، سسکتی تمناؤں تشنہ آرزوؤں، اس کی حسرتوں اس کی آہوں کراہوں کا کچھ ان کو بھی اندازہ ہو جو ان سب کے ذمہ دار ہیں، اس موضوع پر قتیل کی منظومات کی تعداد اس قدر زیادہ ہے کہ بجائے خود ایک ضخیم مجموعہ تیار ہو سکتا ہے۔ میں اسی بے شمار منظومات میں سے جن میں بے مثال منظومات کی تعداد بھی خاصی ہے۔ چند کے عنوانات درج کرتا ہوں۔ "بانجھ" میں بانجھ عورت کے غم اور معاشرے میں اس کی متاثرہ حیثیت اور اس کے دکھ درد کو سمجھنے کی سعی ہے تو "ہرجائی"، "شمع انجمن" اور "راستے کا پھول" میں لٹی ہوئی جوانی کے کرب و بلا کی داستان ہے۔ "ایکٹرس" میں غم ایکٹرس ہے "آج اور کل" میں دو محبت کرنے والوں کی بے چارگی کا احوال ہے۔ "ایک دلہن" میں ایک دلہن کے ٹوٹے ہوئے دل کی ترجمانی ملتی ہے تو "داشتہ"، "ایکسٹرا"، "سرتاج"، "نگار سیمیں"، "زود پشیماں"، "مغویہ"، "راکھ"، "کسبی" جیسی منظومات میں عورت کے دل کے درد کو مختلف زاویوں سے اجاگر کیا گیا ہے اور یہ قتیل کی شاعری کا وہ امتیازی اور انفرادی پہلو ہے جو اور شاعروں کے ہاں ایسی عمدگی اور تابناکی کے ساتھ شاذ ہی ملتا ہو۔ یوں صنف نازک کے جذبات و احساسات کی ترجمانی۔ گویا شاعر کے سینے میں اپنا نہیں، صنف نازک کا دل دھڑک رہا ہو اگرچہ یہاں کئی اشعار پیش کئے جا سکتے ہیں لیکن میں صرف ایک نظم "ایکسٹرا" سے چند اشعار پیش کرتا ہوں ؎

تری یہ مجبور حسن کاری فریب کامل بنی ہوئی ہے
ہر ایک ٹھوکر تری نظر میں نشانِ منزل بنی ہوئی ہے
تری نظر کا ملیں سپنا، نڈھال ہو کر چھلک نہ جائے
تیرے بدن کا بھرا کٹورا کسی کے ہاتھوں چھلک نہ جائے
یہ چور بازار ہے، چلن ہے یہاں نگوڑے پیچھے نکالے
کوئی جسم فروش تاجر کہیں تجھے بھی نہ بیچ ڈالے
اگر تری سادگی کی چلمن سے کوئی فنکار جھانک لیگا
تو زندگی کا سہاگ ترے فراق میں زہر پھانک لے گا

قتیل شفائی نے اگرچہ سیاسی موضوعات پر براہ راست اظہار خیال کم کیا ہے، بے حد کم! تاہم ان کی بعض منظومات جو ان کے ارتکاز فکر کی بھی غماز ہیں ان کے سیاسی شعور کی پختگی اور ان کی وسعت نظر کی آئینہ داری کرتی ہیں، "کشمیر" اپنے ہر فریق کے لئے ایک جذباتی اور وقار کا مسئلہ بھی ہے۔ کس نے اس کو کس زاویہ سے دیکھا یا صرف اپنے زاویہ سے، یہ علحدہ بات ہے لیکن فنکاروں نے اس باب میں صرف انسانی اور اخلاقی قدروں سے کام لیا۔ قتیل کا موقف بھی ایک فنکار کا موقف ہے ان کی نظم "کشمیر" کے یہ اشعار، درد و کرب سے بھرپور انسان دوستی کی عمدہ مثال ہیں ؎

آگ اور خون کے سنگم پہ کھڑی ہوں کب سے
اپنے سہمے ہوئے ماحول کا لاشہ بن کر

جیسے حالات کے بپھرے ہوئے طوفانوں میں
رہ گئی ہو مری توقیر تماشہ بن کر

اور صرف دو مصرعوں پر مشتمل یہ نظم اپنے اختصار کے باوجود اپنے میں معنویت کی ایک دنیا لئے ہوئے ہے۔ عنوان ہے "سلامتی کونسل"

تلاشِ امن میں نکلے تو ایک جنگل میں
حنوط کی ہوئی اک فاختہ ملی ہم کو،

سلامتی کونسل، اس کے دائرہ کار اور اس کی افادیت و اہمیت پر کیسا کاری طنز ہے۔

جن فنکاروں نے آزادی کی جدوجہد کا دور دیکھا۔ اس جدوجہد میں بلا واسطہ حصہ لیا ہو یا اپنے فن کے ذریعہ بالواسطہ، انہوں نے آزادی کے بعد برصغیر کے لئے خوش آئند توقعات وابستہ کی تھیں، نئے نئے خواب دیکھے تھے۔ تخیلات میں جانے کتنی سرسبز و شاداب دنیائیں بسائی تھیں اور ان سب کا اپنے فن میں اظہار کیا تھا ۔ لیکن جب آزادی ملی، ملک تقسیم ہوا اور پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو کیا یہ وہی حالات تھے جن کے لئے عوام نے قربانیاں دی تھیں، بے جگری کیساتھ برطانوی سامراج کا مقابلہ کیا تھا! اپنا تن من دھن لٹا دیا تھا ۔ ہندوستان میں کہ پاکستان میں شائد ہی کوئی فنکار ہوگا جو ان کے حالات سے مطمئن رہا ہو کہ ہم نے وہی پایا جس کو ہم پانا چاہتے تھے ورنہ یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر تو یہاں کے وہاں کے سارے فنکاروں کا مشترکہ تاثر رہا، قتیل بھی انہی فنکاروں میں شمار ہوتے ہیں جو واقعات کی پیشرفت سے غیر مطمئن رہے۔ اپنے قلب میں ایک کسک ایک چبھن لئے! اور سب کی طرح انہوں نے دیکھا کہ منظر وہی ہے رنگ بدل چکا ہے، افسانہ وہی ہے، عنوان اور ہے کہیں کوئی تبدیلی نہیں۔ تاحد نظر، افق تا افق، وہی ہے جو کہ تھا۔ ان اشعار کا مطالعہ کیجئے۔ جیسے صریر خامہ، صریر خامہ نہیں، روح کی تڑپ ہے۔ وہی قید، وہی زنجیریں

قید قفس کے بعد کرے گا، قید گلستاں کون گوارہ
اب بھی وہی زنجیریں ہیں گو پہلی سی جھنکار نہیں

مجروح گلوں کے دامن میں پیوند لگے ہیں خوشبو کے
دیکھا جو بہاروں کا یہ چلن سنسان بنوں کی یاد آئی

دیکھا تو خوشی کے پھول کھلے، سوچا تو غموں کی دھول اڑی
کہتے ہیں بہاراں لوگ جسے، وہ سایہ اک پت جھڑ کا ہے

گلوں کی نیم بسمل زندگی کا رقص جاری ہے
چمن والو، چمن میں دیکھ لو جشن بہار اپنا

پروانوں کی راکھ اڑادی باد سحر کے جھونکوں نے
شمع بنی ہے پیکر ماتم، دیکھنے والے دیکھا تھا

اور پھر وہ نظم، جس کا عنوان ہی "جشن آزادی" ہے کا یہ بند ملاحظہ۔ حقیقت کی عکاسی اور پھر کیسے انداز میں

تم اگر جشن بہاراں بھی کہو گے اس کو
موت کے گھاٹ یہ دھوکا بھی اتر جائیگا
باد صرصر کو اگر تم نے کہا موج نسیم
اس سے موسم میں کوئی فرق نہیں آئیگا

۱۹۴۷ء کے مابعد حالات سے، دونوں ممالک کے فنکار لگ بھگ یکساں طور پر متاثر ہوئے لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، دونوں ممالک کے حالات میں زبردست تفاوت پیدا ہوتا گیا۔ پاکستان میں تقریباً ہمیشہ آمریت کے نتیجے میں آئین زبان بندی اور آزادی رائے پر قدغن نے وہاں کے فنکاروں کو عجیب کشمکش اور گو مگو کے حالات سے دوچار کر دیا۔ نہ جانے کتنے فنکاروں نے مصلحت سے کام لیا ہو، کتنوں نے خاموشی اختیار کر لی ہو، کتنوں نے اشاریت کا سہارا لیا ہو، کتنوں نے درپردہ غزل کہا ہو —————— ؟ قتیل کے ہاں پاکستان کے ان حالات کا ردّ عمل با آسانی محسوس کیا جا سکتا ہے، واضح طور پر ۔ انہوں نے خاموشی اختیار نہیں کی، دہ زبان غزل وہ سب کچھ کہہ گیا جو ان کو کہنا چاہیئے تھا۔ جو وہ کسی اور طرح نہیں کہہ سکتے تھے ۔ ہاں ان اشعار کے مطالعے سے قبل پاکستان کے داخلی حالات، فوجی انقلابات حکمرانوں کے رویہ۔ فوجی معاہدات میں شرکت اور مشرق و مغرب سے ان کے تعلقات کو ذہن میں رکھئے، معنویت اور گہری اور گہری ہوتی جائے گی ؂

بٹھا دیئے ہیں کسی نے بہار پر پہرے
صبا چلے بھی تو اذن خرام لے کے چلے
بھٹک رہا ہے زمانہ گھنے اندھیروں میں
وہ رات ہے جسے اندیشۂ سحر بھی نہیں
چمن چمن میں ہوائے سموم کے جھونکے
کبھی ہوں زہر میں جیسے برہنہ شمشیریں
نہ بیچ کر حسن چمن، شان چمن کہلاؤں
دینے والے مجھے ایسا کوئی اعزاز نہ دے
قفس میں آشیاں کا نام سن کے مطمئن نہ ہو
یہ باغباں کا حسن گفتگو ہے اور کچھ نہیں
کچھ اس ڈر سے کبھی روداد بہاراں ہم نہیں کہتے
کہ ان باتوں کو ارباب چمن محسوس کرتے ہیں

یوں قتیل کی شاعری اس نسل کے جذبات و احساسات، مزاج اور ذہنی رویے کی عکاسی کرتی ہے جس نے بیسویں صدی کے ربع دوم و سوم میں دنیا کو سنا، دیکھا، سمجھا، پرکھا اور برتا۔ یہ دراصل اس نسل کے شعور کی رو اور روداد بھی ہے۔ ایک دستاویز ہے

رومان سے انقلاب کے سفر کی۔ اپنی سحرانگیز لفظیات، شبنمی لہجہ، نرمی، لچک، غنائیت، سرشارانہ فضا اور سوز و گداز کے باعث اپنے ہمعصروں سے کئی مشترک قدروں کے حامل ہونے کے باوجود انفرادیت، طرحداری اور بانکپن کی حامل ہے اور یہی اس کے وقیع اور دلآویز ہونے کی دلیل ہے کہ قتیل شفائی کی شاعری، قتیل شفائی کی شاعری ہے جس میں روح عصر چھلکتی اور غم دوراں سانس لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

قتیل شفائی نے اردو شاعری کو کئی جہتوں سے اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے اور کوئی جہت ایسی نہیں جس میں ان کی انفرادیت اجاگر نہ ہوئی ہو نظم و غزل اور گیت کو انہوں نے ایسے لحناتی لہجے سے ہم کنار کیا ہے جو خالصتاً انکا اپنا ہے

ڈاکٹر وحید قریشی

گیتوں کے شاعر کی غزل

ظفر ادیب

غزل کے عناصر میں رومان اور غزل کے اسلوب میں رومانی لہجہ کسی پہلوؤں سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ رومان، حقیقت میں پنجاب کی زندہ دلان پنجاب کا حصہ ہے اور یہ اس روایتی رومان سے جو روایتی غزل کی ریڑھ کی ہڈی رہا ہے اس سے مختلف ہے۔ یہ حسن و عشق کے نغموں اور ان کی نغمگی کے سوا کچھ اور ہی شے ہے اپنے "ماورائے شاعری چیزے دگر است" ہی کہا جا سکتا ہے۔ اسے فنکاری سے زیادہ شعریت سے تعلق ہے یہ جنوں کو وجد آنے کی کیفیت رکھتا ہے یوں بھی سرزمین پنجاب عشق و محبت کی سرزمین ہے۔ یہاں دریاؤں کے کنارے حسن و عشق سے آباد رہے ہیں، جیالا پن یہاں کے خمیر میں شامل ہے۔ روایتی غزل کا حسن یہاں حسن نہیں اور روایتی غزل کا عشق یہاں عشق نہیں۔ اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ یہاں کی غزل روایتی غزل نہیں پیکر کے اعضا سے نہیں، روح کے اعتبار سے ـــ یہاں کی غزل یہاں کے لوگوں کے سواد وسرے لوگوں کی غزل سے الگ پہچانی جاتی ہے۔ اگرچہ غالب کی غزل کا یہاں کی غزل پر غالب ہی اثر پڑا ہے، مگر یہاں کی فصل نے اس میں کچھ اور نغمگیں اور رومانی کیفیت شامل کر کے اسے اپنے ہی انداز سے اپنا لیا ہے۔

پنجاب میں روایتی شاعری کے اسکول کی بجائے جس کا بڑا حصہ غزلیہ شاعری ہے اور جس کا اثر یہاں کے داغ اسکول یا یو۔ پی اسکول کے پیرو کار افراد پر پڑا ہے جن کی تعداد کو غالب اکثریت کا بلکہ قابلِ لحاظ اکثریت کا نام بھی نہیں دیا جا سکتا۔ نظم کی دلی، دماغی اور تجرباتی شاعری کا اسکول گردید ہ کئے رہا ہے۔ جس کا تعلق یہاں کے قدرتی ماحول اور اس کی پروردہ امنگوں سے ہے پنجاب کی اردو شاعری کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو آپ کو نظم ہی کا پلا بھاری دکھائی دے گا اور یہی یہاں کا ممتاز بلکہ کسی حد تک غالب اسلوب ہے اس کا تمام تر حسن، رومانی روح اور پیکر کے ساتھ یہاں کی غزل میں آیا۔ پنجاب کے غزل گوؤں کے یہاں جنہوں نے غزلیں بھی کہی ہیں یا معتد بہ تعداد میں غزلیں کہی ہیں نظم کا پایا جانا بھی لازمی ہے یہ یہاں کے لوگوں کی فطرت اور سیرت کا حصہ ہی نہیں خیال و جذبہ کی بنیاد بھی ہے جس کے بغیر شاعری شاعری نہیں ہو پاتی کچھ اور ہی ہو جاتی ہے۔

اختر شیرانی کے یہاں ایک اور اسلوب پایا جاتا ہے جس کا رشتہ گیت سے ہے۔ برج کے گیت سے نہیں اگرچہ یہاں کے کچھ لوگوں نے برج کے گیت کی لے میں گیت کہے ہیں۔ جس گیت میں اختر شیرانی سے ایک اور اسلوب کا رشتہ ہے۔ وہ پنجاب کے ڈھولا اور ماہیا میں اپنا رشتہ جوڑے ہوئے ہے یہ ایک اور اسلوب ان کے بعد کے لوگوں میں اور زیادہ نمایاں ہوا۔ ان کے یہاں ترکیب تو پاتا ہے لیکن پورے طور سے صورت نما نہیں ہوتا اگرچہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس اسلوب کی بنیاد انہیں کے ہاتھوں پڑی یہ بھی ایک حقیقت ہی ہے کہ ان کے خمیر میں پنجاب ایسا رچا بسا نہیں تھا جیسا اس کی پیروی کرنے والوں کے خمیر میں۔

ندیم اور راشد کے بعد آنے والے شاعروں میں قتیل اس اسلوب کا نمائندہ شاعر ہے۔ راشد کا اسلوب پہلے مغربی بعد میں ایرانی رہا اگرچہ انہیں جس انداز سے انہوں نے برتا اس انداز نے اسے ان کا اپنا ہی اسلوب بنا دیا۔ ندیم کے یہاں اس اسلوب کی ترقی یافتہ صورت پائی جاتی ہے اگرچہ وہاں جہاں جہاں وہ شدت سے ترقی پسند ہوتے ہیں اس اسلوب کی نرمی، گھلاوٹ اور موہنی پن کو زک پہنچی ہے یوں وہ بیشتر اسی اسلوب کے خدوخال ابھارتے رہے ہیں اور اسی اسلوب کے خصائص کو پروان چڑھاتے رہے ہیں۔ یہی جمالی کیفیت فیض کے یہاں پائی جاتی ہے جو جلالی ہو کر اقبال کے یہاں فیض سے برسوں پہلے گونجنے اور دل میں اترنے لگی تھی۔ ساحر کا اسلوب اس اسلوب سے کچھ ہٹا ہوا ہے کیوں؟ نہ جانے۔ اگرچہ انہوں نے ایک زمانہ لاہور جیسے حسین و جمیل شہر کی ہواؤں کو جزوِ جسم و جان بنایا لیکن ان کے یہاں اس اسلوب کا وافر حصہ نہیں آیا وہ نظم کی لے کو اونچا کئے رہے اور گیت کے جمیل حسن کی جانب ان کی نظر نہیں گئی۔ غزلیں کہی ہیں انہوں نے بھی۔ لیکن اختر شیرانی کے اس ایک اور اسلوب سے تھوڑا بہت ہٹ کر ہی۔ جو حسن ان کے یہاں روش روش دکھائی پڑتا ہے اسے ہم کسی اور کے حسن کا نام نہیں دے سکتے۔ وہ ان کا اپنا ہی اندازِ حسن ہے جس کی رگوں میں ترقی پسندی کا لہو دوڑتا ہے لیکن ترقی پسندی کی تحریکی چھاپ نہیں وہ اوّل اور آخر شاعر رہے لیکن نظم کی کیفیت اور نظم کی لے کے ہی شاعر۔

قتیل نے گیت بھی لکھے، نظمیں بھی لکھیں اور غزلیں بھی کہیں مگر ان کے فن کا حسن اور شعر کا جمال غزل ہی میں نکھرتا ہے، اس کے بعد گیت کی کشش محسوس کی جاتی ہے اگرچہ حیرت ہوتی ہے کہ ان کے یہاں یہ گیت کی روش کیونکر پروان چڑھی۔ وہ سرحد کی فضاؤں میں جوان ہوتے اور مزاج بھی انہوں نے وہیں کا پایا، وہیں کی آب و ہوا اور فضا کا ان پر اثر نمایاں ہوا اسے غالباً سوہنی مہیوال سسی پنوں، ہیر رانجھے کا دیس نہیں کہا جا سکتا، وہ خوشحال خاں خٹک کا دیس ہے اور خوشحال خاں خٹک کے دیس کا جیسا نزا نہ ہوتا ہے اسی کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، اس میں تلواروں کی جھنکار ہوتی ہے پائل کی نرم نغمگی نہیں۔ جمال کی جھمک نہیں ہوتی جلال کی کڑک ہوتی ہے لہراؤ اور بہاؤ نہیں ہوتا، طوفان کی خس و خاشاک بہالے جانے والی تیز و تند روانی ہوتی ہے کیا ہوا، کیسے ہوا، اور کیوں ہوا مگر قتیل کے یہاں یہ ہوا، اس کے یہاں گیت کی گنگناہٹ آئی اور گیت کا سجیلا پن آیا اور گیت کی نرم اور ہلکی سُریں آئیں۔

اس سے پہلے کہ قتیل کی غزل کے بارے میں کچھ کہوں یہ کہنا مناسب سمجھتا ہوں کہ قتیل فنکاری زدہ نہیں ہوئے وہ بیشتر شاعر رہے۔ اگرچہ کہیں کہیں وہ عجیب اور بعض حسین و خوش آہنگ ردیفوں کے چکر میں آئے اور کہیں کہیں تجرباتی رو میں بھی بہہ نکلے، جیسے غزل کو متزاد کی صورت میں نہیں بلکہ ردیف کو متزاد کا حصہ بنا دیا گیا ایک دو مقامات پر شعری روایات سے انحراف بھی اختیار کیا

لیکن اس سے ان کی غزل پر جو ان امور سے پیشتر دامن بچاتی رہی اور انہوں نے جو خالص شاعر کی حیثیت سے کہی کوئی تاریک سایہ نہیں پڑتا بلکہ یہ امور ایک طرح سے چاند کی پرچھائیاں ہو جاتے ہیں۔ جو بدنمائی کے داغ کا نام نہیں پا سکتیں، ایک اور بات جو اس کی ایک خوبی بھی قرار پاتی ہے اور عیب بھی ہو جاتی ہے کہ ان کی شاعری کے نو مجموعے آ چکے ہیں۔ جہاں اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی طبع نہایت زرخیز ہے اور ان کا دل رنگا رنگ جذبات کا خزانہ ہے اور ان کی زندگی بے شمار تجربات میں سے گذری ہے وہاں یہ بھی اندیشہ لاحق ہو جاتا ہے کہ کچھ اعادہ چاہے بدلے ہوئے الفاظ ہی میں سہی، اور کچھ محض کہنے کے طور پر کہی ہوئی باتیں آ جائیں اس میں شبہ نہیں کہ وہ اپنے حسنِ بیان سے اور رنگین و سدا بہار الفاظ سے ایک حد تک اس اندیشے کو واضح اور نمایاں نہیں ہونے دیتے۔ وہ شعر کے پیکر کو سجانے میں ماہر ہیں اور معانی کے لباس کو زیادہ سے زیادہ دلآویز بنانے کا فن جانتے ہیں، جس سے کان بجتے رہتے ہیں۔ اور آنکھیں چمک چمک اٹھتی رہتی ہیں آپ ان کی کوئی غزل اس حسن سے مسحور ہوئے بغیر نہیں سن سکتے یا نہیں پڑھ سکتے۔ یہ حسن واقعی ہاتھ لگانے سے میلا ہو جانے والا حسن ہوتا ہے۔ اس کی تہہ میں یا اس حسین پردے کے پیچھے کیا ہے دیکھنے کی جرأت یا حوصلہ کرنے کو بہت کم جی چاہتا ہے۔

شاعر اور خالص شاعری روایت ہر دور میں رہی ہے۔ غزل کے نشاۃ ثانیہ کا تو انحصار ہی اسی روایت پر ہے جس کا نمائندہ بلکہ بانی شاعر حسرت موہانی ہوا۔ جس کی شاعری پر اس کی سماجی اور سیاسی زندگی کی ظاہر یا پوشیدہ چھوٹ بھی نہیں پڑتی، ان کی زندگی کے سیاسی پہلو کو دیکھئے تو کتنا غیر شاعرانہ ہو کر رہ گیا تھا۔ لیکن شعری پہلو شاعرانہ بالکل شاعرانہ ہی رہا۔ اگر کہیں کچھ سیاسی پہلو کا عمل دخل ہو گیا ہے تو وہ بھی بڑی حد تک شاعرانہ ہو گیا، ترقی پسند تحریک کے شاعروں کے قافلے میں مجاز، اور فیض نمایاں رہے مخدوم بھی اسی ذیل میں آتے ہیں۔ اگرچہ فیض اور مخدوم کی شاعری کا تھوڑا سا حصہ نظریاتی بھی ہو گیا۔ لیکن بیشتر یہ تینوں شاعر ہی رہتے ہیں۔ ساحر کی بھی بالکل یہی روش رہی ہے قتیل اگر ان سب سے زیادہ نہیں تو کسی سے کم بھی خالص شاعر نہیں رہتے بلکہ وہ شاعر ہی رہتے ہیں کہیں بھی غیر شاعرانہ روش اس کو منظور اور قبول نہیں ہوتی۔ یہی بات ہم جدید شاعری میں باقی مرحوم کے یہاں دیکھتے ہیں وہ جدید یہ کم ہوا اور شاعر زیادہ رہا اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ ان کے یہاں فکری سمتیں اور وسعتیں نہیں پائی گئیں یہ سب کچھ تو ہوا ہے لیکن ایک حسن اور دلپذیری اور دلآویزی کے ساتھ ہوا ہے لذتیت یا چٹخارے پن کا گذر نہیں ہونے پاتا۔ جذبات کی صداقت زندہ اور سانس لیتی ہوئی رہتی ہے تجربات سڈول ہو کر ہی آ پاتے ہیں، محض تخیل کاری نہیں ہو پاتی، اصلیت کو کہیں ہاتھ سے نہیں جانے دیا جاتا۔ زندگی یعنی اپنی زندگی میں غیر متعلق کوئی چیز نہیں آتی، لیکن اس انداز سے کہ وہ آپ بیتی نہیں رہتی سب کے دل ہی کی بات لے کر آتی ہے اس میں جگ بیتی کا کھردرا پن بھی نہیں رہتا، سب کچھ بالکل ترشا ترشایا ہوا ہیرا ہی ہوتا ہے۔

قتیل غزل میں گیت اور گیت میں غزل کہتا ہوا پایا جاتا ہے۔ اس کی غزل بوجھل نہیں ہوتی، اضافتی اور عطفی ترکیبوں سے اور اس کا گیت ہلکا نہیں ہوتا ہزار بار کہے ہوئے اور بیان کئے ہوئے معاملات کی شمولیت سے۔ وہ دونوں کا اپنا اپنا وزن اور وقار قائم رکھتے ہیں۔ اگرچہ ان کی غزل گیت کی کیفیت اور فضا لئے رہتی ہے لیکن وہ غزل کی انفرادیت کو باقی رکھتے ہیں اور اسے اس کی انفرادیت سے محروم نہیں ہونے دیتے بلکہ ایک نئے پن سے اسے روشناس کراتے ہیں۔ اور ایک نئی طرح ڈالتے ہیں۔ جس میں وہ اپنی بھرپور شخصیت کے ساتھ جو رنگین اور حسین بلکہ صاف ستھری انسانیت اور انسان دوستی کی روشن مثال ہے جلوہ گر رہتے ہیں۔ اور اپنے

جاننے والوں کو بھی اسی طرح مسحور کرتے ہیں جس طرح اپنے قدر دانوں اور پرستاروں کو۔

مشاعروں اور عوام میں ان کی مقبولیت دیکھ کر ساحر لدھیانوی (مرحوم) کی ان کے مجموعے 'پیراہن' پر رائے سے سو فیصدی اتفاق کرنا ہی پڑتا ہے کہ ہر ایک شعر و ادب کے قدر دان کو ہے اور ہونا چاہئے۔

"قتیل شفائی پاکستان کا ساحر لدھیانوی ہے اور ساحر لدھیانوی ہندستان کا قتیل شفائی ———— میرے اور تمہارے شعری رویوں میں بڑی ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور قبول عام جسے بعض لوگ ہلکی چیز سمجھتے ہیں مجھے بھی حاصل ہے اور تمہیں بھی اور سچ تو یہ ہے کہ پہچان کا یہ مقام بڑی مشکل سے حاصل ہوتا ہے اور تمہاری شان تو یہ ہے کہ تمہیں پاکستان سے بڑھ کر ہندستان میں پسند کیا جاتا ہے۔

ساحر جیسے شاعر کو قتیل جیسے شاعر کے بارے میں اسی انداز سے رائے دینی چاہئے تھی اپنی انا پر ایک منفرد فنکار کو باقی رکھنا لازمی ہوتا ہے جہاں یہ انداز نہیں آتا تو ہاں انفرادیت مشکوک ہی ہو جاتی ہے اس کی مثالیں فارسی اور اردو ادب میں بھری پڑی ہیں، اس زمانے میں بھی ہیں اردو کی زیادہ وسعت دار بانوں میں بھی ———— شری باندے یہ جی شرما اگر (جیسے) دیوانِ غالب کی شرح اپنے ہی انوکھے انداز سے لکھتے ہیں۔ تو غالب کون ہے کہ پہلو بہ پہلو اگر کوئی ہے، بھی رکھنے سے نہیں ہچکچانے۔ اب قتیل کی شاعری کے بارے میں اس دور کے سب سے بڑے بین الاقوامی شہرت کے شاعر کی رائے بھی ایک اور ہی پہلو سے اہمیت رکھتی ہے۔ فیض 'گفتگو' کے شروع میں منفرد رنگ کی منفرد مثال کے تحت لکھتے ہیں۔ یوں تو اب تک قتیل نے بہت سے اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن اس قبول عام کا سہرا غالباً ان کی غزل ہی کے سر ہے۔

ان کا لہجہ ہمیشہ سے مطربانہ ہے اور ان کی فکر ہمیشہ سے دردمندانہ۔ طرب اور درد کے درمیان جو بہت سے مقامات پڑتے ہیں کوئی رنگین، کوئی دلستاں، کوئی نازنین، کوئی اداس، قتیل صاحب نے مختلف پیرایوں میں انہی کی منظرکشی کی ہے۔ اور اس کاوش میں انسان دوستی اور امید فردا کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا۔"

یہ قتیل کی شاعری کے ایک اور پہلو کو آئینہ دکھانی ہے اگرچہ اس میں ایک سلک پس پشت سے جھانکتا ہوا جان پڑتا ہے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ قتیل کا لہجہ ہمیشہ سے مطربانہ ہی رہا ہے ان دونوں رایوں کے ساتھ قتیل کی شاعری کو اور زیادہ نکھرے ہوئے انداز میں پیش کرنے کے لئے ایک مثال بھی پیش کر دوں تو کوئی بے جا نہ ہوگا۔ اس لئے بھی کہ اسے نہایت تطابق حاصل ہے اور دوسرے فن (حقیقی فن) کے حسن کو اس سے بہتر طور پر نہیں سراہا جا سکتا فن کی دائمی پہچان کے ساتھ ———— "تاج محل" پر ایک انگریز مصنف اپنے ذاتی واردات بیان کرتا ہوا لکھتا ہے۔ اتفاق سے وہ تعمیرات کے رموز سے بھی آگاہ تھا۔ اور تعمیر کے حسن و قبح سے متعلق گہری نظر رکھتا تھا۔

"میں تاج محل کے احاطے میں داخل ہوتے ہی سحرزدہ ہو گیا، جس طرف نظر جاتی اسی طرف کی ہو جاتی، ہر ایک شے اور ہر ایک پہلو تصور سے بالا حسین و جمیل تھا۔ الفاظ نہیں پائے جا رہے تھے کہ جن میں اس حسن و جمال کا کما حقہ نہیں تو تھوڑا بہت اعتراف کر سکتا، جتنا وقت احاطے سے باہر نہ آیا اسی ماحول اور اسی خیال میں رہا لیکن جیسے ہی احاطے کے پھاٹک سے باہر آیا تو جمالیات کا سحر چھٹنے لگا اور عقلیات نے پر پرزے نکالے اور میں تعمیر کے عیب اور نقص ڈھونڈھنے میں کامیاب ہوتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔"

غالباً یہی جمالیات اور عقلیات کا فرق ہے جو یہ کہنے پر بھی جب کبھی ایسے ہی مواقع ہوتے ہیں مجبور کر دیتا ہے کیونکہ اس طرح کے دورے اس وقت پڑتے ہیں جب کوئی جمالیات سے محروم ہو جاتا ہے اور عقلیات کا اثر اس پر حاوی ہوتا ہے اسی لئے

کہا جاتا ہے کہ آرٹ، ادب اور فنِ لطیف ماپ تول اور کسوٹی پر کسنے کی چیزیں نہیں مگر اس کے معنی یہ بھی نہیں کہ معیارات سے بے نیاز ہو جائے وہ بھی ایک چیز ہی ہیں۔

اسی سلسلے میں مجھے ایک بات یاد آتی ہے میں اسے بیان کی ترغیب کو نہیں روک پا رہا ہوں چونکہ اسی جمالیات سے رشتہ ہے اس کا۔ اس لئے وہ کچھ مناسب ہی ہو جاتی ہے۔

غالباً ۱۹۴۷ء کی بات ہے میں حضرت احسان دانش کے ساتھ مکتبہ دانش کا شریک تھا۔ بیڈن روڈ کی چوتھی منزل کے دفتر میں دن گذرتا تھا۔ بہت دنوں سے مکتبہ دانش کا بورڈ لکھنے کو پڑا تھا۔ احسان صاحب نے سرفراز آرٹسٹ (میکلوڈ روڈ) کے ذمہ یہ کام لگایا ہوا تھا۔ لیکن وہ موڈ میں نہیں آ رہے تھے۔ ایک دن بولے "چلئے استاد! آج آپ کا بورڈ لکھ دیں"، وہ مشہور کاتب ہیں اور احسان دانش چلے۔ سرفراز نے بورڈ کا کچھ ہوں ہی سا اندازہ لیا اور برش رنگ میں بھر کر بورڈ پر پھیر دیا، ایک ہی ہاتھ میں بورڈ لکھا گیا کہیں نوک پلک سنوارنے کی ضرورت نہیں پڑی، جب یہ ہو گیا تو سرفراز کاتبوں سے مخاطب ہو کر بولے "دیکھ لو استاد! کہیں کوئی کور کسر تو نہیں رہ گئی؟" کاتب بولے "کہ ظالم! تو تو اگر سیاہی الٹ کر زمین پر لوٹ جائے تو ادب کا شاہکار پیش کر دے۔" یہ جمالیات کا معاملہ ہے جب وجدان پر آتا ہے، تو معجزے سے کم پر نہیں ٹھہرتا۔

بات ہو رہی تھی قتیل کی غزلیہ شاعری کی۔ جس نے خواص و عوام میں اپنی محبوبیت کی انتہا کو چھو لیا ہے اور جس کا فنی اور شعری تجزیہ کرتے ہوئے بھی جی ہچکچاتا ہے، کیونکہ اس عمل میں ایک خوبصورت چیز کے کسی قدر ہی سہی مجروح ہونے کا اندیشہ ہے حسن تو چیز ہی ایسی ہے جسے عشق کی بے باک نگاہیں بھی جراحت پذیر ہونا گوارا نہیں کرتیں۔ اور انہیں کہیں بھی اس کے ساتھ سایے کی پرچھائیں نہیں دکھائی دیتی ایسی چیز پر تو بے رحم نقاد بھی جھجک جھجک کر رہ جاتا ہے کیونکہ ابھی تک اس کے سینے میں دل زندہ ہے اور دل زندہ اپنی ہی زندگی سے بے نیازی برت سکتا۔ خدا کرے کہ اسے سخن سازی یا انشاء پردازی نہ سمجھے۔

اگرچہ قتیل کے غالباً نو عدد مجموعہ ہائے شاعری ہیں۔ میرے پیش نظر اس مقالے کے سلسلے میں گفتگو اور پیراہن رہے ہیں۔ کچھ اور غزلیں بھی ——— جو ممکن ہے ان کے دوسرے مجموعوں میں شامل ہوں، لیکن میں نے انہیں کچھ جرائد ہی میں دیکھا ہے۔ یہ مجموعے مختلف اصنافِ سخن پر مشتمل ہیں، گیت بھی، غزلیں اور نظمیں بھی ان کے دامن میں ہیں، مطربہ طوائف کے موضوع سے متعلق ہے۔ چھتنار میں جدید رنگ کی رونمائی ہے۔ گفتگو اور پیراہن صرف غزلوں ہی پر مشتمل ہیں اور یہ ترتیب کے اعتبار سے تازہ ترین ہی ہیں۔ ان کی شاعری پچاس برس کی مدت پر پھیلی ہوئی ہے، بارہ برس کی عمر میں اپنی پہلی شعری کاوش پر انعام ملا۔ ۱۹۴۶ء سے وہ جانے پہچانے شعراء کی صف میں پائے جانے لگے، درجنوں اعزازات اور انعامات حاصل کئے جن میں قومی پیمانے کے بھی کئی ایک ہیں۔ ہری پور ہزارہ میں تو وہ کچھ زیادہ نمایاں نہیں تھے اور ان کا اندازِ شاعری بھی بیشتر روایتی ہی تھا۔ لیکن ندیم قاسمی سے راہ و رسم اور اختر شیرانی کے اثر کی ہمہ گیری اور اس دور کے شعری انداز و اسلوب نے انہیں ممتاز بنایا اور لاہور آ جانے پر تو وہ اپنی ہی طرح حسین و جمیل غزلیں کہنے لگے پھر تو عمر کے ساتھ ساتھ اور وقت کے ساتھ ساتھ رعنائیاں ہمراہ ہو گئیں اور آج وہ رعنائیوں کا ڈھیر ہو رہے ہیں۔ خصوصاً اپنی غزل میں۔ دوسری اصناف بھی قابل لحاظ طور پر نیچے تک سنوار لیتی ہے لیکن غزل کی بات ہی کچھ اور ہے میرے خیال میں اس کے بعد ہی ان کے گیت کا نمبر آتا ہے ممکن ہے کچھ لوگ میرے اس خیال سے اتفاق نہ کریں اور ان کے گیت ہی کو ان کی جانِ شاعری قرار دیں۔

فن اور شخصیت

اب قتیل کی رنگ بھری پچکاریوں کی ہولی دیکھئے میں اس بات کی جہاں تک ممکن ہو سکے گا احتیاط کروں گا کہ مثالی اشعار کی پیشکش کے سبب یہ مقالہ طویل اور گراں نہ ہو جائے۔ اس لئے بھی کہ ان کی پوری شاعری کا انتخاب بھی پیش کیا جا سکتا ہے اگرچہ انتخاب کرنے والے کی اپنی پسند کی چھاپ اس انتخاب پر ہوگی پھر بھی اس امر کا امکان ہے کہ کچھ اعادہ واقع ہو جائے۔ ان اشعار میں جو میں شامل مقالہ کرنا چاہوں گا۔ اس سے یہ تو فرض نہیں ہو جاتا کہ میں ان اشعار کو درج نہ کروں جن کی بنیاد پر قتیل کی غزلیہ شاعری کے اوصاف سے متعلق ذہن بنا ہے اور جو اس مقالہ میں شروع ہی سے ایک زیریں لہر کی طرح سے کارگر رہا ہے۔ پھر یہ بھی کیا ضروری ہے کہ میری ہی پسند اوروں کی پسند بھی ہو جائیگی لیکن اس مقالے کے ساتھ ان کا تعلق روح اور جگر کا تعلق ہے، شاید ہی اس سے کسی کو انکار ہو سکے۔

پیراہن

ابتدائیہ (جس کا ایک مصرع ہے "شیشہ کند نہ ہونے پائے ساری عمر مرے فن کا" اور جس میں واضح اشارہ موجود ہے زندہ جذبات کے زندہ بت تراشنا وہ جذبات نہیں جو محض خواب و خیال میں وجود رکھتے ہیں یا جن کی کوئی حقیقت بنیاد نہیں ہوتی بلکہ وہ جو تجربات اور واردات کی وادیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ اور جنہیں فنکار اپنے شیشے سے تراش کر زندہ جاوید، دھڑکتے ہوئے دل والے بت بنا دیتا ہے۔) اور دعائیہ (جس کا ایک مصرع "وہ اسے کوئی تخلیق ہمیشہ زندہ رہنے والی دے" اور جس کا رشتہ بھی ابتدائیہ کے مندرجہ بالا مصرع سے جڑا ہوا ہے) اور اختتامیہ کے درمیان (جس کا ایک شعر ہے سہ "جشن بہاراں اب کے بھی ہم نے منا ڈالا ہے مگر / گلشن سے باہر تھی صبا قحط صبا گلشن میں تھا"۔ اگر اسی طرح ہے۔ غزلیں ہی غزلیں ہیں جیسے پھولوں کا ڈھیر — رنگ بھی ہے اور مہک بھی — جیسے قتیل کی شخصیت اور شاعری خصوصاً غزلیہ شاعری کا انفرادی اور امتیازی پہلو بجا طور پر کہا جا سکتا ہے۔

غزل یعنی اپنی غزل کا تعارف بمعنی تعریف ایک غزل کے مطلع میں دیتے ہیں۔

سخن بریدہ زباں کا بدل ہی باقی ہے
وضاحتوں کے لئے اب غزل ہی باقی ہے

کیا ہی سچی عصریت لئے ہوئے یہ شعر ہیں کیا اس سے کوئی صاحب ضمیر انکار کر سکتا ہے۔

ہر کسی کو فکر ہے اب اپنے جام کی
جاؤ گے اب کیا تمنا لے کے میخانوں میں تم

سو گئے ہیں وہ تو چادر پتھروں کی تان کر
ڈھونڈتے تھے جن خداؤں کو صنم خانوں میں تم

تم تو ساحل پر گڑے ہو ایک پتھر کی طرح
کشتیوں کا رقص کیا دیکھو گے طوفانوں میں تم

کیا اس آخری شعر سے زیادہ خوبصورت امتزاج جدیدیت اور غیر جدیدیت کے درمیان ہو سکتا ہے؟ غزل کی آبرو بھی بے داغ رہتی ہے اور جدیدیت کی بات بھی ہو جاتی ہے۔

فن اور شخصیت

قتیل غزل میں رنگِ اقبال سے نہیں بچ سکے شاید بچ بھی نہیں سکتے تھے۔ اگرچہ اس میں ایک یا دوسرے پہلو سے اپنا پن لے آنے کی فکر بھی انہیں رہی۔

حالات کے قدموں پہ قلندر نہیں گرتا
ٹوٹے بھی جو تارا تو زمیں پر نہیں گرتا

مشکوک نظر سے مجھے تکتی ہے یہ دھرتی
کیوں عرشِ معلیٰ مرے سر پر نہیں گرتا

کرنا ہے جو سرِ معرکۂ زیست تو سن لے
بے بازوئے حیدر درِ خیبر نہیں گرتا

یہ اپنے معروف رنگ سے ہٹتے ہوئے اُن کا انداز بھی دیکھئے۔

تیز دھوپ میں آئی ایسی لہر سردی کی
موم کا ہر اک پتلا بچ گیا پگھلنے سے

کب سننے دیتی ہے شور سمندر کا
پانی کی اک بوند جو میرے کان میں ہے

ٹانک دو اس میں اک مصنوعی تتلی بھی
کاغذ کا جو گلدستہ گلدان میں ہے

اپنے ہجر کے پس منظر میں جھانک مجھے
میری سب روداد اسی عنوان میں ہے

اُن کو پیڑوں میں چھپی آگ دکھائے کوئی
وہ جو بیٹھے ہیں چناروں کی گھنی چھاؤں میں

کرتے رہو تم ثنائے ساقی
خالی ہے، میرا گلاس لوگو

وہ شخص برا تھا نہ وہ ہرجائی تھا
اس کو فقط اندیشۂ رسوائی تھا

میری اونچائی تو میرے سر سے ہوتی ہے شروع
میرے قد میں ڈھونڈتے ہیں لوگ میرے ناپ کو

چُپ نے پنجے گاڑ دیئے کہرام کے سینے میں
سوچ اسیرِ دام ہوئی اب آگے کیسا ہوگا

اور یہ لہجہ دیکھئے جس میں ساحر کی پرچھائیں دکھائی دیتی ہے یا جس پر ساحر کی پرچھائیں پڑ جاتی ہے —

موت برحق ہے مگر میری گذارش یہ ہے
زندہ انساں کا جنازہ نہ اٹھایا جائے
قد جس سے رسن و دار کی بڑھ جاتی ہے
مجھ کو اس حرفِ ندامت سے بچایا جائے

گفتگو حمد کا رنگ روپ لئے آغازِ گفتگو سے سفر شروع کرتا اور کچھ اس میں ہے وہ سب کچھ خدا کی طرف سے ودیعت کیا ہوا کہتا ہے۔

سب حمد و ثنا تیرے لئے ہے میرے مولا
تو وہ ہے کہ جس نے مجھے توفیق ہنر دی
تخیل پر اتری تیرے انوار کی شبنم
میں رات کا راہی تھا مجھے تو نے سحر دی
پہنچایا مجھے تو نے سمندر کی تہوں میں
تلاش کو تو نے خبرِ لعل و گہر دی
صد شکر کہ تو نے مجھے فنکار سمجھ کر
کلیوں کے چٹکنے سے مجھے اپنی خبر دی

اب غزلوں کے اشعار دیکھئے جو بالکل ان کے اپنے اور معروف رنگ و آہنگ کا پتہ دیتے ہیں۔

کیا بتاؤں دوستو! ان کے خیال آنے کا خیال
جھلملاتی جھیل میں لرزاں کوئی مہتاب تھا
اپنے قریب پا کے معطر سی آہٹیں
میں بارہا سسکتی ہوا سے لپٹ گیا
سہما سہما سا اک سایا مہکی مہکی سی اک چاپ
پچھلی رات میرے آنگن میں آ پہنچے وہ اپنے آپ

کسی دُلہن کے چمکتے ہوئے جھومر کی طرح
رات نے صبح کے ماتھے پہ سجایا سورج
شب کو بھی روح کے آنگن میں رہی دھوپ قتیلؔ
چاند تاروں نے بھی آ کر نہ بجھایا سورج

تتلیوں کا رنگ ہو یا جھومتے بادل کا رنگ
ہم نے ہر اک رنگ کو جانا تیرے آنچل کا رنگ

یہ کسک بھی کہیں کہیں جھانک پڑتی ہے۔ جو توقعات پوری نہ ہونے پر دلوں میں جھلملاتی رہتی ہے۔

چار جانب جس کی رعنائی کے چرچے ہیں قتیلؔ
جانے کب دیکھیں گے ہم اس آنے والی کل کا رنگ

اور یہ غزل میں گیت کا رنگ

چاندی جیسا رنگ ہے تیرا سونے جیسے بال
اِک تو ہی دھنوان ہے گوری باقی سب کنگال
ہر آنگن میں سجے نہ تیرے اُجلے روپ کی دھوپ
چھیل چھبیلی رانی تھوڑا گھونگھٹ اور نکال

پھر یہ دار و رسن کی بات غزل کا لہجہ لئے ہوئے طرح طرح سے اپنی جھلکیاں دکھاتی ہے۔

کھلا ہے جھوٹ کا بازار، آؤ سچ بولیں
نہ ہو بلا سے خریدار، آؤ سچ بولیں
سکوت چھایا ہے انسانیت کی قدروں پر
یہی ہے موقعِ اظہار آؤ سچ بولیں
ہمیں گواہ بنایا ہے وقت نے اپنا
بنامِ عظمتِ کردار آؤ سچ بولیں
تمام شہر میں کیا ایک بھی نہیں منصور
کہیں گے کیا رسن و دار، آؤ سچ بولیں

اور اپنے ماضی کو کتنے پیار سے یاد کرتے ہیں۔

وادیٔ سرہن میں تھیں جو مہرباں مجھ پر قتیلؔ
وہ بہاریں ڈھونڈتی ہیں اب مجھے پنجاب میں

فن اور شخصیت

کاش ان بہاروں کا بھی کہیں ذکر پایا جاتا، گیتوں اور غزلوں میں تو لفظ و بیان کی رنگینی میں آثار پائے جاتے ہیں -
،،جب کبھی آتا ہے میرا نام تیرے نام کے ساتھ — جانے کیوں لوگ میرے نام سے جل جاتے ہیں،، کی آواز اور لہجہ یہاں بھی پایا جاتا ہے -

کیا خبر کب نیند آئے دیدۂ بے خواب میں
شام سے ہم جل رہے ہیں سایۂ مہتاب میں
جس گلی میں گھر تمہارا ہے کرو اس کا خیال
ہم تو ہیں بدنام اپنے حلقۂ احباب میں

اور یہ جدید رنگ جس کی پرچھائیاں 'پیراہن' میں اور گہری ہوئیں —

بکھرا پڑا ہے تیرے ہی گھر میں ترا وجود
بیکار محفلوں میں تجھے ڈھونڈتا ہوں میں
میں خودکشی کے جرم کا کرتا ہوں اعتراف
اپنے بدن کی قبر میں کب سے گڑا ہوں میں
پہنچا جو تیرے در پہ تو محسوس یہ ہوا
لمبی سی اک قطار میں جیسے کھڑا ہوں میں

پودا پودا پال کے وقت نہ ضائع کر
کاغذ کے کچھ پھول سجا گلدانوں میں

رات کے بعد سحر بھی آئی
اپنا اک خواب تو سچا نکلا

قتیل لوٹ لوٹ کر اس لہجے اور انداز پر آتے ہیں - غالباً یہی ان کا اصل رنگ ہے -

اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں سجا لے مجھ کو
میں ہوں تیرا تو نصیب اپنا بنا لے مجھ کو
میں جو کانٹا ہوں تو چل مجھ سے بچا کر دامن
میں ہوں گر پھول تو جوڑے میں سجا لے مجھ کو

پھولوں کی اداسی کو چھپا جاتی ہے خوشبو
اڑتا ہے کوئی رنگ تو چھا جاتی ہے خوشبو

پربتوں سے نکل آئیں گے مقرکتنے پیکر
لفظ زن خامشیِ سنگ دکھائی دے گی

خدا کرے کبھی ایسا ہو، یہ دور ایسا آیا ہے کہ اس کا امکان بظاہر دکھائی نہیں دیتا۔

رات یوں چاند کو دیکھا ہے ندی میں رقصاں
جیسے جھومر ترے ماتھے پہ ہلا کرتا ہے
لوگ کہتے ہیں جسے نیل کنول وہ تو قتیل
شب کو اُن جھیل سی آنکھوں میں کھلا کرتا ہے

آ گئے تھے جس کی دید کو جھونکے بہار کے
میرے بدن میں پھر وہی خوشبو رچا ئے

تو ہمیں جب کبھی یاد آئے
چیت کی چاندنی یاد آئے
کیا ہوئیں جگنوؤں سی وہ آنکھیں
رات برسات کی یاد آئے

وہ جب سے گیا شہر میں ہے قحطِ رقیباں
اِس شہر کی رونق تھی اسی شخص کے دم سے

یہ معجزہ بھی محبت کبھی دکھائے مجھے
کہ سنگ تجھ پہ گرے اور زخم آئے مجھے
زمانہ درد کے صحرا تک آج لے آیا
گذار کر تیری زلفوں کے سائے سائے مجھے

اس رنگ کے ساتھ قتیل کے یہاں غزل کا یہ اپنی ہی پہچان لیئے ہوئے رنگ بھی ہے۔

مچا ہے شور سا ہونٹوں کے پیچھے
یہی چپ ہے تو پھر آواز کیا ہے

مجھے خوف آ رہا ہے قہقہوں سے
بھلا رونے کا یہ انداز کیا ہے

میں آپ اپنا تعاقب کر رہا ہوں
یہ عالم اے میرے دم ساز کیا ہے

سبھی خاموش ہیں پیاسے بھی رہ کر
تری محفل کا یہ اعجاز کیا ہے

مگر یہ آنکھوں میں کھلتے ہوئے کنول دیکھنے والا شاعر ستاروں کو بھی اپنی غزل سناتا ہوا پایا جاتا ہے۔

تری آنکھوں میں جب کھلتے ہوئے دیکھے کنول میں نے
ستاروں کو سنائی دیر تک اپنی غزل میں نے

نہ ہوگا سو برس کی عمر میں بھی یہ سکوں حاصل
گزارا تجھ سے مل کر جس طرح ایک ایک پل میں نے

ہزار شیوہ غزل کا یہ ہزار شیوہ غزل گو اس آواز کو بھی اپنے ساز دل سے نکالتا ہے۔

پل چل کے برہنہ جیسے دنیا نے کیا ہے
اس درد نے اب میرا بدن اوڑھ لیا ہے

میں ریت کے دریا پہ کھڑا سوچ رہا ہوں
اس شہر میں پانی تو یزیدوں نے پیا ہے

اے گورکنو! قبر کا دے کر مجھے دھوکا
تم نے خلاؤں میں مجھے گاڑ دیا ہے

ٹوٹی ہوئی مسجد میں کھڑا دیکھ رہا ہوں
محفوظ شوالے کا گجر ہے کہ نہیں ہے

مگر گھوم پھر کر پھر اپنے مرکز کی طرف آ جاتا ہے اور اپنے محور کے دائرے کو کبھی بھول نہیں جاتا۔

کہاں سے ڈھونڈ کے لاؤں چراغ سے وہ بدن
ترس گئی ہیں نگاہیں کنول کنول کیلئے

نئے موسم بڑے بے درد نکلے
ہرے پیڑوں کے پتے زرد نکلے
دلوں کی برف پہنچی عارضوں تک
یہ انگارے بھی کتنے سرد نکلے
دکھائے خواب سے کچھ آہٹوں نے
بدن جلتا گیا پرچھائیوں کا

اللہ اللہ یہ کیفیتِ دل اور یہ صورتِ حالات۔

ہے شہر میں قحط پتھروں کا
جذبات کے زخم کھا رہا ہوں
ممکن ہے جواب دے اُداسی
در اپنا ہی کھٹکھٹا رہا ہوں
آیا نہ قتیلؔ دوست کوئی
سایوں کو گلے لگا رہا ہوں

اور اس مجموعے کا یہ آخری شعر

جب پو پھٹی تو بڑھ کر، کچھ نا امیدیوں نے مجھ سے قتیلؔ پوچھا
کیا تو ہی ہے جواب تک، موہوم آہٹوں کی جھنکار سن رہا تھا

کچھ اور ادھر اُدھر سے — شاید اب تک چھپے ہوئے مجموعوں سے باہر کی غزلوں سے۔

ہر طرف جنگل ہی جنگل بستیوں کے درمیاں
شہر جیتے اژدھا اور میں اکیلا آدمی
گھومتا پھرتا ہوں شاید کوئی مجھ سا آملے
غم کے میلے جا بجا اور میں اکیلا آدمی
دل کے صحرا سے کیا آباد اسے میں نے قتیلؔ
یہ جہاں میری عطا اور میں اکیلا آدمی

یہ اکیلا آدمی متوقع آدمی ہی ہے جو ماضی میں تو رہا بھی مگر مستقبل میں اس کے ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ یوں دنیا نہ کبھی خالی رہی نہ کبھی خالی رہے گی لیکن منظرِ عام پر اور ہر کہیں آدمی نما آدمی ہی پایا جاتا ہے اور پایا جائے گا۔ کیونکہ پیغمبروں کا سلسلہ تو بند ہو گیا جب پیغمبر ہی نہیں تو صحابہ کہاں ہاں درویشوں اور صوفیوں اور فقیروں میں کچھ لوگ نکل آیا کریں گے جو آدمی کی جھلک دکھاتے رہا کریں گے۔

ہ ہی جیسے برسات کی رات میں جگنو کی چمک۔

رات لگا تھا پیار کا میلہ نکلا تھا پونم کا چاند
بیٹھا تھا میں جہاں اکیلا پل بھر وہاں نہ چمکا چاند
مست پون کے جھونکے شاید انہیں کبھی لے آتے
کاش ابھی کچھ دیر نہ چھپتا رہ سکتا موسم کا چاند
چٹک رہی تھیں آس کی کلیاں کوک رہی تھی کوئل بھی
یاد بہت آیا ایسے میں تیرے نول قسم کا چاند
وصل کی رات کا راج دلارا، آیا ہجر کے لمحوں میں
ہائے یہ کس عالم میں دیکھا میں نے کس عالم کا چاند

یہ گیتوں کے شاعر کی غزل گیت کی فضا بھی رکھتی ہے اور گیت کی روح بھی۔ لیکن ردیف کی پٹریاں جہاں خوش آہنگ جھنکار پیدا کرتی ہے وہاں کچھ دھڑکنوں کو گنگنانے نہیں دیتیں۔

"فن اور شخصیت" کے غزل نمبر میں جو غزلیں دی ہیں اُن کے منتخب شعر درج ذیل ہیں۔ ان کا حوالہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ یہ تاریخ شعر میں رہ جانے والی غزلیں تصور کی گئی ہیں اور یہ بات ایک حد تک درست بھی ہے کیونکہ یہ انتخاب جاں نثار اختر کا کیا ہوا ہے۔

چلو اچھا ہوا کام آگئی دیوانگی اپنی
وگرنہ ہم زمانے بھر کو سمجھانے کہاں جاتے
قتیل اپنا مقدر غم سے بیگانہ اگر ہوتا
تو پھر اپنے پرائے ہم سے پہچانے کہاں جاتے

ایک اور مشہور غزل کے چار شعر درج ہیں چار ہی شعر اس غزل کے بھی ہیں، زبان زد عوام یہ شعر ہے۔

جب بھی آتا ہے میرا نام ترے نام کے ساتھ
جانے کیوں لوگ میرے نام سے جل جاتے ہیں

تین غزلیں "گفتگو" سے لی ہوئی ہیں (۱) منظر سمیٹ لاتے ہیں جو تیرے گاؤں کے (۲) ہر بے زبان کو شعلہ نوا کہہ لیا کرو (۳) رنگ جدا، آہنگ جدا، مہکار جدا — ایک اور غزل ہے جس کے یہ شعر توجہ کش ہیں۔

کون سیاہی گھول رہا ہے وقت کے بہتے دریا میں
میں نے آنکھ جھپکی دیکھی ہے آج کسی ہرجائی کی
اڑتے اڑتے آس کا پنچھی دور افق میں ڈوب گیا
روتے روتے بیٹھ گئی آواز کسی سودائی کی

کچھ اس انداز کے تیور اور بیان اپنے شعروں کو قتیل دے دیتے ہیں کہ وہ نہایت دلربا، سحر کن اور ظرف آزما ہو جاتے ہیں۔ سننے والے تو بعض اوقات ماہی بے آب سے دکھائی پڑتے ہیں اور پڑھنے والوں پر بھی ایسی تو نہیں، کچھ ہی اس سے کم کیفیت پائی جاتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ جادو جگانے کی صلاحیت ان میں خداداد ہی ہے اور یہی صلاحیت انہیں ہندو پاک کا نہایت پیارا اور دلآویز شاعر بنائے ہوئے ہے۔

'اوراق' سالنامہ ۱۹۷۶ء میں دو غزلیں ہیں۔ یقیناً کسی نہ کسی مجموعے میں آگئی ہوں گی کچھ بے جا نہیں معلوم ہوتا اگر ان کے بعض اشعار جو مجھے "رسوا کرنے والے ہوں" یہاں درج کر دوں شاید ان سے کوئی ایسا پہلو تکمیل پا جاتے جو اس سارے مقالے میں تشنہ رہ گیا ہے۔

کچھ بھی ہو آپ کے ماحول کا معیار حیات
آپ کے ذہن میں تصویر ہماری ہوگی
تہمتوں سے ابھی مرے گا یہ جہاں دار وفا
اب اسی ڈھنگ سے توقیر ہماری ہوگی

کوئی بات دل میں وہ ٹھان کے رہا کچھ تری شان سے
وہ نیاز مند جو سر بزم کئی دن سے تیرے حضور ہے
ہیں نکل کے بھی تیرے دام سے دگر دوں گا اپنے مقام سے
ہیں قتیل تیغ جفا سہی، مجھے تجھ سے عشق ضرور ہے

شاید میں کسی حد تک قتیل کی غزلیہ شخصیت کو پیش کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں اور کوئی پہلو نظر انداز نہ ہوا ہو، جو اس کی غزل کو ایک امتیازی شان دیتا ہو۔ میری کوشش رہی ہے کہ کہیں سخن گسترانہ بات نہ آ پڑے اور قتیل اور قتیل کے پرستاروں کی توقعات اگر کما حقہ نہیں تو بڑی حد تک پوری ہو جائیں۔ یہ میں کر سکتا ہوں یا نہیں اس کا فیصلہ اصحاب الرائے پر ہے اگرچہ میں اپنے زعم میں اس سے عہدہ برآ ہو گیا ہوں۔

قتیل شفائی
حقیقت کو رومان اور تخیل کا ٹچ دے کر
جاندار اور موثر شاعری کرتا ہے ——

—————— ڈاکٹر آغا سہیل

قتیل شفائی اور آزاد غزل

مظہر امام

قتیل شفائی تہذیبِ عاشقی کے البیلے پن کے شاعر ہیں۔ وصال و ہجر سے زیادہ وہ احساسِ عشق کی لذت اور سرور کے جرعہ کش ہیں۔ اُن کا (کر)دارِ عاشق اپنے دکھ درد میں دوسروں کو شریک کرنا نہیں چاہتا۔ وہ خود کسی سے ہمدردی کی بھیک کیا مانگیں گے، وہ تو ستاروں کو بھی دلاسا (د)یتے ہیں:

ہمیں بھی نیند آ جائے گی، ہم بھی سو ہی جائیں گے
ابھی کچھ بے قراری ہے، ستارو تم تو سو جاؤ

وہ خود اپنی محبت کی تشہیر کرنا نہیں چاہتے، مگر دیوانگی پر کسی کا کیا اختیار ہے، وہ خوش ہیں کہ انھیں اپنی داستانِ درد سنانی نہیں پڑی۔ یا (اُن کے) سکوت ہی کو صدا کہہ لیا کرو):

چلو، اچھا ہوا، کام آ گئی دیوانگی اپنی
وگرنہ ہم زمانے بھر کو سمجھانے کہاں جاتے

قتیل شفائی کی سب سے مشہور غزل شاید وہی ہے جس کا شعر ابھی آپ نے پڑھا۔ لیکن میرے ذہن میں ان کی جو غزل میرے عنفوانِ شباب سے ہی چپک کر رہ گئی ہے اس کے دو تین شعر قندِ مکرر کے طور پر پیش کروں گا۔ آپ نے یہ اشعار بارہا پڑھے یا سُنے ہوں گے۔ اگر میری یادداشت غلطی نہیں کرتی تو یہ غزل پہلی بار "سویرا" لاہور کے پہلے شمارے میں ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئی تھی۔

کون سیاہی گھول رہا ہے وقت کے بہتے دریا میں
میں نے آنکھ جھکی دیکھی ہے آج کسی ہرجائی کی
وصل کی رات نہ جانے کیوں اصرار تھا اُن کو جانے پر
وقت سے پہلے ڈوب گئے تاروں نے بڑی دانائی کی

اُڑتے اُڑتے آس کا پنچھی دُور اُفق میں ڈوب گیا
روتے روتے بیٹھ گئی آواز کسی سودائی کی

قتیل شفائی نے غزلیں بھی لکھی ہیں، نظمیں اور گیت بھی، لیکن اگر اُردو کے عصری ادب میں اُن کا نام درجۂ اعتبار حاصل کر سکا ہے اور اگر ہماری ادبی تاریخ میں اُن کا نام محفوظ رہے گا تو اُن کی غزلوں کی وجہ سے۔ وہ الفاظ کی شیرینی اور نرمی اور لہجے کی ملائمیت کے باعث دور سے پہچانے جاتے ہیں۔ انھیں اردو زبان کی دلکش روایت کا پورا عرفان ہے۔ اور وہ اسی زندہ روایت کی آبیاری سے شاعری کے چمن میں گل بوٹے کھلانے پر قادر ہیں۔

قتیل کی عمومی شاعری یا کم از کم ان کی غزل گوئی کا تفصیلی جائزہ بھی اس مضمون کے موضوع سے خارج ہے۔ اس مختصر تمہید کا مقصد صرف یہ ہے کہ قتیل شفائی کی غزل کے مزاج، اسلوب اور رنگ و آہنگ کا ہلکا سا خاکہ پیش کر دیا جائے۔ یہ مزاج اور اسلوب، جس کا رشتہ اردو کی شعری روایت سے نہایت گہرا ہے۔ قتیل نے عموماً رواں دواں، مروج اور مانوس بحروں میں غزلیں کہی ہیں۔ نیا بننے کے شوق میں نامانوس بحروں اور غیر مناسب زحافات سے دلچسپی نہیں دکھائی لیکن ان کی شاعری نے ہمیشہ تازگی کا احساس دلایا ہے۔ ان کے کلام کا سرسری مطالعہ بھی یہ ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے کہ انھیں ہمیشہ خوب سے خوب تر کی جستجو رہی ہے۔ ہندوستان کے گذشتہ سفر میں انھیں ایک نئی صنفِ سخن "آزاد غزل" کے تجربے سے آشنا ہونے کا موقع ملا۔ آزاد غزل ہندوستان میں کئی سال سے زیرِ بحث ہے، اور اب پاکستان میں بھی اس کا چرچا ہونے لگا ہے قتیل نے اس صنف کے امکانات کو بہ یک نظر محسوس کر لیا۔ اور انھوں نے چار آزاد غزلیں لکھیں۔

آزاد غزل کا تجربہ سب سے پہلے میں نے ۱۹۴۳ء میں کیا تھا لیکن اس کی اشاعت پہلی بار ۱۹۶۲ء میں ہوئی۔ اس کا ردِعمل کچھ امید افزا نہیں رہا۔ ۱۹۶۸ء میں جب میری دوسری آزاد غزل "شب خون" الہ آباد میں شائع ہوئی تو اس تجربے نے ادبی حلقوں کو چونکایا اور اس کی بازگشت پہلی بار پاکستان میں بھی سنائی دی جب "فنون" کے "جدید غزل نمبر" (اشاعت: ۱۹۶۹) میں سلیم اختر نے اپنے مضمون "تخلیقی عمل کا نفسیاتی مطالعہ" میں اس غزل کو نقل کیا۔ پاکستان میں اس نئی صنفِ سخن سے متاثر ہونے والے پہلے شاعر ظفر اقبال تھے، مگر انھوں نے "اینٹی غزل" کہنے کے شوق میں اپنی آزاد غزل کو بھی غیر سنجیدہ رنگ بخشا۔ محض نمونتاً دو تین شعر ملاحظہ فرمایئے:

اس مکاں کو اس مکیں سے ہے شرف
یعنی اک افواہ سی اڑنے لگی ہے ہر طرف
"چھدر ہوں" اور چور کا ہو کیا علاج
ماسوائے ہینڈ کف
نظرِ ثانی بھی کریں گے اس غزل پر اے ظفرؔ
فی الحال تو لکھی ہے رَف

کاش اس غزل پر ہی نہیں، ظفرؔ اقبال اپنے شعری موقف پر بھی نظرِ ثانی کرتے، اور پھر اسی نئی صنف کی جانب توجہ دیتے تو آزاد غزل کے گیسو سنوارنے میں ان کے شانۂ فن کو یقیناً کامیابی حاصل ہوتی۔"

اس کوشش کے بعد کئی سال تک پاکستان میں آزاد غزل کا نام نہیں سنا گیا۔ ۱۹۷۶ء میں "اوراق" لاہور (مدیر: ڈاکٹر وزیر آغا) میں عنوان چشتی کا مقالہ "جدید اردو غزل میں عروضی تجربے" شائع ہوا۔ اس مضمون کے دو صفحات میں آزاد غزل کی صنفی خصوصیات بیان کی گئی تھیں اور مظہر امام، کرامت علی کرامت، یوسف جمال، مسعود شمس، بدیع الزماں خاور اور زرینہ ثانی کی آزاد غزلوں سے نمونے پیش کئے گئے تھے۔ پھر "اوراق" کے سالنامہ ۱۹۷۹ء میں یوسف جمال کی ایک آزاد غزل شائع ہوئی مگر اس کا عنوان "آزاد غزل" نہیں بلکہ "ایک تجربہ" تھا۔ یوسف جمال کے توجہ دلانے پر اُن کی دوسری غزلیں "اوراق" کے شمارہ جولائی اگست ۱۹۷۹ء اور سالنامہ ۱۹۸۰ء میں آزاد غزل کے عنوان سے ہی شائع ہوئیں۔ جولائی اگست ۱۹۷۹ء کے شمارے میں علیم صبا نویدی کی آزاد غزلوں کے مجموعے "ردِ کفر" پر ڈاکٹر انور سدید کا ایک بہت حوصلہ افزا تبصرہ شائع ہوا۔ ستمبر اکتوبر ۱۹۸۱ء کے "اوراق" میں علیم صبا نویدی کی آزاد غزل اہتمام سے شائع کی گئی۔

۱۹۸۰ء میں ہی ایک اطلاع کے مطابق، پاکستان ٹیلی ویژن کے ادبی پروگرام "ماہ نامہ" میں احمد ندیم قاسمی، وزیر آغا اور منیر نیازی نے آج کی اردو غزل پر گفتگو کرتے ہوئے آزاد غزل کے تجربے کا خصوصی ذکر کیا۔ اور اس صنف کے موجد کی بھی نشاندہی کی۔ مشفق خواجہ کے مرتب کردہ وقیع کتابی سلسلہ "تخلیقی ادب" (کراچی) کی دوسری کتاب میں پاکستان کی غزل کے دس سال (۱۹۷۰ء سے ۱۹۸۰ء) کا جائزہ لیتے ہوئے نظیر صدیقی نے لکھا،

> "غزل کی ہیئت میں تبدیلی ممکن نہیں۔ ویسے ایک ہندوستانی شاعر مظہر امام نے
> غزل کی ہیئت کو بھی بدلنے کی کوشش کی ہے .... جس کا نام انھوں نے
> آزاد غزل رکھا ہے۔"

ساتھ ہی انھوں نے میری ایک آزاد غزل کے تین شعر بھی بطور نمونہ پیش کئے۔

خان پور (پاکستان) کے شاعر اور افسانہ نگار حیدر قریشی نے اپنے رسالے "جدید ادب" (اپریل ۱۹۸۰ء) میں گوشہ "آزاد غزل" اپنے ایک مختصر نوٹ اور مختلف شاعروں کی دس آزاد غزلوں کے ساتھ شائع کیا۔ پھر ۱۹۸۱ء میں انھوں نے "آزاد غزل" کے لئے "جدید ادب" کا ایک بڑا حصہ وقف کیا، جس میں مناظر عاشق ہرگانوی کے مضمون کے ساتھ سترہ[۱۷] آزاد غزلیں شامل کیں۔

پاکستان میں آزاد غزل کی مقبولیت کا ایک بڑا ثبوت یہ ہے کہ برصغیر کے سب سے اہم شاعر فیض احمد فیض نے بھی اس صنف میں ایک تجربہ کیا ہے۔ اس میں بھی فیض کا مخصوص رنگ و آہنگ حسب معمول نمایاں ہے۔ ملاحظہ ہو۔

شوقِ دیدار کی منزلیں
پیار کی منزلیں
دل میں پہلی لپک عشق کے نور کی
حسنِ دلدار کی منزلیں
دور پہلی جھلک شعلۂ طور کی
نورِ انوار کی منزلیں
آن ملنے کے دن

اپنی دھرتی کے آباد بازار کی منزلیں
منزلیں منزلیں
قول و اقرار کی منزلیں
پھول کھلنے کے دن
حسن عالم کے گلزار کی منزلیں
آس کی، پیاس کی
چاند تاروں کے ویران کہسار کی منزلیں

قتیل شفائی جیسے مقبول اور ہر دلعزیز شاعر نے بھی اس صنف کی طرف توجہ دی ہے۔ انھوں نے اپنی چار آزاد غزلیں "افکار" کراچی کے اگست سن ۸ء کے شمارے میں "ہم تجرباتی غزلیں" کے نام سے شائع کرائی ہیں۔ یہ غزلیں دیکھئے۔

(۱)

اُجلے اُجلے روشن چہروں کی یہ قندیلیں
آ نظروں سے ان کی روشنیاں پی لیں
جنم ہمیشہ لیں گے اُن سے پیارے پیارے پریت کنول
بانجھ نہیں وہ نیلے نینوں کی جھیلیں
ہر افسانہ مانگے ہم سے نذرانہ کچھ لفظوں کا
ایسے ہم کیسے ہونٹوں کو سی لیں
کچھ دن سے یہ کیفیت ہے میرے گھائل خوابوں کی
جیسے اڑتی ہوں بے چین ابابیلیں
مانگنے والا جو بھی مانگے، سب کچھ حاضر کر دیں گے
دیوانوں کے دل میں پیار کی زنبیلیں
اپنی سانس ملا دی اس نے آج ہماری سانسوں میں
اب شاید دو چار برس ہم بھی جی لیں
پیار کو سب سے اونچا مذہب کہہ تو دیا ہے تو نے قتیل!
لوگ کریں اب جانے کیا تاویلیں

(۲)

دیر تک جاگتے رہنے کی یہ عادت مجھ کو

آزمالے شبِ فرقت مجھ کو
بھول بیٹھا ہوں اُسے خلقِ خدا کے ڈر سے
اب بھی جس کی ہے ضرورت مجھ کو
خود کو برتر نہ سمجھ اے مرے کم ظرف حریف!
دشمنی کی نہیں فرصت مجھ کو
میں کھلونا ہوں مگر جس کی بھی تخلیق ہوں میں
وہی رکھے گا سلامت مجھ کو
کتنے الزام ہیں اب تک مری بینائی پر
اب نہیں دید کی حسرت مجھ کو
جس نے خود جامۂ رسوائی مجھے پہنایا
وہی کرتا ہے ملامت مجھ کو
لے گیا ساتھ اگر میں تری آنکھوں کا خمار
تھا منا روزِ قیامت مجھ کو
چھین کر لے گیا مجھ سے مجھے اک شخص قتیل!
تم دلادو مری قیمت مجھ کو

(۳)

رات کے رنگ رسیلے کب تھے
مجھ کو حاصل ترے وعدوں کے وسیلے کب تھے
مجھ پہ طاری تھا خود اپنا ہی خمار
میری آنکھوں میں ترے خواب نشیلے کب تھے
اب ہوا سانس بھی لیتی ہے جہاں
اس جگہ پہلے برس ریت کے ٹیلے کب تھے
درمیاں تیری طلب تھی ورنہ
بے سبب دست و گریباں قبیلے کب تھے
لفظ کی دھار سے کاغذ کتنا
اس قدر زخم کے مضامین کٹیلے کب تھے

تیرے انکار پہ اصرار بڑھا
ورنہ پہلے ترے عشاق تنہا کب تھے
سب کا ماضی تھا قتیل ایک مگر
میرے ہم عمر مری طرح اکیلے کب تھے

(۴)

کھول کر زلفیں حسیناؤں کو روتے دیکھئے
پتھروں کو موم ہوتے دیکھئے
خوش ہوا جی وہ دودھ سے لبریز مٹکے توڑ کر
اب اسے پانی بلوتے دیکھئے
صرف شہروں ہی میں کب آئی ہے نیندوں کی بہار
جنگلوں میں شیر سوتے دیکھئے
بے طلب جن کو ملی ساحل کی ہر آسودگی
کشتیاں اُن کو ڈبوتے دیکھئے
تھی بزعم خود جنھیں نفرت خوشامد سے انھیں
ہار پھولوں کے پروتے دیکھئے
لوگ کہتے ہیں کہ کھیتی سُرخ چڑیاں چگ گئیں
آتے ہیں اب سبز توتے، دیکھئے
سُرخیاں میرے لہو سے جن پہ کل تک تھیں قتیل
اب وہ چہرے زرد ہوتے دیکھئے۔

ان غزلوں سے پہلے قتیل شفائی کا ایک نوٹ بھی شائع ہوا ہے، جو درج ذیل ہے:۔

" غزلوں کی ہیئت میں تبدیلی بہ ظاہر محال ہے، مگر کیوں نہ اس ضمن میں بھی تجربہ کر لیا جائے۔ غزل کی ہیئت میں جو عناصر زیادہ اہم ہیں وہ قافیہ ردیف ہیں کہ انھیں سے غزل کو صوت و آہنگ کی دلکشی ملتی ہے۔ ردیف کو نظر انداز بھی کر دیں تو قافیہ بہرحال غزل کی جان رہے گا۔ سو میں نے قافیہ ردیف کو نہیں چھیڑا۔ صرف کبھی مصرع ہائے اولیٰ میں اور کبھی مصرع ہائے ثانی میں چند رُکن کم کر دیئے ہیں۔ اس طرح نہ تو غزل کی نغمگی مجروح ہوتی ہے اور نہ ہی موثر طور پر مضامین باندھنے میں دقت پیش آتی ہے۔ بلکہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ غزل کی یہ ہیئت بعض

صورتوں میں صوت و آہنگ کے تقاضے زیادہ خوش اسلوبی سے پورے کرسکتی ہے ۔"

قتیل شفائی کی اس تحریر سے بعض حلقوں کو یہ شبہ ہوا کہ انھوں نے ان آزاد غزلوں کو اپنے تجربے کے طور پر پیش کیا ہے اور وہ اس تجربے کا کریڈٹ خود لینا چاہتے ہیں ۔ افتخار اجمل شاہین (کراچی) کا ایک خط " افکار" ستمبر ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا جس کا یہ اقتباس قابل لحاظ ہے۔

" قتیل شفائی کی چار تجرباتی غزلیں (شمارہ اگست ۱۹۸۰ء) دیکھیں ۔ ان کی تحریر سے یہ دھوکا ہوتا ہے کہ یہ تجربہ اُن کا اپنا ہے ، حالاں کہ اس کے موجد ہندوستان کے معروف اور مقبول شاعر مظہر امام ہیں ۔ انھوں نے یہ تجربہ پہلی بار ۱۹۴۵ء میں کیا تھا جس سے اہل قلم حضرات بخوبی واقف ہیں ۔ مظہر امام ۱۹۴۵ء سے اب تک آزاد غزلیں بھی کہہ رہے ہیں ۔ اب تو ان کی تقلید میں نوجوانوں کا ایک گروہ بھی شامل ہو گیا ہے ۔ ماہنامہ "کوہسار" (ہزاری باغ) کے تازہ شمارے میں ایسی چند غزلیں شائع ہو چکی ہیں ۔"

۲۲؍اگست ۱۹۸۰ء کے روزنامہ " جسارت" کراچی میں افتخار اجمل شاہین کا ہی ایک خط شائع ہوا جس میں انھوں نے لکھا۔

" ماہنامہ " افکار" اگست ۱۹۸۰ء کے شمارے میں قتیل شفائی کی چار آزاد غزلیں چھپی ہیں جنھیں انھوں نے اپنے تجربے کا نام دیا ہے ۔ اس طرح گویا اس کے موجد ہونے کا دعویٰ بھی کیا ہے ۔ مگر شاید موصوف کو یہ معلوم نہیں کہ اس طرح کا پہلا تجربہ مظہر امام نے ۱۹۴۵ء میں کیا تھا اور اس وقت سے مظہر امام آزاد غزلیں کہہ رہے ہیں ۔ بلکہ اب تو ان کی پیروی میں تقریباً ایک درجن شعراء بھارت میں ایسی تجرباتی غزلیں کہہ رہے ہیں اور ان لوگوں نے اس کا امام ، مظہر امام کو تسلیم بھی کر لیا ہے ۔"

ستمبر ۱۹۸۰ء ہی کے " افکار" میں ڈاکٹر انور سدید کا ایک نہایت اہم خط اسی سلسلے میں شائع ہوا جس کا یہ اقتباس توجہ طلب ہے ۔

" برادرِ محترم قتیل شفائی صاحب نے آزاد غزل کا تجربہ کیا ہے ۔ ہندوستان میں اس تجربے کو دس بارہ برس قبل مظہر امام صاحب نے شروع کیا تھا ۔ اب ان کے ساتھ کئی اور شعراء شریک ہو گئے ہیں ۔ علیم صبا نویدی نے تو آزاد غزل کا ایک مجموعہ بھی شائع کیا ہے ۔ پاکستان میں یوسف جمال صاحب نے اس تجربے کو کامیاب کرنے کا بیڑا اٹھا رکھا ہے ۔ اوراق کے کسی گذشتہ شمارے میں اُن کی آزاد غزلیں چھپ چکی ہیں ۔ اس زاویے سے دیکھیے تو قتیل شفائی صاحب کا تجربہ نیا نہیں ۔ تاہم انھوں نے یہ التزام برتا ہے کہ مصرع اول اور مصرع ثانی میں جب ارکان کی تعداد کم و بیش کی ہے تو پوری غزل میں اس نظام کو برقرار رکھا ہے ۔ یوں یہ ایسا تجربہ ہے جس میں شاعر نے کچھ پابندیوں کو خود ہی اپنے اوپر وارد کر لیا ہے ۔ تجرباتی طور پر ان کا یہ اقدام ، ممکن ہے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائے ، لیکن فنی لحاظ

سے یہ غزل کی ہیئت کو وسعت عطا نہیں کرتا۔"

میرا خیال ہے کہ قتیل شفائی نے آزاد غزل کے موجد ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ انھوں نے بڑی انکساری کے ساتھ غزل میں ہیئتی تجربے کی بات کی ہے۔ آزاد غزل میں غزل کی ساری صنفی خصوصیات برقرار رکھی جاتی ہیں۔ ردیف قافیے کو چھیڑا نہیں جاتا۔ ہر شعر اپنی جگہ مکمل ہوتا ہے۔ صرف مصرعوں کے ارکان میں کمی بیشی روا رکھی جاتی ہے۔ یعنی ممکن ہے کہ ایک مصرع آٹھ ارکان پر مشتمل ہو اور دوسرا مصرع تین ارکان پر۔ یا پہلا مصرع چار ارکان پر مشتمل ہو اور دوسرے مصرعے میں سات ارکان ہوں۔ یعنی آزاد غزل میں ارکان کی قید نہیں۔ مصرعوں کو قصداً چھوٹا بڑا کرنے کی کوشش بھی نہیں کی جاتی۔ اگر کسی شعر میں دونوں مصرعوں کے ارکان برابر ہوں، تو وہ بھی آزاد غزل میں شامل ہو سکتا ہے۔ قتیل شفائی نے آزاد غزل کو تھوڑا سا پابند بنایا ہے یعنی ان کی تمام غزلوں میں سارے پہلے مصرعے اور سارے دوسرے مصرعے ایک دوسرے سے برابر ہیں۔ یعنی اگر پہلے مصرعے میں چار ارکان ہیں تو ہر شعر کے پہلے میں چار ہی ارکان آئے ہیں۔ اور دوسرے مصرعے میں اگر تین ارکان ہیں تو ہر شعر کے دوسرے مصرعے میں تین ارکان کا ہی استعمال ہوا ہے۔ یہ "پابندی" کچھ لوگوں کے نزدیک مستحسن بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ تجربہ بقول انور سدید "فنی لحاظ سے غزل کی ہیئت کو وسعت عطا نہیں کرتا"۔ ہندوستان کے دو شاعروں ظہیر غازی پوری اور فرحت قادری نے بھی آزاد غزل کے حدود میں رہ کر تجربے کئے ہیں۔ ظہیر غازی پوری نے ارکان کی کمی بیشی تو کی ہے، لیکن ہر شعر کے ارکان برابر رکھے ہیں۔ یعنی ہر شعر اپنی جگہ پابند ہے، لیکن پوری غزل آزاد۔ فرحت قادری نے چار چار اشعار پر مشتمل دو آزاد غزلیں لکھی ہیں۔ پہلی غزل میں یہ التزام کیا ہے کہ پہلا مصرع آٹھ ارکان پر مشتمل ہے اس کے بعد ہر مصرعے میں ایک ایک رکن کم ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ چوتھے شعر کے دوسرے مصرعے میں صرف ایک رکن رہ جاتا ہے۔ اسی طرح دوسری غزل ایک رکن سے شروع ہوتی ہے، اور چوتھے شعر کے دوسرے مصرعے میں آٹھ رکن پر ختم ہو جاتی ہے۔

جس طرح آزاد نظم میں مختلف طرح کے تجربے کئے گئے ہیں۔ اسی طرح آزاد غزل میں کئی طرح کے تجربے کئے جا رہے ہیں، جو اپنی اپنی جگہ توجہ کا مطالبہ کرتے ہیں۔ قتیل شفائی نے آزاد غزل میں جس نوع کی پابندی اختیار کی ہے، تقریباً ویسی ہی پابندی علیم صبا نویدی نے بھی اپنی اکثر آزاد غزلوں میں روا رکھی ہے۔ قتیل شفائی نے اپنی آزاد غزلوں میں اس کا پورا خیال رکھا ہے کہ غزل کی نغمگی مجروح نہ ہونے پائے۔ انھوں نے غزل کی تمام خصوصیات کو حسن و کمال برتنے کی کوشش کی ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ ہر جگہ انھیں کامیابی ہوئی ہو، لیکن بیشتر اشعار میں وہ نغمگی اور ترنگ برقرار ہے جو قتیل شفائی سے منسوب ہے۔ قتیل شفائی شعر کو شعر کی طرح برتتے ہیں۔ وہ آزاد غزل کی حرمت سے بھی واقف ہیں۔ وزیر آغا کا یہ بیان بہت وقیع ہے۔ اس کا اظہار انھوں نے میرے نام ایک ذاتی خط میں کیا ہے:۔

"لوگ ہاں آزاد غزل کے تجربے کو نثری نظم کے تجربے سے بلا وجہ ہی منسلک کرتے ہیں۔ نثری نظم پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ یہ شاعری نہیں بلکہ نثر ہے۔ جب کہ آزاد غزل پر ایسا کوئی اعتراض وارد نہیں ہو سکتا۔"

شمس الرحمٰن فاروقی نے ایک بار لکھا تھا کہ اگر غالب جیسا کوئی شاعر آزاد غزل کو مل جاتا تو یہ صنف کامیاب ہو جاتی۔ غالب کی دوبارہ آمد کا انتظار تحصیل حاصل ہے۔ غالب کے بغیر بھی یہ صنف روز بروز مقبولیت اور کامیابی کی منزلیں طے کرتی جا رہی ہے۔ پاکستان کے فیض احمد فیض، قتیل شفائی، عید قریشی اور غفور اسلم کے علاوہ ہندوستان اور بنگلہ دیش کے تقریباً ساٹھ ستر شاعر اس صنف میں طبع آزمائی کر رہے ہیں اور اگر ایسے فیض احمد فیض، قتیل شفائی جیسے شاعر مل جائیں تو پھر آزاد غزل کی کامیابی میں کیا شبہ رہ جاتا ہے۔!

* *

"پیرہن" — ایک جائزہ

بشر نواز

مجاز، فیض، مخدوم اور ساحر کی طرح قتیل شفائی بھی مقبول شاعر ہیں۔ ادھر کچھ دنوں سے بعض حضرات مقبولیت کو کمزور یا عمومی شاعری کی دین قرار دینے میں کوشاں ہیں۔ بڑی یا اچھی شاعری مقبولیت حاصل کرتی ہے یا نہیں بہ الفاظ دیگر کیا اچھے شاعر کا غیر مقبول ہونا ضروری ہے؟ ایک ایسا سوال ہے جس پر بحث کرنے کی یہاں گنجایش ہے نہ فرصت تاہم اتنا تو کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح ہر مقبول شاعر لازماً کمزور نہیں ہوتا اسی طرح ہر ناپسندیدہ شاعر کا اچھا شاعر ہونا بھی لازمی نہیں فیض رمخدوم ہوں یا مجاز، ساحر اور قتیل ہوں بہرحال ایسے شعراء ہیں جو تاریخ ادب میں اپنی جگہ بنا چکے ہیں۔ مقام اور درجوں میں فرق ہو سکتا ہے یہاں ان شعراء کے تقابل کا موقع نہیں کہنا یہ ہے کہ قتیل بھی ان شعراء میں ہیں جنھیں عام قاری نے بھی پسند کیا اور ادب سے خصوصی شغف رکھنے والوں نے بھی سراہا۔

"پیرہن" قتیل کا نیا مجموعہ کلام ہے قتیل شفائی میٹھے لہجے اور راست اظہار کے شاعر ہیں۔ ان کی رومانویت کہیں کہیں سطحی بھی ہو جاتی ہے لیکن اکثر ان کا تجربہ صادق اور اسی وجہ سے ان کے یہاں گہرائی کی کمی محسوس ہوتی ہے جسے وہ احساس کی شدت کی وجہ سے خوش گوار بنا دیتے ہیں ان کی یہ خصوصیت گذشتہ مجموعوں میں زیادہ نمایاں ہے۔ "پیرہن" میں ایک دوسری سمت نمایاں نظر آتی ہے۔ "پیرہن" کی اکثر غزلوں میں ایمائیت کا کافی عمل دخل ہے یوں لگتا ہے کہ شاعر، خارجی دباؤ کی وجہ سے بات دو ٹوک انداز میں کہنے کی بجائے اشاروں کنایوں میں کہہ رہا ہے۔ یہ ایمائیت قتیل کے حق میں فایدہ مند ہی ثابت ہوئی ہے کہ ان کے اشعار "یک سطحیت" سے اونچے اٹھ آئے ہیں اور ہلکے سے طنز نے انہیں مزید جھکا دیا ہے۔

سب کہتے ہیں اک جنت اتری ہے میری دھرتی پر
میں دل میں سوچوں شاید کمزور مری بینائی ہے
جب کوئی کرتا ہے قطعِ رنگ دبو پر احتجاج
پھول کاغذ کے سجا لیتے ہو گل دانوں میں تم

اتنا تو ہوا فایدہ بارش کی کمی سے
اس شہر میں اب کوئی پھسل کر نہیں گرتا

خیر اگر چاہتے ہو سروں کی
راہ لو اپنے اپنے گھروں کی
وقت کی چال پہچانتے ہیں
خیر ہو میرے دانش وروں کی

ظاہر ہے یہ طنز سماجی اور سیاسی صورتِ حال کی پیداوار ہے قتیل کا رومانوی مزاج اِس طنز کی دھار کو زیادہ تیز نہیں ہونے دیتا اور احتجاج کی لے نرم لہجے میں ڈھل کر وہ کیفیت پیدا کر دیتی ہے جو جاڑوں کی نرم دھوپ میں ہوتی ہے۔ سنہ ء کے بعد کی غزل سے نرمی رخصت ہونے لگی ہے اور اس کی جگہ ایک حلاوت اور احتجاجی لہجہ راہ پانے لگا ہے لیکن قتیل شفائی کی غزل پر اِس کا اثر نہیں پڑا۔ وہ شاید شعوری طور پر بھی اپنا لہجہ بدلنا نہیں چاہتے کیوں کہ انھیں خبر ہے

جو بھی رنگ تیرا ہے، بس وہی غنیمت ہے
چہرے کب بدلتے ہیں منہ پہ خاک ملنے سے

جن شعراء کو اپنے حدود کا اندازہ نہیں ہوتا وہ ہر قسم کی شاعری کو نیکی کی دھن میں شاعری ہی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ قتیل ان شعراء میں نہیں ہیں اس لئے انہوں نے کبھی اپنے مزاج سے ہٹ کر اور اپنے دایرے سے نکل کر شعر کہنے کی کوشش نہیں کی اور یہی ان کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ قتیل راست انداز کے شاعر ہیں یعنی ان کا شعری رویہ اِستعاراتی یا علامتی نہیں ہے۔ ان کا تجزیۂ عشق بھی میر، غالب یا فراق کی طرح پیچیدہ نہیں سادہ و معصوم ہے۔ قتیل کا کمال یہ ہے کہ وہ جس سادگی سے محسوس کرتے ہیں اُسی سادگی سے اسکے اظہار پر قدرت بھی رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کا شعر راست دل پر اثر انداز ہوتا ہے اور ہلکی سی اداسی کی لے اسے اور دل کش بنا دیتی ہے۔

ایک اک پتھر جوڑ کے میں نے جو دیوار بنائی ہے
جھانکوں اس کے پیچھے تو رسوائی ہی رسوائی ہے!
یوں لگتا ہے سوتے جاگتے اوروں کا محتاج ہوں میں
آنکھیں میری اپنی ہیں پر ان میں نیند پرائی ہے

وہ صرف جسم ہی نہیں احساس بھی تو ہے
راتوں میں چاند بن کے نکلنا بھی دیکھ اسے

آدرشیوں کے شہر میں گرچہ نا صبے بھی تھے
وہ دور مجھ سے رہ کے بھی بہت مرے قریب تھا

محبت کی کہانی منفرد تھی   مگر دنیا نے دہرائی بہت ہے

پھر جاگے ہیں تجدید ملاقات کے ارماں
پھر تیرے شبستاں کی خبر لائے ہیں بادل

ہم سب پر جو بیت چکی ہے
اس کا بھول ہی جانا اچھا

اس طرح کے اشعار جو اپنے قاری کو کسی نہ کسی مرحلے پر یاد آجاتے ہیں یقیناً اپنے خالق کے سچے تجربے کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ اچھے شعر کی خصوصیت فوری یاد ہو جانا ہی نہیں ہے بلکہ زندگی کے کسی موڑ پر اچانک یاد آجانا بھی ہوتی ہے اور یہ خصوصیت قتیل کے بہت سارے شعروں میں موجود ہے اب رہی یہ بات کہ قتیل کے اشعار زندگی کے کس موڑ پر اور انسان کے کس موڈ میں یاد آتے ہیں سو میں عرض کروں گا کہ یہ موڑ پہلی محبت کا تجربہ بھی ہو سکتا ہے اور ابتدائی ناکامیوں یا کامیابیوں کا پیدا کردہ موڈ بھی ہو سکتا۔ ابتدائی عمر کے تجربوں کو ہم تجربے کی وسعت اور زمانے کا سرد و گرم چکھنے کے بعد بھلے ہی قابلِ اعتنا نہ سمجھیں لیکن ہر انسان میں ایک حیرت زدہ، معصوم سا نوعمر بہر حال ہر دور میں جیتا ہے جو اس کے پر سکون لمحوں میں زیادہ توانا ہو کر زندگی کی بے رنگیوں کو رنگین کر جاتا ہے اور یہی وہ لمحے ہوتے ہیں جب قتیل کا کوئی شعر کوئی مصرعہ ذہن میں گونجنے لگتا ہے۔

ملا نہ جام تو ہم تشنہ لب سجائیں گے
تمہاری آنکھوں کی تصویر بادہ خانوں میں

کس نے دی آواز مجھے اک پیڑ کی سوکھی ڈالی سے
شاید یہ وہ موسم ہے جو بچھڑ گیا ہریالی سے

میری خوشیاں بھی ان دیکھی میرے غم بھی ان دیکھے
جنگل کے پھولوں کا یارو کیا کھلنا، کیا مرجھانا

یہ اور ان جیسے بہت سارے شعر گذرتے وقت کا احساس دلاتے ہیں۔ وہ نہیں رہا جو کبھی تھا لیکن اُس سے بچھڑنے کا دکھ باقی ہے۔ گئے زمانوں کو لوٹا کر نہ لا سکنے کا احساس اور اس سے پیدا شدہ کسک زندہ ہے۔ یہ کسک یہ دکھ ہر باشعور اور زندہ انسان کا مقدر رہے۔ یہ صحیح ہے کہ یہ کسک یا دکھ پوری زندگی کو محیط نہیں ہے چنانچہ اس کا اظہار، پوری زندگی کا اظہار نہیں لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ بھی زندگی کا ایک ایسا حصہ ہے جسے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ قتیل کے اشعار زندگی کے اسی اٹوٹ اور سدا زندہ حصے کے آئینہ دار ہیں۔ جب تک انسان کے دل و دماغ میں زندگی کے معصوم تجربے زندہ ہیں قتیل اور ان کے قبیلے کے دوسرے فن کاروں کا فن زندہ ہے اور خدا کرے انسان کا حافظہ اپنے ابتدائی تجربوں کو کبھی فراموش نہ کر سکے کہ انہیں کی وجہ سے زندگی کی شقاوت اور بے رنگی قابلِ برداشت بنتی ہے۔

پیرہن کے ابتدائیہ میں ایک شعر ہے

جو بھی من کی ہوک ہے اس کو کوک بنا دے کوئل کی
دکھ کی جو بھی سولی ہے بن جائے جھولا ساون کا

یہ حقیقت ہے کہ قتیل "ہوک" کو "کوک"، اور "دکھ کی سولی" کو ساون کا جھولا" بنانے میں کامیاب رہے ہیں اور یہی کامیابی

قتیل کو اچھا اور مقبول شاعر بنانے کی ضامن ہے۔

اِس تپتے جھلستے دور میں "پیرہن" کی غزلیں ایک خوش گوار جھونکے کی طرح اپنے قاری کی تسکین کا سامان کرتی ہیں اور اُسے اُن لمحوں کی یاد دلاتی ہیں جنھیں وہ بھولتا جا رہا ہے۔

وفا کے شیش محل میں سجا لیا میں نے
وہ ایک دل جسے پتھر بنا لیا میں نے

تو آئے تو لگتا ہے اپنا بھی سحر ہو گئی
انداز ہیں سب تیرے سورج کی کرن والے

اپنے ہجر کے پس منظر میں جھانک مجھے
میری سب روداد اِسی عنوان میں ہے

اپنے ہونٹوں پر سجانا چاہتا ہوں
آ تجھے میں گنگنانا چاہتا ہوں

گلاب جیسی وہ آگ اسکے سجل بدن کی
اُسی کو چھونے سے ہاتھ میرا جلا ہوا ہے

میں نے ابتدا میں قتیل کے شعری رویئے میں پیدا ہونیوالی ایک تبدیلی یعنی ان کے طنزیہ انداز کی طرف اشارہ کیا ہے۔ چلتے چلتے ایک اور خصوصیت کی طرف توجہ مبذول کروانا چاہوں گا۔ قتیل عموماً رواں دواں مردجہ بحروں میں اپنا اظہار کرتے کرتے ہیں اور یہ بحریں ان کے مزاج اور موضوع کیلئے انتہائی مناسب بھی ثابت ہوئی ہیں۔ "پیرہن" میں انہوں نے کچھ نسبتاً الگ بحریں بھی استعمال کی ہیں ان بحروں میں چلتی ہوئی تیز ہواؤں کی سی کیفیت نہیں ایک ٹھیراؤ اور دھیما پن ہے۔ یہ بحریں رک رک کر سوچنے کی مہلت دیتی ہیں۔ ان بحروں کا استعمال قتیل کے بدلتے ہوئے مزاج کی عکاسی کرتا ہے کہ اب وہ ٹھہر ٹھہر کر گذرے ہوئے شب و روز کا جائزہ لینے لگے ہیں۔ ان پر غور و فکر کر کے اپنے تجربات کے نتایج اخذ کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ ٹھیراؤ ان کے اشعار میں قدرے گہرائی اور تہہ داری کا ضامن بنتا جا رہا ہے۔ یہ تبدیلی خوش گوار بھی ہے اور اِس بات کا اشاریہ بھی ہے کہ قتیل اپنے شعری سفر میں تھکے نہیں ہیں اور اُن کا ذہنی ارتقاء ایک منزلِ خاص ہی پر رک نہیں گیا ہے بلکہ وہ اپنے مزاج کی بنیادی خصوصیات کے ساتھ اپنے دائرے کو توڑنے میں مصروف ہیں جبکہ ان کے بہت سارے ہم عصر اپنے آپ کو دہرانے پر اکتفا کئے ہوئے ہیں

نیند سے خالی آنکھوں میں رات گئے تک لہرائے جگنو جنگل اور سائے
ماضی کی سب تصویریں لے کر میرے پاس آئے جگنو جنگل اور سائے

جب کنول ہاتھ میسّر نہ آ سکا
تو میں کائی چرا لایا جھیل کی

نفرتیں بونے والوں کو مژدہ
فصل تیار ہے خنجروں کی

چہرے پہ لکھی ہے پیاس لوگو
پڑھ لو جسے غم شناس لوگو

مجھ کو لگا عام سا اک آدمی
آیا وہ جب کام کے اوقات میں

•••

قتیل کا پیراہن

شبنم رومانی (لاہور پاکستان)

غزل نے میر و مرزا سے ناصر کاظمی اور شکیب جلالی تک کئی رنگ بدلے ہیں۔ کئی سانحوں اور تجربوں سے دوچار ہوئی ہے۔ مخالفت کے بہت تھپیڑے سہے اور مخالفوں کو بہت جھٹکے دئے ہیں۔ مگر وقت کے ساتھ ساتھ غزل نے اپنی صلاحیت اور اپنی قوت کا لوہا منوالیا ہے اور اپنی اہمیت اور ضرورت ثابت کردی ہے۔ اب غزل کو نہیں غزل گو کو امتحان کا سامنا ہے کہ وہ لفظوں سے فکر و خیال کا زیادہ سے زیادہ رس کس کس طرح نچوڑ سکتا ہے اور غزل گوئی کے اس عرفان عظیم میں اپنے وجود کی سلامتی اور اپنے فن کے تشخص کے لئے کیا وظیفہ اختیار کرتا ہے۔

قتیل شفائی کی غزلوں کا تازہ ترین مجموعہ "پیراہن" سفارشوں سے پاک اور از "ابتدائیہ" تا "اختتامیہ" شاعری ہی شاعری ہے۔ کسی دیباچے، پیش لفظ، تقریظ یا فلیپ نوٹس کے بغیر یہ کتاب اپنے شاعر کی خود اعتمادی اور اپنے قارئین پر اعتماد کا اظہار کرتی ہے۔

قتیل شفائی بنیادی طور پر نرم لہجے اور غنائی اسلوب و ادا کے شاعر ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کی تخلیقی شخصیت مختلف رنگوں میں بٹی ہوئی نہیں بلکہ یکرنگ ہے۔ گیت ہو، نظم ہو یا غزل، ان کا منفرد مزاج ہر پیرائے میں ان کی پہچان کا سامان فراہم کرتا ہے۔ قریۂ شعر میں ایک عمر گذار نے اور متعدد مقبول شعری مجموعوں میں خود کو پیش کرنے کے بعد اب قتیل کی شاعری میں متجسسانہ گفتگو کا محل نہیں رہ گیا۔ شہرت اور شعریت کے لحاظ سے اب ان کا شمار پاکستان کے چند ممتاز ترین شعراء میں ہوتا ہے اور ان کی ہر نئی کتاب ان کے پسند کرنے والوں کے لئے ایک ارمغان کی حیثیت رکھتی ہے۔

ساحر لدھیانوی نے کہا تھا کہ قتیل شفائی پاکستان کا ساحر اور ساحر لدھیانوی ہندوستان کا قتیل ہے۔

یہ بات انہوں نے اس لیئے کہی تھی کہ ان دونوں کے شعری دیوں میں کافی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔ دونوں کے اظہار سانچے ملتے جلتے ہیں دونوں کا تعلق فلمی صنعت سے رہا ہے اور ان کے فلمی گیتوں نے ان کی ادبی شہرت میں اضافہ کیا ہے۔ مگر یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی کسی کا بدل ہو سکے۔ ساحر ساحر ہے اور قتیل قتیل۔ تاج محل اور شاہی مسجد کا بدل ہو ہی نہیں سکتا۔ شعری دیوں کی ہم آہنگی کے باوجود اندازِ نظر کا فرق صاف ظاہر ہے جو انسان کے بنیادی تصورات سے پھوٹتا ہے ؎

کام کے لوگ وطن میں بھی نہیں تھے کمیاب
پھر بھی کچھ لوگوں نے باہر سے منگائے کچھ لوگ
جب وہ بچ نکلے تو پانی میں مجھے پھینک دیا
کود کر میں نے جو دریا میں بچائے کچھ لوگ

یہ فرق تجربے کا ہے اور ان بنیادی تصورات کا جو تجربے کی آنچ کھا کر پختہ تر ہو جاتے ہیں۔ قتیل کو اپنے دیار میں ساحر سے مختلف تجربات کا سامنا رہا ہے قتیل شفائی نے دو انتہاؤں کو جوڑا ہے۔ ایک طرف اس کی شاعری احساس عمل سے مضبوط رشتہ قائم کئے ہوئے ہے تو دوسری طرف معاشرے کی دو ٹوک نقاد بھی ہے۔ منافقتوں کے دکھی احساس اور قول و عمل کے تضادات کی جھنجھلاہٹ نے ان کی غزل میں کڑوی، مٹھاس اور میٹھی تلخی کے ساتھ ساتھ ایک قسم کے کھرے پن اور کھردرے پن کو بھی جگہ دی ہے اور ان کے لہجے کی غنائیت نے پلٹ کر حملہ کرنے کا فن بھی اپنایا ہے اور یہ کوئی معمولی فن نہیں ہے ؎

ڈرتے نہیں زخموں سے ہم دار و رسن والے
پتھر نہ اٹھا ہم پر شیشے کے بدن والے

تک رہی تھی راستہ صرف اک گھڑی دیوار کی
دیر سے ہم لوٹ کر جس رات اپنے گھر گئے

ٹانک دو اس میں اک مصنوعی تتلی بھی
کاغذ کا جو گلدستہ گلدان میں ہے

اس سے بڑا موذی کہاں جو اپنے محسن کو ڈسے
ہم لوگ اب تک مفت میں سانپوں سے ڈرتے آئے ہیں

کی سفارش میں نے جس کی وہ نہ آیا لوٹ کر
ایسا لگتا ہے کہ اس کا کام شاید ہو گیا

خبر نہیں ہے جنھیں بارشوں کے موسم کی
مزے سے بیٹھے ہیں کاغذ کے شامیانوں میں

عدل کی تم نہ مجھے آس دلاؤ کہ یہاں
قتل ہو جاتے ہیں زنجیر ہلانے والے

سازش کے اس دور میں بیتا جنم قتیلؔ اگر وہ
مار دیا ہوتا غالبؔ کو آم کھلا کر ہم نے

مگر جیسا میں پہلے کہہ چکا ہوں قتیلؔ بنیادی طور پر نرم لہجے اور غنائی اسلوب والا کے شاعر ہیں ان کے ہاں لفظ کی نغمگی خیال کی موسیقی سے مل کر شعر کو سحر بنا دیتی ہے اور احساسِ جمال سے ان کی شاعری کا رشتہ استوار رکھتی ہے اس لئے وہ کبھی کبھی تمام عصری کثافتوں کو پھلانگ کر اپنی فطری فضا میں آنکلتے ہیں ؎

کاش نے جاتے کبھی مانگ کے آنکھیں میری
یہ مصوّر ___ تیری تصویر بنانے والے

پہلی رات کے چاند میں ایسی جھکی ہوتی ہے اک بدلی
زلف کرے سرگوشی جیسے تیرے کان کی بالی سے

جب وہ ملا تو کھو گیا میں خواہشوں کی بھیڑ میں
حاصل مجھے کتنا سکوں اپنے اکیلے پن میں تھا

"پیراھن" کا آغاز حمدیہ اشعار سے ہوتا ہے جن میں قتیلؔ نے اپنے لیئے یوں دعا کی ہے ؎

آخر دم تک پتھر کاٹوں دودھ کی نہر بہانے کو
تیشہ کند نہ ہونے پائے ساری عمر مرے فن کا

حقیقت یہ ہے کہ قتیل ادب کا ایسا فرہاد ہیں جس کا تیشہ ہمیشہ کی طرح تیز اور خارا شکن ہے۔ قتیل شفائی کے خواب اب تک جوان اور قلم اب تک آبدار ہے۔ وہ مسلسل لکھ رہے ہیں اور نظمیں، غزلیں، گیت سب کچھ اپنے وجود کی خوبصورتی اور اپنے باطن کی قوت کے ساتھ لکھ رہے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گردشِ ماہ و سال کا ان کی تخلیق توانائی پر کوئی بس نہیں چل رہا۔ جیسے بارگاہ خداوندی میں ان کی دعا قبول ہو گئی ہو۔

اس مجموعے کی دوسری چیز بھی دعا ہے اور یہ دعا ہیئت اجتماعی کے لئے کی گئی ہے ؎

جو اپنی اولاد سے بڑھ کر سمجھے پیڑوں پودوں کو
آنے والے موسم میں اس باغ کو ایسا مالی دے

خدا یہ دعا قبول کرے اور وطن اور اہلِ وطن سے قتیل کی والہانہ محبت کا ان کو اجر دے۔ ان دعاؤں سے گذر کر "پیراہن" کی غزلوں کا مطالعہ ایک خوشگوار تاثر سے دوچار کرتا ہے اور زندگی کو برتنے اور زندگی کرنے کا حوصلہ بخشتا ہے۔

قتیل صاحب اردو کے واحد شاعر ہیں جنہوں نے فلموں میں بھی اپنی شاعری کا معیار برقرار رکھا ہے اسلوب کی یہ ہم آہنگی بہت کم دیکھنے میں آتی ہے ....

—— تاج سعید

قتیلؔ کی شاعری کا پس منظر

شہزاد احمد لاہور
(پاکستان)

وقت کے بارے میں انسانی تصورات ہمیشہ تبدیل ہوتے رہے ہیں انسان اپنے تہذیبی ارتقاء کے ابتدائی دور میں بھی وقت کے بارے میں کچھ نہ کچھ شعور ضرور رکھتا تھا۔ پھر جب فلسفے کی موشگافیاں شروع ہوئیں تو ایک طرف تو وقت کے وجود ہی سے انکار کر دیا گیا اور دوسری طرف اسے اکلوتی حقیقت تسلیم کیا گیا اور یوں وقت مقام کبریائی تک جا پہنچا۔ مگر ان تمام انکار کے باوجود انسان نے اپنی عملی ضرورت کے لئے وقت کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا یعنی ماضی حال مستقبل۔ پھر ان تینوں تصورات نے خود انسان کے ارتقاء میں اپنے نقوش ظاہر کرنے شروع کر دئے۔ ایک طرف تو وہ ماضی پرست تھا جو ہمیشہ عظمتِ رفتہ کا متلاشی رہتا تھا۔ بعض نفسیات والوں کا خیال ہے کہ انسان کا ماضی اس کے اندر ہمیشہ زندہ رہتا ہے اور یہ ماضی محض انفرادی نہیں ہوتا بلکہ اجتماعی بھی ہوتا ہے۔ دوسرے طرف وہ گروہ ہے جو اپنی تالیف قلب کے لئے مستقبل کے واہمے تراشتا ہے اور ایک رومانی رجائیت تشکیل کرتا ہے۔ مگر حال میں رہنے والے بہت کم ہوتے ہیں۔ کیونکہ حال پر لحظ متبدل ہے لہذا ان کے بارے میں فلسفیانہ توجیہات کی ضرورت مقابلتاً کم پیش آتی ہے۔ محدودے چند لوگ ایسے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ انسان ہمیشہ حال ہی میں زندگی گذارتا ہے جب بھی وہ سوچتا یا کوئی عمل کرتا ہے وقت سے اس کا تعلق زمانہ حال ہی سے ہوتا ہے کیونکہ ماضی تو جاچکا اور مستقبل ابھی آئے گا لہذا جو کچھ موجود ہے وہ صرف حال ہے۔

مگر یہ ساری بحث ایک طرح سے محض مابعد الطبیعات سے متعلق ہے شاعری میں اسکی شکل جذباتی سطح پر خاصی تبدیل ہو جاتی ہے ماضی یادرفتگاں اور مستقبل حواشی لمحہ جاوداں کی صورت اختیار کرتے ہیں مگر حال لمحہ موجود یعنی ——IMMEDIATE بن جاتا ہے۔ اس لمحہ موجود میں وقت اپنی خاص شکل میں اظہار بنا پاتا ہے بلکہ اس خاص لمحے کے تمام پہلو ایک اکائی کی شکل اختیار کرتے ہیں ”جو کچھ اسی وقت موجود ہے صرف وہی موجود ہے اور مجھے صرف

اسی کے بارے میں کچھ کہنا ہے" یہ جملہ قتیل شفائی نے کبھی شاید استعمال نہیں کیا مگر مجھے یوں لگتا ہے کہ وہ ہر لمحہ تبدیل ہوتے ہوتے لمحہ موجود کو اپنی گرفت میں لینا چاہتا ہے۔ اس کے لئے ماضی کسی غیر معمولی دلچسپی کا حامل نہیں۔

شوق تو یہ ہے آج کے فاتح کہلائیں
جنگ ابھی تک ماضی کے میدان میں ہے

دوسری طرف مستقبل کے سہانے خواب بننے کا عمل بھی قتیل کی شاعری میں بتدریج کم ہوتا چلا گیا ہے ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے زمانے میں وہ اپنی انتہا کو چھو پاتا مگر اب وہ قتیل کی تصویر کے کینوس میں پس منظر بن گیا ہے پس منظر میں صرف وہ حقیقتیں ہیں جو اب موجود ہیں یا جن کی موجودگی کو جذباتی طور پر شاعر محسوس کرتا ہے۔ اب اگر شاعر کا رویہ لمحہ موجود سے وابستگی فرض کر لیا جائے تو پھر اس کے ساتھ ایک طرح کی حقیقت پسندی ضرور منسلک ہو جاتی ہے مگر یہ حقیقت پسندی کوئی فلسفیانہ تصور نہیں ہے بلکہ چیزیں جس طرح شاعر کو محسوس ہوتی ہیں ان کو اسی طرح بیان کر دینے کا عمل ہے۔ یہ ایک طرح سے جذباتی دیانت ہے فکری حقیقت پسندی کا عنوان شاید اسے نہ دیا جا سکے

قتیل اپنے جذبات کے اظہار میں کوئی وسیلہ تلاش نہیں کرتا۔ وہ جو کچھ محسوس کرتا ہے اس کا اسی طرح اظہار کر دیتا ہے اس کے نزدیک یہی دیانت فن ہے۔ لہٰذا وہ شرماتا نہیں اور نہ ہی اسے یہ فکر لاحق ہوتی ہے کہ سننے والے اس کے بارے میں کیا اخلاقی رائے قائم کریں گے۔ یہ ایک طرح سے متعین اخلاقی ضابطوں سے نجات حاصل کرنے کی کوشش ہے۔ مگر قتیل کے ساتھ اس کی نسل کے اور رویے بھی چپک گئے ایک طرف تو رومانی رویہ ہے جو کلاسیک کے رد عمل کے طور پر پیدا ہوا تھا اور فیض کی وساطت سے ساحر لدھیانوی اور قتیل شفائی تک پہنچا دوسرا رویہ اپنی ذات کا حوالہ ہے جو ہر حال میں قائم رکھا جاتا ہے یہ بنیادی طور پر تو رومانی رویے ہی کی ایک صورت ہے مگر لازمی صورت نہیں ہے۔ ایسی رومانی شاعری بھی ممکن ہے جس میں یہ حوالہ بالکل تبدیل جائے۔

میں نے اب تک جو گفتگو کی ہے اس کا تعلق قتیل کی شاعری سے کہیں زیادہ اس پس منظر سے ہے جس پس منظر میں قتیل نے اپنی شاعری کا آئینہ خانہ سجا رکھا ہے۔ اس وقت زیر بحث کتاب ان کا نیا مجموعہ کلام بلکہ بیاض غزلیات ہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے قتیل کی شاعری ابتدائی طور پر گیتوں اور نظموں پر زیادہ انحصار کرتی تھی۔ وہ اپنے ہر دکھ کو نغمہ بنانے پر قادر تھے۔ اور ان کی سب سے بڑی خصوصیت ایک عرصے تک یہی غنائیت یا نغمگی ہی خیال کی جاتی تھی۔ ان کا فلم کا کیریئر بھی کچھ اسی طرف اشارہ کرتا ہے۔ مگر ان کی غزل اس نغمگی اور غنائیت کے علاوہ بھی اپنے اندر بہت کچھ رکھتی ہے۔ ان کے اور دیگر ہونے والے تمام واقعات یا واقعات کے بارے میں رد عمل ان کے ذاتی حوالے کی کٹھالی سے گذر کر شعر کی شکل اختیار کرتے نظر آتے ہیں وہ کسی موضوع اور کسی جذبے کو شجر ممنوعہ خیال نہیں کرتے۔ مگر ان کے یہاں ہیئتی سطح پر شاعری کا جو تصور تھا اس میں ابھی تک کوئی قابل ذکر تبدیلی نہیں ہوئی شعری ہیئت کے سلسلے میں انہوں نے جو پابندیاں شروع ہی میں قبول کر لی تھیں وہ اس کو نباہ رہے ہیں۔ غزل ان کے

نزدیک گیت کی طرح ایک ایسی صنف ہے جو بنیادی طور پر گائی جا سکتی ہے۔ چنانچہ ان کے ہاں الفاظ کی نشست ہمیشہ ایسی رکھی جاتی ہے کہ کسی سطح پر بھی اس کی نقل محروم نہ ہو۔

یہی صورت قتیل کی نظموں میں بھی کسی نہ کسی حد تک موجود ہے مگر اس وقت زیر بحث نہیں ہے اسی بنیادی غنائی تصور کی وجہ سے ان کی غزل نے جدید غزل سے اپنے فاصلے کو قائم رکھا ہے۔ پھر ان کے موضوعات بھی ایک خاص مزاج کے ہیں جن میں کلاسیکل طرز اظہار کی جھلک ہمیشہ نمایاں رہتی ہے۔ قتیل شفائی مزاج کے لحاظ سے کلاسیکی غنائی انداز کے شاعر ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ ان کا رشتہ لمحہ موجود کے ساتھ بہت گہرا ہے۔ وہ لمحہ بہ لمحہ زندگی گذارتے ہیں اور ہر اہم لمحے کو ریکارڈ کرتے چلے جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے شعر کہنے کی رفتار میں کمی واقع نہیں ہوتی۔ مجھے کوئی تعجب نہ ہو گا اگر چند مہینوں کے بعد قتیل صاحب پھر اپنا پیراہن تبدیل کریں اور ایک ایسی ہی تقریب کا پھر سے اہتمام ہو۔

اب آخر میں پیراہن سے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

سخن بریدہ زباں کا بدل ہی باقی ہے
وضاحتوں کے لئے اب غزل ہی باقی ہے

آج ہوا معلوم مجھے اس شہر کے چند سیانوں سے
اپنی راہ بدلتے رہنا سب سے بڑی دانائی ہے

پرانے جوڑوں کا سہے یہ عالم
کہ پانی کم ہے اور کائی بہت ہے
محبت کی کہانی منفرد تھی
مگر دنیا نے دہرائی بہت ہے

کب سننے دیتی ہے شور سمندر کی
پانی کی اک بوند جو میرے کان میں ہے

سخی ضرور ہے وہ لیکن اے گدا تو نے
کٹے ہوئے میرے دست طلب نہیں دیکھے

لہجہ کی پہچان کا شاعر

فصیح اکمل

قتیل شفائی سطحی اور دوسرے درجے کا شاعر ہے۔ اس کی شاعری میں معنیٰ آفرینی، تہہ داری اور استعارہ وابداخلیت نہیں ہے جو اعلیٰ شاعری کی روایت سے اس کا رشتہ مستحکم کرے۔

اس کی شاعری میں میر کا لہجہ نہیں، غالب کا آہنگ نہیں، اقبال کا فلسفیانہ اسلوب نہیں، ترقی پسندوں کا خطیبانہ مزاج نہیں، جدید شاعروں کے ترسیل وابلاغ کا مسئلہ نہیں، اور پھر جدید تر شعور کا نثری بیانیہ بھی نہیں۔

لیکن گجر، مطربہ، جل ترنگ گفتگو، روزن، آوازوں کے سائے، چھتنار پیرہن، ہریالی اور جھومر ایسے شعری انتخابات ہیں جو اس سکہ بند تنقیدی وار کی زد میں ہونے کے باوجود شاعر کے اپنے منفرد شعری رویہ کی پہچان کے لئے ناکافی نہیں ہیں۔

یہ رویہ کسی نعرہ یا تحریک کی دین نہیں بلکہ خود شاعر کے دھڑکتے دل اور اپنی ذاتی برے بھلے کی پہچان کا نتیجہ ہے ـــ اس پہچان میں کھوٹ ہو سکتی ہے۔ لیکن اس جذبہ کی صداقت سے انکار کون کرے گا۔

میں قتیل دل کا ہوں رازداں کہ محبتوں کا ہوں ترجماں
مجھے فخر ہے میری شاعری میری زندگی سے جدا نہیں

دل کی رازداری سے محبت کی ترجمانی تک قتیل کا شعری سفر خود اپنے تجربات کے سائے سائے اپنی ڈگر بناتا ہے۔ اس سفر میں داغ، امیر مینائی، حسرت موہانی، ریاض خیرآبادی، شاد عظیم آبادی، جگر مرادآبادی اختر شیرانی، مجاز، ساحر، سب سے اس کی ملاقات ہوتی ہے لیکن وہ غالب کی طرح

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

کسی تیز رو" کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کا قطعاً خواہشمند نہیں ــــ وہ سست رفتار سہی۔ لیکن اپنی رفتار کا انداز الگ سی رکھتا ہے۔ کیونکہ وہ رازداریٔ دل اور ترجمانیٔ محبت کو اپنا مدعا اور مقصد بنا چکا ہے اس کے سامنے رہبر کی تلاش و جستجو کا مسئلہ نہیں ہے۔

قتیل کے یہاں وہ فنکارانہ صداقت ہے جو کسی بھی فنی پارہ کو خون جگر کی آمیزش سے خوبصورت بنا دیتی ہے۔ وہ کوئے یار سے اٹھکر سوئے دار نہیں جاتا۔ بلکہ کوئے یار میں ہی رہتا ہے۔ کیوں کر بنیادی طور پر

عاشقیان کوئے دلداریم
رخ بہ بنیاد دیں نمی آریم

کا شاعر ہے۔ ۶۰ء یا ۶۱ء میں اس کی ایک غزل بیحد مشہور ہوئی تھی۔

یہ اُداس اُداس ٹھنڈک جو اسیر ہے بدن میں
کہیں بجلیاں نہ بھر دے کسی گوشۂ چمن میں
میری مفلسی سے بچ کر کہیں اور جانے والے
یہ سکوں نہ مل سکے گا تجھے ریشمی کفن میں

آخر الذکر شعر کی مقبولیت نے قتیل کا نام دور دور تک پہونچا دیا تھا۔ قتیل کو فلمی شاعری نے نقصان پہونچایا یا فائدہ، یہ قطعی علیحدہ بحث ہے۔ لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ فلمی شاعری میں بھی اس نے اپنے مزاج کی پوری چھاپ برقرار رکھی۔ اور اس کمرشیل "کوئے دلداروں" میں بھی وہ عارضی تجربوں کا شکار نہیں ہوا۔ اور ذاتی تجربات کے دروازے اس پر کھلے رہے۔ "مطربہ" انھیں تجربات کا ماحصل تھی جس نے ۱۹۶۴ء میں پاکستان کا ممتاز ادبی انعام حاصل کیا تھا۔ قتیل کا نام بساط ادب پر اس وقت تک اپنے لئے گنجائش نکال چکا تھا۔ اس انعام سے اس کے صف کے لوگوں پر کیا بیتی یہ تو دہی جانیں۔ لیکن "مطربہ" کی نظمیں اپنی سیدھی سچی طنزیہ کاٹ کی بنا، پر ہر اس شخص کا ذاتی تجربہ بن گئیں جو اس کوچے سے گذر چکا تھا۔

جو کام اس سلسلہ میں بڑے بڑے سماجی رہبر اور ادارے نہ کر سکے وہ ایک مختصر شعری مجموعہ نے کر دکھایا۔

یہ قتیل کی فنکارانہ صداقت کا کھرا پن تھا۔ وہ سچا اور جدید لہجہ جو

از دل خیزد بر دل ریزد

کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

قتیل کے تمام شعری مجموعے پڑھ ڈالئے۔ تخیلات کہکشاں میں دو رنگ کبھی صاف آنچل میں، کبھی نقاب

کی اوٹ سے ۔ وہ مرکزی تصوراتی چہرا جو شاعر کے دیدۂ دل میں بس کر رہ گیا ہے اپنی بہار دکھاتا نظر آئے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے قدم کائنات کی وسعتوں میں کہیں ہوں اس کی آنکھیں دیدار اور خواہش دیدار سے سرشار ملتی ہیں۔

قتیل بہت معمولی باتوں کو اس طرح آسانی سے کہہ کر گذر جاتا ہے کہ دوسرے شاعر صرف سوچتے رہ جاتے ہیں۔ یہ معمولی باتیں ــــ اسکی شاعری میں غیر معمولی پیکر بن جاتی ہیں ــــ اور وہ

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

کی منزل سے ہنستا مسکراتا گذر جاتا ہے۔ قتیل کی عوامی مقبولیت کا سب سے بڑا راز اسکی یہی سادگی اور بیانیہ کی یہی معصومیت ہے۔

اس کے علاوہ جو بیحد اہم بات ہے وہ یہ ہے کہ قتیل نے اپنا قد یا اپنا چہرا نمایاں کرنے کے لئے دوسروں کی محنت پر اپنا چہرا رکھکر پیش کرنے کی منافقانہ کوششیں نہیں کیں۔ اس نے اپنا چہرا اپنی محنت پر رکھکر پیش کیا۔ اس کا قد ـ قدرت نے جتنا بلند کر دیا تھا اس نے اس میں اپنی ذاتی محنت اور فنکارانہ صلاحیت سے خود ہی اضافہ کیا۔

ماسکو یا امریکہ کا سہارا نہیں لیا۔ کہ ایسی شہرتیں ملتی ہوتی ہیں پائیدار نہیں۔ فردوسی، حافظ، سعدی جامی، رومی، عطار اور سنائی نے اپنے عہد میں مصلحتوں سے عارضی سمجھوتہ کر کے تنقیدی کتابوں میں اپنے تذکرے نہیں کرائے۔ انھوں نے اپنی تعریف میں بے ربط مضامین نہیں لکھوائے۔ ولی دکنی، سراج اورنگ آبادی، میر تقی میر، نظیر اکبر آبادی نے بھی ان تمام " دور اندیشیوں " سے کام نہیں لیا۔ بس اپنا کام کرتے رہے اور خاموش رہے۔

ان لوگوں کو نہ کسی ازم " کی حمایت کرنے کے لئے معاشی سہولیات فراہم کی گئیں اور نہ خود انہوں نے خود ساختہ دانشوری " کا اشتہار اپنی پیٹھ پر چپکا کر عوامی جلسوں میں شرکت کی۔ لیکن یہ عوام کے محبوب اور مقبول شاعر ہیں۔

زمانہ کی گردشیں ان کے " بقائے دوام " کو ذرہ بھر نقصان نہیں پہونچا سکیں۔ کیونکہ یہ لوگ اپنے جذبات کے اظہار میں صادق تھے۔ انھوں نے مصلحتوں کا لبادہ نہیں پہنا۔ واضح رہے کہ میں نے اس صف میں غالب کا نام نہیں لیا ہے ــــ غالب کی شاعرانہ مکاریاں اب عرف عام میں کھل چکی ہیں۔

قتیل نے بدلتے زمانے کی ہر کیفیت کو محسوس کیا ہے۔ یہ اس کی شاعری کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے اس نے اس دور کی " اخلاقی اقدار " سیاسی بازی گری، سرمایہ کی غیر منصفانہ تقسیم اور اس سے پیدا شدہ خرابیوں " " سماجی انتشار اعتماد اور عقیدوں کے کھوکھلے پن، جنگ کی تباہ کاریوں، مہذب سوسائٹی کے غیر مہذب کردار " سب کو اپنے افکار و تخیلات کے دائرے میں سمیٹا ہے۔ لیکن بیحد نرم اور میٹھے الفاظ کے ذریعے۔

اس کو قتیل کا حسن بیان سمجھئے یا اسکی فنکارانہ خامی کہ وہ موضوع کے لئے الفاظ نہیں تراشتا۔ اس کے پاس جو لہجہ ہے، جو الفاظ ہیں انہیں کے ذریعہ وہ ہر موضوع پر اظہار کرتا ہے۔

یہ انداز بیان اس کو گیت کے بیانیہ سے ملا ہے۔ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ وہ بنیادی طور پر " کوئے دار " کا شاعر

اس کی غزلوں میں یہ تمام موضوعات مل جائیں گے۔ لیکن لہجہ اور الفاظ وہی ہوں گے۔ جو اس کی پہچان متعین کرتے ہیں۔

سخن بر یدہ زباں کا بدل ہی باقی ہے
وضاحتوں کے لئے اب غزل ہی باقی ہے

جب کوئی کرتا ہے قحط رنگ و بو پر احتجاج
پھول کاغذ کے سبھی بیچتے ہو گلدانوں میں تم

سب کہتے ہیں اک جنت اتری ہے میری دھرتی پر
میں دل میں سوچوں شاید کمزور میری بینائی ہے

تجربوں کی پردہ پوشی سے بڑا کیا جرم ہے
وہ بھی کم ظالم نہ تھے جو ظالموں سے ڈر گئے

میں نے آواز اٹھائی تھی رواجوں کے خلاف
برچھیاں لے کے گھروں سے نکل آئے کچھ لوگ

کام کے لوگ وطن میں بھی نہیں تھے کم یاب
پھر بھی کچھ لوگوں نے باہر سے منگائے کچھ لوگ

نعروں کے اس شور میں بھائی
شہروں سے ویرانہ اچھا

شوق تو یہ ہے آج کے فاتح کہلائیں
جنگ ابھی تک ماضی کے میدان میں ہے

سکونت بار جب بن جائے بنیاد رفافت پہ
مکاں تقسیم ہو جاتے ہیں خود اپنے مکینوں سے

بھوک لگتی اسے خوراک بن جاتے ہیں لوگ
آسمانوں سے کبھی رزق زمیں آتا نہیں

یہ ماضیوں کا یہ مستقبلوں کا ٹکراؤ
مرا زمانہ بٹا ہے کئی زمانوں میں

پیدا انسانوں کے بدلے ہوتے ہیں اب پتھر
کر دیا بے حس نسلوں کو آرام سکھا کر ہم نے

موت برحق ہے مگر میری گذارش یہ ہے
زندہ انسان کا جنازہ نہ اٹھایا جائے

میں بھی ہوں اسی دور کا سہما ہوا انساں
تھوڑے سے تبسم کی ضرورت ہے مجھے بھی

آج فلاطون ہوتا تو کچھ بے دماغ دانشور
اپنے کاندھوں پر رکھ لیتے سر اتار کر اس کا

قتیل نے متذکرہ موضوعات کی پرچھائیاں جس دھیمے لہجے میں پیش کی ہیں ان کے لئے دوسرے شاعر موضوع کے اعتبار سے الفاظ تراشتے ۔ اور پھر اس پر نظمیں کہتے۔ لیکن قتیل نے اپنی نظموں میں بھی اپنے گیت جیسے لہجہ کو برقرار رکھا ہے ۔یہی اس کی کامیابی ہے۔

بدلتے ہوئے حالات کی نمائندہ نظمیں اس کے مجموعہ چھتنار میں ہیں۔ جن میں "آدمی" سے لیکر "بہائم" تک سارے وقتی مسائل کو قتیل نے اپنے انداز سے سمجھنے کی کوشش کی ہے بعض ایسے موضوعات بھی اس نے انتخاب کئے ہیں

دوسرے شاعروں کے لئے "کسرِ شان" ہوتے۔

مثلاً بہی کھاتہ، جس میں اس نے سرمایہ دار ذہنیت اور اشیا میں ملاوٹ جیسے جرم کو آئینہ کیا ہے۔ سبحان اللہ بِسلزم کی مفاد پرستانہ تعبیر کے پس منظر میں "تعجب" آدمی کی اس وحشیانہ روش کو بے نقاب کرتی ہے جو ہر دور میں عورت جنس بازار بناتی رہی ہے۔

"وفا" اور "ٹویٹ ہام" جیسی نظمیں بھی اس مجموعے میں شامل ہیں لیکن ہر نظم قتیلؔ کے مخصوص لب و لہجہ اور الفاظ، صبر مزاجی کی نمائندگی کرتی ہے۔

قتیلؔ نے اپنے دائرے سے کہیں بھی قدم باہر نہیں رکھا ہے۔ وہ اپنے لہجہ کو پہچانتا ہے اور یہی قتیلؔ کی فنکارانہ دانائی ہے جو اسکو "عوامی" بھی بناتی ہے اور محبوب بھی۔ بقول میرؔ

شعر میرے ہیں گو خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

قتیل شفائی کی شاعری انسان کے دل و دماغ پر نرم
اور کومل روپ میں داسی بنی کھڑی رہتی ہے ——

—————— مظفر بخاری

غزلیں



تمہاری انجمن سے اٹھ کے دیوانے کہاں جاتے؟
جو وابستہ ہوئے تم سے، وہ افسانے کہاں جاتے؟

نکل کر دیر و کعبے سے اگر ملتا نہ مے خانہ
تو ٹھکرائے ہوئے انساں خدا جانے کہاں جاتے

تمہاری بے رخی نے لاج رکھ لی بادہ خانے کی
تم آنکھوں سے پلا دیتے تو پیمانے کہاں جاتے؟

چلو اچھا ہوا کام آ گئی دیوانگی اپنی،
وگرنہ ہم زمانے بھر کو سمجھانے کہاں جاتے

قتیل اپنا مقدر غم سے بیگانہ اگر ہوتا
تو پھر اپنے پرائے ہم سے پہچانے کہاں جاتے

اُفق کے اس پار زندگی کے اُداس لمحے گزار آؤں،
اگر مرا ساتھ دے سکو تم تو موت کو بھی پکار آؤں
کچھ اس طرح جی رہا ہوں جیسے اٹھائے پھرتا ہوں لاش اپنی
جو تم ذرا سا بھی دو سہارا تو بارِ ہستی اتار آؤں

ہم کو تو انتظارِ سحر بھی قبول ہے،
لیکن شبِ فراق، ترا کیا اصول ہے؟
اے ماہِ نیم شب تری رفتار کے نثار
یہ چاندنی نہیں ترے قدموں کی دھول ہے

غنچوں کا رس، کلیوں کا مَس ایک زمانے کو للچائے
ہائے مگر وہ پھول کہ جس پر کانٹوں کو بھی پیار آئے!
آنسو، ایک سلگتا آنسو، ضبط کہاں تک ہاتھ بڑھائے
یہ بس حلق سے کیسے اترے، یہ انگارہ کون چبائے

انگڑائی پر انگڑائی لیتی ہے رات جدائی کی
تم کیا سمجھو تم کیا جانو بات مری تنہائی کی؟

کون سیاہی گھول رہا تھا وقت کے بہتے دریا میں
میں نے آنکھ جھکی دیکھی ہے آج کسی ہرجائی کی

ٹوٹ گئے سیال نگینے پھوٹ بہے رخساروں پر
دیکھو میرا ساتھ نہ دینا بات ہے یہ رسوائی کی

وصل کی رات نہ جانے کیوں اصرار تھا ان کو جانے پر
وقت سے پہلے ڈوب گئے تاروں نے بڑی دانائی کی

اڑتے اڑتے آس کا پنچھی دور افق میں ڈوب گیا
روتے روتے بیٹھ گئی آواز کسی سودائی کی

یارو کسی قاتل سے کبھی پیار نہ مانگو
اپنے ہی گلے کے لئے تلوار نہ مانگو

گر جاؤ گے تم اپنے مسیحا کی نظر سے
مر کر بھی علاجِ دلِ بیمار نہ مانگو

اس چیز کا کیا ذکر جو ممکن ہی نہیں ہے
صحرا میں کبھی سایۂ دیوار نہ مانگو

حالات کی بھیگی رات بھی ہے جذبات کا تیز الاؤ بھی
میں کون سی آگ میں جل جاؤں اے نکتہ ور سمجھاؤ بھی

ہر چند نظر نے جھیلے ہیں ہر بار سنہرے گھاؤ بھی
ہم آج بھی دھوکہ کھا لیں گے تم بھیس بدل کر آؤ بھی

جب کوئی مست گھٹا جھوم کے لہراتی ہے
دل کی وادی سے پپیہے کی صدا آتی ہے

میں تیرے لمس کا شیدا ہوں مگر صرف اتنا
پھول کو جیسے ہوا چھو کے گزر جاتی ہے

ڈھل گیا چاند گئی رات چلو سو جائیں
ہو چکی اُن سے ملاقات چلو سو جائیں

دُور تک گونج نہیں ہے کسی شہنائی کی
لُٹ گئی آس کی بارات چلو سو جائیں

لوگ اقرارِ وفا کر کے بھلا دیتے ہیں
یہ نہیں کوئی نئی بات چلو سو جائیں

شام ہوتی تو کسی جام سے جی بہلاتے
بند ہے اب تو خرابات چلو سو جائیں

اتنے چھینٹوں سے بھی دھویا نہ گیا داغِ الم
کیا کرے گی ہمیں برسات چلو سو جائیں

جو ہے بیدار یہاں اس پہ ہے جینا بھاری
مار ڈالیں گے یہ حالات چلو سو جائیں

ہم نے کیا کچھ نہ سرِ شام کہا تھا قتیلؔ
آخرِ شب نہ ملو ہاتھ چلو سو جائیں

بے خودی میں پاس لُٹو نے اقرار پہلے تو نہ تھا
اتنا غافل وہ بُتِ عیار پہلے تو نہ تھا

اہلِ دل جاتے ہیں اب دار و رسن کی راہ سے
اس قدر مشکل وصالِ یار پہلے تو نہ تھا

مصر کی گلیاں اُتر آئی ہیں اپنے شہر میں
حسن والوں کا یہ حالِ زار پہلے تو نہ تھا

روز و شب اپنے لئے ہیں قتل کے فتوے قتیلؔ
مفتیٔ شہر اس قدر دیں دار پہلے تو نہ تھا

●

اک جام، کھنکتا جام کہ ساقی رات گزرنے والی ہے
اک ہوش رُبا انعام کہ ساقی رات گزرنے والی ہے

وہ دیکھ ستاروں کے موتی ہر آن بکھرتے جاتے ہیں
افلاک پہ ہے کہرام کہ ساقی رات گزرنے والی ہے

گو دیکھ چکا ہوں پہلے بھی نظّارہ دریا نوشی کا
ایک اور صلائے عام کہ ساقی رات گزرنے والی ہے

یہ وقت نہیں ہے باتوں کا، پلکوں کے سائے کام میں لا
الہام، کوئی الہام کہ ساقی رات گزرنے والی ہے

مدہوشی میں احساس کے اونچے زینے سے گر جانے دے
اِس وقت نہ مجھ کو تھام کہ ساقی رات گزرنے والی ہے

●

پریشاں رات ساری ہے، ستارو تم تو سو جاؤ
سکوتِ مرگ طاری ہے، ستارو تم تو سو جاؤ

ہنسو اور ہنستے ہنستے ڈوبتے جاؤ خلاؤں میں
ہمیں پر رات بھاری ہے، ستارو تم تو سو جاؤ

ہمیں تو آج کی شب پو پھٹے تک جاگنا ہوگا
یہی قسمت ہماری ہے، ستارو تم تو سو جاؤ

تمھیں کیا آج بھی کوئی اگر ملنے نہیں آیا
یہ بازی ہم نے ہاری ہے، ستارو تم تو سو جاؤ

کہے جاتے ہو رو رو کر ہمارا حال دنیا سے
یہ کیسی رازداری ہے؟ ستارو تم تو سو جاؤ

ہمیں بھی نیند آجائے گی، ہم بھی سو ہی جائیں گے
ابھی کچھ بے قراری ہے، ستارو تم تو سو جاؤ

دنیا نے ہم پہ جب کوئی الزام رکھ دیا
ہم نے مقابل اس کے تیرا نام رکھ دیا

اک خاص حد پہ آ گئی جب تیری بے رخی
نام اس کا ہم نے گردشِ ایام رکھ دیا

انسان اور دیکھے بغیر اس کو مان لے!
اک خوف کا بشر نے خدا نام رکھ دیا

اب جس کے جی میں آئے وہی پائے روشنی
ہم نے تو دل جلا کے سرِ عام رکھ دیا

کیا مصلحت شناس تھا وہ آدمی قتیلؔ
مجبوریوں کا جس نے وفا نام رکھ دیا

کیا عشق تھا جو باعثِ رسوائی بن گیا
یارو تمام شہر تماشائی بن گیا

تھا بے قرار وہ مرے آنے سے پیشتر
دیکھا مجھے تو پیکرِ دانائی بن گیا

کرتا رہا جو روز مجھے اس سے بدگماں
وہ شخص بھی اب اس کا تمنائی بن گیا

وہ تیری بھی تو پہلی محبت نہ تھی قتیلؔ
پھر کیا ہوا اگر کوئی ہرجائی بن گیا

نہ بول اس بزم میں اے دوست کیوں دیوانہ بنتا ہے
یہاں تو اک ذرا سی بات کا افسانہ بنتا ہے

بھلا توسِ قزح کیا ہے جمالِ یار کے آگے
ملیں سو رنگ تو اک جلوۂ جانانہ بنتا ہے

سلانے آ گئے پھولوں کو پھر جھونکے ہواؤں کے
یہی وہ موڑ ہے گلشن جہاں ویرانہ بنتا ہے

ایک ذرا سا دل ہے جس کو توڑ کے بھی تم جا سکتے ہو
یہ سونے کا طوق نہیں یہ چاندی کی دیوار نہیں ہے

●

چاندی جیسا رنگ ہے تیرا سونے جیسے بال
اک تو ہی دھنوان ہے گوری باقی سب کنگال

ہر آنگن میں سجے نہ تیرے اُجلے روپ کی دھوپ
چھیل چھبیلی رانی تھوڑا گھونگھٹ اور نکال

بھر بھر نظریں دیکھیں تجھ کو آتے جاتے لوگ
دیکھ تجھے بدنام نہ کردے یہ ہرنی سی چال

کتنی سندر نار ہو کوئی میں آواز نہ دوں!!
تجھ سا جس کا نام نہیں ہے وہ جی کا جنجال

سامنے تو آئے تو دھڑکیں مل کر لاکھوں دل
اب جانا دھرتی پر کیسے آتے ہیں بھونچال

بیچ میں رنگ محل ہے تیرا کھائی چاروں اور
ہم سے ملنے کی اب گوری تو ہی راہ نکال

کر سکتے ہیں چاہ تری اب سرمد یا منصور
ملے کسی کو دار یہاں اور کھنچے کسی کی کھال

یہ دنیا ہے خود غرضوں کی لیکن یار قتیل
تو نے ہمارا ساتھ دیا تو جئے ہزاروں سال

●

مل کر جدا ہوئے تو نہ سویا کریں گے ہم
اک دوسرے کی یاد میں رویا کریں گے ہم

آنسو چھلک چھلک کے ستائیں گے رات بھر
موتی پلک پلک میں پرویا کریں گے ہم

جب دوریوں کی آگ دلوں کو جلائے گی
جسموں کو چاندنی میں بھگویا کریں گے ہم

مجبوریوں کے زہر سے کرلیں گے خودکشی
یہ بزدلی کا جرم بھی گویا کریں گے ہم

●

پھر رہے ہیں لوگ ہاتھوں میں لئے خنجر کھلے
کوچے کوچے میں اب آتا ہے نظر مقتل کا رنگ

چار جانب جس کی رعنائی کے چرچے ہیں قتیل
جانے کب دیکھیں گے ہم اس آنے والی کل کا رنگ

حسن کو چاند، جوانی کو کنول کہتے ہیں
اُن کی صورت نظر آئے تو غزل کہتے ہیں

اُف وہ مرمر سے تراشا ہوا شفاف بدن
دیکھنے والے اسے تاج محل کہتے ہیں

پڑ گئی پاؤں میں تقدیر کی زنجیر تو کیا
ہم تو اس کو بھی تری زلف کا بل کہتے ہیں

میں نے توڑی تھی صراحی کہ گھر آئے بادل
دوستو اس کو مکافاتِ عمل کہتے ہیں

مجھ کو معلوم نہیں اس کے سوا کچھ بھی قتیل
جو صدی وصل میں گزرے اسے پل کہتے ہیں

موجوں کا مجھے غلام لکھ دو
تم ریت پہ میرا نام لکھ دو

قسمت مجھے دے کے بُلبُلے کی!
ماتھے پہ مرے دوام لکھ دو

پہلے تو وہ آگ مجھ سے چھوٹی
پانی کو بھی اب حرام لکھ دو

جو بھی نظر آئے خشک دریا
تم اس پہ صلائے عام لکھ دو
("آموختہ" سے)

جب تعلق نہ رہا کوئی تو جھگڑا کیسا
شاید اب وہ مرا دل بھی نہ دکھانا چاہے

دل کو یوں تھپکیاں دیتا ہوں کہ جیسے کوئی ماں
اپنے روتے ہوئے بچے کو سلانا چاہے

اس کا وہ پیار کہ برسات کی پہلی بارش
جس میں انسان لگاتار نہانا چاہے

احترامِ لب و رخسار تک آ پہنچے ہیں
بوالہوس بھی مرے معیار تک آ پہنچے ہیں

کیا وہ نظروں کو جھروکے میں معلق کر دیں؟
جو ترے سایۂ دیوار تک آ پہنچے ہیں

اپنی تقدیر کو روتے رہیں ساحل والے
جن کو آنا تھا وہ منجدھار تک آ پہنچے ہیں

اب تو کھل جائے گا شاید تری الفت کا بھرم
اہلِ دل جراتِ اظہار تک آ پہنچے ہیں

ایک تم ہو کہ خدا بن کے چھپے بیٹھے ہو
ایک ہم ہیں کہ لبِ دار تک آ پہنچے ہیں

دے کر ہمیں فریبِ وفا آپ خوش رہیں
برباد ہم ہوئے بھی تو کیا آپ خوش رہیں

پیش آئیں بے رُخی سے تو یہ آپ کی خوشی
اپنی تو ہے بس اتنی دُعا آپ خوش رہیں

صدمے دیے قتیلؔ کو کیا کیا نہ آپ نے!
اس پر بھی آپ کا ہو بھلا آپ خوش رہیں

برسات کی بھیگی راتوں میں پھر کوئی سہانی یاد آئی
کچھ اپنا زمانہ یاد آیا، کچھ ان کی جوانی یاد آئی

کلیوں کی طرح جو چٹکی تھی، اُن گلشن گلشن ہونٹوں پر
لو بیٹھے بٹھائے آج ہمیں وہ بات پرانی یاد آئی!

○

کسی نے کر دیا ہے منع اظہار انا سے بھی
یہ غیرت مند انسانوں کے مر جانے کا موسم ہے

قید کر دیا سانپوں کو یہ کہہ کر سپیروں نے
یہ انسانوں کو انسانوں سے ڈسوانے کا موسم ہے

سروں کی فصل کٹتی ہے تو اگ آتی ہیں دستاریں
خدا جانے یہ کس موسم کو دہرانے کا موسم ہے

قتیل اس بار اپنے شعر پر تکیہ نہ کر بھائی
غزل کا یہ نہیں موسم یہ افسانے کا موسم ہے

○

پہلے جو آئے اُن کی پذیرائی کیا ہوئی
دیوانہ اب کوئی سرِ مقتل نہ آئے گا

واپس گیا تو رخ پہ سیہ دھاریاں بھی تھیں
نینوں میں اب لگا کے وہ کاجل نہ آئے گا

○

○

موت برحق ہے مگر میری گذارش یہ ہے
زندہ انساں کا جنازہ نہ اٹھایا جائے

میں بتاؤں گا اُسے زخم کی لذت کیا ہے
پھول کا مجھ سے تعارف تو کرایا جائے

انگلیاں کاٹ کے ایجاب رفاقت جس کی
اس منافق سے مرا ہاتھ چھڑایا جائے

○

ڈرتے نہیں زخموں سے ہم دار و رسن والے
پتھر نہ اٹھا ہم پر شیشے کے بدن والے

منظور پرستش ہے اک سانولی مورت کی
غزلوں میں سجاتا ہوں الفاظ بھجن والے

○

○

اپنے ہونٹوں پر سجانا چاہتا ہوں
آ تجھے میں گنگنانا چاہتا ہوں

تھک گیا میں کرتے کرتے یاد تجھ کو
اب تجھے میں یاد آنا چاہتا ہوں

آخری ہچکی ترے زانو پہ آئے
موت بھی میں شاعرانہ چاہتا ہوں

○

بہت دلوں سے نہیں اپنے درمیاں وہ شخص
اداس کر کے ہمیں چل دیا کہاں وہ شخص

اس ایک شخص میں تھیں دلربائیاں کیا کیا
ہزار لوگ ملیں گے مگر کہاں وہ شخص

○

○

جاگتی آنکھیں ماضی بن کر کھڑے کھڑے سو جائے گا
پیچھے مڑ کر دیکھنے والا پتھر کا ہو جائے گا

ڈستی راہوں میں تو کس کی کھوج میں نکلا ہے آخر
لوٹ ابھی جا دیوانے تو اس جنگل میں کھو جائے گا

اپنا شہر ہو یا بیگانہ دل والوں کے سب دشمن
سب کو ایک سا پائے گا تو جس نگری کو جائے گا

دروازوں کی اوٹ میں کنگن جہاں کھنکتے ہیں قتیل
کچھ بھی کرے تو ان گلیوں میں دھیان ترا تو جائے گا

○

میں عام سا اک آدمی ہوں
اس شہر کے خاص خاص لوگو!

دے دو اسے اپنی اپنی شبنم
دریا کو لگی ہے پیاس لوگو!

○

●

رقص کرتے ہیں خلاؤں میں اندھیرے لوگو
شام کے رنگ میں ڈوبے ہیں سویرے لوگو

پیار ہے تم سے مجھے تم ہو مرا آئینہ!
مجھ سے تم دور نہ ہونا کبھی میرے لوگو

وقت آیا ہے کہ منزل کا تعین کر لیں
رخ ہواؤں کا بتاتے ہیں پھریرے لوگو

●

چاندنی سموئی ہے نقرئی جبینوں میں
رات کیوں نہ ہم کاٹیں جاگ کر جبینوں میں

اُف وہ نیند کے سائے نیم باز آنکھوں پر
بھر رہا ہو مے کوئی جیسے آبگینوں میں

بدلیاں ہوں ساون کی یا سماں ہو پھاگن کا
حسرتیں سلگتی ہیں بھیگتے مہینوں میں

جانے تیری سکھیوں نے تجھ سے کیا کہا ہوگا
ہم تو ہو گئے رسوا اپنے ہم نشینوں میں

●

غزل سرا ہے زمانہ کوئی سنے تو سہی
نظر نظر ہے ترانہ کوئی سنے تو سہی

صدائیں دیتے ہیں تیر افگنوں کو رہ رہ کر
بنیں گے ہم بھی نشانہ کوئی سنے تو سہی

ہمی پہ آئے گا الزام ناصبوری کا
ستمگروں کا بہانہ کوئی سنے تو سہی

●

باہیں بھی ہیں موجود یہاں دار و رسن بھی
دیکھیں تو کدھر جاتے ہیں جھولوں کے پرستار

نادیدہ بہاروں پہ ہے ایمان ہمارا
ہم ایسے کہاں ہوں گے رسولوں کے پرستار

●

گرمیٔ حسرتِ ناکام سے جل جاتے ہیں
ہم چراغوں کی طرح شام سے جل جاتے ہیں

شمع جس آگ میں جلتی ہے نمائش کے لئے
ہم اسی آگ میں گمنام سے جل جاتے ہیں

بچ نکلتے ہیں اگر آتشِ سیّال سے ہم
شعلۂ عارضِ گلفام سے جل جاتے ہیں

خود نمائی تو نہیں شیوۂ اربابِ وفا
جن کو جلنا ہو وہ آرام سے جل جاتے ہیں

ربط باہم پہ ہمیں کیا نہ کہیں گے دشمن
آشنا جب ترے پیغام سے جل جاتے ہیں

جب بھی آتا ہے مرا نام ترے نام کیساتھ
جانے کیوں لوگ مرے نام سے جل جاتے ہیں

●

مسجد کی اذاں ہو کہ شوالے کا گجر ہو
اپنی تو یہ حسرت ہے کسی طرح سحر ہو

خوشبو کی ندی پھوٹ بہے ریشۂ گل سے
اک موجِ صبا کا بھی جو گلشن پہ گذر ہو

مایوس بھلا کیوں ہو کوئی سنگدلوں سے
شاید کسی پتھر کے بھی سینے میں شرر ہو

دل جان کے واعظ نے جسے توڑ دیا ہے
آجائے مزا وہ بھی جو اللہ کا گھر ہو

کس منہ سے کرے اب کوئی جنت کی تمنّا
ممکن ہے وہاں پھر کوئی ممنوع شجر ہو

اے چارہ گرو! سیر ہوس خوب ہے لیکن
زندانِ وفا میں کوئی دیوانہ اگر ہو

●

یہ اُداس اُداس ٹھنڈک جو بسی ہے پون میں
کہیں بجلیاں نہ بھر دے کسی گوشۂ چمن میں

یہ عجیب فصلِ گل ہے کہ کسی بھی گل کی رنگت
نہ جچی مری نظر میں۔ نہ رچی ترے بدن میں

میں طلوعِ صبحِ نو سے ابھی مطمئن نہیں ہوں
ترا حُسن بھی تو ہوتا کسی خوشنما کرن میں

سرِ بام بھی پکارا، لبِ دار بھی صدا دی
میں کہاں کہاں نہ پہنچا تری دید کی لگن میں

مری مفلسی سے بچ کر کہیں اور جانے والے
یہ سکوں نہ مل سکے گا تجھے ریشمی کفن میں

میں لیے لیے پھرا ہوں غمِ زندگی کا لاشہ
کبھی اپنی خلوتوں میں کبھی تیری انجمن میں

ترے غم میں بہہ گیا ہے مرا ایک ایک آنسو
نہیں اب کوئی ستارا جو چمک سکے گگن میں

میں قتیلؔ وہ مسافر ہوں جہانِ بے بسی کا
جو بھٹک کے رہ گیا ہو کسی اجنبی وطن میں

●

اب یہ حالت ہے دل کے داغوں کی
کانپتی ہیں لویں چراغوں کی

کس کو حاصل ہے جز غمِ دَر دراں
دوستی ہم سے کم فراغوں کی

دل جلاؤ کہ تیرگی تو چھٹے!
چھن گئی روشنی دماغوں کی

تو نے کی گفتگو تو یاد آئی
دھیمی دھیمی کھنک ایاغوں کی

یہ ملاحت کسی کے چہرے پر
سانولی شام جیسے باغوں کی

عارضوں سے نہ گیسوؤں کو ہٹاؤ
سانس رُک جائے گی چراغوں کی

وہ دل ہی کیا ترے ملنے کی جو دعا نہ کرے
میں تجھ کو بھول کے زندہ رہوں خدا نہ کرے

رہے گا ساتھ ترا پیار زندگی بن کر
یہ اور بات مری زندگی وفا نہ کرے

یہ ٹھیک ہے نہیں مرتا کوئی جدائی میں
خدا کسی سے کسی کو مگر جدا نہ کرے

سنا ہے اس کو محبت دعائیں دیتی ہے
جو دل پہ چوٹ تو کھائے مگر گلہ نہ کرے

اگر وفا پہ بھروسہ رہے نہ دنیا کو
تو کوئی شخص محبت کا حوصلہ نہ کرے

بجھا دیا ہے نصیبوں نے میرے پیار کا چاند
کوئی دیا مری پلکوں پہ اب جلا نہ کرے

زمانہ دیکھ چکا ہے پرکھ چکا ہے اسے
قتیل جان سے جائے پر التجا نہ کرے

جو بھی غنچہ ترے ہونٹوں پہ کھلا کرتا ہے
وہ مری تنگیٔ داماں کا گلا کرتا ہے

دیر سے آج مرا سر ہے ترے زانو پر
یہ وہ رتبہ ہے جو شاہوں کو ملا کرتا ہے

میں تو بیٹھا ہوں دبائے ہوئے طوفانوں کو
تو مرے دل کے دھڑکنے کا گلا کرتا ہے

رات یوں چاند کو دیکھا ہے ندی میں رقصاں
جیسے جھومر ترے ماتھے پہ ہلا کرتا ہے

جب مری سیج پہ ہوتا ہے بہاروں کا نزول
صرف اک پھول کواڑوں میں کھلا کرتا ہے

کون کافر تجھے الزامِ تغافل دے گا
جو بھی کرتا ہے محبت سے گلا کرتا ہے

لوگ کہتے ہیں جسے نیل کنول وہ تو قتیل
شب کو ان جھیل سی آنکھوں میں کھلا کرتا ہے

اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں بسا لے مجھ کو
میں ہوں تیرا تو نصیب اپنا بنا لے مجھ کو

میں جو کانٹا ہوں تو چل مجھ سے بچا کر دامن
میں ہوں گر پھول تو جوڑے میں سجا لے مجھ کو

میں کھلے در کے کسی گھر کا ہوں ساماں، پیارے
تو دبے پاؤں کبھی آ کے چرا لے مجھ کو

ترکِ الفت کی قسم بھی کوئی ہوتی ہے قسم
تو کبھی یاد تو کر، بھولنے والے، مجھ کو

مجھ سے تو پوچھنے آیا ہے وفا کے معنی
یہ تری سادہ دلی مار نہ ڈالے مجھ کو

میں سمندر بھی ہوں، موتی بھی ہوں، غوطہ زن بھی
کوئی بھی نام مرا لے کے بلا لے مجھ کو

تو نے دیکھا نہیں آئینے سے آگے کچھ بھی
خود پرستی میں کہیں تو نہ گنوا لے مجھ کو

کل کی بات اور ہے، میں اب سا رہوں یا نہ رہوں
جتنا جی چاہے ترا، آج ستا لے مجھ کو

باندھ کر سنگِ وفا کر دیا تو نے غرقاب
کون ایسا ہے جو اب ڈھونڈ نکالے مجھ کو

خود کو میں بانٹ نہ ڈالوں کہیں دامن دامن
کر دیا تو نے اگر میرے حوالے مجھ کو

بادہ پھر بادہ ہے، میں زہر بھی پی جاؤں قتیل
شرط یہ ہے، کوئی باہوں میں سنبھالے مجھ کو

پھولوں کی اداسی کو چھپا جاتی ہے خوشبو
اڑتا ہے کوئی رنگ تو چھا جاتی ہے خوشبو

خوشبو کا خمیر اٹھتا ہے خاکسترِ گل سے
گل ہی سے مگر آنکھ چرا جاتی ہے خوشبو

آتی ہے تو کانٹے بھی دعا دیتے ہیں اس کو
جاتی ہے تو گلشن کو رلا جاتی ہے خوشبو

یوں مجھ میں ترے لمس کا احساس رچا ہے
اپنے ہی بدن سے تری آ جاتی ہے خوشبو

دیکھوں جو قتیل ان سا کوئی حسنِ معطر
جذبات میں کہرام مچا جاتی ہے خوشبو

زندگی کے غم لاکھوں اور چشمِ نم تنہا
حسرتوں کی میت پر رو رہے ہیں ہم تنہا

مل سکا نہ کوئی بھی ہمسفر زمانے میں
کاٹتے رہے برسوں جادۂ الم تنہا

کھیل تو نہیں یارو راستے کی تنہائی
کوئی ہم کو دکھلائے چل کے دو قدم تنہا

دل کو چھیڑتی ہو گی یادِ رفتگاں اکثر
لاکھ جی کو بہلائیں شیخِ محترم تنہا

مسجدیں ترستی ہیں اُس طرف اذانوں کو
اِس طرف شوالوں میں رہ گئے صنم تنہا

اِس بھری خدائی میں وہ بھی آج اکیلے ہیں
خلوتوں میں رہ کر بھی جو رہے تھے کم تنہا

تھی قتیلؔ چاہت میں اُن کی بھی رضا شامل
پھر بھی ہم ہی ٹھہرے ہیں موردِ ستم تنہا

●

میں نے پوچھا، پہلا پتھر مجھ پہ کون اٹھائے گا
دُنیا بولی، سب سے پہلے جو تجھ سے شرمائے گا

پوچھ سکے تو پوچھے کوئی روٹھ کے جانے والوں سے
روشنیوں کو میرے گھر کا رستہ کون بتلائے گا

لوگو میرے ساتھ چلو تم جو کچھ ہے وہ آگے ہے
پیچھے مڑ کر دیکھنے والا پتھر کا ہو جائے گا

میرے بعد وفا کا دھوکا اور کسی سے مت کرنا
گالی دے گی دنیا تجھ کو، سر میرا جھک جائے گا

تہہ خانے میں بند تھا میں اور مجھ پر یہ الزام لگا
سورج کو میں جھانک رہا تھا روشندان کی جالی سے

کس نے دی آواز مجھے اک پیڑ کی سوکھی ڈالی سے
شاید یہ وہ موسم ہے جو بچھڑ گیا ہریالی سے

جاگنے والے تیرے لئے یہ پچھلی رات کا تحفہ ہے
روشنیوں کے پھول اٹھائے ڈھلتے چاند کی تھالی سے

لاکھ وہ سامنے بیٹھا ہے پر ایسی بھی مدہوشی کیا؟
ہوش سنبھال قتیلؔ کہ چائے چھلک رہی ہے پیالی سے

جس میں سورج کا طرفدار ہر اک سایا ہے
میں نے اس شہر میں گھر موم کا بنوایا ہے

بد دعا راہگزاروں کی نہ لگ جائے اسے
اک شجر کاٹنے والا مرا ہمسایا ہے

حالات کے قدموں پہ قلندر نہیں گرتا
ٹوٹے بھی جو تارا تو زمیں پر نہیں گر

گرتے ہیں سمندر میں بڑے شوق سے در
لیکن کسی دریا میں سمندر نہیں گر

سمجھو وہاں پھلدار شجر کوئی نہیں
وہ صحن کہ جس میں کوئی پتھر نہیں گر

کرنا ہے جو سر معرکۂ زیست تو سن
بے بازوئے حیدر درِ خیبر نہیں گر

قائم ہے قتیلؔ اب یہ مرے سر کے ستو
بھونچال بھی آئے تو مرا گھر نہیں گر

وہ بے کلی تھی ابابیل کی اڑانوں میں
کہ سوگوار ہوئے بادل آسمانوں میں

خبر نہیں جنھیں طوفان برق و باراں کی
مزے سے بیٹھے ہیں کاغذ کے شامیانوں میں

نہ جائیں چھوڑ کے خالی بتاؤ لوگوں کو
بلائیں رہتی ہیں اُجڑے ہوئے مکانوں میں

یہ ماضیوں کا یہ مستقبلوں کا ٹکراؤ
مرا زمانہ بٹا ہے کئی زمانوں میں

زمیں پر تو ٹھکانہ کوئی ملا نہ قتیل
گپھا بنائیں گے ہم چاند کی چٹانوں میں

کب سننے دیتی ہے شور سمندر کا!
پانی کی وہ بوند جو مرے کان میں ہے

ٹانک دو اس میں اک مصنوعی تتلی بھی
کاغذ کا جو گلدستہ گلدان میں ہے

شوق تو یہ ہے آج کے فاتح کہلائیں
جنگ ابھی تک ماضی کے میدان میں ہے

کیوں وہاں چھائے جہاں انکی ضرورت ہی نہیں
کاش! بادل یہ برستے کبھی صحراؤں میں

جو بھی آتا ہے بتاتا ہے نیا کوئی علاج
بٹ نہ جائے ترا بیمار مسیحاؤں میں

○

ہاتھ دیا اس نے میرے ہاتھ میں
میں تو ولی بن گیا اک رات میں

مجھ پہ توجہ ہے سب آفات کی
کوئی کشش تو ہے مری ذات میں

ہاتھ میں کاغذ کی لئے چھتریاں
گھر سے نہ نکلا کرو برسات میں

○

بہت ہی چاہتا ہے اس سے ملئے
مگر وہ شخص ہرجائی بہت ہے

پہنچنے کے لئے پار سمندر تک
کشتی کی ایک انگڑائی بہت ہے

○

○

مسخ ہونے سے تو بچا مجھ کو
اے خدا تیرا شاہکار ہوں میں

زندگی ہے خدا کے ہاتھ قتیل
ماورائے صلیب و دار ہوں میں

○

کچھ لوگوں سے جب میری ملاقات نہیں تھی
میں بھی یہ سمجھتا تھا خدا سب سے بڑا ہے

بن سکتا نہیں چاند کسی کا کبھی کھلونا
بچہ مرے اندر کا مگر ضد پہ اڑا ہے

○

نیک بندوں کے ہاتھ آ گئے ہیں
قسمتیں جاگ اٹھیں پتھروں کی

اہلِ ایمان ہیں دست و گریباں
اب ضرورت نہیں کافروں کی

...ہر اپنا ہواؤں کو بنانے والے
...نہ آئیں کے پلٹ کر کبھی جانے والے

...ملے گا تجھے بکھرے ہوئے خوابوں کے سوا
...ت پر چاند کی تصویر بنانے والے

...اس انداز میں کچھ اور حسیں لگتا ہے
...ے منہ پھیر کے غزلیں مری گانے والے

...ب نے پہنا تھا بڑے شوق سے کاغذ کا لباس
...س قدر لوگ تھے بارش میں نہانے والے

...ت بنا دیتے ہیں اب ریت کی دیواروں پر
...ے غافل ہیں نئے شہر بسانے والے

...گئے ہم تو یہ کتبے پہ لکھا جائے گا
...ر گئے آپ زمانے کو جگانے والے

...ر دیوار پہ حسرت سی برستی ہے قتیل
...نے اس دیس گئے پیار نبھانے والے

سب کہتے ہیں اک جنت اتری ہے میری دھرتی پر
میں دل میں سوچوں شاید کمزور مری بینائی ہے

آنے والی فصل سے پہلے گر گئے نرخ ضمیروں کے
پہلا سا ہے قحط نہ اب وہ پہلی سی مہنگائی ہے

آج ہوا معلوم مجھے اس شہر کے چند سیانوں سے
اپنی راہ بدلتے رہنا سب سے بڑی دانائی ہے

توڑ گئے پیمان وفا اس دور میں کیسے کیسے لوگ
یہ مت سوچ قتیل کہ بس اک یار ترا ہرجائی ہے

○

جب بھی چاہیں اک نئی صورت بنا لیتے ہیں لوگ
ایک چہرے پر کئی چہرے سجا لیتے ہیں لوگ

ہو خوشی بھی ان کو حاصل یہ ضروری تو نہیں
غم چھپانے کے لیے بھی مسکرا لیتے ہیں لوگ

اس قدر نفرت ہے ان کو تیرگی کے نام سے
روزِ روشن میں بھی اب شمعیں جلا لیتے ہیں لوگ

یہ بھی دیکھا ہے کہ جب آ جائے غیرت کا مقام
اپنی سولی اپنے کاندھے پر اٹھا لیتے ہیں لوگ

روشنی ہے ان کا ایماں روک مت ان کو قتیل
دل جلاتے ہیں یہ اپنا تیرا کیا لیتے ہیں لوگ

○

○

مری خوشیاں بھی ان دیکھی میرے غم بھی ان دیکھے
جنگل کے پھولوں کا یارو کیا کھلنا کیا مرجھانا

میں نہیں تیری بزم کے لائق تو شاید سچ کہتا ہے
اچھا جاؤں تو خوش ہولے میں پاگل میں دیوانہ

پھولوں کی مانند کھلے تھے ماضی میں دو پیار مرے
آج ملک منسوب ہے مجھ سے اک بانو اک سلطانہ

○

سخی ضرور ہے وہ لیکن اے گدا تو نے
کٹے ہوئے مرے دستِ طلب نہیں دیکھے

کسی حسیں کی تجھے بددعا لگی ہوگی
قتیل تو نے یہ دن بے سبب نہیں دیکھے

○

دینے والے میرے دیس کی دھرتی کو خوشحالی دے
باغوں کو پھل پھول عطا کر کھیتوں کو ہریالی دے

مولا مجھ کو ڈال دے اپنے درویشوں کے رستے پر
اس کا بھی میں برا نہ مانوں جو نت مجھ کو گالی دے

جو اپنی اولاد سے بڑھ کر سمجھے پودوں پیڑوں کو
آنے والے موسم میں اس باغ کو ایسا مالی دے

صدیوں جھلسایا ہے جسکو پیلی گرم دوپہروں نے
اس دہقان کے چہرے کو اب شنگرف جیسی لالی دے

ساری دنیا تیرے ذمے دنیا کی ہر چیز تری
مجھ کو تو بس ایک مرے کردار کی تو رکھوالی دے

بڑا نہ آخر بن بیٹھے وہ ہم سے چھوٹے لوگوں میں
جس کو رتبہ دیا ہے تو نے ظرف بھی اس کو عالی دے

یوں تو لکھتا ہی رہتا ہے نظمیں غزلیں گیت قتیلؔ
اسے کوئی تخلیق ہمیشہ زندہ رہنے والی دے

وہ پھول ہے اور خوشبوؤں میں پلا ہوا ہے
وہ جب کھلا تو کئی رتوں کا بھلا ہوا ہے

دمک رہا ہے کچھ ایسے وہ میرے بازوؤں میں
کسی کٹھالی میں سونا جیسے گلا ہوا ہے

جہاں سنائی نہ دے کسی کو کسی کی آہٹ
وہیں سے پیدا ہر اک بڑا زلزلہ ہوا ہے

○

سخن بریدہ زباں کا بدل ہی باقی ہے
وضاحتوں کے لیے اب غزل ہی باقی ہے

مکاں بچا نہ کوئی بارشوں کی شدت سے
کہیں کہیں کوئی اونچا محل ہی باقی ہے

○

نیند سے خالی آنکھوں میں، رات گئے تک لہرائے جگنو، جنگل اور سائے
ماضی کی سب تصویریں، لے کر میرے پاس آئے جگنو، جنگل اور سائے

نیلے پربت کے نیچے، رنگ بھری اک وادی تھی، اس میں اک شہزادی تھی
اس شہزادی کی باتیں، کرتے ہوئے کچھ گھبرائے، جگنو، جنگل اور سائے

○

جب وہ بچ نکلے تو پانی میں مجھے پھینک دیا
کود کر میں نے جو دریا میں بچائے کچھ لوگ

کام کے لوگ وطن میں بھی نہیں تھے کمیاب
پھر بھی کچھ لوگوں نے باہر سے منگائے کچھ لوگ

○

کیا عجب ان کا بھی اک دن غازیوں میں ہو شمار
لے کے جو اپنی ہتھیلی پر ہمارا سر گئے

●

نیند کے گہرے سمندر میں جہاں غرقاب تھا
ایک میں ساحل پہ تھا، سو ماہیِ بے آب تھا

اُس نے جھٹکا اپنی بھیگی زلف کو اور اُس کے بعد
دُور تک پھیلا ہوا سایوں کا اِک سیلاب تھا

عمر گزری ساحلوں پر سیپیاں چنتے ہوئے
جس میں گوہر بھی ہو کوئی، وہ صدف نایاب تھا

میری کشتی کے لئے آغوش پھیلائے ہوئے
یا خدا کی ذات تھی یا حلقۂ گرداب تھا

خواب کی مانند مجھ کو یاد آتا ہے قتیلؔ
دل کا یہ صحرا کبھی اک قریۂ شاداب تھا

●

جب اپنے اعتماد کے محور سے ہٹ گیا
میں ریزہ ریزہ ہو کے حریفوں میں بٹ گیا

دشمن کے تن پہ گاڑ دیا میں نے اپنا سر
میدانِ کارزار کا پانسہ پلٹ گیا

تھوڑی سی اور زخم کو گہرائی مل گئی
تھوڑا سا اور درد کا احساس گھٹ گیا

درپیش اب نہیں ترا غم کیسے مان لوں
کیسا تھا وہ پہاڑ جو رستے سے ہٹ گیا

اپنے قریب پاکے معطر سی آہٹیں!
میں بارہا سسکتی ہوا سے لپٹ گیا

جو بھی ملا سفر میں کسی پیڑ کے تلے!
آسیب بن کے مجھ سے وہ سایا چمٹ گیا

لٹتے ہوئے عوام کے گھر بار دیکھ کر!
اے شہر یار! تیرا کلیجہ نہ پھٹ گیا

رکھے گا خاک ربط وہ اس کائنات سے
جو ذرّہ اپنی ذات کے اندر سمٹ گیا

چوروں کا احتساب نہ اب تک ہوا قتیلؔ!
جو ہاتھ بے قصور تھا، وہ ہاتھ کٹ گیا

○

سارے شہر کو چونکا یا یہ کام دکھا کر ہم نے
شہرت پائی دیواروں پر نام لکھا کر ہم نے

معذرتوں کی زحمت سے محفوظ کیا یاروں کو
اپنے ساتھ اکیلے اپنی شام منا کر ہم نے

سازش کے اس دور میں لیتا جنم قتیل اگر وہ
مار دیا ہوتا غالب کو آم کھلا کر ہم نے

○

بارشِ خونِ شہیداں سے وہ آئے گی بہار
ساری دھرتی ہمیں گلرنگ دکھائی دے گی

راز میں رہ نہ سکے گی کوئی اظہار کی لے.
اک نہ اک صورتِ آہنگ دکھائی دے گی،

○

وہ صرف جسم ہی نہیں احساس بھی تو ہے
راتوں میں چاند بن کے نکلتا بھی دیکھ اسے

○

توڑ کر خواب دلربا چپ چاپ
جانے والا چلا گیا چپ چاپ

بات کرتا رہا وہ آنکھوں سے
میں اسے دیکھتا رہا چپ چاپ

ذکر سن کر اداس جنگل ، کا
کوئی دیوانہ رو دیا چپ چاپ

طاقِ جاں میں قتیل آخرِ شب
جل رہا ہے بس اک دیا چپ چاپ

○

دل کی تنہائی کا مجھ کو خود ہی اندازہ نہیں
یہ اک ایسا گھر ہے جس کا کوئی دروازہ نہیں

ایک سے حالات لیتے ہیں جنم ہر دور میں
کون کہتا ہے قتیل اپنی غزل تازہ نہیں

○

●

ہنسنے کو ہے قحط آنسوؤں کا!
ہم وقت سے پہلے کیوں نہ رولیں

ہجر ایک طویل رَت جگا ہے
بہتر ہے کہ تھوڑی دیر سولیں

●

لوگوں میں احتیاط کا پیکر بنا رہا
وہ میرا نام سُن کے بھی پتھر بنا رہا

حالات بار بار مٹاتے نہیں کیسے؟
میں ساری عمر حرفِ مکرّر بنا رہا

●

اپنی سانس مِلادی اُس نے آج ہماری سانسوں میں
اب شاید دو چار برس ہم بھی جی لیں

●

اب میرے دل کی راہ سے ہوتا ہے یوں اُس کا گزر
جیسے چلے بادِ صبا، خوشبو کی چادر اوڑھ کر

دیکھو تو ایک چہرہ ہے وہ، سوچو تو سامانِ سخن
گاہے غزل۔ گاہے سبو۔ گاہے کلی۔ گاہے قمر

●

یقیں تھا شیخ کو جنت میں جام کھنکیں گے
اِسی خوشی میں وہ پیاسا ہی مرگیا ہوگا

سُنا ہے لُٹ گئے رستے میں قافلے والے
ضرور ساتھ کوئی راہ بر گیا ہوگا

چراغ رکھ کے ہتھیلی پہ جو ہوا سے لڑا!
وہ اپنے آپ کو روشن تو کرگیا ہوگا

●

شام کے سانولے چہرے کو نکھارا جائے!
کیوں نہ ساغر سے کوئی چاند ابھارا جائے

راس آیا نہیں تسکیں کا ساحل کوئی
پھر مجھے پیاس کے دریا میں اُتارا جائے

اب مرے شہر میں آئے گی سواری کس کی
اب کس امید پہ راہوں کو سنوارا جائے

●

نئے اک شہر کو صبحِ سفر کیا لے چلی مجھ کو
صدائیں دے رہی ہے ایک چھوٹی سی گلی مجھ کو

●

لقمہ اٹھاؤں جب بھی میں، وہ آ کھڑا ہو سامنے
روتا بلکتا بھوک سے، بچہ مرے ہمسائے کا

اے زندگی کی لذتو، میں کیا کروں یہ محتسب
یوں راہ میں حائل رہے، کوٹھے پہ جیسے نایکہ

●

جو تیرے پیار کا سودا سروں میں رکھتے ہیں
وہ اپنا کانچ سا دل پتھروں میں رکھتے ہیں

سدا اُڑان کی دولت ملا نہیں کرتی
سنبھال کر اسے پنچھی پروں میں رکھتے ہیں

کسی غریب کا گھر جن سے جگمگا اُٹھتا
جلا کے ہم وہ دیئے مقبروں میں رکھتے ہیں

قتیل جتنے بھی ہیں مصلحت کے سوداگر
وہ زندگی کو چھپا کر گھروں میں رکھتے ہیں

●

وہ مجھ سے دُور تھا، میں پھر بھی لڑکھڑا سا گ
خمار بن کے بدن میں اُتر رہا تھا کو

●

اُداس اُداس چاندنی کے زرد زرد رنگ سے
بنا کشانِ انتظار بھی حسیں رنگ رنگ سے

چمن چمن گلاب د نیا سمن کی یہ کشور یاں
نظر کے آس پاس بج رہے ہیں جلترنگ سے

ترے جمال کی پھوار پڑ رہی ہے ذہن پر
لہک رہی ہے فکر تیرے پیرہن کے رنگ سے

غرورِ حُسن سے نہیں سرورِ دلبری سے ہے
یہ پھوٹتا ہوا شباب تیرے انگ انگ سے

فسردگی نے رنگ ہی بدل دیا مزاج کا!
بِلا کچھ اور آ گئی اس آئینے پہ زنگ سے

یہ برق حادثوں کی سرحدوں پہ کوندتی ہوئی
مشابہت ہے کس قدر اسے مری اُمنگ سے

قتیلؔ اپنی ٹھوکروں میں لعلِ شب چراغ تھا
ملی نیائے رھگذر مجھے شرار سنگ سے

حلقۂ زنجیر میں پیدا صدا ہم سے ہوئی
یہ وہ نغمہ ہے کہ جس کی ابتدا ہم سے ہوئی

ہم نے پہلی بار ہی توڑے نہیں طوقِ ستم
یہ خطا اے وحشتِ دل بارہا ہم سے ہوئی

سُن رہا ہے اک جہاں شورِ سلاسل آجکل
اس چمن کی سرزمیں نغمہ سرا ہم سے ہوئی

کون اُٹھاتا ہے نقابِ روئے جاناں اے قتیلؔ
یہ قیامت بھی سرِ محفل بپا ہم سے ہوئی

حادثے پھیل گئے سایۂ مژگاں کی طرح
غمِ دوراں بھی ملا ہے غمِ جاناں کی طرح

لاکھ پیوند امیدوں نے لگا رکھے ہیں
دل کی صورت نظر آتی ہے گریباں کی طرح

اور ہوں گے وہ میسر ہے جنھیں لطفِ بہار
ہم تو گلشن میں بھی رہتے ہیں بیاباں کی طرح

جنھیں دیکھ کر زمانہ میرا نام لے رہا تھا
وہ نشان مٹ چکے ہیں تری خاک رہگذر سے
مجھے کیا زیب دیگا مری دھڑکنوں کا جادو
یہ صدا تو آرہی ہے کسی دُور کے نگر سے

حکایاتِ لب و رخسار سے آگے نہیں جاتے
وہ نغمے جو تمہارے پیار سے آگے نہیں جاتے
گدائے ذات کیا جانیں نوائے کائنات اے دل
یہ وہ منصور ہیں جو دار سے آگے نہیں جاتے
عجب اہلِ سماعت ہیں جو زنجیروں سے گھبرا کر
تری پازیب کی جھنکار سے آگے نہیں جاتے

●

زلفوں میں اڑانیں بھنوروں کی چہرے پر نور کا تڑکا ہے
کس شان کی ظلمت چھائی ہے، کس قہر کا شعلہ بھڑکا ہے

جب برق گری تھی آنکھوں پر اب قلب و جگر کی خیر نہیں
ہاتھوں میں سنہرا تیر لیے پھر تاک میں اندھا لڑکا ہے

دیکھا تو خوشی کے پھول کھلے سوچا تو غموں کی دھول اڑی
کہتے ہیں بہاراں لوگ جسے وہ اک سایہ پت جھڑ کا ہے

●

حالات کی اُجڑی محفل میں اب کوئی سلگتا ساز نہیں
نغمے تو لپکتے ہیں لیکن شعلوں سا کہیں انداز نہیں

چھلکے نہ سبو اور سموم اُٹھیں قطرہ نہ ملے اور پیاس بجھے
یہ طرز ہم پینے والوں کا ساقی کا کوئی اعجاز نہیں

اے صحن چمن کے زندانی کر جشن طرب کی تیاری
بجتے ہیں بہاروں کے کنگن زنجیر کی یہ آواز نہیں

●

ہو چکا انتظار سونے دے
اے دلِ بے قرار سونے دے

مٹ گئیں رونقیں چراغوں کی
لٹ گئے رہگذار سونے دے

آہٹوں کے فریب میں مت آ
ان کا کیا اعتبار سونے دے

پی لئے آنسوؤں کے جام بہت
ٹوٹتا ہے خمار سونے دے

اونگھتا ہے اداس پیڑوں پر
چاندنی کا غبار سونے دے

●

خرد کے نام جنوں کا پیام لے کے چلے
ہم اپنے ساتھ ہی اپنا مقام لے کے چلے

اٹھا دئے ہیں کسی نے بہار پر پہرے
صبا چلے بھی تو اذنِ خرام لے کے چلے

خدا کے نام سے واقف ہر ایک راہ نہ تھی
کبھی کبھی تو ہم اپنا بھی نام لے کے چلے

فریب کھا ہی گئے اہلِ جستجو آخر!
چراغ ڈھونڈنے آئے تھے شام لے کے چلے

قتیلؔ جن سے پریشاں ہیں طائرانِ حرم
وہ پھر سے دانۂ ہمرنگ دام لے کے چلے

•

حسن ہو وہ پیمانہ جس کی ایک گردش سے
آدمی کا سایہ بھی لڑکھڑانے لگتا ہے

جام جب کھنکتے ہیں رات بھر سرِ محفل
کون جانے غم اپنا کس گھڑی کانپنے لگتا ہے

یوں ترے بغیر اے دوست چاندنی چھٹکتی ہے
جیسے کوئی راہوں میں خاک اڑانے لگتا ہے

جب کوئی سناتا ہے داستاں بہار دنکی
ہم کو اپنا پیراہن یاد آنے لگتا ہے

•

شکم نے دل کی حقیقت بھی کھول دی آخر
مقام رزق سے آگے کوئی مقام نہیں

اگر حیات ہے باقی تو کائنات بھی ہے
ہمیں نہ ہوں تو کسی چیز کو دوام نہیں

بجائے بارِ عمل کیوں اٹھائیں دستِ دعا
مقابلہ ہے بشر سے، خدا سے کام نہیں

ہمیں بھی دانۂ گندم نے کر دیا رسوا
اگرچہ دہر میں جنّت کا اہتمام نہیں

پھول پہ دھول، ببول پہ شبنم، دیکھنے والے دیکھتا جا
اب ہے یہی انصاف کا عالم، دیکھنے والے دیکھتا جا

جام بہ جام لگی ہیں مہریں میخانوں پر پہرے ہیں
روتی ہے برسات چھما چھم دیکھنے والے دیکھتا جا

اس نگری کے راج دلارے ایک طرح کب رہتے ہیں
ڈھلتے سائے بدلتے موسم دیکھنے والے دیکھتا جا

ایک پرانا مدفن جس میں دفن ہیں لاکھوں امیدیں
چھلنی چھلنی سینۂ آدم دیکھنے والے دیکھتا جا

ایک ترا ہی دل نہیں گھائل درد کے مارے اور بھی ہیں
کچھ اپنا کچھ دنیا کا غم دیکھنے والے دیکھتا جا

●

بنا رہا ہے ضمیر اپنی چشمِ حیراں کو!
اب آئینے کی ضرورت نہیں ہے انساں کو

بدل گئی ہیں حیا کی روایتیں شاید
ہوس بھی شرم دلاتی ہے جسمِ عریاں کو

بہت گراں نہیں خونِ بشر کے بدلے میں
کوئی تو آج خریدے گا جنسِ ایماں کو

سمٹ رہی ہے کچھ ایسے بہار اب کے برس
چھپائے جیسے دلہن اپنے روئے تاباں کو

یوں ہی فدا نہیں اس پر نگارِ مستقبل
ذرا قریب سے دیکھو جمالِ زنداں کو

قتیلؔ اہلِ حرم ہیں نظر جھکائے ہوئے
کس احترام سے بیچا گیا ہے یزداں کو

●

پیار کو روگ بنانے والے پیار کو سمجھا تو نے کھیل
ہو جاتی ہے چھلنی پیارے کیکر پر انگور کی بیل!

کون کرے گا اب اجیارا، لمبی ہے برہا کی رات
سوکھ گئے آنکھوں میں آنسو، ختم ہوا دیپک میں تیل

●

تدبیر بھی ہے دیگر جہاں تقدیر وہاں لے آئی ہے
تم پاس رہو، یا دور بسو، ہر حال میں اب رسوائی ہے

ہر رات وہ جی بہلانے کو آتے ہیں خیالوں میں لیکن!
کیا تم کو بتاؤں دل والو! تنہائی پھر تنہائی ہے

تم لاکھ چھپاؤ سینے میں احساس ہماری چاہت کا
دھڑکن سے تمہارا پیار وہاں آواز یہاں تک آتی ہے

دن جلتا ہے شام سویرے
ایک چراغ اور لاکھ اندھیرے

لوگ سمجھتے ہیں سودائی
پیار نے اپنے بھی دن پھیرے

تو ہی بتا یہ درد ہے کیسا
پلکیں میری آنسو تیرے

●

لگی ہوئی ہیں ضمیرِ حیات پر مُہریں
کسی میں جرأتِ اظہار بھی نہیں باقی

کبھی کبھی جو رگِ جاں سے پھوٹ پڑتا تھا
وہ نغمۂ رسن و دار بھی نہیں باقی

ہمیں تو کفر کا طعنہ دیا تھا واعظ نے
حرم میں اب کوئی دیندار بھی نہیں باقی

گنگناتی سی کوئی رات بھی آجاتی ہے
آپ آتے ہیں تو برسات بھی آجاتی ہے

آرزوؤں کے جنازے ہی نہیں پلکوں پر
بجلیوں کی کبھی بارات بھی آجاتی ہے

وہ فسانے جو ترے نام سے منسوب ہوئے
ان فسانوں میں تری بات بھی آجاتی ہے

●

یہ بھی انداز ہیں بادِ مخالف کہ نہ ہو
دِل اُڑا جاتا ہے اور رنگ تتلیاں کی طرح

نہ کوئی ساز نہ سنگیت نہ پازیب نہ گیت
اُف یہ ماحول کہ ہے شہرِ خموشاں کی طرح

پہلے مزاجِ راہ گزر جان جائیے
پھر گردِ راہ جو بھی کہے مان جائیے

کچھ بے ریا اگر ہے تو دربانِ میکدہ
دیر و حرم میں بے سر و سامان جائیے

کچھ کہہ رہی ہیں آپ کے سینے کی دھڑکنیں
میرا نہیں تو دل کا کہا مان جائیے،

اک دھوپ سی جمی ہے نگاہوں کے آس پاس
یہ آپ ہیں تو آپ پہ قربان جائیے!

شاید حضور سے کوئی نسبت ہمیں بھی ہو
آنکھوں میں جھانک کر ہمیں پہچان جائیے

اپنی غزل قتیل وہ کوئل کی کوک ہے
جس کی تڑپ کو دور سے پہچان جائیے

چمن چمن فریبِ رنگ و بو ہے اور کچھ نہیں
بس اک جمالِ خام چار سو ہے اور کچھ نہیں

قفس میں آشیاں کا نام سن کے مطمئن نہ ہو
یہ باغباں کا حسنِ گفتگو ہے اور کچھ نہیں

خمار ہے کہاں کہ دل کی تشنگی بجھائیے
اس انجمن میں سایۂ سبو ہے اور کچھ نہیں

تمھیں گلوں کی بے بسی میں حسن کی تلاش ہے
یہ جستجو برائے جستجو ہے اور کچھ نہیں

کھٹک رہی ہے جو ابھی ضمیرِ کائنات میں
لٹی ہوئی بشر کی آبرو ہے اور کچھ نہیں

ہم اپنے دل کی دھڑکن کو بنا کر رازدار اپنا
ترے غم میں کیا کرتے ہیں اکثر انتظار اپنا

اگر دل ہے تو کلیوں کی اُداسی پر بھی تڑپے گا
اگر ہم ہیں تو ہوگا جاں نثاروں میں شمار اپنا

ترے قدموں پہ لا ڈالا اگر دل نے دفینہ اپنا
محبت کو زمانہ سونپ دے گا اختیار اپنا

جہانِ آرزو میں منزلِ راحت اُنہی کی ہے
نچھاور کر دیا ہے جس پہ راہوں نے غبار اپنا

نہ جانے کونسی منزل پہ آ پہنچا ہے پیار اپنا
نہ ہم کو اعتبار اُن کا، نہ اُن کو اعتبار اپنا

کلیوں کی نیم بسمل زندگی کا رقص جاری ہے
چمن والو! چمن میں دیکھ لو جشنِ بہار اپنا

●

تمناؤں کو سینے سے جُدا ہونے نہیں دیتی
محبت دردسے ناآشنا ہونے نہیں دیتی

اگر آنکھوں کے پردے میں کوئی نغمہ سلامت ہو
تو خاموشی نظر کو بے صدا ہونے نہیں دیتی

مرے غم کو وفا کے آئینے میں دیکھنے والے
بس اک ضد ہے کہ توہینِ وفا ہونے نہیں دیتی

وہ تنہائی جسے تیرے تصور کا بھرم سا ہو
شبِ غم بھی سحر کی ابتدا ہونے نہیں دیتی

تمہیں کہہ دو وہ دیوانے کہاں سر پھوڑنے جائیں
جنہیں رسوا تمہاری خاکِ پا ہونے نہیں دیتی

●

حالات سے خوف کھا رہا ہوں
شیشے کے محل بنا رہا ہوں

سینے میں مرے ہے موم کا دل
سورج سے بدن چھپا رہا ہوں

دریائے فرات ہے یہ دنیا
پیاسا ہی پلٹ کے جا رہا ہوں

ہے شہر میں قحط پتھروں کا
جذبات کے زخم کھا رہا ہوں

آیا نہ قتیل دوست کوئی
سایوں کو گلے لگا رہا ہوں

●

نہیں دھڑکا مجھے رسوائیوں کا!
سفر درپیش ہے تنہائیوں کا

چھپا بیٹھا ہوں اپنی خامشی میں
گیا موسم وہ بزم آرائیوں کا

ذرا دیکھو مرے دل میں اتر کر
سمندر نام ہے گہرائیوں کا

قریب آتے گئے وہ جیسے جیسے
بھرم کھلتا گیا دانائیوں کا

قتیل آنکھوں میں ہے تصویر یوسف
کرم مجھ پر بھی ہے کچھ بھائیوں کا

کیا لیجئے کام چشمِ تر سے !
پانی تو گذر گیا ہے سر سے

ہر سمت ہیں درد کے جزیرے
دیکھو تو ذرا نکل کے گھر سے

دریاؤں میں پیاس خیمہ زن ہے
ہر موج بلا سکوں کو ترسے

اُڑتا نہیں بھاپ بن کے پانی
اے کاش کہیں سے آگ برسے

دلیل ہے گواہی ابرِ رحمت
ناراض خدا نہیں بشر سے

آئی تھی کہیں سے زرد آندھی
پھل توڑ کے لے گئی شجر سے

کچھ پاؤں کٹے ہوئے ملے ہیں
گذرا ہوں میں جس بھی رہگذر سے

کرتی ہے یہ دل جلوں کو پاگل
میں سو گیا چاندنی کے ڈر سے

جاتا ہے جو پانیوں کی تہہ تک
پتھر کوئی باندھ لو کمر سے

پانی نے ڈسا قتیل جن کو
پیاسے وہ چلے تھے کس نگر سے

رستے یاد نہیں راہنما یاد نہیں
اب مجھے کچھ تری گلیوں کے سوا یاد نہیں

پھر خیالوں میں وہ بھیگے ہوئے ساون آئے
لیکن اب تجھ کو پپیہے کی صدا یاد نہیں،

ایک وعدہ تھا جو شیشے کی طرح ٹوٹ گیا
حادثہ کب یہ ہوا کیسے ہوا یاد نہیں

ہم دیا کرتے تھے اغیار کو طعنہ جن کا
اب تو ہم کو بھی وہ آدابِ وفا یاد نہیں

وضع داری سے ہے مجبور مرا پیار قتیل
سب پرانے ہیں کوئی داغ نیا یاد نہیں

●

ترا چہرہ تجھی سے کیوں نہاں ہے
سکندر! تیرا آئینہ کہاں ہے

کروں تقلیدِ ساعت کی تلافی!
ابھی اب مصرفِ شورِ اذاں ہے

مکمل کر چکا میں فردِ عصیاں
خداوندا! ترا اب امتحاں ہے

اداسی دے رہی ہے جس پہ دستک
بھری بستی میں یہ کس کا مکاں ہے

قتیل اس شخص کا ہے نام یارو
جو ماضی کا سجیلا نوجواں ہے

●

گاتے ہوئے پیڑوں کی خنک چھاؤں سے تنگ نکل آئے
ہم دھوپ میں جلنے کو ترے گاؤں سے آگے نکل آئے

تھے ہم بھی گنہگار پر اک زاہدِ مکّار کی ضد میں
بازار میں بکتی ہوئی سلماؤں سے آگے نکل آئے

بکتی رہی اک دنیا قتیل اپنی خریدار مگر ہم
یوسف نہ بنے اور زلیخاؤں سے آگے نکل آئے

●

نئے موسم بڑے بے درد نکلے
ہرے پیڑوں کے پتے زرد نکلے

وہ اک عورت کی خاطر لڑ رہے ہیں
مرے احباب پورے مرد نکلے

جو بیت گئی اس کی خبر ہے کہ نہیں ہے
دیکھو مرے تن پر مرا سر ہے کہ نہیں ہے

یاروں کو بہت پیارا ہے زندانِ وفا سے
لیکن کسی دیوار میں در ہے کہ نہیں ہے

ملتی ہو ضیا جس کو چراغوں کی لوؤں سے
اِس شہر میں ایسا کوئی گھر ہے کہ نہیں ہے

ٹوٹی ہوئی مسجد میں کھڑا دیکھ رہا ہوں
محفوظ شوالے کا گجر ہے کہ نہیں ہے

کیوں تیرا گریباں ہے قتیلؔ اب بھی سلامت
کچھ تجھ پہ نئی رُت کا اثر ہے کہ نہیں ہے

تلخ لفظوں میں شیرینیاں گھول کر دل دکھانا مگر تم بھی سچ بول کر
میں تو کر لوں گا تسلیم اُن کا بھی حق جو ہوس کار اہلِ نظر ہو گئے

بند ہے زندگی جبر کے خول میں کیا جئیں ہم قتیلؔ ایسے ماحول میں
جس قدر چپ تھے ان کو دولت ملی جتنے کم ظرف تھے معتبر ہو گئے

مری نظر سے نہ ہو دُور ایک پل کے لئے
ترا وجود ہے لازم مری غزل کے لئے

سدا جئے یہ مرا شہرِ بے مثال، جہاں
ہزار جھونپڑے گرتے ہیں اک محل کے لئے

●

تمام شہر ہی خانہ خراب جیسا ہے
مرے لہو کا نشہ بھی شراب جیسا ہے

نہار رہا ہوں میں اس کے بدن کی کرنوں میں
وہ آدمی ہے مگر ماہتاب جیسا ہے

کروں تلاش جواہر تو ریت ہاتھ آئے
سمندروں کا چلن بھی سراب جیسا ہے

جلا گیا مجھے اپنے بدن کی ٹھنڈک سے
وہ جس کا رنگ دہکتے گلاب جیسا ہے

قتیلؔ کام و دہن اپنا ساتھ دیں کہ نہ دیں
وفا کا ذائقہ لیکن ثواب جیسا ہے

●

بن قتل کے برہنہ جسے دُنیا نے کیا ہے
اُس درد نے اب میرا بدن اوڑھ لیا ہے

میں ریت کے دریا پہ کھڑا سوچ رہا ہوں
اس شہر میں پانی تو یزیدوں نے پیا ہے

اے گورکنو! قبر کا دے کر مجھے دھوکا
تم نے تو خلاؤں میں مجھے گاڑ دیا ہے

میں صاحبِ عزّت ہوں، مری لاش نہ کھولو
دستار کے پُرزوں سے کفن میں نے سیا ہے

پھیلا ہے ترا کرب قتیلؔ آدھی صدی پر
حیرت ہے کہ تو اتنے برس کیسے جیا ہے

●

کیسے کیسے بھید چھپے ہیں پیار بھرے اقرار کے پیچھے
کوئی پتھر تان رہا ہے شیشے کی دیوار کے پیچھے

دل میں آگ لگا جاتا ہے یہ بے بہار کا موسم
ایک تپش بھی ہوتی ہے اس ٹھنڈی ٹھار پھوار کے پیچھے

کون لگائے کھوج کسی کا خود غرضی کے اس جنگل میں
ملتا ہے انسان یہاں پر لیکن ایک ہزار کے پیچھے

تیرا تو اک دل ٹوٹا ہے یار قتیل اداس نہ ہو تو
لوگ تو جان بھی دے دیتے ہیں پیارے اپنے یار کے پیچھے

●

●

تہہ میں جو رہ گئے، وہ صدف بھی نکالئے
طغیانیوں کا ہاتھ سمندر میں ڈالئے

اپنی حدوں میں رہیئے کہ رہ جائے آبرو
اوپر جو دیکھنا ہے تو پگڑی سنبھالئے!

صدیوں کا فرق پڑتا ہے لمحوں کے پھیر میں
جو غم ہے آج کا، اسے کل پر نہ ٹالئے

آیا ہی تھا ابھی مرے لب پر وفا کا نام
کچھ دوستوں نے ہاتھ میں پتھر اٹھا لئے

کہہ دو صلیبِ شب سے کہ اپنی منائے خیر
ہم نے تو پھر چراغ سروں کے جلا لئے

محسوس ہو رہا ہے کچھ ایسا مجھے قتیل
نیندوں نے جیسے آج کی شب پر لگا لئے

●

یہ معجزہ بھی محبت کبھی دکھائے مجھے
کہ سنگ تجھ پہ گرے اور زخم آئے مجھے

میں اپنے پاؤں تلے روندتا ہوں سائے کو
بدن مرا ہی سہی، دوپہر نہ بھائے مجھے

بہ رنگِ عود ملے گی اسے مری خوشبو
وہ جب بھی چاہے بڑے شوق سے جلائے مجھے

میں گھر سے تیری تمنا پہن کے جب نکلوں
برہنہ شہر میں کوئی نظر نہ آئے مجھے

وہی تو سب سے زیادہ ہے نکتہ چیں میرا
جو مسکرا کے ہمیشہ گلے لگائے مجھے

میں اپنے دل سے نکالوں خیال کس کس کا
جو تو نہیں تو کوئی اور یاد آئے مجھے

زمانہ درد کے صحرا تک آج لے آیا
گزار کر تری زلفوں کے سائے سائے مجھے

وہ میرا دوست ہے سارے جہاں کو ہے معلوم
دغا کرے وہ کسی سے تو شرم آئے مجھے

وہ مہرباں ہے تو اقرار کیوں نہیں کرتا
وہ بدگماں ہے تو سو بار آزمائے مجھے

میں اپنی ذات میں نیلام ہو رہا ہوں قتیلؔ
غمِ حیات سے کہہ دو خرید لائے مجھے

●

وہ جب سے گیا، شہر میں ہے قحطِ رقیباں
اس شہر کی رونق تھی اسی شخص کے دم سے

انجام ہے اس پیار کا اک حرفِ ندامت
آغاز ہوا جس کا ترے قول و قسم سے

لوگ آتے رہے کانچ کا ملبوس پہن کر
افسوس کہ پتھر بھی نہ مارا گیا ہم سے

کی جب سے قتیلؔ اس نے مئے ناب سے توبہ
میخانے کا میخانہ ہے ناراض قدم سے

کچھ دن سے قتیلؔ اس کی مجھے آس لگی ہے
اترے جو غزل بن کے مرے ذہن پہ چھم سے

●

دُنیا کو یہ کمال بھی کر کے دِکھایئے
میری جبیں پہ اپنا مقدر سجایئے

میں چاندنی میں گوندھ کے لایا ہوں رات کو
اب آپ اس سے کوئی سویرا بنایئے

سب نے کئے ہیں مجھ پہ جفاؤں کے تجربے
اِک بار آپ بھی تو مجھے آزمایئے

شاید چھپا ہو اس میں کہیں نام آپ کا
دُنیا سے چھُپ کے میری غزل گنگنایئے

اس روپ میں تو آپ کو پہچانتا ہوں میں
چہرے پہ اب نیا کوئی چہرہ سجایئے

●

تو ہمیں جب کبھی یاد آئے
چیت کی چاندنی یاد آئے

بھولنا چاہا اِک آشنا کو
سینکڑوں اجنبی یاد آئے

کیا ہوئیں جگنوؤں سی وہ آنکھیں
رات برسات کی یاد آئے

جب کروں میں زمانے کا شکوہ
بھول اپنی کوئی یاد آئے

دیکھ کر موسلا دھار بارش
اپنی تشنہ لبی یاد آئے

حق تو بچھڑے ہوؤں کا ہے، لیکن
اِک نیا شخص بھی یاد آئے

تھا قتیل آخری دوست اپنا
وہ بھلا آدمی یاد آئے

●

اِس دور میں توفیقِ انا دی گئی مجھ کو
کِس جرم کی آخر یہ سزا دی گئی مجھ کو

یہ کون مرے نام کو دہرا سا رہا ہے
شاید کسی گنبد میں صدا دی گئی مجھ کو

وہ اُن کا بُلانا مجھے اک صاحبِ زر سے
اوقات مری یاد دلا دی گئی مجھ کو

کچھ نام لکھے ہی تھے ابھی میرے قلم نے
کاغذ کی طرح آگ لگا دی گئی مجھ کو

گم ہو گیا مستی میں تڑپنے کا مزا بھی
کیا چیز قتیلؔ آج پلا دی گئی مجھ کو

جب میں نے کیا فصلِ بہاراں کا تقاضہ
اک پھول کی تصویر دکھا دی گئی مجھ کو

●

کیا کچھ ہونے والا ہے، یہ تم کو نہیں اندازہ
شہر کے لوگو! کھلا نہ رکھنا کوئی بھی دروازہ

جس کے ہاتھ میں خنجر ہوگا وہی بنے گا مُنصف
یوں ہم اپنی فریادوں کا بُھگتیں گے خمیازہ

سو سو بار یہاں سب کو مصلوب کیا جائے گا
اِک اِک شخص کا نکلے گا اب سو سو بار جنازہ

پہنائیں گے مُلّا قاضی صرف اسے زنجیریں
جس کے تن پر زخم نظر آئے گا تازہ تازہ

●

مُجھ میں کم ظرفیِ احساس نہیں ہے یارو
ورنہ آرام کسے راس نہیں ہے یارو

گر ملے آبِ بقا بھی تو اکیلا نہ پیئوں
پیاس اب صرف مری پیاس نہیں ہے یارو

مُجھ کو جینا ہے تو پھر کیسے رہوں تم سے الگ
زندگی ہے، کوئی بن باس نہیں ہے یارو

اس کی تصویر لیے بیٹھا ہے آنکھوں میں قتیلؔ
جس کے ملنے کی کوئی آس نہیں ہے یارو

●

یہ بات پھر مجھے سُورج بتانے آیا ہے
ازل سے میرے تعاقب میں میرا سایا ہے

میں لازوال تھا مِٹ مِٹ کے پھر اُبھرتا رہا
گنوا گنوا کے مجھے زندگی نے پایا ہے

ملی ہے اُس کو بھی شہرت قتیلؔ میری طرح
جب اُس نے اپنے لبوں پر مجھے سجایا ہے

●

جانچ پرکھ کر دیکھ چکی تو ہر منہ بولے بھائی کو
کہنے دے اب کوئی سچی بات قتیلؔ شفائی کو

شہرت چاہے کیسی بھی ہو لوگ توجہ دیتے ہیں
لاکھ حسیں ملتے ہیں اب تک مجھ جیسے ہرجائی کو

گھبرائی کیوں بیٹھی ہے اب غمخواروں کے نرغے میں
لے آئی ہے محفل میں جب تو اپنی تنہائی کو

پاگل پن تو دیکھو جس دِن ڈولی اُٹھنے والی تھی
اپنے ہاتھ سے توڑ دیا اک دلہن نے شہنائی کو

کیوں اوروں کے نام سے چھپوانا ہے اپنے شعر قتیلؔ
یوں برباد کیا نہیں کرتے اپنی نیک کمائی کو

ہر بے زباں کو شعلہ نوا کہہ لیا کرو
یارو سکوت ہی کو صدا کہہ لیا کرو

خود کو فریب دو کہ نہ ہو تلخ زندگی
ہر سنگدل کو جانِ وفا کہہ لیا کرو

گر چاہتے ہو خوش رہیں کچھ بندگانِ خاص
جتنے صنم ہیں اُن کو خدا کہہ لیا کرو

یارو یہ دورِ ضعفِ بصارت کا دور ہے
آندھی اُٹھے تو اُس کو گھٹا کہہ لیا کرو

اِنسان کا اگر قدِ قامت نہ بڑھ سکے
تم اس کو نقصِ آب و ہوا کہہ لیا کرو

اپنے لئے اب ایک ہی راہِ نجات ہے
ہر ظلم کو رضائے خدا کہہ لیا کرو

لے دے کے اب یہی ہے نشانِ ضیا قتیلؔ
جب دل جلے تو اُس کو دیا کہہ لیا کرو

لہو میں ڈوبا ہوا ملا ہے وفا کا ہر اک اصول تجھ کو!
میں جانتا ہوں پسند کیوں ہیں گلاب کے سُرخ پھول تجھ کو

گواہ بن کر بتا رہی ہیں یہ سُرخیاں تیری انگلیوں کی
سمیٹنے پڑ رہے ہیں خونخوار جنگلوں کے ببول تجھ کو

تھکی انا کا سفر کہاں تک کہیں تو رک جا، کہیں تو دم لے
بنا دیا ہے مسافتوں نے ترے ہی قدموں کی دھول تجھ کو

یہ ریزہ ریزہ سی آرزوئیں کبھی تو کر دے مرے حوالے
میں اپنے بکھرے بدن کی مانند دیکھتا ہوں ملول تجھ کو

وہ خط رقیبوں کے ہاتھ آیا لکھا تھا جو میرے نام تو نے
کہاں کہاں کر چکی ہے رُسوا تری یہ چھوٹی سی بھول تجھ کو

قتیلؔ کتنے ہی لفظ اپنی اساس کا ذائقہ بدل لیں
اگر بتا دوں کبھی میں اپنی غزل کی شانِ نزول تجھ کو

●

تم پوچھو اور میں نہ بتاؤں ایسے تو حالات نہیں
ایک ذرا سا دل ٹوٹا ہے اور تو کوئی بات نہیں

کس کو خبر تھی سانولے بادل بن برسے اڑ جاتے ہیں
ساون آیا لیکن اپنی قسمت میں برسات نہیں

ٹوٹ گیا جب دل تو پھر یہ سانس کا نغمہ کیا معنی
گونج رہی ہے کیوں شہنائی جب کوئی بارات نہیں

غم کے اندھیارے میں تجھ کو اپنا ساتھی کیوں سمجھوں
تو پھر تو ہے میرا تو سایا بھی میرے ساتھ نہیں

ما نا جیون میں عورت اک بار محبت کرتی ہے
لیکن مجھ کو یہ تو بتا دے کیا تو عورت ذات نہیں

ختم ہوا میرا افسانہ اب یہ آنسو پونچھ بھی لو
جس میں کوئی تارا چمکے آج کی رات وہ رات نہیں

میرے غمگیں ہونے پر احباب ہیں یوں حیران قتیل
جیسے میں پتھر ہوں میرے سینے میں جذبات نہیں

●

اُس پر تمہارے پیار کا الزام بھی تو ہے
اچھا سہی قتیل پہ بدنام بھی تو ہے

پلکوں پہ اب نہیں ہے وہ پہلا سا بارِ غم
رونے کے بعد کچھ ہمیں آرام بھی تو ہے

آخر بُری ہے کیا دلِ ناکام کی خلش؟
ساتھ اُس کے ایک لذتِ بے نام بھی تو ہے

ہم جانتے ہیں جس کو کسی اور نام سے
اِک نام اس کا گردشِ ایام بھی تو ہے

منکر نہیں کوئی بھی وفا کا مگر قتیل
دُنیا کے سامنے مرا انجام بھی تو ہے

●

حُسن تھا جو ترے بام و دَر کا
زرد پتّا ہوں میں اس شجر کا

سب کریں چاند تاروں کی باتیں
کوئی رستہ دکھائے نہ گھر کا

یہ ہماری محبّت کے چرچے
شور وادی میں جیسے گجر کا

اپنی اپنی عبادت ہے سب کی
اپنا اپنا خدا ہر بشر کا

کس کو ہے اب قتیلؔ اتنی فرصت
کون ساتھی بنے عمر بھر کا

●

سسکیاں لیتی ہوئی غمگیں ہواؤ، چپ رہو
سو رہے ہیں درد ان کو مت جگاؤ، چپ رہو

رات کا پتھر نہ پگھلے گا شعاعوں کے بغیر
صبح ہونے تک نہ بولو ہم نواؤ، چپ رہو

بند ہیں سب میکدے، ساقی بنے ہیں محتسب
اے گرجتی گونجتی کالی گھٹاؤ، چپ رہو

تم کو ہے معلوم آخر کون سا موسم ہے یہ
فصلِ گل آنے تلک اے خوشنواؤ، چپ رہو

سوچ کی دیوار سے لگ کر ہیں غم بیٹھے ہوئے
دل میں بھی نغمہ نہ کوئی گنگناؤ، چپ رہو

چھٹ گئے حالات کے بادل تو دیکھا جائے گا
وقت سے پہلے اندھیرے میں نہ جاؤ، چپ رہو

دیکھ لینا، گھر سے نکلے گا نہ ہمسایہ کوئی!
اے مرے یارو، مرے درد آشناؤ، چپ رہو

کیوں شریکِ غم بناتے ہو کسی کو اے قتیلؔ
اپنی سولی اپنے کاندھے پر اٹھاؤ، چپ رہو

●

مجلسِ ذات سے تنہا نکلا
میرا غمخوار بھی مجھ سا نکلا

گریہ رُکا نہ گیا پلکوں سے
راستہ کاٹ کے دریا نکلا

رات کے بعد سحر بھی آئی
اپنا اِک خواب تو سچا نکلا

کتنا ظالم نظر آیا تھا رقیب
وہ بھی مجبورِ تمنا نکلا

نکتہ چیں یعنی وہی اہلِ نظر
آنکھ رکھتے ہوئے اندھا نکلا

بے زری کھا گئی دل والوں کو
غمِ دل بھی غمِ دُنیا نکلا

دل کی بات اور ہے دیکھا کس نے
جسم کا رنگ تو اُجلا نکلا

در و دیوار تعاقب میں چلے
گھر سے میں جب بھی اکیلا نکلا

روشنی کر گئی مجھ کو تقسیم
جسم سے کب مرا سایا نکلا

تھا بہت شہر میں بدنام قتیلؔ
یار، وہ شخص تو اچھا نکلا

●

سچ سے کترائے اگر لوگ یہاں
لفظ مفہوم سے کترائے گا

ہم اسے یاد بہت آئیں گے
جب اسے بھی کوئی ٹھکرائے گا

نہ رہے جب وہ بھلے دن بھی قتیلؔ
یہ زمانہ بھی گزر جائے گا

●

●

کوئی مقامِ سکوں راستے میں آیا نہیں
ہزار پیڑ ہیں لیکن کہیں بھی سایا نہیں

کِسے پکارے کوئی آہنوں کے صحرا میں
یہاں کبھی کوئی چہرہ نظر تو آیا نہیں

ترس گئی ہے زمیں بادلوں کی صورت کو
کِسی ندی نے کوئی گیت گنگنایا نہیں

اُجڑ گیا تھا کِسی زلزلے میں شہرِ وفا!
نہ جانے پھر اسے ہم نے بھی کیوں بسایا نہیں

قتیلؔ کیسے کٹے گی یہ دوپہر غم کی
مِرے نصیب میں ان گیسوؤں کا سایا نہیں

●

ایک ہی رنگ رچاؤ سب اِنسانوں میں
دوڑ رہا ہوں دُنیا کی شِریانوں میں

باہر تو ہر سو ہے راج درندوں کا
امن کا ہے ماحول فقط زندانوں میں

پودا پودا پال کے وقت نہ ضائع کر
کاغذ کے کچھ پھول سجا گلدانوں میں

اِنسانوں کا خون ہی تم کو پینا ہے
کھوپڑیوں میں پی لو یا پیمانوں میں

رات کی چُپ میں دل کی دھڑکن تیز کرو
کوئی تو آواز پڑے گی کانوں میں

پہلے ہی وہ گورا ہے، یہ کالا ہے
اور ہمیں بانٹو گے کِتنے خانوں میں

مجھ کو اپنے دیس کی مِٹّی کافی ہے
کیا رکھا ہے نسلوں اور زبانوں میں

کب تک دھوکا کھائے اپنی پیاس قتیلؔ
خالی جام کھنکتے ہیں مے خانوں میں

●

شبِ الم کے بھی ہوتے ہیں کچھ نہ کچھ آداب
تڑپنے والے سحر تک تو انتظار کریں!

ثبوتِ عشق کی یہ بھی تو ایک صورت ہے
کہ جس سے پیار کریں اس پہ تہمتیں بھی دھریں

کچھ ایسے دوست بھی میری نگاہ میں ہیں قتیلؔ
کہ مجھ کو باز رکھیں جس سے خود اسی پہ مریں

●

جھونکوں سے بجلیوں کی بشارت بھی پائیں گے
ہم لوگ موسموں کے ولی بن کے آئیں گے

ڈر ہے کہ پتھروں کو نہ کر دے کوئی خبر
اب کانچ کا لباس پہن کر ہم آئیں گے

محنت کبھی کسی کی اکارت نہیں گئی
اِک بوند بوئیں گے تو سمندر اگائیں گے

●

تمہارے ذکر سے یاد آئے کیا گھٹا کے سوا
ہمارے پاس کوئی اور استعارا نہیں

یہ التفات کی بھیک اپنے پاس رہنے دے
ترے فقیر نے دامن کبھی پسارا نہیں!

مرا تو صرف بھنور تک سفینہ پہنچا ہے
تجھے تو ڈوبنے والوں نے بھی پکارا نہیں

چلائے جاؤ قتیلؔ اپنا کاروبارِ وفا!
جو اس میں جان بھی جائے تو کچھ خسارا نہیں

●

لفظ چنتا ہوں تو مفہوم بدل جاتا ہے
اک نہ اک خوف بھی ہے جرأتِ اظہار کے ساتھ

دو گھڑی آؤ مل آئیں کسی غالبؔ سے قتیلؔ
حضرتِ ذوقؔ تو وابستہ ہیں دربار کے ساتھ

●

کیا خبر کب نیند آئے دیدۂ بے خواب میں
شام سے ہم جل رہے ہیں سایۂ مہتاب میں

اب تمہاری یاد سے پڑتے ہیں یوں دل میں بھنور
جیسے کنکر پھینک دے کوئی بھرے تالاب میں

جس گلی میں گھر تمہارا ہے، کرو اس کا خیال
ہم تو ہیں بدنام اپنے حلقۂ احباب میں

یوں کسی کا پیار آغوشِ ہوس میں جا چھپا
کوئی لاشہ جس طرح لپٹا ہوا کمخاب میں

وادیٔ سرحد میں تھیں جو مہرباں مجھ پر قتیلؔ
وہ بہاریں ڈھونڈتی ہیں اب مجھے پنجاب میں

●

صدمہ تو ہے مجھے بھی کہ تجھ سے جدا ہوں میں
لیکن یہ سوچتا ہوں کہ اب تیرا کیا ہوں میں

میں خودکشی کے جرم کا کرتا ہوں اعتراف
اپنے بدن کی قبر میں کب سے گڑا ہوں میں

کس کس کا نام لاؤں زباں پر کہ تیرے ساتھ
ہر روز ایک شخص نیا دیکھتا ہوں میں

کیا جانے کس ادا سے لیا تو نے میرا نام
دنیا سمجھ رہی ہے کہ سب کچھ ترا ہوں میں

پہنچا جو تیرے در پہ تو محسوس یہ ہوا
لمبی سی ایک قطار میں جیسے کھڑا ہوں میں

لے میرے تجربوں سے سبق اے مرے رقیب
دو چار سال عمر میں تجھ سے بڑا ہوں میں

جاگا ہوا ضمیر وہ آئینہ ہے قتیلؔ
سونے سے پہلے روز جسے دیکھتا ہوں میں

●

دی ہم نے اپنی جان تو قاتل بنا کوئی
مشہور اپنے دم سے ہے گھر گھر کسی کا نام

اپنی زباں تو بند ہے تم خود ہی سوچ لو
پڑتا نہیں ہے یونہی ستمگر کسی کا نام

ماتم سرا بھی ہوتے ہیں کیا خود غرض قتیل
اپنے غموں پہ روتے ہیں لے کر کسی کا نام

●

یہ تہمت خاک تہمت ہے، میرے ہم جرم ہمسایو
تمہاری عمر میں تم سے کہیں رسوا رہا ہوں میں

تری آغوش چھوٹی، تو ملی وہ بد دعا مجھ کو
کہ اب اپنی ہی باہوں میں سمٹتا جا رہا ہوں میں

●

کھلا ہے جھوٹ کا بازار، آؤ سچ بولیں
نہ ہو بلا سے خریدار، آؤ سچ بولیں

سکوت چھایا ہے انسانیت کی قدروں پر
یہی ہے موقعِ اظہار، آؤ سچ بولیں

ہمیں گواہ بنایا ہے وقت نے اپنا
بنامِ عظمتِ کردار، آؤ سچ بولیں

سنا ہے وقت کا حاکم بڑا ہی منصف ہے
پکار کر سرِ دربار، آؤ سچ بولیں

تمام شہر میں کیا ایک بھی نہیں منصور
کہیں گے کیا رسن و دار، آؤ سچ بولیں

بجا کہ خوئے وفا ایک بھی حسیں میں نہیں
کہاں کے ہم بھی وفادار، آؤ سچ بولیں

جو وصف ہم میں نہیں کیوں کریں کسی میں تلاش
اگر ضمیر ہے بیدار، آؤ سچ بولیں

چھپائے سے کہیں چھپتے ہیں داغ چہرے کے
نظر ہے آئینہ بردار، آؤ سچ بولیں

قتیل جن پہ سدا پتھروں کو پیار آیا
کدھر گئے وہ گنہگار، آؤ سچ بولیں

●

ہم کو پاسبانوں سے تہ بہ لا یہ کہنا ہے
کب تلک ہمیں آخر قاتلوں میں رہنا ہے

آج کل سہاگن ہے نام اس برہگن کا
صبر جس کا آنچل تھا، جبر جس کا گہنا ہے

ہم زمیں پہ رہتے ہیں تم فلک نشیں ٹھہرے
جو بھی غم ہوا نازل وہ ہمیں کو سہنا ہے

اب کے سنگ باری میں احتیاط لازم تھی
ہم نے جسم کے اوپر اور جسم پہنا ہے

اس ستم ظریفی سے، ہم قتیلؔ کیا سمجھیں
آدمی ہے کپڑوں میں، زندگی برہنہ ہے

●

کرتا ہوں پیار اپنے خدا سے میں اس لئے
وہ بھی حسین ہے مری تخئیل کی طرح

شاید مرا مسیح بھی آواز دے مجھے
پڑھتا ہوں ہر کتاب کو انجیل کی طرح

●

سجا کے اپنی ہی آنکھیں ہزار چہروں پر
کیا ہے میں نے سدا اعتبار چہروں پر

میں تیری بزم میں کس کس کی دشمنی لیتا
لکھا تھا نام ترا بے شمار چہروں پر

مری نظر تو ہے پھر بھی مری نظر یا رو
اب آئینوں کو نہیں اعتبار چہروں پر

●

کیا عشق تھا جو باعثِ رسوائی بن گیا
یارو تمام شہر تماشائی بن گیا

بن مانگے مل گئے مری آنکھوں کو رتجگے
میں جب سے ایک چاند کا شیدائی بن گیا

تھا بے قرار وہ مرے آنے سے پیشتر
دیکھا مجھے تو پیکرِ دانائی بن گیا

کرتا رہا جو روز مجھے اس سے بدگماں
وہ شخص بھی اب اس کا تمنائی بن گیا

وہ تیری بھی تو پہلی محبت نہ تھی قتیل
پھر کیا ہوا اگر کوئی ہرجائی بن گیا

●

سرخ آہن پر ٹپکتی بوند ہے اب ہر خوشی
زندگی نے یوں تو پہلے ہم کو ترسایا نہ تھا

خوب روئے چھپ کے گھر کی چار دیواری میں ہم
حالِ دل کہنے کے قابل کوئی ہمسایہ نہ تھا

●

باقی رہی نہ پھر وہ سنہری لکیر بھی
تارا جو ٹوٹ کر شبِ خاموش میں گرا

اُڑتا رہا تو چاند سے یارانہ تھا مرا
گھائل ہوا تو وادیِ گل پوش میں گرا

●

وہ شخص کہ میں جس سے محبت نہیں کرتا
ہنستا ہے مجھے دیکھ کے نفرت نہیں کرتا

گھر والوں کو غفلت پہ سبھی کوس رہے ہیں
چوروں کو مگر کوئی ملامت نہیں کرتا

بھولا نہیں میں آج بھی آدابِ جوانی
میں آج بھی اوروں کو نصیحت نہیں کرتا

انسان یہ سمجھیں کہ یہاں دفن خدا ہے
میں ایسے مزاروں کی زیارت نہیں کرتا

دنیا میں قتیلؔ اس سا منافق نہیں کوئی
جو ظلم تو سہتا ہے بغاوت نہیں کرتا

●

منزل جو میں نے پائی تو ششدر بھی میں ہی تھا
وہ اس لئے کہ راہ کا پتھر بھی میں ہی تھا

شک ہو چلا تھا مجھ کو خود اپنی ہی ذات پر
جھانکا تو اپنے خول کے اندر بھی میں ہی تھا

آسودہ کس قدر وہ ہوا مجھ کو اوڑھ کر
کل رات اس کے جسم کی چادر بھی میں ہی تھا

مجھ کو ڈرا رہی تھی زمانے کی ہمسری!
دیکھا تو اپنے قد کے برابر بھی میں ہی تھا

آئینہ دیکھنے پہ جو نادم ہوا قتیلؔ
ملکِ ضمیر کا وہ سکندر بھی میں ہی تھا

تھی ہم آغوشی مگر پھر بھی مجھے حاصل نہ تھا
وہ اک ایسا لمس تھا جس میں بدن شامل نہ تھا

ریت کی دلدل ملی مجھ کو سمندر پار بھی
میں وہاں اترا جہاں ساحل کبھی ساحل نہ تھا

وہ تو اک سازش تھی میرے خون کی میرے خلاف
جن کے سر الزام آیا وہ مرا قاتل نہ تھا

ہم نے کاٹے پیڑ تو سایوں کی یاد آنے لگی
لیکن اب حرفِ ندامت سے بھی کچھ حاصل نہ تھا

پر لگا کر اڑ گئے آخر مری نیندوں کے ساتھ
پیار کے وہ خواب جن کا کوئی مستقبل نہ تھا

اُن سے مل کر یہ بھی دیکھی شعبدہ بازی قتیلؔ
دھڑکنیں موجود تھیں سینے میں لیکن دل نہ تھا

میں نے تو پکارا ہے محبت کے اُفق سے
رستے میں ترے سنگِ حرم ہے مجھے کیا

میں سرمد و منصورؔ بنا ہوں تری خاطر
یہ بھی تری امید سے کم ہے تو مجھے کیا

رنگ جدا، آہنگ جدا، مہکار جدا
پہلے سے اب لگتا ہے گلزار جدا

نغموں کی تخلیق کا موسم بیت گیا
ٹوٹا ساز تو ہو گیا تار سے تار جدا

پہلے مِلا تھا دروازے سے دروازہ
لیکن اب دیوار سے ہے دیوار جدا

قتیل شفائی نمبر

کے لئے

نیک خواہشات کے ساتھ

امریک آنند





انقلابی فکر کا نغمہ سرا

ڈاکٹر قمر رئیس

صبح دس بجے صابر دت صاحب کا تار ملا کہ قتیل شفائی نمبر کے لئے موعودہ مضمون فوراً درکار ہے۔ اس تاکید پر میں قتیل صاحب کی شاعری کے تعلق سے کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ دو بجے ایک دوست نے فون پر فراق گورکھپوری کے سانحۂ ارتحال کی خبر دی۔ ذہن کچھ دیر کیلئے شل سا ہو گیا۔ جوش کی موت کے دس دن بعد فراق بھی چل بسے۔ ان دونوں میں تو خیر یارانہ تھا ہی لیکن میں بھی زمانہ طالب علمی سے دونوں کی دوستی کا دم بھرتا آیا ہوں۔ آیات و نغمات (جوش) اور رمز و کنایات (فراق) میں اپنے ہی جذبات اپنی ہی واردات پڑھتا رہا ہوں۔ روحانی انتشار اور ذہنی کساد کے لمحوں میں کبھی کبھی وہ مجھے کتنا سکون کتنی قوت بخشتے تھے۔ درماندگی اور پریشان حالی میں سہارا دینے والے ہی تو دوست کہلاتے ہیں۔

اب قتیل شفائی صاحب کی طرف مڑا تو خیالات گڈ مڈ ہونے لگے۔ قتیل فراق ——— فراق قتیل ——— دونوں کے خال و خط میں کچھ مشترک اور مانوس سے نقوش اُجاگر ہونے لگے۔ دونوں غزل کے شاعر کیف و نشاط کے شاعر کی حیثیت سے شہرت کے آسمان پر درخشاں رہے۔ دونوں نے غزل کی کلاسیکی وضع اور لہجہ میں اپنے عصر کے احساس و آگہی کو ایسے اچھوتے ڈھنگ سے سمویا کہ اس پر اُنکی مہر ثبت ہو گئی لیکن ان کی شاعری کے اس انفرادی آہنگ سے قطع نظر یہ سوال بھی ذہن میں آیا کہ انھوں نے غزل کے واسطہ سے اپنے عشق کو اور عشق کے واسطہ سے اُردو غزل کو آفاق انگئی اور حقیقت شعاری کا جو ہنر سکھایا کیا ترقی پسند تحریک اور اشتراک فکر سے ان کی وابستگی کے بغیر یہ ممکن ہو سکتا تھا؟ غزل کو ایک آفاقی اور عقلی شعورِ حیات سے مزین کرنے میں ان کے معاصرین فیض احمد فیض، جاں نثار اختر، مجروح سلطان پوری اور غلام ربانی تاباں نے بھی نمایاں حصہ لیا ہے لیکن میں اُن کا ذکر نہیں کرتا کہ وہ آخر تک ترقی پسند دبستانِ فکر سے

[illegible] ہے اور آج بھی ہیں۔ کہنا یہ ہے کہ اس دور با کمال شاعروں کی تخلیقی فکر بھی اسی چشمہ سے سیراب ہوتی رہی ہے۔ حسرت، اصغر اور جگر کے تغزل کی [illegible] معانی فضا سے غزل کو باہر نکالنے اور اسے عہد جدید سے [illegible] شعور اور تجربات کے [illegible] نے انجام دیا ہے۔ یہ بات ان [illegible] ترقی پسند تحریک [illegible] فراق گورکھپوری نے محمد طفیل کے نام اپنے ایک خط میں لکھا ہے۔

"[illegible] خیالات جگہ پانے لگے [illegible] میری کوشش اپنی نظموں میں یہ [illegible] بہتر کرد [illegible] ہونے لگا۔"

[illegible]

[illegible] انقلاب [illegible]

[illegible]

[illegible] انقلاب [illegible] فراق

[illegible] اور [illegible]

ہم [illegible] عاشقوں [illegible]

اس دور میں زندگی [illegible]

[illegible] ہوگئی [illegible]

اس طرح کے ان گنت اشعار فراق کے کلام سے پیش کئے جا سکتے ہیں۔ جو انسان دوستی ہی نہیں فرد اور معاشرہ کے تعلق سے بیسویں صدی کی ترقی پذیر عقلی حسیت کو پیش کرتے ہیں۔

فراق کی طرح قتیل شفائی کا تخلیقی سفر بھی کم و بیش ایسے ہی مرحلوں اور منزلوں کی نشان دہی کرتا ہے۔ جوش کے علاوہ عہد جدید کے کسی شاعر کی شعری لفظیات کا ذخیرہ اتنا وسیع اور متنوع نہیں ہے جتنا کہ فراق اور قتیل کا ہے۔ دونوں نے بے شمار نئے کھردرے اور ایک حد تک نامانوس الفاظ حریم غزل میں اس طرح داخل کئے کہ وہ اسی کے ہو رہے۔ یہ صرف ان کے تخلیقی ہنر کا کرشمہ نہیں۔ یہ ان کے تجربات اور فکر و تخیل کی جزرسی اور ہمہ گیری کا ثبوت ہے۔ ہر نیا تجربہ لفظیات کے ایک نئے پیکر کے ساتھ جنم لیتا ہے۔ وہ شاعر کے احساس و آگہی کے فرسودہ یا پامال عناصر کو الگ کر کے اس معنوی سچائی کو اظہار کی قوت بخشتا ہے جو شاعر کی اپنی دریافت ہوتی ہے اور اس کے تجربہ کو دوسرے تجربات سے متاثر کرتی ہے۔ اس عمل میں مروجہ الفاظ بھی نئے شعری اور معنوی تلازمات کی ترسیل کا وسیلہ بن جاتے ہیں۔ فراق اور قتیل دونوں کے کلام میں الفاظ کو نئے تناظرات اور نئے رمزیاتی معنی (SUGGESTIVE MEANING) سے ہمکنار کرنے کی صد ہا مثالیں مل جاتی ہیں۔

بعض دوسرے ترقی پسند شعراء کی طرح قتیل کی ابتدائی دور کی شاعری میں بھی رومانی طرز فکر اور جذباتی وفور حاوی تھا۔ مجموعہ ہریالی کے گیتوں اور اس عہد کی نظموں اور غزلوں میں زندگی کے تئیں معصومیت آشتی اور مفاہمت کا جو رویہ ملتا ہے وہ پنجاب کی شادابیوں کے پس منظر میں بالکل فطری ہے۔ اپنی دھرتی اس کی ہریالی اور اس کے عوام سے جس گہری وابستگی نے ان گیتوں کو جنم دیا تھا اسی نے آگے چل کر اس ماحول اور زندگی کے المناک تضادات بھی ان کے سامنے بے نقاب کئے۔ اور ان محرومیوں اور دکھوں کے ویران اندھیروں میں سانس لیتے ہوئے انسان اب ان کے وجود میں نشتر کی طرح کھٹکنے لگے اور یہیں سے ان کی شاعری میں جاں سوزی اداسی اور احتجاج کے عناصر بڑھنے لگے۔

لیکن اب ظلمت کی گردن پہ میرا ہاتھ ہے
ہر قدم پر آج تیری بھوک میرے ساتھ ہے

وہ مرحوم اقبال سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔

تو نے مزدوروں کی محنت کے تحفظ کے لئے
شہریاروں کی رعونت کو ملایا خاک میں!
آج لیکن تیری آنکھیں بند ہو جانے کے بعد
کچھ نہیں ہے مفلسوں کے دامن صد چاک میں

محنت کش انسانوں کے دامن صد چاک سے اس وابستگی نے اگر ایک طرف ان کی شاعری میں حزن و غم کا احساس گہرا کر دیا تو دوسری طرف انھیں ان قومی اور عالمی تحریکوں سے جوڑ دیا جو محنت کش عوام اپنی آزادی اور جمہوری حقوق کے لئے حوصلہ خیز انداز سے چلا رہے تھے۔ ویت نام اور آخر شب کا نقارہ جیسی نظمیں ایک انقلابی عزم اور رزمیہ شکوہ کی حامل کہی جا سکتی ہیں۔

مارے گا شب خون کبھی تو اندھیاروں پر اجیارا
بول مغنی کب گونجے گا آخر شب کا نقارہ

فن اور شخصیت

پاکستانی معاشرہ میں کم و بیش ہر دور میں ادیبوں کی زبان اور قلم پر سرکاری مہریں لگی رہیں اور ادیبوں کے ضمیر اور قلم کو خریدنے کی سازشیں ہوتی رہیں۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں بے شمار ادیبوں نے اپنے قلم کی حرمت کا سودا کر لیا لیکن اس صف میں صرف ترقی پسند ادیب ہی تھے جو اس گھناؤنے کاروبار سے الگ رہے۔ قتیل شفائی کی نظم "میرا قلم" قلم کی آزادی کا رزم نامہ ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

مرا قلم مرے جمہور کی امانت ہے
اسے عوام کی بے چارگی ستاتی ہے
مرے قلم کی زباں کاٹ دی گئی لیکن !!
مرے قلم کی خموشی بھی گنگناتی ہے
مرے قلم کی رگوں میں وہ خون جولاں ہے
کہ جس سے عظمتِ انساں کو آنچ آتی ہے
مرے قلم کو زمانہ تو کیا خرید سکے گا !
کہ اکثر اس سے معیشت شکست کھاتی ہے
میں خود اسیر سہی میرا فن اسیر نہیں
مرا قلم کسی جلاد کا ضمیر نہیں

یہ وہی رومان پرور قلم ہے جو کبھی حسن و عشق اور رندی کے والہانہ نغمے الاپتا تھا اور اب ایک سرکش شعلہ کی طرح اس کی روح کا الاؤ بن گیا ہے۔ خواجہ حافظ نے سچ کہا تھا۔

تحصیلِ عشق و رندی آساں نمود اول
جانم بسوخت آخر در کسبِ ایں فضائل

قتیل کی غزل کی شاعری اگر ایک طرف حسن و عشق کی واردات کی نقش گری ہے تو دوسری طرف اس کے آہنگ میں انقلابی لشکر کی نغمہ سرائی بھی صاف سنائی دیتی ہے۔ آج جب دنیا کی ایک تہائی سے زائد آبادی ایک آزاد اور منصفانہ اشتراکی سماج میں زندگی بسر کر رہی ہے اور تیسری دنیا کے کروڑوں انسان ایک ایسے ہی سماج کی تعمیر کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں تو اب اس کی ضرورت نہیں رہی کہ ادیب اور شاعر کف در دہاں ہو کر انقلابی خیالات کی تبلیغ کریں یا ظلم و جبر کی برہنہ طاقتوں کے خلاف نعرے لگائیں۔ آج کا باشعور قاری ان حقائق کا ادراک رکھتا ہے اس لئے آج کا فنکار تخلیقی ضبط و نظم کے ساتھ اپنے جذبات و خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ وہ ایسا استعاراتی پیرایۂ بیان اختیار کرتا ہے جو آج کی حقیقتوں اور اس کے پیچھے پنہاں عصری صداقتوں کے ہر رخ کو بے نقاب کر سکے۔

نغموں کی تخلیق کا موسم بیت گیا
ٹوٹا ساز تو ہو گیا تار سے تار جدا

مل جاتا ہے موقع خونی لہروں کو
ہاتھوں سے جب ہوتے ہیں پتوار جُدا

جو بیت گئی اس کی خبر ہے کہ نہیں ہے
دیکھو مرے تن پر مرا سر ہے کہ نہیں ہے
ملتی ہو ضیا جس کو چراغوں کی لوؤں سے
اس شہر میں ایسا کوئی گھر ہے کہ نہیں ہے
جذبات کی ٹھنڈک سے ٹھٹھرتے ہوئے لوگو
حالات کے سورج سے مفر ہے کہ نہیں ہے

ان اشعار کی علامتوں اور ان کے نرم و نازک لہجہ کے پیچھے جو تخلیقی ذہن کارفرما ہے وہ درد و کرب کے اسی بلاخیز سیلاب میں تڑپ رہا ہے جو آج دبے کچلے انسانوں کا مقدر ہے۔ وہ جانتا ہے کہ جب پتوار عام انسانوں کے ہاتھ سے جدا ہوتے ہیں تو آمریت کی سفاک اور خونی لہریں جھپٹ پڑتی ہیں۔ وہ ظلم و تشدد کی طاقتوں سے سرتابی کا انجام جانتا ہے۔ ایک خوف ہر لحظہ اس کی جان سے لگا رہتا ہے اس لئے بار بار پوچھتا ہے کہ میرے شانے پر میرا سر سلامت ہے یا نہیں؟ وہ بلقع نور شہر کی پر تعیش زندگی پر نظر ڈالتا ہے جو غریبوں اور ضعیفوں کے استحصال کا ثمرہ ہے وہ گھروں میں روشن برقی فانوسوں میں چراغوں کی لو کا متلاشی ہے جو مدھم ہونے کے باوجود معصومیت اور عزم و استقامت کی علامت ہے۔ الغرض قتیل کی غزلوں میں انقلابی فکر و احساس کی یہ پیکر تراشی اور ایک ایسی روشن اور رچی ہوئی انفرادیت کی حامل ہے جو انھیں اپنے تمام معاصرین سے ممتاز اور الگ کرتی ہے وہ جب یہ کہتے ہیں۔ کہہ دو سبب شب سے کہ اپنی منائے خیر ؎ ہم نے تو پھر چراغ سروں کے جلا لئے تو ساری دکھی لیکن پرحوصلہ انسانیت ان کی ہم آواز ہو جاتی ہے۔

سر کی چوٹ قتیلؔ نہ پوچھو
پورا ماضی آن گرا ہے

قتیل شفائی کا احساسِ کرب

ڈاکٹر حامدی کاشمیری

قتیل شفائی کے شعری رویے کو، اپنے اکثر و بیشتر معاصر ترقی پسند شعراء سے جو چیز ممیز کرتی ہے وہ اس کی صداقت اور شیفتگی ہے ان کے شعری مزاج کی تشکیل بظاہر ان ہی حالات و واقعات سے ہوئی ہے جو سماجی اور سیاسی سطح پر ان کے لئے دیگر معاصرین کی مانند بلیغ کا حکم رکھتے تھے اور جن کا سامنا کر کے ان کی داخلی شخصیت نکھرے۔ حالات اور تشکیلی اثرات سے آشنا ہوتی، وہ ذہنی طور پر ایک ایسے ماحول میں بلوغ کو پہنچے جو روایت زدہ، ملوکانہ، پس ماندہ اور شکست خوردہ تھا۔ یہ ماحول ان کے لئے دم گھونٹ دینے والا تھا۔ صدیوں کی سیاسی جبریت نے آزادی اور انفرادیت کے احساس کو کچل دیا تھا، طبقاتی تضادات نے انسان کو ظالم و مظلوم میں منقسم کر کے ایک غیر انسانی صورت حال کو جنم دیا تھا۔ انسان کی بے بسی، بے چارگی، جہالت اور پسماندگی کے امثال، مناظر کو دیکھ کر قتیل شفائی جیسے حساس اور دردمند شاعر کا شدید طور پر متاثر ہونا قابل فہم ہے ان کی شخصیت میں ردعمل کے طور پر درد، غم، اضطراب، غصہ، احتجاج اور کرب کے جذبات موجیں مارنے لگے وہ ایک موثر لسانی اظہار وضع کرنے کے لئے کوشاں رہے۔

اپنے دور میں گرد و پیش کی زندگی کے تضادات، الجھنوں اور مسئلوں کا گہرا شعور ہی ان کے وجود کے لئے ایک مضطرب شعوری اساس فراہم کرتا ہے جس طرح دیگر ترقی پسند شعراء مثلاً سردار جعفری، مخدوم محی الدین، کیفی، ساحر لدھیانوی، احمد ندیم قاسمی اور جاں نثار اختر نے اپنے عہد کے سماجی اور تہذیبی مسائل کی آگہی ہی موضوع شعر بن جاتی ہے، قتیل شفائی نے بھی اپنے عہد کے معاشرتی اور سیاسی شعور ہی پر انحصار کیا، لیکن اس ضمن میں دو چیزیں ان کے یہاں مابہ الامتیاز ہیں۔ اول، انھوں نے اپنے معاشرتی شعور کی بیداری کے لئے ایک مخصوص نظریہ پر انحصار نہیں کیا، وہ بیساکھیوں کے محتاج نہ تھے، انھوں نے شخصی طور پر پوری ذہنی آزادی سے اپنے عہد کی حقیقتوں، دردوں اور اصل کرب [illegible] انھوں نے البتہ مارکسی فلسفے کے مطالعے سے اپنے سماجی احساس کو تیز تر ضرور کیا۔ دوم مارکسزم سے وابستگی ان کے احساساتی وجود کے فعال اور متحرک رہنے میں حارج نہیں ہوئی۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ وہ مارکسی فلسفے کو اور مدارس فکر کی ذہنی موشگافیوں اور خشک استدلالی مباحث میں کھو نہیں گئے اور اس انسانی صورت حال سے دور نہیں ہوئے جو اس دور کے مختلف تضاد اور جن کو سلجھانے کے لئے کئی ترقی پسند شعراء

قتیل شفائی ۔۔۔

... [illegible] تھے اور خود ہی ... حقیقت ... سامان کر رہے تھے، قتیل شفائی نے عقل فلسفہ کا ... [illegible] پوچھا ہے کہ ... [illegible] ... اپنے عدوان ... [illegible] ... ہے۔

... [illegible] طبقاتی نظام کی ... [illegible] تضادوں اور ... [illegible] ... احساس کا ... ہے۔ یہ دکھ نہیں بلکہ مستقل ہے ... [illegible] ... محبت ... [illegible] ... آزادی اور عزتِ نفس کی پامالی، پراگندگی اور شکست کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے، اور ... [illegible] سرایت کر جاتا ہے۔

آج کی شاعری کا ایک ... موضوع سماج کی ستائی ہوئی بے بس اور مظلوم عورت ہے جو اپنے انسانی ادراک اور جمالیاتی جذب و کشش کے باوجود مردوں کے ... سماجی اور ... ماحول میں قابلِ رحم زندگی گذار رہی ہے۔ وہ نسلِ انسانی کی بقا اور محبت اور آشتی کی تہذیبوں کی ضمانت کی علامت ہونے کے باوجود ... بازار میں نیلام ہوتی ہے اور طوائف کی مکروہ اور ... زندگی گزار رہی ہے۔ قتیل شفائی کی بیسیوں نظموں میں عورت کا ... کردار میں ایک طوائف ... مظلوم و مقہور انسانیت کی علامت بھی بن جاتا ہے۔ قتیل شفائی نے اس موضوع پر "معذرت"، "ایک نظم"، ... اس شہر کے اُس گوشے میں، ... شمعِ انجمن، "راستے کا پھول"، "بانجھ"، "راکھ"، "راستہ"، عورت، ایک ... کسی ... کے بدن کی سوا ... یہ اندازہ ہے کہ اس کا موضوع اتنے تواتر سے اُن کی نظموں میں ... تکرار کا عیب پیدا کرتا ہے، تاہم اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی کہ موضوع کا یہ تصرف انداز اُن کے یہاں محض ایک جانے پہچانے مسئلے کو نظمانے کا رائج الوقت طریق نہیں بلکہ ان ... قرب سے عبارت پانے کی سعیٔ مسلسل ہے جو زہر کی طرح اُن کی رگ و پے میں سرایت کر گیا ہے۔ ایسا کرتے ہوئے وہ کئی نظموں میں جذباتیت کے شکار بھی ہوئے ہیں۔ چنانچہ "معذرت"، "ایک نظم"، "آج اور کل"، "آج کی باتیں کل کے سپنے" میں موضوع جذباتیت کی زد میں آ گیا۔

کل نیرا بیا ... ریشم و کمخواب کی میزانوں میں (معذرت)

تو نے بیچی ہے سرِ عام جوانی اپنی (ایک نظم)

حُسن جب ریشم و کمخواب میں تل جاتا ہے (آج اور کل)

تل گیا حسن زر و سیم کے میزانوں پہ (آج کی باتیں کل کے سپنے)

یہ کرب کبھی کبھی اُن کے یہاں سیاسی تشدد ... شکستگی، اور عدم یقینیت سے بھی دوچند ہو جاتا ہے۔ "جشنِ آزادی" میں وہ اُس المیے کا احساس دلاتے ہیں، جو آزادی کے خوابوں کی شکست کا نتیجہ ہے اور جس کا اظہار فیض احمد فیض نے "صبحِ آزادی" جیسی نظموں میں

کیا ہے "اردو ہی نفس اور عوام جیسی نظمیں بھی ملکی سیاسیات سے متعلق ہیں، یہ صحیح ہے کہ اُن کا دائرہ خیال ملکی سیاسیات، سماجی نابرابری اور عامۃ الورود عشقیہ کیفیات تک ہی محدود ہے۔ نتیجے میں ان کے تجربوں میں تنوع، عمق اور وسعت کی تلاش بے سود ہے، تاہم یہ واقعہ ہے کہ انھوں نے شخصی درد اور سوز کے ساتھ اپنے موضوعات کو برتا ہے اور ان موضوعات کی اوپری سطح کو چیر کر تہہ میں ان کے عالمگیر انسانی جذبے کی موج رواں کا خوشگوار احساس ہوتا ہے یہی وہ خصوصیت ہے جو قتیل شفائی کو اپنے وقت سے منسوب کرتے ہوئے بھی آئندہ کا شاعر بناتی ہے اس کا بیّن ثبوت ان چند نظموں اور غزلیہ اشعار سے بھی ملتا ہے جن میں جدید دور کی مشینی تہذیب میں سانس لیتے ہوئے انسان کے نفسیاتی اور روحانی کرب کا اظہار ملتا ہے۔ اور قتیل شفائی کی عصری آگہی کی تہہ داری واضح ہوتی ہے۔ چنانچہ آپ بیتی، منزل منزل، کچھ غم جاناں، غم دوراں، آکتاہٹ، بیداری، نیا سفر اس سلسلے میں قابل ذکر ہیں۔ ان نظموں میں قتیل شفائی کی دردمندی کی آنچ قاری کے وجود کو پگھلاتی ہے۔ ان نظموں میں وہ "خیال وخواب سے شعور تک[1]" کا سفر کرتے ہیں۔ ان میں اُن کا کرب، کرب ذات بن جاتا ہے۔

نہ بادل نہ سایہ نہ ٹھنڈک نہ راحت
نگاہوں پہ اک حسرتوں کا سراب
چھایا رہا
یہ اس تشنگی اپنی روح تجسس
ابابیل بن کر انق تا انق
بھٹکتی رہی (منزل منزل)

اس حد کو پہنچ جائے گا تنہائی کا احساس
آپ اپنی ہی پرچھائیں سے ڈر جائیں گے ہم لوگ
دیتی ہی رہے گی یہ زمیں ہم کو صدائیں
صدیوں کی رفاقت سے مکر جائیں گے ہم لوگ (نیا سفر)

سوال یہ ہے کہ قتیل شفائی کے یہاں احساس کرب کس طرح اور کس حد تک ان کی شخصیت کے تخلیقی مضمرات کو بروئے کار لانے میں مدد دیتا ہے۔ احساس کرب اگر شاعر کے جذبے ہی کو جگاتا ہے اور اس کی ذہنی اور فکری قوتوں سے متصادم نہیں ہوتا تو جذبہ، جذباتیت بن کر رہ جاتا ہے اور شعری عمل کو مفلوج کرتا ہے۔ قتیل شفائی کی اکثر نظمیں اِسی جذباتیت کی مظہر ہیں لہٰذا شعری معنویت سے عاری ہیں۔ ایسی نظمیں بالعموم ملول کلامی، تکرار، سطحیت اور عمومیت کی شکار ہیں۔ اِن نظموں میں بھی اُن کا کرب جھلکتا ہے، مگر یہ شعری تجربے کے بطن سے

---

[1] خیال وخواب سے چل کر شعور تک پہنچے
تری تلاش میں ہم دور دور تک پہنچے (قتیل)

نمو کرنے کے بجائے تخلیق کار (جو شعری تخلیق کے تعلق سے ایک اجنبی (OUTSIDER) ہی کی حیثیت رکھتا ہے) کا بیانیہ کرب بن جاتا ہے۔ نتیجے میں تجربے کے المیہ کا احساس بھی دلاتا بلکہ غیر دلچسپ ذاتی نوحہ بن کر رہ جاتا ہے۔ اس نوع کی ذاتی تشریح یا تبصرہ کے غیر پسندیدہ اور غیر متعلقہ عنصر کے دخیل ہونے سے شعری تجربہ کا کلی نظام تہہ و بالا ہو جاتا ہے، یہ گویا کھرے سونے کے ساتھ کھوٹ کی ملاوٹ ہے۔ شعر توضیح، تفصیل اور مقصدیت سے گرانبار ہو جاتا ہے۔ قتیل شفائی کے مقابلے میں فیض اور مخدوم کی کئی نظموں میں خود ضبطی اور توازن سے تجربے کی سالمیت برقرار رہتی ہے۔

تاہم ان کی غزلوں کے بعض اشعار اور بعض نظمیں بھی ان کے کرب کی تحلیل شدہ صورت کو ابھارتی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ معاصر حقائق سے ذہنی اور جذباتی طور پر منسلک ہیں اور جو واقعہ ان کے وجود کو تخلیق شعر پر آمادہ کرتا ہے وہ ان کی پوری شخصیت کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ اور پھر یہی واقعہ ان کی شخصیت کا آب و رنگ کشید کر کے تخلیقی رتبہ حاصل کرتا ہے اور ایک نئی شکل اختیار کرتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ایسا واقعہ یا کردار، اپنی تاثر انگیزی کے اوصاف ان کی شخصیت کی فکری قوتوں کو متحرک نہیں کر پاتا، یہ ان کے جذباتی رویوں کو ہی انگیز کرتا ہے۔ تاہم یہ دلچسپ امر ہے کہ ان کے جذباتی ہیجان، جو ان کے کرب کا زائیدہ ہے، اتنا اثر و نفوذ رکھتا ہے کہ حقیقی تجربے کی صورت بدل دیتا ہے اور شعری تجربے کی نمو کے لئے راستہ ہموار کرتا ہے۔ نظم "بیداری" اس ضمن میں بطور مثال پیش کی جا سکتی ہے۔ اس نظم میں مندر، کلس، فانوس، پجاری، دیوتا، دیویاں اور چٹانیں ایک مربوط تخیلی فضا کی تشکیل کرتی ہیں۔ ایک صنم کدہ کی فضا، جس میں ایک پجاری "عقیدت کا گلا گھونٹتا ہے" اور "دیوتاؤں کی سسکتی ہوئی خونیں آنکھیں" نمودار ہوتی ہیں اور پھر

لیکن احساس کے اس پار کوئی پوچھتا ہے
یہ جواہر کی چٹانیں ہمیں کیا دیتیں ہیں۔

ظاہر ہے کہ کو بالا نظم علامتی معنویت سے عاری قرار نہیں دی جا سکتی، یہ موجودہ انسان کے عقیدوں کی شکست کے المیئے کی مظہر بن جاتی ہے۔

قتیل شفائی کی نظر اپنے اندرون کے بجائے بیرون پر رہتی ہے اسی لئے ان کے یہاں لاشعوری تجربوں کی تلاش عبث ہے، وہ ذاتی آشوب سے بھی آشنا ہیں۔ وہ انسان کی آفرینش اور زوال کے توجہ گیر ازلی مسائل سے بھی کوئی سروکار نہیں رکھتے۔ ان کے یہاں روایت شکنی کا رجحان بھی نہیں ملتا نہ لئے لسانی شکست کا کوئی مسئلہ بھی نہیں ملتا۔ اس کے باوجود جدید دور کے شعرا میں ان کی قدر و قیمت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے یہاں مخصوص سیاسی اور معاشرتی حالات کے سبب تیزی میں انسانی قدروں کی پامالی کے المناک تجربے ملتے ہیں۔ جو ان کی دردمندی اور انسان دوستی کو پیش کرتے ہیں دوسرا بات یہ ہے کہ وہ لسانی سطح پر روایت پسندی کے میلان کا اظہار کرتے ہوئے بعض لفظ و پیکر کے ذریعہ معنوی امکانات تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنا تجربے اور مشاہدے کے پھیلاؤ کو حسی لطافتوں کے ساتھ تابناک پیکروں میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ شاعر کے لئے اپنے متضاد تجربوں کو ایک وحدت کے طور پر لفظوں میں ڈھالنے کا عمل بہت جانکاہ ہوتا ہے اور گنے چنے دیدہ ور شاعر ہی اس نازک مرحلے سے سلامتی سے گذر جاتے ہیں۔ قتیل شفائی بھی ان میں شامل ہیں انھوں نے اپنے نازک احساسات اور مشاہدات کے موثر اظہار کے لئے متعدد تراکیب اور پیکر تراشے ہیں جو ان کی لسانی ہنرمندی ہی کے نہیں بلکہ تخلیقی حدت میں لفظ و خیال کی پیوستگی کے الہامی عمل کے غماز ہیں۔ چند نمونے یہ ہیں: شفاف اندھیرا، روپ ترنگ، ردق غیرتیں، نظر کی نغمگی، نقرئی باس، آزاد گفتاری، گلشن زریں، جنت زرنگار، زرپوش کلائی، سال خوردہ خواہش، ہنری اُلکا

اقلیم گلابیدہ حجاب، سحر تاب اشارے، شعلہ زرتاب، شفق رنگ خطوط، زرکار چہرے کے گنگناتے الفاظ، شاخ ماضی، سیاہ پوش خیال۔

قتیل شفائی کی شاعری میں ان کا کرب چیخ یا شور بن کر نہیں ابھرتا اور نہ ہی تشنج کی کیفیت کو جنم دیتا ہے۔ یہ ان کے شخصی خواص یعنی نرمی، لطافت، خوش طبعی، جمالیاتی احساس اور محبت سے آمیز ہو کر داخلی نغمگی میں ڈھل جاتا ہے۔ یہ نغمگی رسیلی اور لطیف ہے اور سادہ اور مترنم لفظوں میں ڈھل جاتی ہے اس میں خوابناکی، مگر یہ خوابناکی انسان کو سلاتی نہیں بلکہ بیداری کی طرف لے جاتی ہے۔

قفس میں آشیاں کا نام سن کر مطمئن نہ ہو
یہ باغباں کا حسنِ گفتگو ہے اور کچھ نہیں

تمہیں گلوں کی بے بسی میں حسن کی تلاش ہے
یہ جستجو برائے جستجو ہے اور کچھ نہیں

تمہاری انجمن کے ہم وہی بجھے چراغ ہیں
جو تیرگی کو اور بھی نکھارتے چلے گئے

ہم تو ایک اندھی مسند میں اپنی جان پہ کھیل گئے
تمہیں بتاؤ اجڑی رُتو کیا جیتا کیا ہارا ہے

برپا قتیل کب سے اک جشنِ مستقل ہے
رہتی ہے حسرتوں کی دل میں ہما ہمی سی

پھر سے وہی سیلاب حوادث، جانے دو ساحل والو
یا اس بار سفینہ ڈوبا یا اب کے منجدھار نہیں

کیوں کسی اور کو دیں زحمتِ دل جوئی ہم
جو بھی شکوے ہیں ہوں گے وہ خدا سے ہوں گے

وہ جو گم سم سا اک شخص ہے نا
اس کے کرب میں مبتلا ہے

قتیل شفائی کی شاعری کے چند بنیادی عناصر

پروفیسر عتیق احمد

درخت اگر سرسبز اور گھنیرے ہوں، اور لق و دق صحراؤں میں ہوں، تو ان کے سایوں کی راحت بخش ٹھنڈک کڑے کوس اور کڑی دھوپ کے مسافروں کو راہ کا ملنا سہل بنا دیتی ہے۔ خواجہ آتش نے ایسے ہی کسی تخیل اور جذبے کے زیر اثر بے ساختہ اور معصوم سی دعا دی تھی

خدا دراز کرے عمر ان درختوں کی
کہ جن کے سایہ بڑی شے ہیں رہروؤں کے لیے۔

ادب اور شعر، فنونِ لطیفہ اور فلسفہ اپنی اصلیت میں جذبات، خیالات اور غور و فکر کے ایسے ہی زندگی بخش اور دل فریب ہریالی کے تختے اور گھنے درخت ہیں۔ معاشرے کے اندر استحصالی قوتوں کے پیدا کردہ اجاڑ اور لق و دق صحراؤں میں، غربت اور افلاس زدہ آبادیوں میں، درد اور کرب کے گونجتے سناٹوں میں، ان کی راحت بخش ہریالی اور ٹھنڈے سایوں کی چھتریاں زندگی سے موت تک کے پُرخار راستوں کے مسافروں کی منزلیں آسان بناتی ہیں۔ ان میں جینے کا حوصلہ، آگے بڑھنے کی امنگ اور مقاومت کا جذبہ ابھارا رکھتی ہے۔ تاریخِ انسانیت کے ہر ورق پر ان مسافرانِ آبلہ پا کے چھالوں اور زخمی تلوؤں سے بہتے ہوئے خون کی سرخی، ان کی کٹھنائیوں کی گواہی دیتی رہی ہے۔ ہر دور کے صاحبِ بصیرت ادیب، شاعر، فن کار اور فلسفی نے ان گواہیوں کو ریکارڈ کیا ہے۔ معاشروں کو متحرک اور رواں دواں رکھنے والی اقدار و روایات کی نمو اور آبیاری ان ہی کے "جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں" کو ریکارڈ کرنے والے قلموں اور موءِ قلم کی رہینِ منت رہی ہے۔

قتیل شفائی اپنی افتادِ طبع، مزاج کی ساخت اور فکر کے اعتبار سے اسی قافلۂ جنون اور لگن کا فرد ہے جو بے آب و گیاہ زمینوں پر خنک سایہ دار اشجار کی پود لگاتا ہوا چلتا ہے، چاہے اس سفر میں اُسے جسم و جان کی کیسی ہی کڑی بازی کیوں نہ لگانی پڑی ہو۔ قتیل شفائی کی اس قافلۂ جنوں میں شرکت محض لفظی یا جذباتی نہیں ہے۔ وہ جانتا ہے کہ حالات کے بطن سے خود اس کا رزار اور معاملات جنم لیتا ہے تب ہی تو وہ پورے یقین اور وثوق کے ساتھ اعلان کرتا ہے: "ہمارے ہی مشعلوں کبھی تو اندھیاروں پر اُجیارا!" یہ جذبہ، یہ لگن "برائے شعر گفتن" نہیں، بلکہ اس کے آدرش اور لائحۂ عمل دونوں ہی کی بنیاد اور روح ہے۔ قتیل شفائی کی جگ بیتی اس دعویٰ کا ثبوت ہے۔

ے گا سنجوں کبھی تو اندھیاروں پر اُجیارا
بول مغنّی کب گونجے گا آخرِ شب کا نقارا

قتیل شفائی کے اب تک کے پورے تیس پینتیس برسوں کے شاعرانہ کیریئر پر نظر ڈالیے تو اندازہ ہوگا کہ آغازِ سفر میں اس نے جس کومل ورنرم ونازک مہربانی" کی بیری کو ہمارے نقافتی اور جذباتی اُجاڑ بیابان میں لگایا تھا وُہ موسموں کے گرم و سرد کو سہہ کر آب "چھتنار" درختوں کا ایک ایسا حسین نخلستان بن چکا ہے جس کے دھوپ اور سایہ کے چُنت دار CHEQUERED SHADE میں غزل کی نرمی اور حلاوت، گیتوں کی مدُھر اور رس بھری کوملتا، نظموں کے فکر و فلسفہ کی انقلاب آموز اور زندگی بخش کیفیتیں ہر رنگ گھُلی مِلی تپتی دُھوپ، دور کڑے کوس کے مسافروں کو ٹھنڈک اور اگلے سفر کے لیئے قوت اور حرارت بہم پہنچا رہی ہیں :

لیکن اب حالات کی نبضوں پہ میرا ہاتھ ہے — ہر قدم پر آج تیری بھوک میرے ساتھ ہے
اب جوانی پر فن کو مستقبل پہ لہراؤں گا میں — اَن گنت ماؤں کے دل کا چین بن جاؤں گا میں

قتیل شفائی کے ان اشعار میں جہاں دبے اور کچلے ہوئے لوگوں کو حالات کا پامردی سے مقابلہ کرنے اور آگے بڑھنے کا حوصلہ دینے کی اُمنگ ملتی ہے، وہیں یہ بات بھی بہت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اُس کا یہ انداز واعظانہ نہیں، بلکہ لوگوں کے دُکھ درد میں شریک ہونے کا، اُن کی غم خواری کا اور اُن کے ہم سفر ہو جانے کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ انداز صرف شاعرانہ انداز نہیں بلکہ اپنے پڑھنے والوں اور اُن کی وساطت سے دوسرے بے شمار افراد کو اپنے ہم راہ لے کر چلنے کا ایک رویّہ بن جاتا ہے۔ قتیل شفائی کو اُس کے بہت سے ہم عمر اور ہم عصر شعراء میں اِس رویّہ کی بنا پر الگ پہچانا جا سکتا ہے۔
قتیل شفائی کی شاعری اُن کے جذباتی اور فکری سفر کی ایسی داستان ہے جس میں آپ بیتی اور جگ بیتی کے درمیان کہیں حدِ فاصل نہیں کھینچی جا سکتی۔ جو کچھ وُہ کہتے ہیں وہی کچھ اُن کا قاری اور اُن کے معاشرے کا ہر فرد کہنے کا متمنّی نظر آتا ہے۔ اُن کی ایک نظم "نئی تقویم" کا آخری بند ہے :-

یہ نوعمر پَل، یہ جواں سال گھڑیاں
یہ بُوڑھے پہر حسبِ دستور ہوں گے
عناں وقت کی اپنے ہاتھوں میں ہوگی
ہم اپنے تہوّر پہ مغرور ہوں گے
وہی ضابطے ہوں گے تقویم کے اب
جو اِس دَور میں ہم کو منظور ہوں گے

یہی کچھ آج کے منظم ہوتے ہوئے محنت کش معاشروں کی آرزو اور اُمنگ بھی ہے۔ لیکن آرزوئیں اور اُمنگیں تو ہر انسان کی اتنی ہوتی ہیں کہ "ہر خواہش پہ دم نکلے"۔ اصل بات اِن کے پسِ پردہ وہ وَلولہ اور یقین ہوتا ہے جو اپنی بات منوانے کے لیئے سب کچھ کر گزرنے کی سکت رکھتا ہو۔ قتیل شفائی کے رویّے میں یہ یقین اور وَلولہ اجتماعیت کے تاریخی شعور کا نتیجہ ہے۔ اِن کے (تا حال) موجودہ مجموعے "چھتنار" میں "آخرِ شب کا نقارہ" اور "ویٹ نام" دونوں نظمیں اس یقین اور ولولہ کی تاریخی تاویل اور شعور کا واضح ثبوت ہیں۔

ادب اور شاعری کے حوالے سے اِسی طرح کی باتیں ہمارے ادب میں "پردہ نشین بیبیوں" کی قسم کے مبصّروں (بزعمِ خود نقّادوں) کو بڑے اچنبھے کی باتیں

ہیں۔ ان کے گھسے ہوئے گراموفون ریکارڈوں پر سوئی برس ہا برس سے صرف اُس لکیر میں اٹک کر رہ گئی ہے جہاں "ادب کو ادب ہونا چاہیئے" کا جملہ ریکارڈ ہو گیا تھا۔ نہ ساؤنڈ بکس کی سوئی آگے چلتی ہے، نہ اِن مبصرانِ کرام کا ذہن اور قلم آگے بڑھنے کی راہ پاتا ہے۔ قتیل شفائی کی جن نظموں کو ایسے مبصروں نے سب سے زیادہ سراہا ہے وہ "چھتنار" کی دو نظمیں، رخصتی اور ہجومِ دل کی وادیوں میں، ہیں۔ وجہ یہ ہوئی کہ یہ دونوں نظمیں اپنی ظاہری طرزِ ادا کی بنا پر روایتی انداز کی ہیں "اور" ان کے ایک نہایت گھریلو "ادبی" معیار قرار پا گئی ہیں۔ اب یہ الگ بات ہے کہ اِن دونوں نظموں کا تعلق کسی طور بھی اس مجموعے کی دوسری غیر روایتی نظموں سے نہیں کٹتا۔ ان دونوں نظموں کے بین السطور جو یاس انگیز فضا اور غم آگیں محرومی اور کسک ہے وہ تمام تر بے ضرر طرزِ اظہار کے باوجود، زندگی بسر کرنے کے عزم و ولولے سے خالی نہیں۔ قتیل شفائی نے اِس کیفیت کو اپنے ایک شعر میں بڑی نزاکت کے ساتھ اظہار کیا ہے :

تمہاری انجمن سے ہم وہی بجھے چراغ ہیں جو تیرگی کو اور بھی نکھارتے چلے گئے

قابلِ تعریف بات تو اِن مبصروں کے نزدیک اِس شعر میں "رچاؤ"، "گھلاوٹ" یا زیادہ سے زیادہ "لہجے کی کھنک" ایسی دو چار کلاسیکی انداز کی خوبیاں ہی ہوں گی، لیکن قابلِ غور باتیں تو ہمیں تلخ اوقات والے بندۂ مزدور کی اُن بستیوں تک لے جاتی ہیں جہاں کی تنگ و تاریک فضا کسی اور جگمگاتی جاگتی بستی کے لئے زندگی کا تازہ اور سرخ لہو دے کر تیرگی کی سیاہ چادر میں لپٹی پڑی ہے۔

نظر کی تشنگی، رنفوں کے بل، ہونٹوں کی شیرینی
یہاں ہر چیز جھوٹے پیار پر مجبور ہوتی ہے
یہاں کردار کے اُجلے صنم ڈھالے نہیں جاتے
یہاں ہر زندگی گفتار پہ مجبور ہوتی ہے
جھروکے سے جھٹکتے ہیں یہاں ہنستے ہوئے فاقے
یہاں چکتا ہے سودا زندگی کی التجاؤں کا
یہاں دن کو بدن تلتے ہیں میزانِ حکومت میں
یہاں جمت ہے راتوں کو اکھاڑا رہنماؤں کا

خریدارو یہاں ہر رات جشنِ عام ہوتا ہے
یہ وہ منڈی ہے جس میں پیار کا نیلام ہوتا ہے۔

یہ اُن بستیوں کی تصویر ہے جس میں ضمیر فروشی، جسم و جان فروشی اور مذہب اور ایمان فروشی، سب کچھ نام و نمود کمانے اور ملمع کی گئی زندگیاں گذارنے کی خاطر روا ہے۔ ستم یہ ہے کہ عیش و عشرت کے "یہ جشنِ عام" اُن محنت کشوں کے اِستحصال پر برپا کیا جاتا ہے جن کی تنگ و تاریک بستیوں میں فاقوں اور عسرت کے سوا اور کوئی سرمایۂ حیات نہیں ہوتا۔ اِس دل دوز صورتِ حال کو قتیل شفائی نے روحِ اقبال کو خطاب کرتے ہوئے کہا ہے :

تو نے مزدوروں کی محنت کے تحفظ کیلئے شہریاروں کی رعونت کو ملایا خاک میں
آج لیکن تیری آنکھیں بند ہو جانے کے بعد کچھ نہیں ہے مفلسوں کے دامنِ صد چاک میں

قتیل شفائی کے یہاں گرد و پیش کی پیچیدہ اور مضمحل فضا کا یہ شعور بہت فراواں ہے۔ موضوعات کا جتنا تنوع ہمیں ان کے یہاں ملتا ہے وہ سب

ہی زندہ احساس کے سبب ہے جو قتیل کو کسی آبلہ پا مسافر کی مانند معاشرے کے ہر گلی کوچہ، ہر بستی اور "جاگتے جگمگاتے" محلات کے تاریک گوشوں تک یوں سینچا ہے کہ گویا وہ اس سب کچھ کا "تماشا" بنا رہتا ہے۔ قتیل کی اداشناس، نظروں سے نہ وہ محنت کش اوجھل ہے جس کی نظروں کی چمک اور بازوؤں کی لچک میں انقلاب ہیں طوفان خیز، دقتی طور پر سکوت اور سکون کی دبیز چادر اوڑھے زندگی کی کٹھن راہوں پہ صبر و تحمل کے ساتھ گام زن ہے، اور نہ ہی وہ طبقہ اپنا اصل کردار ان کی نظروں سے پوشیدہ رکھ سکتا ہے جو بگلا بھگت بنا اِن محنت کشوں کی محنت ہڑپ کرنے کے لیے نت نئے روپ دھارتا ہے اور معاشرہ پر اپنی قیادت سیادت کا سکہ چلاتا رہتا ہے۔

قتیل کے فن میں ایک ہمہ جہت دردمندی اور دل سوزی کا عنصر بہت حاوی ہے۔ یہ بات اُس ہی فنکار کے یہاں ہوتی ہے جو بے ریا خلوص اور [illegible] کی کٹھن راہ کو اپنا سکتا ہو۔ قتیل شفائی نے ان دونوں عادتوں کو اپنی فنی زندگی کا شعار بنا رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کے سماجی شعور، فنی اظہار اور فکر و تفکر [illegible] کھرا پن، گہرائی اور ہمہ گیری کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ ذرا ان اشعار کو دیکھیے کہ اِس میں قتیل کا چہرہ اور کردار کس طور اُبھرتا ہے۔

جب اپنے اعتماد کے محور سے ہٹ گیا۔
میں ریزہ ریزہ ہو کے حریفوں میں بٹ گیا۔
لٹتے ہوئے عوام کے گھر بار دیکھ کر
اے شہریار تیرا کلیجہ نہ پھٹ گیا۔
چوروں کا احتساب نہ اب تک ہوا قتیلؔ
جو ہاتھ بے قصور تھا وہ ہاتھ کٹ گیا

جو بیت گئی اس کی خبر ہے کہ نہیں ہے
دیکھو میرے کرتن پر میرا سر ہے کہ نہیں ہے؟
جلتی ہو ضیا جس کو چراغوں کی لوؤں سے
اس شہر میں ایسا کوئی گھر ہے کہ نہیں ہے؟
جذبات کی ٹھنڈک سے ٹھٹھرتے ہوئے لوگو
حالات کے سورج سے مفر ہے کہ نہیں ہے؟
کیوں تیرا گریباں ہے قتیلؔ اب بھی سلامت
کچھ تجھ پہ نئی رُت کا اثر ہے کہ نہیں ہے؟

اِن اشعار کے ساتھ اگر قتیل کی ایک (پوری) نظم "مرا قلم" بھی سامنے رکھی جائے تو یہ اندازہ لگانے میں بڑی سہولت ہو جاتی ہے کہ نرم و نازک گیتوں [illegible] اپنی ناکردہ خطا یعنی "رومان پرستی" کا یہ "ملزم" یوں بھی اعلان کرتا ہے:

شرر کو پھول بنانا مجھے نہیں آتا — گھٹا کو زلف سمجھنا میرا اصول نہیں
ترس گئے ہوں اگر ہونٹ مسکرانے کو — تو کس زباں سے کہوں، زندگی ملول نہیں

روش روش پہ اگر خار راستہ روکیں — میں کیوں کہوں کہ یہاں سرو ہیں ببول نہیں
مرے قلم نے اگر کوئی بھید کھول دیا
تو اعتراف کروں گا یہ میری بھول نہیں

میرا قلم مرے جمہور کی امانت ہے — اسے عوام کی بے چارگی ستاتی ہے
مرے قلم کی زبان کاٹ دی گئی لیکن — مرے قلم کی خموشی بھی گنگناتی ہے
مرے قلم کی رگوں میں وہ خون جولاں ہے — کہ جس سے عظمت انساں کی آنچ آتی ہے
مرے قلم کو زمانہ تو کیا خریدے گا — کہ اکثر اس سے مشیت شکست کھاتی ہے

میں خود اسیر سہی، میرا فن اسیر نہیں۔
مرا قلم کسی جلاد کا ضمیر نہیں۔

قتیل شفائی کے اس اعلان کا پس منظر بھی سن لیجئے، جو اسی نظم کے پہلے اور دوسرے بند کے ردِ اشعار میں ملتا ہے:

میرے قلم سے تقاضہ ہے شہر یاروں کا
کہ اس کے لب پہ رہے تذکرہ بہاروں کا
یہ بھولا بھالا تقاضہ بجا سہی لیکن — مرے ضمیر کو یہ بندگی قبول نہیں

قتیل شفائی کے یہاں یہ جذبہ پوری استقامت کے ساتھ گذشتہ تیس برس کی شاعری میں ملتا ہے۔ ابتدائی دور میں اُس کے نوجوانی کے مزاج میں عشق و رومان پسندی (پرستی نہیں) کچھ حائل ضرور رہی، مگر جلد ہی وہ اس فضا سے اپنے آپ کو نکال لایا۔ بالخصوص "روزن" اور اس کے بعد کی شاعری میں قتیل کی ابتدائی شاعرانہ روش سے بتدریج گریز واضح طور پر نظر آنے لگتا ہے، اور "چھتنار" تک پہنچتے پہنچتے یہ جذبہ قتیل کے فکر و فن کا لازمہ بن گیا۔

ابلاغ کو ہماری جدیدیت پسند نسل نے ایک مسئلہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ ترقی پسند تحریک کا مرکزی کردار یہی رہا ہے کہ اُس نے ابلاغ کو ابہام پسندی اور لایعنی الفاظ کے گورکھ دھندے سے نکال کر عام فہمی بلکہ عوام فہمی کی راہ دکھائی۔ رجعت پرستوں نے اس پر بہت ناک بھوں چڑھائی، بلکہ ابھی تک ادب میں صحافتی انداز رائج کرنے کا طعنہ دیا جاتا ہے۔ جدیدیت پسند نسل نے ترقی پسند تحریک سے انحراف اور بغاوت کا گُر گرہ میں باندھا اور سب سے پہلا وار سیدھے اور صاف ستھرے طرزِ اظہار پر ہی کیا۔ نتیجہ سامنے ہے۔ حد درد انتہا یہ ہے کہ علامات جیسی نازک چیز کو بھی انہوں نے گنجلک اور ثقیل بنا کر ناقابلِ فہم بنا دیا۔ ابلاغ کا اصل معاملہ یہ ہے کہ اگر گفتگو کرنے یا لکھنے والا اپنے خیال اور جذبہ کو پوری طرح سے سمجھتا ہے تو نہ بات کرنا اُس کے لئے مشکل ہوگی نہ لکھنے میں کہیں بے جا تاویلات اور مبہم الفاظ کا سہارا لینے کی ضرورت پڑے گی۔ بات یہ نہیں ہے کہ علامتی شعر اور علامتی نثر کوئی عیب یا گھٹیا بات ہے۔ مگر بات یہ بھی تو نہیں ہے کہ مروجہ غیر علامتی اسلوب اور اظہار کوئی عیب یا گھٹیا پن ہے۔

ساری بات اتنی ہے کہ کہنے اور لکھنے والا جو کچھ کہہ اور لکھ رہا ہے، اُس میں کہیں گوشت پوست کا آدمی بولتا بھی ہے یا نہیں؟ یہ آواز کہیں "غیر مرئی" یا "فوق البشری" آواز تو نہیں بن رہی ہے؟ سیدھی سی بات ہے کہ فرشتوں کے لئے لکھنا ہے تو پہلے اُن کی زبان اور بولی سیکھئے، اور اگر آدمیوں اور انسانوں کے لئے لکھنا ہے

تو اُن کی زبان اور اُن کی بولی نہ سمجھیئے۔ رہ گئی بات، ہر بات میں فلسفہ بگھارنے کی تو یقین کیجیے کہ فلسفہ اتنا آسان نہیں ہے کہ مونگ یا مسور کی دال میں بھی اس کا بگھار لگایا جا سکتا ہو۔

قتیل شفائی کے اسلوب اور اظہار میں ایک روانی، ایک شگفتگی اور ایک بہاؤ ہے۔ ابلاغ اُس کے یہاں مسئلہ نہیں ایک فریضہ ہے۔ فرض کی ادائیگی کو مسئلہ بنا دینا "نااہل" کے ٹریبیونل کے سامنے پیشی لگوانا ہے۔ قتیل شفائی نے زبان و بیان کی پُر پیچ راہوں کو اس ہی لیئے ہموار پگڈنڈی بنائے رکھا ہے کہ وہ جانتا ہے کہ اُسے کیا کہنا ہے، کِس سے کہنا ہے، اور کس کی طرف سے کہنا ہے۔ قتیل کے ان اشعار کو پڑھیے،

کون اس دیس میں دے گا ہمیں انصاف کی بھیک
جس میں خونخوار درندوں کی شہنشاہی ہے
جس میں غلّے کے نگہبان ہیں وہ گیدڑ جن سے
قحط و افلاس کے بھوتوں نے اماں چاہی ہے۔

زندگی بھوک مٹائے کہ ہوا سے کھیلے — مطمئن پیٹ نہیں ہے تو وفا کیسی ہے۔
برہنہ جسم کو تلقین حیا۔ کیا معنی! — سانس رُک جائے تو پھر موجِ ہوا کیسی ہے

کیا یہاں قتیل نے رمز و اشاریت کے گُروں کو نہیں برتا ہے؟ کیا ان اشعار میں کہیں کوئی علامت نہیں استعمال ہوئی ہے؟ کیا ان اشعار کے پیچھے جذبے اور جذبات میں گہرائی کا احساس نہیں ہوتا؟ کیا شاعر کے لہجے میں کوئی اُتھلاپن ہے؟ زمانہ سازی ہے؟ یا یہ سب محض سخن سازی ہے؟ کیا وہ بات اُن تک نہیں پہنچ رہی ہے جن سے کہی گئی ہے؟ یا وُہ سمجھنے سے قاصر رہ جائیں گے کہ جن کی نیابت کی گئی ہے؟ شعر و ادب کی کسوٹی تو ان ہی سوالات کے مرکب سے تیار کی جاتی ہے۔ ان میں سے کوئی سوال ایسا نہیں ہے کہ جس کا مطلوبہ اور صحیح جواب نقدِ ادب و شعر کی اِس کسوٹی پر منفی رویہ پیش کرے۔

قتیل شفائی اپنے شعری مواد، رویے، اسلوب اور اظہار میں ہر اعتبار سے سچا فن کار اور کھرا ترقی پسند ہے۔ اُس کے احساس کی تپش اور ادراک کی صلابت دونوں ہی اُس کے سچ اور کھرے پن کی گواہی دیتے ہیں۔ وہ ملمع ساز نہیں ملمع سازوں کے اصل چہروں کی درندگی اور شقاوت کو بے نقاب کرنے والا فنکار ہے؛

آج کہ ہیں نو دولتیوں کے پانچ سواروں میں شامل
چودھری صاحب "سوشل ازم" کے سخت مخالف ہیں
اور پانچوں وقت مصلے پہ لاکھوں کی باتیں کرتے ہیں

قتیل شفائی کے اِس انداز میں اُس کی فنکارانہ صداقت پر کسی علامت یا سمبل کا پردہ نہیں ہے۔ اُس نے جو دیکھا، جو سوچا بس وہی لکھ دیا۔ دیکھنے، سوچنے اور لکھ دینے کا مرحلہ بہت کٹھن ہوتا ہے۔ بشرطیکہ اِن تینوں مراحل میں لکھنے والوں کا شعورِ تاریخ نہ صرف بیدار ہو بلکہ تاریخِ عصر اُس کے دائرہ فکر سے باہر کی بات بھی نہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ قتیل کے یہاں یہ دونوں ہی عناصر موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نہ کبھی اُس کے جذبے کی آنچ دھیمی پڑی ہے اور نہ کبھی اُس کے فکر و نظر کے چراغ کی لَو مدھم ہوئی ہے۔ پچیس تیس برس کی مدت بہت لمبی تو نہیں لمبی ضرور شمار ہوتی ہے۔ اس عرصے میں قتیل کے کتنے ہی ہم سفر فنکار یا تو عہدوں اور جاہ پسندی کی سودا بازیوں کی نذر ہو گئے یا پھر ترقی پسند تحریک پر قدغن اور اِس تحریک سے وابستہ ادیبوں پر حصولِ معاش کی تنگی اور اظہار و بیان پر پہرہ بٹھا دیئے جانے کے عمل سے گھبرا کر جنت کمانے نکل کھڑے ہوئے۔ قتیل نے اس لمبی مدت میں اپنے احساس، شعور، دید و آگہی کی روِش اور قلم کی جنبشِ "مستانہ" کو مردانہ وار باقی

اور برقرار رکھا۔ اُس نے قلم اور کاغذ، دونوں کی حُرمت کیلئے جوش اور جذبے کے ساتھ جنگ جاری رکھی۔ یہ نہیں ہے کہ اذیتوں سے اُس کا واسطہ نہ پڑا ہو، مگر اُس نے نہ کبھی اس کا مرثیہ لکھا، نہ صورتِ حالات پر بَین کیئے۔

اب کہ قتیل شفائی کو قلم اور قرطاس سے رشتہ جوڑے کوئی "نصف صدی کا قصہ ہو رہا ہے، اُس کے پڑھنے والوں کو اس بات پر بہت خوشی اور اطمینان ہے کہ قتیل کے سب دعویٰ میں، اُس کے اندازِ فکر میں، اور اُس کی رفتارِ نگارش میں استقامت، پختگی اور ایک ارتقائی عمل مسلسل جاری رہا ہے۔ کشاکشِ زندگی اور صعوبتوں سے مسلسل دوچار رہنے کے باوجود اُن کا یہ فن کار ہر بار نئے حوصلوں اور نئے ولولوں کے ساتھ اُن کے دوش بدوش اور ہم سفر رہتا ہے۔ قتیل شفائی کی اس روش نے اُس کے فکر و فن کو ہر موڑ پر اور ہر لمحہ متحرک رکھا ہے۔ اُس کے لفظوں کو شگفتگی اور اُس کے ارادوں کو تازگی دی ہے۔ وہ کھلے دل و دماغ کا فن کار ہے۔ اور یہی سب کچھ کسی بھی فن کار کے فن کو سدا بہار اور خود فن کار کو زندۂ جاوید بنانے کی ضمانت دیتا ہے۔

اُس کے بے شمار قارئین کے اس اعتماد میں شریک ہوتے ہوئے مجھے ایک لمحہ کے لئے بھی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ قتیل شفائی اپنے پڑھنے والوں اور ملک کے کچلے اور دبے ہوئے عوام کے لیئے استحصال سے پاک اور پُرمسرت مستقبل کی تعمیر میں اس ہی طرح سے اپنے قلم کو وقفِ پیکار رکھے گا۔ وہ جس طرح آج شاعری کے سچ بولنے کا معترف ہے، آئندہ بھی ایسا ہی رہے گا کہ ہمیں اُس کے لکھے ہوئے لفظوں پر پورا پورا اعتماد اور بھروسہ ہے۔

استادوں کے سائے میں ہم عصروں کے ہجوم میں شعر کہنا شاید خود سیکھا مگر میرے
بہت سے گیتوں بلکہ لفظوں کا ترنم اکثر اوقات برادرِ محترم قتیل شفائی کی یاد
دلاتا ہے سینئر تو ہیں ہی لکھتے بھی بہت اچھا ہیں۔ مجھ سے کہیں بہتر۔
——— جمیل الدین عالی

تاجروں کا دیس اور قتیل

اعزاز احمد آذر۔ ملتان۔ پاکستان

قتیل شفائی ایک فطری شاعر ہے اس کی شاعری عطیۂ خداوندی ہے اور قتیل اس عطیے کو صرف اپنی ذات کے لئے استعمال کرنے کا حامی نہیں ہے۔ وہ اس بات کا قائل ہے کہ ادب اپنے زمانے کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اور آنے والے زمانے کے لئے آئینے تیار کرتا ہے اور ادیب اپنے زمانے کی پیداوار ہوتا ہے جو مستقبل کے لئے شمع روشن کرتا ہے ایک ہوش مند ادیب خود اپنا عہد ہوتا ہے اور وہ عہد اس کے ساتھ ہی ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کی کڑی دوسرے عہد آفریں ادیب سے مل ہوتی ہے اور پھر اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے اور کبھی ختم نہیں ہوتا۔

یہی وہ جذبات ہیں جو قتیل کے قلم سے جلترنگ جیسے شاہکار کی تخلیق کا محرک ثابت ہوئے ہیں۔ آج کے دور میں ذرا ذرا سی ذاتی خواہشات کی تکمیل اور مفاد پرستی کی خاطر انسان جو گھناؤنے کھیل کھیل رہا ہے۔ وہ قتیل کے اسپ تخیل کے لئے تازیانے سے کم نہیں جلترنگ اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ قتیل کے حساس دل کو اس کے اردگرد بکھرے ہوئے آنسو اور آہیں کتنا صدمہ پہنچاتے ہیں چند سکوں کی خاطر آج ہر اس چیز کا سودا ہو رہا ہے جو بظاہر ناقابل فروخت ہوتی ہے۔ آج کا انسان کس قدر گھٹ گیا ہے۔ یہی وہ احساس ہے جس نے قتیل سے یہ کہلا دیا۔ ؎

زبانیں، دل، ارادے، فیصلے، جاں بازیاں، نعرے
یہ آئے دن کے ہنگامے یہ رنگا رنگ تقریریں
یہاں ہر چیز بکتی ہے خریدارو! بتاؤ کیا خرید وگے؟

علی الاعلان ہوتے ہیں یہاں سودے ضمیروں کے
یہ وہ بازار ہے جس میں فرشتے آکے بک جائیں
یہاں ہر چیز بکتی ہے، خریدارو! بتاؤ کیا خرید وگے؟

قتیل ایک پُرخلوص اور صداقت پسند شاعر ہے مگر اس کا یہ خلوص اور صداقت پسندی تمام تر جذباتی نہیں ہے۔ وہ سماجی اور انسانی شعور کا حامل ہے۔ اس کی شاعری میں موضوع کا تنوع اور ہمہ گیری اور فکری خیال کی وسعت اور گہرائی موجود ہے۔ اس کی نظمیں اس کی اپنی زندگی کی عکاس ہیں اور

چونکہ اس کی شاعری میں خونِ جگر کی گرمی موجود ہے اس لئے اس میں دلکشی بھی زیادہ ہے۔

جلترنگ میں قتیل کی نظموں کا محور اس کا اپنا معاشرہ اور ماحول ہے۔ وہ جب یہ دیکھتا ہے کہ ایک ہی ماحول میں بسنے والے دو انسان آپس میں کس قدر بُعد رکھتے ہیں۔ دولت کی دیوار نے ان کے درمیان کس قدر فاصلہ پیدا کر دیا ہے۔ احتیاج مندوں کے لئے اہلِ زر کی زندگی، خوشیاں اور راحت سامانیاں ایک عذاب بن کے رہ گئی ہیں اور بے بس و مجبور انسانوں کے شب و روز اہلِ ثروت کے ماتھے کی ایک شکن کے رحم و کرم پر کٹتے ہیں۔ مگر قتیل جانتا ہے کہ دولت کے بل پر عزت دار کہلانے والے یہ سیہ کار لوگ رات کی تاریکی میں اپنی اصلیت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ وہ جب ان لوگوں کو مفلسوں کی عزت سے کھیل کر جشنِ ثروت مناتے دیکھتا ہے تو بے اختیار کہہ اٹھتا ہے

نظر کی نغمگی، زلفوں کے بل، ہونٹوں کی شیرینی
یہاں ہر چیز جھوٹے پیار پر مجبور ہوتی ہے
یہاں کردار کے اجلے صنم ڈھالے نہیں جاتے
یہاں ہر زندگی گفتار پر مجبور ہوتی ہے

جھروکے سے جھکتے ہیں یہاں ہنستے ہوئے قاتل
یہاں چکتا ہے سودا زندگی کی التجاؤں کا
یہاں دن کو بدن تلتے ہیں میزانِ حکومت میں
یہاں جمتا ہے راتوں کو اکھاڑا رہنماؤں کا

خریدارو یہاں ہر رات جشنِ عام ہوتا ہے
یہ وہ منڈی ہے جس میں پیار کا نیلام ہوتا ہے

قتیل کی شاعری موضوع کے تنوع کے ساتھ ساتھ لطیف احساسات کا مجمع بھی ہے لیکن اس کا شیشۂ دل اتنا نازک بھی نہیں کہ ہر سنگِ تاثر اسے توڑ دے۔ اس کے قلم نے نظم اور غزل دونوں بزموں کو سجایا ہے۔ اس کی وسعتِ تخیل لامحدود ہے۔ راہ کی ہر ٹھوکر اس کے دل میں نئے ولولے کو جنم دیتی ہے۔ اور وہ اپنے ہر نقشِ قدم سے شعر و سخن کے چراغ جلاتا ہے۔ شعر گوئی قتیل کی فطرت ہے۔ یہ وہ فن کار ہے جس کے گیتوں میں پائل کی جھنکار بھی ہے اور مجاہد کی للکار بھی۔ نغمات کا سوز بھی اور ساز بھی۔ اور رنگ بھی ہے ڈھنگ بھی۔ غرض کہ محاسن کا ایک بے کراں سمندر ہے جو سمٹ کر قتیل کے کوزۂ ذہن میں سما گیا ہے۔ لیکن قتیل کو زمانہ ایسا ملا ہے کہ اس کا طائرِ تخیل لامحدود وسعتوں میں پرواز کرنے کے شوق میں حرص و ہوس کے بکھرے ہوئے جال میں اسیر ہو کر رہ گیا ہے۔ جاگیرداروں اور سرمایہ پرستوں کی لگائی ہوئی آگ میں جلنے والے مزدوروں اور دہقانوں کی حالت دیکھ کر قتیل خون کے آنسو روتا ہے۔ صبح و شام ایک کرنے کے باوجود جب دہقان کو اپنی کاشت کی ہوئی فصل میں سے دو وقت کی روٹی بھی میسر نہیں آتی تو اس کا دل تڑپ اٹھتا ہے اور پھر اس کی آنکھوں کے سامنے

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی　　　　اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

کے خالق کی تصویر گھوم جاتی ہے اور قتیل دہقانوں کے لئے آنسو بہانے والے اقبال کو یوں مخاطب کرتا ہے ؎

تو نے دہقانوں کے ماتھے کا پسینہ پونچھ کر
خوشۂ گندم کا ان کو دانہ دانہ دے دیا
آج لیکن تیری آنکھیں بند ہو جانے کے بعد
بھوک نے کھیتوں کو حسنِ مجرمانہ دے دیا
تو نے مزدوروں کی محنت کے تحفظ کے لئے
شہریاروں کی رعونت کو ملایا خاک میں
آج لیکن تیری آنکھیں بند ہو جانے کے بعد
کچھ نہیں ہے مفلسوں کے دامنِ صد چاک میں

رقص گاہوں سے مزاروں تک تیرے نغمے لُٹے کوچے کوچے میں تیرے پیغام کو بیچا گیا

مگر قتیل حالات کی پیچیدگی اور وقت کی نزاکت کو سمجھتا ہے۔ اسے احساس ہے کہ جرم بے گناہی کی تعزیریں بڑھتی جا رہی ہیں اور کسی مجبور کو اپنی بے بسی کا رونا رونے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ ہر صبح اپنے ساتھ ایک نیا فرمانِ شاہی لے کر طلوع ہوتی ہے اور وقت کی چکی میں پسنے والوں کو عہد وفا باندھنے کا سبق دیا جاتا ہے۔ مگر یہ حقیقت کے اس شناور کا قلم منہ زور گھوڑے کی مانند ہے۔

زندگی بھوک مٹائے کہ ہوا سے کھیلے
مطمئن پیٹ نہیں ہے تو وفا کیسی ہے
برہنہ جسم کو تلقینِ حیا کیا معنی
سانس رک جائے تو پھر موجِ ہوا کیسی ہے

وہ جانتا ہے کہ جب ایوانِ شاہی میں سیہ فام قوانین جنم لیتے ہیں اور امن جہاں کے دشمن جب جشنِ ثروت مناتے ہیں تو موت اپنے ہاتھ میں قرطاس و قلم لے کر نکل آتی ہے۔ مجلہ مجلہ زرکار میں بیٹھے بیٹھے اپنے جمہور سے پیمانِ وفا باندھنے والوں سے تاریک گھروں کے لئے ضیاء مانگتی ہے۔ مگر دیواروں سے سر ٹکرانے والے صرف اپنا سر پھوڑ کر رہ جاتے ہیں۔ اور ایوانِ شاہی کی دیواروں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ مجبور اور بے بس لوگوں کی آہ و زاری آسمانِ زر کو چیر کر خداوندانِ ثروت تک کبھی نہیں پہنچتی۔ لیکن اگر کوئی ایسی آواز گوشِ شاہانہ سے ٹکرانے کی جرأت کرے بھی تو جلالِ شاہی غضب میں آجاتا ہے۔

جب تڑپتا ہے کوئی درد کی سوغات لے کر
اپنے درماں کے لئے خدمتِ جاہی میں
حکم ہوتا ہے کہ فریاد نہ ہونے پائے
جگمگاتے ہوئے ایوانِ شہنشاہی میں

قتیل کے ذہن میں بار بار جو سوال پیدا ہوتا ہے وہ صرف اور صرف یہ ہے کہ اس سفاکی، اس تشدد، اس محرومی، اس مجبوری اور اس بے بسی کا سبب آخر کیا ہے۔ لیکن قتیل کے ذہن کے ایک گوشے سے یہ آواز بھی اٹھتی ہے کہ مجبوری و بے بسی اور یہ الجھنیں انسان کی خود پیدا کردہ ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اگر بے حسی کا ضمیر زندہ ہے اور اسے احساس کے شعلوں سے حرارت پہنچتی ہے۔ اگر اس کا خون اب تک پرسکون اور ساکن سمندر کی طرح ہے۔ اگر اب تک اس میں کوئی طوفان نہیں اٹھا تو اس کی تڑپ کو میں پیار کا تحفہ دوں گا۔ محبت کا انعام دوں گا۔ لیکن انھیں سب سے پہلے کوئی یہ کہہ دے کہ آئندہ یہ گھناؤنے کھیل نہیں کھیلے جائیں گے۔ ماضی کے افسانے نہیں دہرائے جائیں گے۔ کسی مجبور و بے بس جوانی کو بازار میں نہیں لایا جائے گا۔ محبت کو سنہری طوق نہیں پہنائے جائیں گے۔ اور آتش زر داری خلوص و دلربائی کو جلا کر خاک نہیں کر دے گی کیوں کہ وہ اپنے ضمیر کی آواز کو اور دل کی دھڑکنوں کو دبا نہیں سکتا۔ وہ جب اپنے چاروں طرف پھیلے ہوئے آنسوؤں کے سمندر کو دیکھتا ہے تو اُسے خود اپنی زندگی کی کشتی ڈولتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اسے جب آہوں کے شعلے چاروں طرف اٹھتے نظر آتے ہیں تو وہ اپنا دامن نہیں بچا سکتا اور اس کا قلم چیخ اٹھتا ہے۔

کس کے دامن پہ گرائے کوئی جلتے آنسو
کس کی دہلیز پہ برسے گی یہ قسمت کھوئی
بھوک اگلتے ہوئے کھیتوں میں بچارے دہقاں
ہل چلاتے ہوئے چلاتے ہیں روٹی روٹی

کون اس دیس میں دے گا ہمیں انصاف کی بھیک
جس میں خونخوار درندوں کی شہنشاہی ہے
جس میں غلے کے نگہبان ہیں وہ گیدڑ جن سے
قحط و افلاس کے بھوتوں نے اماں چاہی ہے

قتیل کے قلم میں وہ بے باکی اور حقیقت بیانی ہے کہ اس کے اشعار پڑھتے پڑھتے قاری کسی گہری سوچ میں ڈوب جاتا ہے۔ قتیل ایک فنکار ہے۔ اس کا فن اس کی زندگی ہے۔ اپنے فن کو زندہ رکھنے کے لئے قتیل کو کئی کٹھن مراحل سے گذرنا پڑا ہے۔ اس فن کی تکمیل کے لئے اُسے وہ ماحول ملا ہے جس کے تصور ہی سے روح کانپ اٹھتی ہے۔ قتیل کو حالات کی کٹھالی میں سے گذرنا پڑا ہے۔ وقت کی چکی میں پسنا پڑا ہے۔ اور گردش زمانہ سے نبرد آزما ہونا پڑا ہے۔ لیکن اس نے اپنے فن کو کسی مقام پر نہیں چھوڑا۔ حالات سے سمجھوتہ کرنا قتیل کی شان کے خلاف ہے۔ وہ اسے اپنے فن کی توہین تصور کرتا ہے۔ لیکن ایک فن کار کو اپنا فن زندہ رکھنے کے لئے جس کڑی آزمائش سے گذرنا پڑتا ہے اور ہمارے معاشرے میں ایک فن کار کی زندگی جس عذاب سے گذرتی ہے چونکہ اس کا ایک شدید اور گہرا تجربہ قتیل کو بھی ہوا ہے لیکن ان سب متوقع اور غیر متوقع آلام و مصائب کے باوجود قتیل کے پائے استقلال میں لغزش نہیں آئی اور آخر اس نے اپنے فن کا سکہ بٹھا لیا اور اپنے فن کے راستے میں دیوار بننے والوں سے آخر اپنا لوہا منوا لیا اور آج قتیل دنیائے ادب کا ایک درخشندہ تابندہ ستارا ہے۔ مگر یہ مقام حاصل کر لینے کے باوجود اس کے دل سے ایک خلش نہیں مٹی۔ وہ چنگاری جو مدت سے اس کے سینے میں سلگ رہی تھی ابھی نہیں ——— وہ طوفان جو اس کے اندر اُٹھ رہا تھا تھما نہیں ——— وہ لاوا جو مدت سے اس کے ذہن میں پل رہا تھا۔ ٹھنڈا نہیں ہوا ———

اور وہ بجلیاں جو اس کے قلم میں بیتاب تھیں ماند نہیں پڑیں ....

اسے اس مقام تک پہنچنے کے لئے جن خارزاروں سے گزرنا پڑا ہے۔ انہوں نے اس کے سینے میں سلگنے والی چنگاری کو اور بھڑکا دیا اور اس کے اندر کے طوفان کو اور تند و تیز کر دیا۔ اسے اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ وہ اپنے گاؤں سے سینکڑوں میل دور والدین کی نظروں سے اوجھل وہ روزگار کے ساتھ نیک نامی بھی کمانے آیا تھا۔ آج اگرچہ اس کے ماں باپ اپنے بچے کا نام آسمان کی بلندیوں پر دیکھ رہے ہیں لیکن قتیل اس سے بالکل مطمئن نہیں۔ اسے اپنا یہ عروج اور یہ مقام بالکل متاثر نہیں کر سکا ہے۔ اس کے نزدیک اچھی اور کامیاب زندگی کا تصور کچھ اور ہے۔ اسے فن بیچ کر عروج حاصل کرنا قطعی پسند نہیں ہے۔ اپنے شہپاروں کی نیلامی اس کے لئے اذیت ناک ہے۔ چند ٹکوں کی خاطر اس کی تخلیقات کی قربانی قیامت سے کم نہیں ہے۔ اسے اپنے موجودہ مقام تک پہنچنے میں جس قدر تجربات حاصل ہوئے ہیں انہوں نے اس کے ذہن میں ابلنے والے لاوے کو اور آنچ دی ہے۔ اور یہ لاوا یکدم پھٹ پڑا۔ اور اپنی نظم "تاجروں کے دیس میں" میں قتیل نے اپنے احساسات و تجربات کا بڑی خوبصورتی اور سنجیدگی سے اظہار کیا ہے۔

ماں۔ یہ تیرے افلاس کے سب واہمے بے سود ہیں
میری پلکوں پر تیرے آنسو ابھی موجود ہیں
میرے سینے میں تری ہی بے بسی کا درد ہے
تیرے چہرے کی طرح میرا بھی چہرہ زرد ہے
بھیس لایا ہوں اگر تجھ سے میں اپنے آپ کو
ٹوک سکتی ہے تری ممتا میرے اس پاپ کو
لیکن اے بوڑھے بڑھاپے کی مقدس رازدار
گھر پہ فاقے آج بھی کرتے ہیں میرا انتظار
دن ڈھلے پڑتا ہے جب پہلا قدم دہلیز پر
تیر جاتی ہے نظر کی مردنی ہر چیز پر

اور پھر قتیل کا قلم اپنی جولانیاں دکھاتا ہے۔ ؎

تو سمجھتی ہے کہ میں چاروں طرف مشہور ہوں
کون سمجھائے تجھے میں کس قدر مجبور ہوں
کون اس فن کو کرے گا جذب اپنی ذات میں
جو لگائے بھوک کے پیوند احساسات میں
جی میں آتا ہے کہ ایسے فن کا دامن چھوڑ دوں
میرے بس میں ہو تو شہرت کے پروں کو توڑ دوں

اور شہرت کے اس عظیم مقام کو پا لینے کے باوجود روٹی کا سوال قتیل کے لئے بھی ابھی حل طلب ہے۔ وہ واشگاف الفاظ میں

ماں سے کہتا ہے کہ تو نے صرف مجھ میں امارت کا سراغ پایا ہے۔ میرا نام تو نے صرف اوجِ ثریا پر دیکھا ہے لیکن تجھے کیا معلوم کہ

دور کوسوں دور تجھ سے علم و فن کے دیس میں
بک رہی ہے بھوک میری تاجروں کے دیس میں

قتیل ملتجیانہ انداز میں ماں سے کہہ رہا ہے کہ تو جسے شہرت و عظمت گردانتی ہے۔ وہ تاجروں کے اس دیس میں جنسِ خام ہے۔ تجھے کیا معلوم کہ کرمکِ شب تاب سے کسی کو کبھی ایک روشنی نہیں مل سکتی۔ اور خوابوں کا جادو کسی بھی زندگی میں سکون و اطمینان پیدا نہیں کر سکتا ہے اور پھر وہ اپنی اس عظمت کا بھرم یوں توڑ دیتا ہے۔

رات بھر جب ذہن میں بوتا ہوں فن پارا کوئی
کاٹتا ہوں صبح دم ٹوٹا ہوا تارا کوئی
صبح سے جب شام تک کنگال ہو جاتا ہوں میں
آپ اپنے مال کا دلال ہو جاتا ہوں میں
کوڑیوں کے مول بک جاتے ہیں فن پارے مرے
بجھ گئے ہیں پڑ کے کیچڑ میں انگارے میرے

لیکن ہر طرف چھائے ہوئے مہیب اندھیرے میں قتیل کو روشنی کی ایک کرن نظر آتی ہے۔ مایوسیوں کے تند و تیز طوفان میں اُمید ایک سہارا بن کر اسے تھامتی ہے۔ حالات کی چکی میں پستے ہوئے اُس کے اندر ایک ایسی خود اعتمادی پیدا ہو گئی ہے اور زمانے کی گردش اور ماحول کی پیرہ دستیوں نے اب اس کے اندر ایک ایسی لازوال قوت پیدا کر دی ہے کہ وہ بے خود ہو کر کہہ اُٹھتا ہے۔

لیکن اب حالات کی نبضوں پہ میرا ہاتھ ہے
ہر قدم پر آج تیری بھوک میرے ساتھ ہے
اب جو اپنے فن کو مستقبل پہ لہراؤں گا میں
ان گنت ماؤں کے دل کا چین بن جاؤں گا میں

قتیل شفائی چونکہ میرا دوست، ہم سفر، ہم جنس، ہم عصر، ہم مشرب، ہم پیشہ اور ہم جلیس ہے اس لئے اس نے مجھے کبھی کبھار اورنگ زیب کی باتیں بھی بڑے مزے لے لے کر سنائی ہیں۔ میں نے باتوں باتوں میں یہ پتہ چلا لیا ہے کہ اورنگ زیب کس طرح قتیل شفائی بنا ہے۔ اس تبدیلی کا عمل تقریباً وہی ہے جو پانی کے قطرے کو گہر بنا دیتا ہے۔ اب یوں سمجھئے کہ اگر اورنگ زیب ایک شخص تھا تو قتیل شفائی ایک شخصیت ہے۔

قتیل شفائی نے مجھے بتایا کہ اورنگ زیب تقریباً تیس سال پہلے ہری پور ہزارہ کے ایک خوشحال گھرانے میں پیدا ہوا۔ ماں باپ کی پہلی اولاد جس لاڈ پیار اور جس ناز و نعم سے پالی جاتی ہے اورنگ زیب کو بھی ماں باپ کا وہی لاڈ پیار ملا۔ اچھے

ماں باپ، اچھا گھر، اچھی غذا، اچھے لباس، اچھی تربیت اور اچھا ماحول ــــــــ ان ساری اچھائیوں نے ننھے اورنگ زیب پر بڑا اچھا اثر ڈالا چنانچہ گھر ہو یا اسکول ہر جگہ لوگ بڑے پیار سے یہی کہتے تھے کہ اورنگ زیب بڑا اچھا لڑکا ہے ــــــــ

لوگ آج کل قتیل شفائی سے ملنے کے بعد پہلا تاثر یہی قائم کرتے ہیں کہ قتیل نہ صرف شاعر اچھا ہے بلکہ آدمی بھی اچھا ہے۔ یہ اچھائی دراصل اسے ماں باپ کے خون کے ذریعہ ورثہ میں ملی ہے اور اس کو اورنگ زیب نے برسہا برس تک اپنے پاس امانت کے طور پر رکھا اور پھر جب قتیل شفائی صرف شعر گوئی کی صلاحیت لے کر اورنگ زیب سے ملا تو اورنگ زیب کو قتیل شفائی کی بے مائیگی پر ترس آیا اور اس نے اپنی ساری اچھائیاں قتیل شفائی کے حوالے کر دیں۔

یہی وجہ ہے کہ عام شاعروں کی طرح ہم قتیل کے بارے میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ ؎

شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

(اذر)

نہ کوئی خواب ہمارے ہیں نہ تعبیریں ہیں
ہم تو پانی پہ بنائی ہوئی تصویریں ہیں

(قتیل شفائی)

نظمیں



شاعری سچ بولتی ہے

لاکھ پردوں میں رہوں بھید مرے کھولتی ہے
شاعری سچ بولتی ہے
میں نے دیکھا ہے کہ جب میری زباں ڈولتی ہے
شاعری سچ بولتی ہے
تیرا اصرار کہ چاہت مری بے تاب نہ ہو
واقف اس غم سے مرا حلقۂ احباب نہ ہو
تو مجھے ضبط کے صحراؤں میں کیوں رولتی ہے
شاعری سچ بولتی ہے
یہ بھی کیا بات کہ چھپ چھپ کے تجھے پیار کروں
گر کوئی پوچھ ہی بیٹھے تو میں انکار کروں
جب کسی بات کو دنیا کی نظر تولتی ہے
شاعری سچ بولتی ہے
میں نے اس فکر میں کاٹیں کئی راتیں کئی دن
مرے شعروں میں ترا نام نہ آئے — لیکن
جب تری سانس مری سانس میں رس گھولتی ہے
شاعری سچ بولتی ہے
ترے جلوؤں کا ہے پرتو مری ایک ایک غزل
تو مرے جسم کا سایہ ہے تو کترا کے نہ چل
پردہ داری تو خود اپنا ہی بھرم کھولتی ہے
شاعری سچ بولتی ہے

دُعا

نقرئی جھانجھنوں کی جھنن جھن جھنن دوُدھ سے پاؤں کو گدگداتی رہے،
گنگناتی رہیں کانچ کی چوڑیاں، ہر کلائی نئے گیت گاتی رہے
ہر جوانی سدا مسکراتی رہے

گاؤں سے دُور کھیتوں کے اُس پار، وہ صاف شفّاف چشمہ اُبلتا رہے
شوخ پنہاریوں کا حسیں جمگھٹا گاگریں لے کے راہوں پہ چلتا رہے
حسن منظر کے سانچے میں ڈھلتا رہے

گرمیوں کی کڑکتی ہوئی دھوپ میں جھوم کر پیڑ سائے لٹاتے رہیں
ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کے پالے ہوئے مست جھونکے شجر میں پلاتے رہیں
نیند بن کر نظر میں سماتے رہیں،

چودھویں رات کے چاند کی چاندنی کھیتیوں پر ہمیشہ بکھرتی رہے
ان گنت رہگزاروں پہ پھیلے ہوئے ہرا جالے کی رنگت نکھرتی رہے
نرم خوابوں کی گنگا ابھرتی رہے

عید کا دن یونہی روز آتا رہے، ڈھولکوں پر یونہی تھاپ پڑتی رہے
منچلی لڑکیوں میں ہنسی کھیل پر نت نئے ڈھب سے بنتی بگڑتی رہے
کوئی مانے تو کوئی اکڑتی رہے

شہر سے لوٹ کر آنے والے جواں گاؤں میں جوق در جوق آتے رہیں
اپنی اپنی دُلہن کے لئے نت نئی سونے چاندی کی سوغات لاتے رہیں
زندگی کے محل جگمگاتے رہیں

وادیِ سرن کی ایک صبح

کوہِ سرن کی آغوشِ گلپوش میں نقرئی بادلوں نے بسیرا کیا
رات بھر بوندیاں رقص کرتی رہیں، بھیگی موسیقیوں نے سویرا کیا
ہو گئیں صاف شفاف پگڈنڈیاں، میلی میلی چٹانوں کے منہ دھل گئے
سوئی سوئی فضا آنکھ ملنے لگی، بیلی بیلی ہواؤں کے پر تُل گئے
وجد میں آ گئیں شوکتی جھاڑیاں، مست جھرنے سنئے گیت گانے لگے
اُونچے اُونچے صنوبر لہکتے ہوئے مل کے جشنِ مسرت منانے لگے
ذرّے ذرّے کا چہرہ دمکنے لگا، سنگریزوں میں ہیروں سی تاب آ گئی
سارا ماحول اک آئنہ بن گیا، روئے فطرت پہ تابندگی چھا گئی
پیارے پیارے پرندے چہکتے ہوئے آشیانوں سے اُڑ اُڑ کے آنے لگے
ننھے ننھے سے پر پھڑپھڑاتے ہوئے کوئی بے نام سا گیت گانے لگے،
ٹوٹی پھوٹی سی کٹیاؤں میں چونک کر مست چرواہے بیدار ہونے لگے
گونج اٹھیں مرلیوں کی رسیلی دھنیں، ہونٹ گیتوں کی مالا پرونے لگے
سرد چشمے پہ البیلی پنہاریاں دم بخود رس بھرے گیت سننے لگیں
جانی پہچانی آواز پہچان کر حسرتوں کے حسیں جال بُننے لگیں،

بھروسہ

ایک پتنگا
تنہا تنہا !
شام ڈھلے اس فکر میں تھا
یہ تنہائی کیسے کٹے گی ؟

رات ہوئی
اور شمع جلی
مغموم پتنگا جھوم اٹھا
ہنستے ہنستے رات کٹے گی

صبح ہوئی
اور سب نے دیکھا
راکھ پتنگے کی اڑ اڑ کر
شمع کو ہر سو ڈھونڈ رہی تھی ۔

یہ حدیں یہ فاصلے

دیدۂ حیرت سے مجھ کو دیکھتی ہیں آج کل
تیرے کوچے کی پرانی رہنے والی لڑکیاں
سر جھکائے جب گزرتا ہوں ترے کوچے سے میں
چلمنوں کو نوچتی ہیں یہ نرالی لڑکیاں
ڈوب سی جاتی ہیں ماضی کے سنہرے خواب میں
گوری گوری، پیلی پیلی، کالی کالی لڑکیاں

میں کہ تیری خلوتوں سے کل تلک سرشار تھا
آج تیری جلوتوں سے بھی سراسر دور ہوں
ایک نغمہ تھی تجھے کل تک مرے قدموں کی چاپ
آج تیرے لب پہ میں ایک حرفِ نامشکور ہوں
یہ نگاہوں کی حدیں، یہ دھڑکنوں کے فاصلے
تجھ سے اپنا حالِ دل کہنے سے بھی معذور ہوں

زندگی کے بے وفا رنگوں کی یہ قوسِ قزح
ایک ہی حدِ نظر پر کیوں جمی رہتی نہیں
آرزوؤں کی زباں میں پیار کہتے ہیں جسے
کیوں سدا اس پیڑ کی چھاؤں گھنی رہتی نہیں
کیوں تلوّن کے لٹیرے لوٹ لیتے ہیں انھیں
رہروؤں میں تا بہ منزل کیوں بنی رہتی نہیں

کیوں نہیں اٹھتی ہے اب میری نظر تیری طرف
سوچتی ہوں گی دلوں میں بھولی بھالی لڑکیاں
کون سمجھائے انھیں ترکِ محبت کا سبب
ہائے یہ کم فہم، یہ نازوں کی پالی لڑکیاں
دیدۂ حیرت سے مجھ کو دیکھتی رہیں آج کل
تیرے کوچے کی پرانی رہنے والی لڑکیاں

شام کے دِلرُبا دُھندلکے میں

شام کے دِلرُبا دُھندلکے میں
چیل کے نیم خواب پیڑوں پر
دُور سے جب نگاہ پڑتی ہے
چونک اُٹھتے ہیں بھیگتے سائے
دل میں اک تشنگی سی گڑتی ہے
ہاتھ بڑھتا ہے جب خیالوں کا
شاخِ ماضی سے گرد جھڑتی ہے
اور پھر یاد کے محلکے میں !!
جسم کے ساتھ دِل کی تنہائی
دیر تک ایڑیاں رگڑتی ہے

انتخاب

خوشنما رنگ ترے آنچل کا

جیسے شبنم سے بھری کونپل میں   کسی تتلی کے پروں کا پرتو
جیسے جنگل میں کسی مور کا رقص   جیسے جھونکوں میں کسی شمع کی ضو

تیرے شانوں پہ معطر زلفیں

جیسے برسات کی مہکی رت میں   سانولا گیت کسی بادل کا
جیسے گلزار میں بھنوروں کی اڑان   جیسے ممتا میں دھواں صندل کا

یہ جواں سال خد و خال ترے

مجھ سے تعریف نہیں ہو سکتی   تری ترشی ہوئی رعنائی کی
جس میں شامل ہو توازن کا سرور   تو وہ تصویر ہے چغتائی کی

بن گیا ہے مرا سپنا کل کا
خوشنما رنگ ترے آنچل کا

اس کی نوازشوں کا بھرم کھولنا پڑا
اغیار چپ رہے تو ہمیں بولنا پڑا

کروٹ

ننگے پیڑوں کو ڈھانپنے کے لئے
پھیلے جاتے ہیں ریشمیں سائے
آگئے وہ پروں کو پھیلائے
غول کے غول سبز پریوں کے

ایک کروٹ سی، اور خزاں ناپید
ایک آہٹ سی، اور موسمِ گل
خشک پتوں کی کھڑکھڑاہٹ پر
چھاگیا ہے ترانۂ بلبل!

ابر جھوما تو رند بھی جھومے
جام رقصاں ہیں، مے چھلکتی ہے
قہقہے سُن کے موسمِ گل کے
دُور پت جھڑ کہیں سسکتی ہے

یوں جھکا ہے ندی پہ اک شہتوت
دیکھتا ہو وہ جیسے آئینہ
پیڑ کا عکس ہے کہ سبز آنچل
جس میں لپٹا ہو نقرئی سینہ

خلوتوں کے نصیب جاگ اُٹھے
دل مچلنے لگا ہے پہلو میں،
آج کچھ اُن پہ ہی نہیں موقوف
جی میں آتا ہے خود کو بھی چوہیں

ڈالیاں لد گئی ہیں پھولوں سے
خوشبوؤں سے مہک اُٹھے سائے
جیسے گر کر دُلہن کے ہاتھوں سے
ناگہاں عطر داں اُلٹ جائے

رُباعی

ظلمات کا عفریت جیئے یا نہ جیئے
کیوں موت کے بالیں پہ جلاتی ہے دیئے

اے رات سمیٹ لے ستارے اپنے
انساں ترس گیا ہے سورج کے لئے

نومولود

دریچے کھول دو، پردے ہٹا دو ان کواڑوں سے
کہ میرے خون کی میٹھی حرارت دور تک پہنچے
وہ حسرت جو مری آنکھوں سے رہ رہ کر ہمکتی ہے
نشیبِ خاک سے اڑ کر فرازِ طور تک پہنچے

فرازِ طور، جس پر اک تجلی رقص فرما ہے
نشیبِ خاک کے ذرّوں کی دھڑکن سن نہیں سکتا
وہ آنسو دیکھ کر بھی قہقہوں میں جھومنے والا
شرارے پھانک لیتا ہے ستارے چن نہیں سکتا

مری سانسوں کی شہنائی تو میٹھی راگنی چھیڑے
مگر ہونٹوں کی لرزش پھیل کر فریاد بن جائے
مرے چہرے کی رعنائی تو آنچل چاندنی ڈھالے
مگر آنکھوں کی حسرت، درد کی بنیاد بن جائے
مری معصوم حیرانی ابھی جانے کیسا تماشا ہے
کہ جو بھی دیکھنے آئے سراپا یاد بن جائے
(یہاں اب تلخ یادوں کی نمائش کے سوا کیا ہے)

وہ یادیں تلملاتی ہیں ضمیرِ عہدِ ماضی میں،
جنھیں یک رنگئ حالات نے نغمے سنائے تھے

وہ یادیں کلبلاتی ہیں دماغِ طاقِ نسیاں میں،
جنھیں بے داغ ہاتھوں نے بھی جھولے جھلائے تھے
وہ یادیں آہ وہ یادیں کسے اب ہوش ہے اُن کا
وہ دن شاید کبھی اس گھر میں جھونکا بن کے آئے تھے

یہ دولت اور یہ اونچی حویلی بھی نہ تھی لیکن
تہی دستی کے عالم میں بھی اطمینان تھے کیا کیا
یہ میرے ہم سفر جب منزلِ ہستی پہ ابھرے تھے
تو اُن کی پاسبانی کے یہاں امکان تھے کیا کیا

مقدس ماں کے آنسو آج یہ کہہ کر مجھ پہ ہنستے ہیں
کہ میرے دل کی دھڑکن میرا خالق سُن نہیں سکتا
وہ آنسو دیکھ کر جن کی تہوں میں جھومنے والا
شرارے پھانک لیتا ہے شناسے سُن نہیں سکتا

ہو نہ ہو یہ کوئی سچ بولنے والا ہے قتیلؔ
جس کے ہاتھوں میں قلم پاؤں میں زنجیریں ہیں

تاجروں کے دیس میں

ماں ۔۔۔! ترے افلاس کے سب واہمے بے سُود ہیں
میری پلکوں پر ترے آنسو ابھی موجود ہیں
میرے سینے میں تری ہی بے بسی کا درد ہے
تیرے چہرے کی طرح میرا بھی چہرہ زرد ہے
چھین لایا ہوں اگر میں تجھ سے اپنے آپ کو
ٹوک سکتی ہے تری ممتا مرے اس پاپ کو
لیکن اے بھوکے بڑھاپے کی مقدس رازدار
گھر پہ فاقے آج بھی کرتے میرا انتظار
دن ڈھلے پڑتا ہے جب پہلا قدم دہلیز پر
تیر جاتی ہے نظر کی مُردنی ہر چیز پر
رُخ پہ اطمینان کا بہروپ بھر لیتا ہوں میں
سو بہانے اپنی مجبوری سے کر لیتا ہوں میں
ماں ۔۔۔! تری سادہ دلی ڈھلتی ہے جب تحریر میں
تلملاتی ہے نظر اک بے صدا زنجیر میں،
تو کبھی ان دیکھے محلوں سے بلاتی ہے مجھے
پھر بھی تیری خود فریبی ڈھونڈ لاتی ہے مجھے
بے مروّت فکر کی ہر بات سُن لیتی ہے تُو
موتیوں کے روپ میں کنکر بھی چُن لیتی ہے تُو
تو سمجھتی ہے کہ میں چاروں طرف مشہور ہوں
کون سمجھائے تجھے میں کس قدر مجبور ہوں!

کون اس فن کو کرے گا جذب اپنی ذات میں،
جو لگائے بھوک کے پیوند احساسات میں

جی میں آتا ہے کہ ایسے فن کا دامن چھوڑ دوں
میرے بس میں ہو تو شہرت کے پروں کو توڑ دوں

ماں ــ! سمجھتا ہوں کہ مجھ سے کیا شکایت ہے تجھے
میری ہی مانند روٹی کی ضرورت ہے تجھے

تُو نے پایا ہے اگر مجھ میں امارت کا سراغ
گونج اٹھا ہے تیرے احساسات سے میرا دماغ

تیرے جیتے جی اگرچہ میں سنا قاتل ترا
میرے سینے میں دھڑکتا ہے ابھی تک دل ترا

تیرے خوں سے آج بھی رگ رگ مری سیراب ہے
جس کی میں تعبیر ہوں تُو وہ شگفت خواب ہے

لیکن اے بھوک کے بڑھاپے کی مقدس رازدار
گھر پہ فاقے آج بھی کرتے ہیں میرا انتظار

دُور کوسوں دُور تجھ سے علم و فن کے بھیس میں
بک رہی ہے بھوک میری تاجروں کے دیس میں

ماں ــ! ترے نزدیک جس شہرت کا عظمت نام ہے
تاجروں کے دیس میں وہ چیز جنسِ خام ہے

رات بھر جب ذہن میں بوتا ہوں فن پارا کوئی
کاٹتا ہوں صبح دم ٹوٹا ہوا تارا کوئی!

روشنی کس کو ملی ہے کرمکِ شب تاب سے
کس نے اطمینان پایا ہے فسونِ خواب سے

صبح سے جب شام تک کنگال ہو جاتا ہوں میں
آپ اپنے مال کا دلّال ہو جاتا ہوں میں

کوڑیوں کے مول بک جاتے ہیں فن پارے مرے
بجھ گئے ہیں بارہا کیچڑ پہ انگارے مرے

لیکن اب حالات کی نبضوں پہ میرا ہاتھ ہے
ہر قدم پر آج تیری بھوک میرے ساتھ ہے

اب جو اپنے فن کو مستقبل پہ لہراؤں گا میں
ان گنت ماؤں کے دل کا چین بن جاؤں گا میں

طوائف

یہ جواں سال اُمنگیں، یہ اچھوتے ارماں
کس کی جھولی میں یہ انمول ستارے بھردوں
کون ہے جو مری زلفوں کی گھٹا سے کھیلے
کس کی آنکھوں میں سحر تاب اشارے بھردوں

یہ جواں سال اُمنگیں، یہ اچھوتے ارماں
آج تک جسم کی دیوار سے آگے نہ بڑھے
جسم نے جبر کا ہر وار سہا ہے، لیکن
یہ ہٹیلے کبھی انکار سے آگے نہ بڑھے

لُٹ گیا میرے بدن کا وہ تبسم لیکن
اس سے عصمت کا تقدس تو نہیں چھن سکتا
پیاس بجھتی ہے سرابوں کے نظاروں سے کہیں
جاگنے سے کوئی تارے تو نہیں گن سکتا

زندگانی کے عوض شرم و حیا کا نیلام
مجھ پہ اپنوں نے بھلا ظلم یہ توڑا کیوں تھا؟
میری اُلجھی ہوئی سانسوں کو پرکھنے والو
غیر کے رحم و کرم پر مجھے چھوڑا کیوں تھا؟

اُف یہ بے درد زمانے کے المناک اُصول
آپ ہی ظلم کرے، آپ ہی انصاف کرے
لذت و جبر کا فرق اس کو نہیں ہے معلوم؟
کون اس مصلحت اندیش کا دل صاف کرے

اُف یہ نفرت بھری نظروں کے بھیانک سائے
کاش اس رات کے پہلو میں سویرا ہوتا
یا مرے پاس بھی ہوتی کوئی تابندہ کرن
یا ہر اک سمت اندھیرا ہی اندھیرا ہوتا

ہائے یہ رات، یہ خلوت یہ اُلجھتے ہوئے خواب
کس کی آنکھوں میں سحر تاب اشارے بھر دوں
یہ جواں سال اُمنگیں یہ اچھوتے ارماں
کس کی جھولی میں یہ انمول ستارے بھر دوں

اقبال کے تاجر

رقص گاہوں سے مزاروں تک تُو ہی تُو جلوہ گر
کلغیوں کی شان تجھ سے گدیوں کا لال تُو
کیسے کیسے مصر کے بازار ہیں تیرے لئے
دیکھ اپنے تاجروں کا نامۂ اعمال تُو

تُو نے دہقانوں کے ماتھے کا پسینہ پونچھ کر
خوشۂ گندم کا اُن کو دانہ دانہ دے دیا
آج لیکن تیری آنکھیں بند ہو جانے کے بعد
بھوک نے کھیتوں کو حسنِ مجرمانہ دے دیا

تو نے مزدوروں کی محنت کے تحفظ کے لئے
شہر یاروں کی رعونت کو ملایا خاک میں
آج لیکن تیری آنکھیں بند ہو جانے کے بعد
کچھ نہیں ہے مفلسوں کے دامنِ صد چاک میں

تو نے مذہب کے تقدس کی حفاظت کے لئے
آدمیت کو بچایا مفسدانہ بَشر سے
آج لیکن تیری آنکھیں بند ہو جانے کے بعد
بھائی بھائی بھی نظر آنے لگے ہیں غیر سے

تو نے کیا کیا زیست کے رازِ دروں افشا کئے
تیرا ہر پیغام تاویلوں میں لیکن کھو گیا
تجھ کو پیرانِ سیاست بیچنے پر تل گئے
جو بھی چاہا شہر یاروں نے وہی کچھ ہو گیا

رقص گاہوں سے مزاروں تک ترے لٹنے لگے
کوچے کوچے میں ترے پیغام کو بیچا گیا
اُف یہ تیرے تاجروں کی شاطرانہ ذہنیت
ہر نئے سودے میں تیرے نام کو بیچا گیا

تم کو ڈر ہوگا مراعات کے چھن جانے کا
بولنے والے تو بے خوف و خطر بولیں گے

بازار

جوانی، حسن، غمزے، عہد، پیماں، قہقہے، نغمے،
رسیلے ہونٹ، شرمیلی نگاہیں، مرمریں بانہیں
یہاں ہر چیز بکتی ہے!
خریدارو!
بتاؤ کیا خریدو گے؟

بھرے بازو، گٹھیلے جسم، چوڑے آہنی سینے
بلکتے پیٹ، روتی غیرتیں، سہمی ہوئی آہیں
یہاں ہر چیز بکتی ہے!
خریدارو!
بتاؤ کیا خریدو گے؟

زبانیں، دل، ارادے، فیصلے، جاں باز، بیباں، نعرے
یہ آئے دن کے ہنگامے، یہ رنگا رنگ تقریریں
یہاں ہر چیز بکتی ہے!
خریدارو!
بتاؤ کیا خریدو گے؟

صحافت، شاعری، تنقید، علم و فن، کتب خانے
قلم کے معجزے، فکر و نظر کی شوخ تصویریں
یہاں ہر چیز بکتی ہے!
خریدارو!
بتاؤ کیا خریدو گے؟

اذانیں، سنکھ، حجرے، پاٹھ شالے، داڑھیاں، قشقے
یہ لمبی لمبی تسبیحیں، یہ موٹی موٹی مالائیں
یہاں ہر چیز بکتی ہے!
خریدارو!
بتاؤ کیا خریدو گے؟
علی الاعلان ہوتے ہیں یہاں سودے ضمیروں کے
یہ وہ بازار ہے جس میں فرشتے آ کے بک جائیں
خریدارو!
بتاؤ کیا خریدو گے؟

کبھی کبھی ترے ہونٹوں کی مسکراہٹ سے
مجھے بہار کی آہٹ سنائی دیتی ہے
تری نگاہ کی یہ بے حجاب سرگوشی
مجھے پھوار سی پڑتی دکھائی دیتی ہے

اِک ایسا وقت بھی آتا ہے چاندنی شب میں
مرا دماغ، مرا دل کہیں نہیں ہوتا
ترا خیال کچھ ایسا نکھر کے آتا ہے
ترا وصال بھی اتنا حسیں نہیں ہوتا

جشنِ آزادی

مینہ برستا ہے تو دھرتی کی نظر جھومتی ہے
پھول کھلتے ہیں تو گلشن پہ نکھار آتا ہے
لیکن اے جشنِ بہاراں کے نئے منتظمو
خود فریبی سے کہیں دل کو قرار آتا ہے

تم اگر جشنِ بہاراں بھی کہو گے اس کو
موت کے گھاٹ یہ دھوکا بھی اُتر جائے گا
بادِ صرصر کو اگر تم نے کہا موجِ نسیم
اس سے موسم میں کوئی فرق نہیں آئے گا

یہ گلستاں یہ گلستاں میں سِسکتے غنچے،
اپنے اعمال کے پردے میں انھیں ڈھانپ تو لو،
اقتدار آج بھی سرگرمِ سفر ہے لیکن
بے نواؤں کے اِرادوں کو ذرا بھانپ تو لو

آج اِنسان کی عظمت نے کیا ہے اعلان
خود فریبی سے کوئی جی کو نہ بہلائے گا
جب تک آرائشِ گلزار نہیں ہو جاتی
کِسی کونپل کِسی غنچے کو نہ چین آئے گا

لیکن اے جشنِ بہاراں کے نئے منتظمو
یہ تماشا ہمیں بے کار نظر آتا ہے،
مینہ برستا ہے نہ دھرتی کی نظر جھومتی ہے
پھول کھلتے ہیں نہ گلشن پہ نکھار آتا ہے

آرڈی نینس

جگمگاتے ہوئے ایوانِ شہنشاہی میں
جب سیہ فام قوانین جنم لیتے ہیں
جشنِ ثروت کے لئے امنِ جہاں کے دشمن
موت کے ہاتھ میں قرطاس و قلم دیتے ہیں

مملکت حجلۂ زرکار میں بیٹھے بیٹھے
اپنے جمہور سے پیمانِ وفا مانگتی ہے
اور بیداریٔ جمہور وفا سے پہلے
اپنے تاریک گھروندوں میں ضیا مانگتی ہے

وہ ستارے کہ سحر تک ہے جوانی جن کی،
ان کے ماتھوں پہ درخشانیٔ خورشید کہاں
وہ جفاکار جو انسان کا چہرہ نوچیں
اُن سے آرائشِ آفاق کی اُمید کہاں

زندگی بھوک مٹائے کہ ہوا سے کھیلے
مطمئن پیٹ نہیں ہے تو وفا کیسی ہے
برہنہ جسم کو تلقینِ حیا کیا معنی!
سانس رُک جائے تو پھر موجِ ہوا کیسی ہے

جب تڑپتا ہے کوئی درد کی شدت لے کر
اپنے درماں کے لئے خدمتِ جم جاہی میں
حکم ہوتا ہے کہ فریاد نہ ہونے پائے
جگمگاتے ہوئے ایوانِ شہنشاہی میں،


آئینے کے سامنے



قتیل شفائی

ایک قاری کی نظر میں

پروفیسر سید حسن طاہر ڈیرہ غازی خاں پاکستان

ہماری سماج نے صنفِ لطیف کو اس حد تک پردوں میں پوشیدہ رکھا ہے کہ ہوتے ہوتے یہی صنفِ لطیف ایک عجیب سی مخلوق بن کر رہ گئی، ادب میں اس ذکر کے لئے جگہ نہ تھی۔ علم کو اُس کا نام سن کر پسینہ آنے لگتا تھا۔ مگر بھلا ہو اس نام نہاد مغربی تہذیب کا جس نے صنفِ لطیف کو اپنے آپ سے روشناس کر دیا۔ اور کچھ اپنے بل بوتے پر کچھ مردوں کی طرف سے تلافیٔ مافات کی بدولت دخترانِ حوا نے سماج میں اپنی موجودگی اور شدید اہمیت کا احساس پیدا کر دیا۔

اس کے بعد ہمارے شعر و ادب میں عورت کا صرف ذکر آنا شروع ہُوا۔ اس کی تعریف و توصیف بیان کی گئی۔ اور اپنی طرف سے جانے اسے کیا کیا کہہ ڈالا گیا۔ کلی سے نرم، صبا سے لطیف، وجہِ تخلیقِ کائنات، باعثِ رنگینیٔ حیات، لطفِ مجسم۔ اور کبھی بُت کافر، سنگ دل، صنم۔ کہاں تک کہا جائے۔ اسے دوشیزہ، ماں، بیٹی، بہن۔ بیوی، طوائف، محبوبہ سب نظروں سے دیکھا گیا۔ مگر اسے "صرف اور محض عورت" کے طور پر بہت کم۔ نہ ہونے کے برابر دیکھا گیا ہے۔ اور پھر اس کے دل کی دھڑکنیں تو اُردو شاعری نے سنی ہی نہیں۔ قتیل شفائی شاید پہلا شاعر ہے۔ جس نے "عورت" کو "عورت" کے رُوپ میں دیکھا۔ اور پیش کیا۔ اور اس کے دل کی گہرائیوں میں اُتر کر خود اس کی زبان سے اس کی کہانی سنائی ہے۔

"ایکٹرس"۔ "راستے کا پھول"۔ "شمع انجمن"۔ "آئینے کے سامنے"۔ "بانجھ"۔ اور "البم" میں قتیل نے جس ہمدردی اور خلوص سے سوسائٹی کے نصف بہتر کی ترجمانی کی ہے۔ اس کی مثال اردو شاعری میں نہیں ملتی۔ یہ طرح نو اُردو شاعری میں ایک مایۂ ناز اضافہ ہے۔

فلم کے ذریعے ہم زندگی کے مختلف اور متنوع واقعات اور انسانی کردار سے دوچار ہوتے ہیں۔ مگر یہ بہت کم سوچتے ہیں۔ کہ جو ہر فن اداکارہ اپنے حسن اور اداکاری سے مہینوں ہمارے ذہنوں پر چھائی رہتی ہے۔ وہ رقاصہ جس کے انداز و ادا پر ہم بے ساختہ تحسین و آفریں کے پھول برساتے ہیں۔ وہ آتش نوا مغنیہ جس کے لبوں سے گرتے ہوئے گیتوں کے پھول مدتوں فضا میں ترنم بکھیرتے رہتے ہیں۔ خود بھی ہماری طرح انسانی سماج کی ایک فرد ہے۔ اس کے سینے میں بھی دل ہے۔ وہ بھی محبت چاہتی ہے۔ سچی محبت، محض عارضی محبت، صرف نمائشی پیار جو اداکاری کی جان تو ہو سکتا ہے۔ اُس کے دل کی پیاس نہیں بجھا سکتی

تھرتھراتی رہی چراغ کی لو   اشک پلکوں پہ کانپ کانپ گئے

شب کے سلئے نظر کو ڈھانپ گئے — کوئی آنسو نہ بن سکا تارا

اُسے بھی خلوتوں میں سچے پیار کی آرزو رہے۔ جہاں اُسے اور کوئی دیکھنے والا نہ ہو۔ مگر اس کی سچی خواہشات کے ساتھ بھی وہی برتاؤ کیا جاتا ہے یعنی دیکھنے والے دیکھ کر اسے گزر جاتے ہیں ؎

کٹ گیا وقت مسکراہٹ میں — قہقہے روح کو پسند نہ تھے
وہ بھی آنکھیں چُرا گئے آخر — دل کے دروازے جن پہ بند نہ تھے
چھپ جاتا ہے دل کو تنہائی — جس پہ دل اعتبار کرتا ہے
بن جاتی ہوں نخلِ صحرائی

(ایکٹریس)

"نخلِ صحرائی" میں بے کسی اور بے بسی کی کیسی مکمل تصویر ہے!

قتیل نے کہاں کہاں "عورت" کے نازک دل کی سسکیاں سُنی ہیں۔ اور سچی ہمدردی سے اُس کی عکاسی کی ہے۔ اس کے جسم کے خریدار وسب بن جاتے ہیں مگر اس کے پاکیزہ جذبات کا جواب دینے سے یا تو قاصر ہیں یا عمداً اس سے گریز کرتے ہیں وہ گناہ کے اندھیرے میں ہمیشہ ایک روشنی کی کرن کی امیدوار رہی ہے۔ شاید اُسے کہیں سے سچی محبت کا خزانہ مل جائے ؎

نچوڑ لو مرے جواں لبوں کا رس نچوڑ لو — مرے نظر پرست عارضوں کے پھول توڑ لو
میں ان گنت جوانیوں سے بھاگ کھیلتی رہی — میں ہر نئے ایاغ میں شراب انڈیلتی رہی
نہ جانے کیا کمی تھی مرے حسن کے خمار میں — کہ زندگی نہ مل سکی مجھے کسی کے پیار میں

یہ تلخ حقیقت جیسے کھولتے ہوئے اُس پر قہقہے لگاتی ہے۔ کہ جس چیز کی وہ متمنی ہے۔ وہ شاید اس کی قسمت میں ہی نہیں ؎

فریب کھا رہی تھی میں فریب کھا رہی ہوں میں — ابھی تک اپنی مسرتوں کو آزما رہی ہوں میں
مذاق سا بنی ہوئی ہوں کائنات کے لئے — پکارتا ہے ہر کوئی بس ایک رات کے لئے

مگر وہ زندگی کے ساتھ اُمید کا دامن وابستہ رکھتی ہے۔ اسے بہرحال زندگی کا ساتھ دینا ہے۔ وہ کس فیاضی کے ساتھ اپنی آرزوؤں کو زندگی کے تقاضوں پر بھینٹ چڑھا دیتی ہے۔ اور اپنے چھلکے ہوئے آنسوؤں کو چھپاتی ہے۔ تاکہ زندگی کے چہرے پر مسرت کا غازہ پھیکا نہ پڑ جائے ؎

میں سوچتی ہوں بے کسی کا کچھ تو حق ادا کروں
یہ رات بھر کی بھیک آؤ تم کو بھی عطا کروں

(راستے کا پھول) — نچوڑ لو مرے جواں لبوں کا رس . . . .

اسی "پھول" کو قتیل نے ایک بار اور بھی مسلا ہوا پایا ہے۔ اور دل مسوس کر رہ گیا ہے۔ اس نے اس حسین شمع کے جو بھری محفل میں روشنی کیے ہوئے ہے۔ آنسوؤں کو دیکھ پایا ــــــ اور تڑپ اٹھا۔ ایک سچے فن کار کو صرف زندگی کی تصویر ہی پسند نہیں۔ وہ جذبات کی گہرائیاں بھی ٹٹولتا ہے۔ اگر ایک طرف مسکراہٹیں پسند کرتا ہے۔ تو دوسری طرف آنسو دیکھ کر منہ نہیں پھیر لیتا۔ وہ ان سے ہمدردی کرتا ہے۔

دیکھئے ایک "پیاسی" عورت جسے سب کھلونا سمجھ کر کھیلتے رہے ہیں۔ مگر کسی نے اسے اپنا بنا کر رکھنا یا اس کا ہو کر رہ جانا گوارا نہیں کیا ؎

میں زندگی کی ہر اک سانس کو ٹٹول چکی　　میں لاکھ بار محبت کے بھید کھول چکی
میں اپنے آپ کو تنہائیوں میں تول چکی　　میں جلوتوں میں ستاروں کے بول بول چکی
مگر کوئی بھی نہ مانا

وفا کے دام بچھائے گئے قرینے سے　　مگر کسی نے بھی روکا نہ مجھ کو جینے سے
کسی نے جام چرائے ہیں میرے سینے سے　　کسی نے عطر نچوڑا مرے پسینے سے
کسی کو غیر نہ جانا

دیکھئے کتنی حسرت ہے۔ ان مصرعوں میں۔ انسانیت بال کھولے رو رہی ہے!

اور پھر یہ تلخ احساس کہ جو کھیل وہ عمر بھر کھیلتی رہی ہے۔ اب ختم ہونے کو ہے۔ اہلِ محفل کو اب اس شمعِ انجمن کی ضرورت نہیں رہی۔ سب اُس سے کھیل چکے ہیں۔ اور اب اسے چھوڑ گئے ہیں۔ کہ وہ سسک سسک کر جلتی رہے ؎

رہی نہ سانس میں خوشبو تو بھاگ چھوٹ گئے　　گیا شباب تو اپنے پرائے چھوٹ گئے
کوئی تو چھوڑ گئے کوئی مجھ کو لوٹ گئے　　محل گرے سو گرے جھونپڑے بھی ٹوٹ گئے
رہا نہ کوئی ٹھکانہ!

(شمعِ انجمن)

کیسا حسرت ناک انجام ہے۔ اس عورت نے اپنا سب کچھ کھو کر کچھ بھی نہیں پایا۔ اور اب اُسے کھو دینے کا احساس کتنی شدت سے ہو رہا ہے۔ مگر وہ اب کر بھی کیا سکتی ہے۔ وہ ہماری سماج کے سامنے سوالیہ نشان بن کر کھڑی ہوئی ہے۔ اور پوچھ رہی ہے۔ کہ میں نے اپنا سب کچھ تمہیں دے دیا۔ اپنی خوشیوں کو تمہاری خوشیوں پر قربان کر دیا۔ مگر تم نے اس کے عوض میں مجھے کیا دیا؟ یہی کہ اب تمہیں میری ضرورت نہیں۔ تمہاری سماج میں میرے لئے کوئی جگہ نہیں! میں قابلِ نفرت ہوں۔ اور تم! تم جو میرے جسم سے میری زندگی سے کھیلتے رہے ہو۔ حتیٰ کہ تم نے مجھے اس حالت تک پہنچا دیا ہے۔ تم اب بھی گردن اٹھا کر کندھے جھٹک کر مجھ سے۔ بے تعلقی کا اظہار کر رہے ہو۔ تم زمانے کی نظروں میں معزز شہری ہو۔ ذمہ دار باپ ہو۔ وفادار شوہر ہو۔ اور فرماں بردار بیٹے ہو! مگر میں آج نہ کسی کی ماں ہوں۔ نہ بہن نہ بیٹی! نہ کوئی مجھے بیوی بناتا ہے۔ یہی ہے تمہارا انصاف!

مگر سماج اور اس کا مرد حکمران خاموش ہیں۔ وہ جواب دینا ہی نہیں چاہتے۔ وہ کوئی جواب دے ہی نہیں سکتے!

دُکھیاری عورت اب خود ہی اپنے آپ سے اپنا دکھ درد کہتی ہے۔ اسے افسوس ہے کہ اس نے ہمیشہ مردوں کی ہاں میں ہاں ملائی ہے۔ ہمیشہ دوسروں کی خوشی کو مقدم جانا ہے۔ مگر کسی نے اس کے خلوص کا جواب خلوص سے نہیں دیا۔ بلکہ صرف اسے چند لمحوں کے لئے خریدا ہے اور پھر چھوڑ دیا ہے۔ دیکھئے "آئینے کے سامنے" کھڑی ہوئی وہ کس طرح اپنے ہی کردار پر تنقید کرتی ہے ؎

ترے شبستاں کی نکہتوں میں ہزاروں سانسیں مہک رہی ہیں
مگر تری سیج کا کوئی داغ کوئی گُل مطمئن نہیں ہے

اُسے اب اپنے آپ پر غصہ آ رہا ہے کیوں وہ ہمیشہ مرد کا کھلونا بنی رہی ہے۔ کیوں اُس نے خود کو بلا چون وچرا سب کے حوالے کر دیا تھا۔ کیا وہ واقعی ہمیشہ خلوص سے ایسا کرتی رہی ہے۔ ضمیر کہتا ہے نہیں بلکہ اس سارے کھیل کو بساطِ زر پر کھیلا گیا ہے۔ زندگی کے تقاضوں نے اُسے اپنا

جسم بیچنے پر مجبور کر دیا۔ اور وہ نمائشی پیار سے دنیا کا دل لبھاتی رہی جس کے عوض اُس نے زندگی کی بنیادی ضروریات پوری کیں ؎

کھلے کواڑوں کے بند ہونٹوں میں دفن ہیں بے حساب نغمے
مگر ترے ساز نے کسی گیت کا کبھی ساتھ بھی دیا ہے
کھلے رہے ہیں ہزاروں آغوش ہونے کے بعد تک بھی
مگر ترے حسن نے کسی دل کے ہاتھ میں ہاتھ بھی دیا ہے!

وہ اپنے آپ پر جھنجھلا رہی ہے کیوں اس نے زندگی کے حقائق کو پہلے سے ہی نہیں بھانپ لیا تھا۔ وہ خود اپنی زندگی کی کشتی کو شفاف پانیوں میں رکھ سکتی تھی۔ مگر اس نے دلدل ہی میں رہنا منظور کیا۔ اور اب بھی وہ چاہے تو اپنی زندگی کو راہ پر لا سکتی ہے۔ وہ اپنی صلاحیتوں سے واقف ہے۔ اسے دفعتاً اپنی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔ وہ کلوپٹرا، ہیلن اور سیتا بن سکتی ہے ؎

کبھی تصور کے دائرے کو کچھ اور پھیلا کے دیکھ لیتی | کہ ابتدائے شباب کا اوّلیں کرشمہ جواں ہے اب تک
ترے تبسم کے سرد شعلوں کی زد میں آتی رہی ہے دنیا | ہلال و خنجر صلیب و زنار تیرے ہونٹوں سے جل چکے ہیں
تعینات حدود کو تین بار تو نے توڑ ڈالے

مگر انسانی فطرت کی مجبوریاں! وہ چاہتی تو ہے مگر وہ بن نہیں سکتی۔ اسے احساس ہے کہ وہ اب زمانے کی روش سے کٹ کر اپنے لئے موجودہ راستے سے الگ کوئی نئی راہ نہیں ڈھونڈ سکتی۔ اور اس کی زندگی کا یہی تقاضا ہے کہ وہ اس کا ساتھ دے۔ وہ پھر تصور کو حقائق کے اسی محور پر لے آتی ہے جس پر اس کی زندگی گھوم رہی ہے

یہ آئینے کا اداس چہرہ تجھے تسلی نہ دے سکے گا
اب آئینہ توڑ دے کہ تیری نظر نہ یہ بار سہہ سکے گی
کئی مراحل کئی فسانے ابھی ترے انتظار میں ہیں
یوں ہی جو چل دی مگر نہ تیری یہ سیج قائم نہ رہ سکے گی

(آئینے کے سامنے)

یہ کتنی بڑی حقیقت پسندی ہے۔ اور کتنا بڑا دل چاہیئے۔ صدموں کو اس خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کرنے کے لئے۔ نام کی "ترقی پسندی" تو اب پرانی ہو چکی ہے۔ زندگی کے ساتھ تو رہ کر اس کی اصلاح کرنا، مشکلات میں بھی امید کے دامن کو ہاتھ سے نہ چھوڑنا، ہر نوع زندگی کو گوارا بنانا۔ اس کی بہترین مثال قتیل نے "بانجھ" کا کردار پیش کرتے ہوئے دی ہے۔ اس نے ایک "محروم عورت" کے دل کا سارا درد نچوڑ دیا ہے۔

بانجھ وہ اپنی مرضی سے نہیں بنی۔ یہ ایک حادثہ ہے۔ نہ اس میں خاندان یا سماج کا کوئی قصور ہے۔ اس کا بانجھ پن ایک تلخ کڑی حقیقت ہے جس کا کوئی مداوا نہیں۔ مگر وہ جذبات سے مجبور رہے۔ دیکھئے ماتا کس طرح مچل مچل کر۔ بلک بلک کر رو رہی ہے ؎

کتنے ہی سال ستاروں کی طرح ٹوٹ گئے
میری گودی سے کوئی چاند جنم لے نہ سکا

اس عورت نے کتنے ہی طعنے سہے ہیں۔ اپنوں کے، غیروں کے۔ ہر شخص اُسے دیکھ کر جیسے کہتا ہے۔ یہ ایک بیکار چیز ہے۔ جو تخلیق پر قادر نہیں، نہیں جو اس کے اپنے خون شدہ ارمانوں سے ہمدردی کر سکے۔ اس نے کتنی تمنائیں کی ہیں۔ وہ کتنی بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار ہے؟ فن اماں کی خاطر، مگر وہ شائد اسے کوئی بھی نہیں دے سکتا ؎

وہ زمیں جو کوئی پودا نہ اُگل سکتی ہو — قاعدہ ہے کہ اُسے چھوڑ دیا جاتا ہے
گھر میں ہر روز یہی ذکر یہی تورشنا — شاخ سوکھے تو اسے توڑ دیا جاتا ہے

مجھے بانہوں پہ اُٹھالے، مجھے مایوس نہ کر
کر دیا سب نے مقدر کے حوالے مجھ کو

کتنے جھولوں نے جھلایا مرے ارمانوں کو
دل میں سوئی ہوئی ممتا کو سہارا نہ ملا

مگر مظلوم عورت اِسب کچھ سہتی ہے۔ طعنے، اپنی محرومی کا غم اور یہ احساس کہ شاید اس کی خواہش کبھی پوری نہ ہو اور اُسے ہمیشہ کے لئے وہی زندگی گذارنا پڑے جو وہ اب تک گزار رہی ہے۔ مگر وہ کر ہی کیا سکتی ہے۔ وہ خاموش ہے۔ مشرقی خداؤں کے بتوں کے خاموش محرابوں کی طرح ؎

کل بھی خاموش تھی میں آج بھی خاموش رہوں میں
میرے ماحول میں طوفان نہ آیا کوئی
کتنے ارمان مٹے ایک، تمنا کے لئے
گھر لُٹ کے بھی مہمان نہ آیا کوئی

محسوس ہوتا ہے۔ روتی ہوئی ناکام آرزوؤں اور حسرتوں کا ایک طوفان ہے جو اُمڈا چلا آرہا ہے۔
اور سالہا سال ستاروں کی طرح ٹوٹ گئے

(بانجھ)

عورت کے دل میں چاہے جانے کی لافانی خواہش کسی کا سب کچھ ہو رہنے کی تڑپ، کسی کو اپنا بنا لینے کی دوامی آرزو، ایسی ہی فطری خواہشات ہیں جیسی مرد کی تیس، مغاں بننے کی خواہش، ہمہ داں ہونے کا دعویٰ اور فاتح بن کر رہنے کی آرزو۔ یہ سچی خواہشیں ہیں اور ان ہی سچی خواہشوں سے عبارت ہے زندگی۔ قتیل نے انہی معصوم، سچی اور پاکیزہ خواہشوں کو ٹٹولا ہے۔ اس نے "البم" میں ایک عورت کا کردار کس خوبی سے پیش کیا ہے جس نے زندگی کے مختلف مرحلوں میں مختلف قسم کے مردوں کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے، اور خود بھی اُن میں سے کسی ایک کی توجہ کا مرکز بنی ہے۔ اب وہ بیٹھی اپنے تصور میں گزرے ہوئے واقعات کو دہرا رہی ہے۔ زندگی کے بیتے ہوئے سہانے لمحے اس کی چشم تصور کے سامنے ایک متحرک تصویر کی طرح گزر رہے ہیں۔ اور وہ اس تصویر کے ہیرو "مرد" کو مختلف زاویوں سے دیکھ رہی ہے۔ وہ بھی ہیں جنہوں نے اُس سے بے وفائی کی۔ وہ بھی جن کے ساتھ اس نے خود بے وفائی کی۔ نتیجہ ایک خلا، ایک احساس محرومی، ایک اتھاہ تنہائی، اب وہ اپنے موجودہ دور پر نظر ڈالتی ہے۔ اور اپنے موجودہ محبوب کو ہمیشہ

اپنائے رہنا چاہتی ہے۔ مگر اس کے پہلے تجربے اس آرزو کو ڈس رہے ہیں۔
دیکھئے "البم" کھلتا ہے ؎

یہ میری جوانی کی پہلی کرن ہے
مگر اب وہ شمع فروزاں کہاں ہے
یہ میری محبت کی پہلی خطا ہے
جسے میں نے اپنے بدن کے گلابی ترانے سنائے
مگر اب وہ گیتوں کا رسیا کہاں ہے!
یہ ہنستا ہوا زندہ دِل نوجواں ہے
مگر . . . .

مری شوخ چنچل جوانی سے اب اس کا جی بھر چکا ہے
مگر میں اسے یاد کرتی ہوں اب تک!
یہ بھونرے ہیں میری جوانی کے پیاسے
میرے پاس آکر بھی اکثر مری راہ تکتے رہے ہیں
مگر اب نہ جانے کہاں اڑ گئے ہیں

دیکھا آپ نے قتیلؔ نے کتنے نازک حسیات کو کس سادے اور اچھوتے انداز میں بیان کیا ہے "مرے پاس آکر بھی اکثر مری راہ تکتے رہے ہیں" کتنا گہرا نفسیاتی مطالعہ ہے!
اور اب آخری منزل دیکھئے:۔

یہ نوعمر یہ نوگرفتار پنچھی
یہ بھولا مسافر، یہ گیتوں میں سپنوں میں کھویا ہوا سا
یہ آزاد انساں محبّت کے چھینٹوں سے دھویا ہوا سا

اور اس کی یہ خواہش کہ "اُسے دیکھنا چاہتی ہوں ابد تک میں سویا ہوا سا" کتنی فطری کتنی پاکیزہ خواہش ہے۔ مگر شاید یہ طلسم بھی ٹوٹ جائے! مگر تا بکے؟ یہ بھی سوتا رہے گا! قتیلؔ کی ان نظموں میں "عورت" کا کردار کتنا اجاگر کیا گیا ہے۔ اور پھر عورت کے زاویۂ نظر سے مرد کے کردار پر جو تنقید کی گئی ہے۔ وہ کچھ انہی کا حصّہ ہے۔

قتیلؔ نے ایک بہترین فن کار کی طرح اپنے موضوع سے پورا انصاف کیا ہے۔ ان نظموں کی زبان واقعی اور موسیقی اس نازک اور لطیف موضوع کے لئے موزوں ترین ہے۔ لہجہ کتنا پُر درد اور مؤثر ہے۔ تسلسل خیال اس خوبی سے نبھایا گیا ہے کہ ذہن کہیں بھی شاعر کا ساتھ دینے سے انکار نہیں کرتا۔ قتیلؔ نے یہ نظمیں لکھ کر ہمارے ادب کو ایک بہترین اور اہم موضوع سے روشناس کرایا ہے۔ اور ہماری شاعری کو سوسائٹی کے نصف بہتر ہی کا نہیں بلکہ پوری سماج کا ذمّہ دار ترجمان بنایا ہے۔

قتیل کی نظم کا مرکزی کردار

پروفیسر جمیل ملک راولپنڈی۔ پاکستان

قتیل شفائی کی شاعری کا مرکزی کردار عورت ہے۔ یوں تو ہمارے اکثر شاعروں کا محبوب ترین موضوع بھی یہی رہا ہے اس لئے علامہ اقبال کو کہنا پڑا ہے کہ ان بے چاروں کے اعصاب پہ عورت سوار ہے، لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ عورت انسان کی ازلی کمزوری ہے یہ وہ جادو ہے جو ہر انسان کے سر چڑھ کر بولتا ہے۔ پھر شہزادہ [illegible] کبھی تو اس کے حلوے سے پھوٹتا ہے شبیہہ بھی تو اسی کی گود میں جنم لیتا ہے۔ اور ابن مریم کا اعجاز مسیحائی بھی تو دراصل اسی عورت کا معجزہ ہے۔ اگر یہ سب سچ ہے تو پھر اس اہم ترین موضوع کو کیوں کر نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ جدید شاعروں کی صف میں قتیل کے ہاں یہ موضوع اس لئے خاص اہمیت رکھتا ہے کہ اس نے اس کردار کو مرکز و محور بنا کر، ذات، حیات، اور کائنات کی سیاحت کی ہے۔ پھر انداز بیان کے لحاظ سے بھی وہ اس کردار کے توسط سے باآسانی پہچانا جا سکتا ہے اور ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ موضوع تو قتیل کا اپنا موضوع ہے اور یہ انداز تو قتیل کا منفرد انداز ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ قتیل اس موضوع کو اپنانے اور عورت کے کردار سے رسم و راہ بڑھانے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا۔ وہ اس حقیقت کو تسلیم کر کے آگے قدم بڑھاتا ہے کہ عورت اور مرد کا وجود ایک دوسرے کے لئے لابدی ہے۔ یہ دونوں زندگی کی راہ میں ہمسفر ہیں۔ ہم مشرب و ہمراز ہیں۔ یہ زندگی کے دو کردار، قدرت کے دو شاہکار ہیں۔ انہیں سے دنیا میں چہل پہل ہے۔ انہی کے جلوؤں نے کائنات کو رنگا رنگ بنا رکھا ہے یہ کردار دائم و قائم ہیں۔

قتیل ایک شاعر ہے قتیل ایک مرد بھی ہے اس نے عورت کو انہی دو حیثیتوں سے دیکھا ہے۔ قتیل کی اس شاعری اور قتیل کی اس مردانگی میں ایک مسلسل کشمکش اور تصادم کا عمل جاری رہتا ہے۔ اور اسی سے قتیل کے ہاں عورت کا ایک مخصوص کردار جنم لیتا ہے، وہ کردار جس کے جسم کے زاویوں میں ایک توازن اور ہم آہنگی ہے۔ اٹھان اور نغمگی ہے یہی قتیل کا پسندیدہ پیکر جمال ہے۔ یہی اس کا انتخاب ہے۔

مجھ سے تعریف نہیں ہو سکتی
تیری ترشی ہوئی رعنائی کی
جس میں شامل ہو نوازش کا سرور
تو وہ تصویر ہے چغتائی کی (انتخاب)

شاعری توازن اور ہم آہنگی کا نام ہے۔ اور شاعر کی نظر وہ دھاگا ہے جس میں وہ اپنے تجربات اور مشاہدات کے موتی پرو کر انھیں اپنے خون دل سے آب دیتا ہے۔ اور اپنے اس آئیڈیل، اس پیکر حسن و خوبی کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے جس کے گلے کا ہار ہو کر وہ اپنی عمر بھر کی کاوشوں کی داد پا سکے۔ قتیل کو یہ پیکر حسن و خوبی نظر آتا ہے تو وہ بے ساختہ اس کی طرف بڑھتا ہے وہ اس پیکر حسن کے چشموں سے اپنی پیاس بجھاتا ہے۔ مگر جب اس کی روح میں جھانک کر دیکھتا ہے تو اپنی کامرانیوں اور لغزشوں کا احساس اسے چونکا دیتا ہے۔ یہیں سے قتیل کی شخصیت میں چھپے ہوئے شاعر اور مرد کے درمیان ایک کشمکش اور آویزش کا آغاز ہوتا ہے۔ شاعر کے نزدیک داخلی طور پر عورت اور اس کی لطافتوں کا یہی وہ عفریت ہے جو ان کی کامرانیوں میں ناکامیوں کا زہر گھول دیتا ہے۔ خارجی طور پر معاشرے کی تشکیل کرنے والا مرد ہے جس کے ہاتھوں میں عورت ایک کھلونا ہے جس نے آج تک اسے مساوی حقوق نہیں دیئے۔ یہ وہی مرد ہے جس کے ہاتھوں میں تہذیب و تمدن، اخلاق و آداب اور قانون و سیاست کی باگ ڈور ہے۔ وہ ماؤں، بہنوں، بیٹیوں، کو کبھی دیو داسی، کنیز اور باندی بنا کر بازار میں لا بٹھاتا ہے نائٹ کلبوں، رقص گاہوں اور بالاخانہ کی زینت بناتا ہے۔ قتیل شاعر ہے حساس دل رکھتا ہے۔ عورت کی تقدیس پر جان دینے والا ہے مگر اس کی شخصیت پر اس مرد کی چھاپ بھی ہے جو سالہا سال سے عورت کو پامال کرتا رہا ہے مرد کے داخلی تلون اور معاشرے میں پھیلی ہوئی طوائف الملوکی کا نتیجہ یہ ہے کہ شاعر کا تراشا ہوا پیکر جمال، جلد ہی عدم توازن کا شکار ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ شاعر صرف شاعر ہی نہیں مرد بھی ہے، معاشرے کا مرد جس کے اپنے جسم و روح میں توازن موجود نہیں اور جس نے سالہا سال کے استحصال سے عورت کے جسم اور روح کے توازن کو بھی پامال کر دیا ہے بحیثیت مرد، یہ الزام قتیل پر بھی آتا ہے۔ مگر بحیثیت شاعر اس کا کمال یہ ہے کہ اس نے اس کچلی ہوئی عورت کو زبان دیدی ہے۔ وہ مرد ہوتے بھی اس مظلوم کردار کی صدائے احتجاج کا سب سے بڑا محرک ہے۔ وہ ایسا نوحہ گر جس کی نوحہ گری میں بھی نغمہ گری کے انداز نہیں۔ جو اپنے محبوب کردار کے ظلم اور مظلومیت میں برابر کا شریک رہا ہے جس نے اپنے ذاتی تجربات کو کائناتی رنگ دے کر اس بے وفا کردار کو بھی ایک نمونہ اور ایک [illegible] کا درجہ دے دیا ہے قتیل مرد کے ہرجائی پن کو تسلیم کرتا ہے۔

قتیل کی ابتدائی نظموں، ہرجائی، کھنڈر اور پیش گوئی، میں مرد کے اس پہلو کا اظہار ہوا ہے۔ ان نظموں کا کردار محض قتیل کی سوچ کے مظہر بھی ہوں تو وہ بھی ان سے مرد کی بے وفائی اور متلون مزاجی ظاہر ہے۔ جو ہر بار محبوبہ کو چھوڑ کر کہیں دور نکل جاتا ہے۔ اس کی ابتدائی نظموں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وادی سرحد کی عورت سے لمحاتی وصال کے بعد اسے پردیس کی صعوبتیں اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں۔ وہ گھریلو زندگی کی پرسکون فضا، سرحد کی شاداب وادی اور ماں کی آغوش سے محروم ہو جاتا ہے۔ اور پیٹ کے تقاضوں سے مجبور ہو کر تاجروں کے دیس جا نکلتا ہے

تیرے جیتے جی اگرچہ میں بنا قاتل ترا
میرے سینے میں دھڑکتا ہے ابھی تک دل ترا
دور کوسوں دور تجھ سے علم و فن کے بھیس میں
بک رہی ہے بھوک میری تاجروں کے دیس میں

مگر اسے اپنے فن پر اعتماد ہے اور وہ اس کا سہارا لے کر کہتا ہے :-

اب جو اپنے فن کو مستقبل پہ پھیلاؤں گا میں
ان گنت ماؤں کے دل کا چین بن جاؤں گا میں

(تاجروں کے دیس میں)

تاجر کے دیس میں شاعر کی وادی سرین کی وہ الہڑ اور پر خلوص عورت کہیں نظر نہیں آتی جو اب بھی کھیت سے دور دیکھتے ہوئے دوراہے پر اس کا انتظار کر رہی ہے ۔ واپس وہ جانا نہیں چاہتا کہ اس کی فطرت کا تلون اور اس کی انانیت اس کے راستے میں حائل ہے ۔ زندگی میں آگے بڑھنے کی دھن اس کے سر میں سما چکی ہے ۔ اس کی طبیعت کی جدت پسندی اور اس کی شاعرانہ نظر ہر لحظہ کسی نئی برق تجلی کی منتظر ہے ۔ وہ اب ایک ایسی دنیا ، ایک ایسے بازار میں پہنچ چکا ہے ۔ جہاں ہر طرف سے یہی آوازیں آرہی ہیں :-

جوانی حسن ، غمزے ، عہد و پیماں ، قہقہے ، نغمے
رسیلے ہونٹ ، شرمیلی نگاہیں ، مرمریں باہیں

(بازار)

ان آوازوں سے اس کے کان پک جاتے ہیں ۔ وہ جہد اللبقا سے تھک کر چور ہو جاتا ہے ۔ مگر ماں کی آغوش اسے کہیں نہیں ملتی ۔ وادی سرین میں جو عورت چراغ خانہ تھی وہ اب کہاں ہے یہاں تو عورت شمع انجمن بن چکی ہے ۔ وہ اپنا روحانی اور جسمانی توازن کھو چکی ہے اس کے پاؤں زمین سے اکھڑ چکے ہیں ۔ وہ ایک کٹی ہوئی پتنگ ہے جس کو لوٹنے کے لئے سبھی ہاتھ بڑھا رہے ہیں ۔ دراصل قتیل کا یہ کردار بذات خود ایک المیہ ہے ۔ عورت کی سب سے بڑی کمزوری یہی ہے کہ ۔ وہ عورت ہے ۔ اس کا وجود سراپا دعوت ہے ۔ اس کے بے پناہ خلوص سے انکار ممکن نہیں ۔ مگر مشکل یہ ہے کہ وہ اپنے خلوص کی یہ فراواں دولت صرف اسی ایک شخص کی جھولی میں ڈال سکتی ہے جس سے وہ پہلی بار محبت کرتی ہے اور جس پر وہ سبھی کچھ نچھاور کر دیتی ہے ۔ مگر جب اس کا یہی دیوتا ، اسے چھوڑ کر انجانی وادیوں میں کھو جاتا ہے تو اس کی یہ پہلی خطا ہمیشہ کے لئے اس کی یاد بن جاتی ہے ۔ ہوتے ہوتے وہ مستقل شکست کی علامت بن کر ابھرتی ہے پھر جو کوئی آتا ہے اس کے احساس شکست پر ایک اور تازیانہ لگاتا ہے ۔ اور اس کے منتقمانہ جذبات کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کو اور ہوا دیتا ہے پھر یہی چپ چپ رہ کر اندر ہی اندر سلگنے والی عورت ، بے حجابی کو اپنا شعار بنا لیتی ہے ۔ بات یہیں نہیں ختم ہو جاتی ۔ وہ اپنے جسم کی تجارت پر اتر آتی ہے اور اپنے حسن و جمال کے لئے نئے نئے تاجروں اور نئی نئی منڈیوں کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہے اور جب قمقموں کے سیاہ اجالوں میں یہ عورت اپنی زندگی کے البم کا ایک ایک ورق الٹتی ہے تو اس کے روئیں روئیں سے فریاد نکلتی ہے ۔

اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ جاتی ہیں ان آنسوؤں کے آئینوں میں وہ پھر کس سانولے سلونے کسی آمادہ رو کسی نوجوان کو منعکس کرنے اور اسے اپنے دام محبت میں گرفتار کرنے کے خواب دیکھتی ہے۔ تاکہ کسی طور پر اپنی شکستوں کی تلافی کر سکے۔ مگر ایک دن آتا ہے کہ نوجوان بھی پھر سے اتر جاتا ہے وہ پھر آئینے کے سامنے، بیٹھ کر آنے والے لمحوں کے سواگت کے لئے تصویریں بناتی ہے۔ پلکوں کو منقش کرتی ہے۔ لب و رخسار پر غازے کی تہہ جمانی ہے آئینے کے مقابل اس کے ضمیر میں چھپی ہوئی دوسری عورت۔ اس کی ہم راز۔ اس کی اولین لغزش پر اسے کچوکے لگاتی ہے۔ اس کی خوابیدہ غیرت کو جگاتی ہے اسے بے گناہ کی۔ مدِ گناہ سے بچنے کا مشورہ دیتی ہے مگر کیا ایسا ممکن ہے، کیا مرد کو یہ گوارہ ہے کہ عورت اپنی وہ بساط اٹھا دے جہاں آکر وہ دن بھر کی تھکن دور کرتا ہے اور سخاوت کے طور پر اس کے جسم کے بکتے ہوئے کٹورے میں سونے چاندی کے چند سکے بھی ڈال دیتا ہے یہی وہ داخلی کشمکش اور تضاد کی اندوہناک کیفیات ہیں جہاں شاعر قتیل تو اس کٹی ہوئی پتنگ کا آخری دم تک ساتھ دیتا ہے۔ مگر قتیل کے اندر چھپا ہوا مرد اس عورت کا زہر خند اس کی اذیت دہی کو بھی ہنس کر گوارا کر لیتا ہے کہ اس کو تو یہ میٹھا پاپ ہر طور عزیز ہے۔

یہ آئینے کا اداس چہرہ تجھے تسلی نہ دے سکے گا
اب آئینے توڑ دے کہ تیری نظر نہ یہ بار سہہ سکے گی
کئی مراحل کئی فسانے ابھی تیرے انتظار میں ہیں
یونہی چلی چل وگرنہ تیرا یہ کچا تاثر نہ رہ سکے گی

(آئینے کے سامنے)

قتیل شفائی کی شاعری کا یہ مرکزی کردار ہر زمانے میں افراط و تفریط کا شکار رہا ہے۔ ہر زمانے میں شاعروں نے کسی نہ کسی پہلو سے اس کردار کی نقاب کشائی کی ہے۔ سنسکرت زبان کا ایک شاعر سودرگپت طوائف ہی کی زبان میں کہتا ہے۔

رنڈیوں کو تو اس کی بھی کوئی سوچ نہیں ہوتی کہ آتما اور شریر کے جس کھیل نے ہمیں بہلانے کو جاتری آیا ہے۔ وہ اسے اچھی طرح جانتا بھی ہے یا نہیں۔ اور ذرا اس مورکھ سے جو بیسوا کی باہوں میں رہ کر مرنے تو لگتا ہے لیکن یہ سمجھتا ہے کہ خواہ مخواہ کا خرچ ہوا، یہ تو پوچھو کہ آخر تیرے گھر والے تو اس کے کھانے کپڑے پر بھی تو چند ٹکے خرچ کرنے پڑتے۔ اور پھر یہ بھی نہیں کھلنا چاہئے کہ مردانگی کا رعب صرف روپے پیسے ہی سے جمایا جا سکتا ہے۔ آخر عورت کی بھی آتما ہے۔ اور اسے بھی اپنی شریر کی پیاس بجھانی ہوتی ہے۔"

سعادت حسن منٹو کا خیال ہے کہ۔

"عورت کو یہ تمام گر سکھانے والے مرد ہی تو ہیں۔ ورنہ کچھ تبدیلیاں تو ان میں ضرور پیدا ہوتی" حیاتیاتی طور پر مرد کے جنسی پہلو کے بارے میں منٹو ہی نے کیا خوب سچے کی بات کہی ہے۔

مرد جنسی لحاظ سے کوئی انقلاب انگیز ترقی نہیں کی۔ صدیوں اور جنس کے معاملے میں جیسا وہ پہلے تھا۔ اب بھی ویسا ہی ہے۔"

اگرچہ حیاتیاتی اور جنسیاتی طور پر عورت اور مرد کے تقاضے آج بھی وہی ہیں جو صدیوں پہلے تھے اور آئندہ بھی ایسے ہی رہیں گے لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ ہر دور میں مرد اور عورت کی جنسی زندگی کی مختلف صورتیں رہی ہیں اور ہر زمانے کا مروجہ نظام اقدار ان نئی صورتوں کو بروئے کار لا کر ان پر قانون اور اخلاق کی مہر ثبت کرتا رہا ہے۔ عورتوں کا کاروبار کل بھی ہوتا تھا اور آج بھی یہ جنس سرِعام سستے مول بک سکتی ہے۔ یہ مسئلہ کل بھی سنگین تھا اور آج بھی ہے۔ اسے موجودہ دور کا کرم کہئے یا ستم کہ جمہوریت کے فروغ کے ساتھ ساتھ عورت کی بھی خوب نمائش کی جا رہی ہے۔ اور اس کی نمائش کے نئے رنگا رنگ طرز نکلے ہیں، انجمنیں، علمی ادارے، مکتب و مدرسے تیزی سے وجود میں آ رہے ہیں۔ زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی عورت مرد کے دوش بدوش آنے لگی ہے۔ پھر ذرائع آمد و رفت کی ترقی اور سائنسی دور کے کمالات سے مختلف ممالک سرعت سے ایک دوسرے کے قریب آ رہے ہیں تہذیبوں میں عمل اور ردِعمل کی رفتار تیز ہو گئی ہے۔ گئے وقتوں میں یہ مسئلہ ہر ملک میں موجود تھا مگر حدود اور فاصلوں کی وجہ سے اتنا بڑا اور گھناؤنا نظر نہیں آتا تھا۔ موجودہ ہیتوں کی وجہ سے عورت اور مرد کے تعلقات کا مسئلہ زیادہ سنگین اور پیچیدہ صورتیں اختیار کرتا چلا جا رہا ہے خصوصاً وہ ممالک جو اپنی تہذیب و تمدن کا صحت مند سرمایہ استحصال پسندوں کی دستبرد سے نہیں بچا سکے۔ زیادہ خسارے میں رہے ہیں۔ یہاں بھی سب سے زیادہ ظلم عورت کے ساتھ ہی ہوا۔ سامراجیت اور سرمایہ دارانہ نظام اس افراط و تفریط میں مشرقی عورت ایک تو اپنی نسائیت گنوا بیٹھی ہے۔ دوسرے اس کی شخصیت زندگی کے بے شمار شعبوں میں بٹ کر اپنا آپ کھو چکی ہے۔ کسی مثبت نظریۂ زندگی کی عدم موجودگی نے اور بھی ظلم ڈھایا ہے۔ اور ستم بالائے ستم یہ کہ معاشرے کے معمار بدستور عورت کو اپنی حرص و آز کا نشانہ بناتے رہے ہیں۔ قتیل ایک جاگتے ہوئے شعور کا شاعر ہے۔ اس کے ذہن کی تربیت گرد و پیش کی اسی فضا میں ہوئی ہے۔ وہ دیکھ رہا ہے کہ اس طوائف الملوکی میں اس کا محبوب کردار لخت لخت ہو گیا ہے۔ عورت ایک ہی ہے مگر مرد ہونٹوں پر زبان پھیر کر اسے کیسے کیسے ناموں سے پکارتا ہے۔ ایکٹریس، طوائف، داشتہ، ایکسٹرا، کسبی، مغنیہ، رقاصہ، مغویہ، نائکہ، یہ قتیل کی شاعری کے مختلف کردار ہیں۔ جو قتیل کے مرکزی کردار کے مختلف روپ ہیں۔ قتیل نے ان میں سے ہر ایک کے ساتھ زندگی کے کچھ اڑتے ہوئے لمحے گزارے ہیں۔ ان کرداروں کی ریزہ ریزہ شخصیت کو چن چن کر اپنے مرکزی کردار کی تشکیل کر رہا ہے۔ وہ ان میں سے ہر ایک کے دل کی دھڑکن بن کر گوناگوں انداز سے اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کا اظہار کرتا رہا ہے ؎

سونپ جاتا ہے مجھ کو تنہائی
جس پہ دل اعتبار کرتا ہے
بنتی جاتی ہے نفس صحرائی

(ایکٹریس)

میں زندگی کی ہر ایک سانس کو تول چکی
میں لاکھ بار محبت کے بھید کھول چکی
میں اپنے آپ کو تنہائیوں میں تول چکی
میں جلوتوں میں ستاروں کے بول بول چکی
مگر کوئی بھی نہ مانا

(شمع انجمن)

جسم کی لذت ننگی ہو ہو کر جن کمروں میں بکتی ہے
بکنے والی چیز یہاں خود منہ سے بول بکتی ہے
ان کی سونے چاندی کی حوریں ڈھالی جاتی ہیں
راز داروں کے حلقوں میں جو بکھری پائی جاتی ہیں

(داشتہ)

مجھے یہ ڈر ہے تیری آرزو آنسوؤں میں بدل نہ جائے
بدن کے تجربے تری عمر سے بھی آگے نکل رہے ہیں

(ایکسٹرا)

یا مرے پاس بھی ہوتی کوئی تابندہ کرن
یا ہر اک سمت اندھیرا ہی اندھیرا ہوتا

(مغویہ)

یہ سانسوں پہ سوکھے ہوئے پتوں کا ترنم
یہ جسم یہ ٹوٹا ہوا پیتل کا کٹورا
یہ رنگ یہ تیزاب میں ڈوبی ہوئی چاندی
یہ عمر یہ بھادوں کی ہواؤں کا ہلورا (سراج)

قتیل نے اس کردار کو جلوتوں میں بھی رقص کناں اور نغمہ طلب دیکھا ہے اور خلوتوں میں بھی وہ اس کے انگ انگ میں درد کی وجہ بن کر رہا ہے۔ اس نے اس کردار پر اپنے خلوص کی تمام تر دولت بھی نثار کی ہے۔ اور وہ اس نظروں سے بھی گرا ہے کہ وہ اپنا ہوا یا ہو گیا ہے۔ خاوند اور شوہر کو چھوڑیئے کہ جب ... گرتے والوں پر انگلیاں اٹھانا اس کا رتی نصیبی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ اس کا پڑوسی بھی جو ہمسائیگی کا ادا کرتا ہے وہ اس کی سب سے عزیز متاع اس سے چھین کر لے جاتا ہے۔ یہ وہی پڑوسی ہے، جو قتیل کی طرح کا ایک مرد تو ہے مگر جس کے سینے میں قتیل کا دل نہیں دھڑکتا، بڑا اور نازک نظروں کی نشہ پاتر قتیل کی امنگوں کا وہ مرکز و محور اس کے گھر کی وہ چاندنی بھی ... بے شب بہنا ... میں جا رہی جاتی ہے

مگر پھر بھی میرے دل کو گلہ نہیں تجھ سے
اصول یہ ہے کہ جس نے جسے پسند کیا (پڑوسی)

قتیل اس نازک دل کے ساتھ یہ چوٹ بھی سہہ جاتا ہے۔ مگر وہ عورت کے فطری تلون سے باخبر ہے۔ عورت کی خود نمائی اور ادا ... اپنے ... سے وہ خوب واقف ہے۔ اسے یہ بھی معلوم ہے کہ وہ عورت جو کل اس شہرت پر مرمٹی تھی آج کسی راز دار کی ہیں پر بھی بکھر سکتی ہے۔ کیونکہ ہوس کے یہ سب کھیل مرد ہی نے تو عورت کو سکھائے ہیں۔

رات گئے تک گھائل لڑکے کرتے ہیں اعلان یہاں
یہ دنیا ہے سنگدلوں کی کوئی نہیں انسان یہاں
ندداروں کو نظموں میں جب جسم دکھائی دیتا ہے
ایک مہکتی سیج پہ اکثر ٹوٹتی ہے ہر تان یہاں (چھتنار)
دہی ہے بابِ اشارے ۔ دہی بھڑکے ہوئے گیت
کل میرے ہاتھ لگے ، آج کسی اور کے ہیں! (جلتا پتھر)

اگرچہ قتیل محبت کی بازی ہارنے کے بعد بھی اپنی اپنی پسند اس کا نقطۂ نظر اپنانے کی صلاحیت رکھتا ہے اور یہ بڑی بات ہے لیکن حقیقت یہ ہے یہ بلند تر آدرش اپنانے سے پہلے وادیٔ عشق میں قتیل کی بڑی بڑی آزمائش ہوئی ہے ۔ کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ اس نے طنز کے نشتروں سے اپنے محبوب ترین کردار کو ہی گھائل کر دیا ہے ۔ کبھی اس پہ یہ گذری ہے کہ جن تیروں سے وہ اپنی محبوبہ کو چھلنی کرنے چلا تھا ، ان سے خود ہی لہو لہان ہو گیا ہے اس کڑے امتحان سے گذر کر قتیل اس مقام تک جا پہنچا ہے ۔ جہاں عورت کا غم اس کا اپنا غم بن جاتا ہے ۔ یہ درد مشترک مرد اور عورت کو ایک ایسی بنیاد مہیا کرتا ہے جس پہ پورے معاشرے کی عمارت نو تعمیر کی جا سکتی ہے ۔ اور یہیں پہنچ کر قتیل اپنے غم کو حیات و کائنات کے اٹوٹ رشتوں سے منسلک کر لیتا ہے ۔ اب وہ مرد و عورت کی تباہی ، بے وفائی اور ہرجائیت کا ذمہ دار مروجہ نظامِ اقدار کو قرار دیتا ہے اور اس حقیقت کا اعلان بلند بانگ انداز میں کرتا ہے ۔ ۔

یہ محبت یہ وفائیں ، یہ مروت ، یہ خلوص
ان کو سرمائے نے بے کار بنا رکھا ہے
آ کہ اس فتنۂ زر پوش کو عریاں کر دیں
جس نے آفاق کو بازار بنا رکھا ہے (درد مشترک)

مگر اس فتنۂ زر پوش کا زہر معاشرے کے رگ و ریشے میں اس طرح سرائت کر چکا ہے کہ قتیل اپنی آواز کی تیز دھار کے ساتھ بھی اس زہر کے اثرات کو نہیں کاٹ سکتا ۔ کیوں کہ اس فتنۂ زر پوش کو عریاں کرنے کے لئے تو مسلسل کاوشوں اور بے پناہ ریاضتوں کی ضرورت ہے یہ ایک ایسا احساس ہے کہ جو قتیل کی آواز میں ٹھہراؤ اور متانت پیدا کرتا ہے ۔ ۔

اور میں پیار کی تقدیس میں مرنے والا
درد بن کر تیرے احساس میں بس جاؤں گا
وقت آئے گا تو اخلاص کا بادل بن کر
تیری جھلسی ہوئی دنیا پہ برس جاؤں گا

اور اب شاعر کو یہ احساس اندر ہی اندر گھلانے لگتا ہے کہ وہ طلوعِ فردا تک جی بھی سکے گا یا نہیں اور اس کی محبوبہ کا حشر کیا ہوگا ۔ ؟ کیا اسے حسرتوں کی قبر سے نکال کر حیاتِ نو بخشی جا سکے گی ۔ قتیل کے احساس کی یہی کشمکش ، جرم و سزا کی یہی آویزش قتیل کے مرکزی کردار کی

ٹریجڈی کو بلند سطح پر لے آتی ہے۔ جبر و اختیار کی آویزش کے ساتھ ساتھ اس کے غم میں گہرائی اور وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ ؎

آ کہ دونوں سر جھکائیں وقت کی آواز پر
تو مرے انجام پر رو، میں ترے آغاز پر

قتیل اپنی محبوبہ کو اسی آغاز کی یاد دلا رہا ہے۔ جب اس نے دلہن، بیوی اور ماں بننے کے حسین خواب دیکھے تھے۔ مگر کوئی فتنہ زر پوش ایک سرشار جوان بن کر ظاہر ہوا اور آن کی آن میں اس نوخیز کلی کو اپنے پاؤں تلے مسل کر چلا گیا اور پھر وہ عورت، عورت نہ رہی، ایک جنس بن گئی، مگر اب بھی راتوں کی اتھاہ خاموشی میں یہ عورت ؎

بلاتی رہتی ہے خیالوں کی ڈولی سے اکثر بہار دیکھے سویرے پہلے
سنا ہے کہ یہ جنس بازار بھی ایک عورت تھی نیلام ہونے سے پہلے

میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ قتیل وادیٔ سرحد کی محبوبہ سے بچھڑ کر اور ماں کی آغوش سے جدا ہو کر اس خلا کو پر کرنے کی فکر میں رہتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسے ایک ایسی شریک سفر کی تلاش رہتی ہے جو اس کے آدرش کے مطابق ہو۔ اور جو اس کے تمام تر معیار پر پوری اتر سکے جو اسے اتنی ہی محبت دے سکے جو لڑکپن میں اسے اپنے ماحول اور ماں باپ کی آغوش میں ملی تھی۔ مگر ہم نے دیکھا کہ عملی دنیا میں تمام تر اپنا آدرش نہیں ملتا۔ اگر کبھی کسی جسم کے توازن کا سرور اسے میسر بھی آ جاتا ہے تو روح اس توازن سے عاری نظر آتی ہے۔ شاید وادیٔ سرحد کی محبوبہ میں قتیل کو جسم و روح کے توازن کی سرمستی میسر آ جاتی۔ مگر یہاں شاعر کی طبعی افتاد اس کے راستے کا پتھر بن جاتی ہے اور زیادہ غور اور توقف کے بغیر وہ اس منزل کو پھلانگ کر تاجروں کے دیس میں بھٹکنے لگتا ہے۔

مگر یہاں دیکھنے کی چیز تو یہ ہے کہ کیا قتیل کسی مرحلے پر بھی اپنے آدرش کو خیرباد کہنے کے لئے تیار ہوا ہے؟ جواب نفی میں ملتا ہے وہ تو اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ جب عورت دلہن، بیوی اور ماں نہیں بن سکتی تو فتنہ زر پوش اسے بازار میں لا کر بٹھا دیتا ہے۔ ماتا کا جذبہ قتیل کے نزدیک بنیادی جذبہ ہے جس کے سہارے عورت بیوی بن کر زندہ رہنا چاہتی ہے۔ اور اگر اس جذبے کو تسکین نہ ملے تو وہ اپنا سب کچھ لٹا کر گھر کو بازار بنا دیتی ہے۔ اس کا اظہار قتیل نے اپنی ایک منفرد نظم "بانجھ" میں بڑی خوبصورتی سے کیا ہے۔ ؎

کتنے ہاتھوں نے ٹٹولا میری تنہائی کو
کوئی جگنو، کوئی موتی کوئی تارا نہ ملا
کتنے جھونکوں نے جھلایا مرے ارمانوں کو
دل میں سوئی ہوئی ممتا کو سہارا نہ ملا
کل بھی خاموش تھی میں، آج بھی خاموش ہوں میں
میرے ماحول میں طوفان نہ آیا کوئی
کتنے ارمان لئے ایک تمنا کے لئے
گھر لٹانے پہ بھی مہمان نہ آیا کوئی

کتنے ہی سال ستاروں کی طرح ٹوٹ گئے (بانجھ)

امراؤ جان ادا میں مرزا رسوا نے عورتوں کی تین قسمیں گنوائی ہیں۔ نیک بخت، خرابیں، بازاریاں۔ قتیل شفائی کی شاعری کے مرکزی کردار میں عورت کی دوسری قسموں کا رنگ روپ موجود ہے جو سوسائٹی کی دھتکاری ہوئی یا ٹھکرائی ہوئی عورتیں ہیں جو یا تو پیدا ہی بازار میں ہوئی ہیں یا امراؤ جان ادا کی طرح کسی حادثے نے انہیں گھر سے نکال کر خانم کے بالا خانے میں پہنچا دیا۔ ظاہر ہے معاشرہ ایسی عورتوں کو نیک بخت، کہنے پر کیونکر تیار ہوگا۔

قتیل دو وجوہ کی بنا پر اس عورت سے زیادہ متاثر ہو جاتا ہے جس کی چال ڈھال یا خد و خال کسی امراؤ جان ادا یا کسی اور سے ملتے جلتے ہیں۔ ایک تو قتیل کو اس کردار کے جسم کی گائی ہوئی حرارت سے لگاؤ ہے دوسرے وہ اس کی پہلو داری پر مرمٹا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اس کردار کے گھناؤنے پن سے بھی خوب واقف ہے اور اس کو جنم جنم کے لئے اپنا کر ایک پاکیزہ اور باوقار زندگی بسر کرنے کی بار بار صرف دعوت دیتا ہے۔ بلکہ اس کا متمنی بھی ہے۔ لیکن میرا اندازہ ہے کہ جس والہانہ انداز سے قتیل نے اس کردار سے محبت کی ہے اور جس جس روپ میں اس نے اس کردار کو اجاگر کیا ہے۔ اس سے قتیل کی اپنی شخصیت پر بھی اس کردار کی پہلو داری کی ایسی ایسی چھوٹ پڑی ہے کہ اب یہ عورت اگر اچانک نیک بخت بھی بن جائے تو ممکن ہے کہ شاعرانہ اعتبار سے قتیل کے لئے اس کردار کی پہلو داری اور بوقلمونی کے ساتھ ساتھ اس کی اہمیت بھی ختم ہو جائے۔ اگر قتیل ابتدا ہی سے وادیٔ سخن کی نیک بخت، عورت کو اپنی شاعری کا مرکز و محور بنا لیتا تو اسے ان کڑی منزلوں سے گذرنے کی کیا ضرورت تھی جن کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں۔ کیا یہ امکان تھا کہ اس عورت میں قتیل کو فنی پختگی اور یک زندگی کا شکار ہو جاتا۔ اور وہ اپنے اس مخصوص کردار کی بدولت اپنے لب و لہجہ میں ندرت اور انفرادیت پیدا کر سکتا۔ قتیل زندگی کی ندرتوں اور رعنائیوں کا شاعر ہے اور اپنے اس مقصد کے حصول کے لیے وہ مرزا رسوا کی طرح اپنی فنی صلاحیتوں کو بھی بروئے کار لانے کی خاطر ایک زاویے یا جھروکے کا انتخاب کر لیتا ہے جہاں سے وہ اپنے مرکزی کردار کے ذریعے حیات و کائنات کی سیاحت کر سکتا ہے۔ زمانے کی مختلف حالتوں اور کیفیتوں کے سیاق و سباق کا اندازہ لگا سکتا ہے۔ ؎

کس کو سنائیں حالِ دلِ زار اے ادا
آوارگی میں ہم نے زمانے کی سیر کی

مرزا رسوا کے ناول، امراؤ جان ادا، میں خانم کا بالا خانہ، وہ نگار خانہ ہے۔ جسے لکھنوی تمدن کا خلاصہ کہا جا سکتا ہے۔ اس نگار خانے کے ایک جھروکے میں ہمیں امراؤ جان ادا بھی نظر آتی ہے۔ جو اگرچہ اپنی ذات میں اس زمانے کا مکتب و مدرسہ ہے۔ لیکن جو لکھنوی تمدن کے زوال کا باعث بھی بنتی ہے۔

قتیل نے اپنی شاعری میں بازارِ حیات کو خانم کے نگار خانے کے مماثل قرار دیا ہے اور جھروکوں کی طرح عورت میں بھی اس بازار میں سالہا سال سے ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوتی رہتی ہے۔ رسوا کی طرح قتیل کا مرکزی کردار بھی بازارِ حیات کے کسی گوشے میں تک دبک کر بیٹھا۔ آنے جانے والوں کو دعوتِ نظر دیتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ گوشہ کبھی تحصیل روڈ پہ ملتا ہے اور کبھی میکلوڈ روڈ پر، یہ جھروکا کبھی ہیرا منڈی میں کھلا ہوا نظر آتا ہے اور کبھی اس کے پٹ سرائے بیلی رام کی طرف جا کھلتے ہیں۔

فن اور شخصیت

قتیل شفائی نمبر

مرزا رسوا کی امراؤ جان ادا، قتیل شفائی کے ہاں ہزار ہا تشبیہوں میں بٹ چکی ہے جو ہمیں بازارِ زندگی کے نگار خانوں کی طرف اشاروں میں بلاتی رہتی ہے۔ اور سوسوزا دیوں سے اپنی دکھ بھری داستانِ حیات سناتی رہتی ہے۔

یہ مجبوری تھرکتی ہے، جوانی بر سرِ محفل
بدن کے مسکراتے زاویے فریاد کرتے ہیں
جھروکوں سے مہکتے ہیں یہاں ہنستے ہوئے فاقے
یہاں بکتا ہے سودا زندگی کے ارمانوں کا
یہاں دن کو بدن تلتے ہیں میزانِ حکومت میں
یہاں جھنا ہے راتوں کو اکھاڑا رہنماؤں کا

قتیل کا مرکزی کردار وہ آئینہ ہے، جو ٹوٹ کر انگنت کرچیوں میں تقسیم ہو چکا ہے قتیل کی نگاہِ شیشہ گران کرچیوں کو سمیٹ کر ہر بار کوئی آئینہ تراش لیتی ہے۔ قتیل کے ہاں یہ آئینہ بار بار ٹوٹتا ہے اور وہ بار بار ان نوکدار ٹکڑوں کو اپنی نظر میں چبھو لیتا ہے اسے اس آئینہ کی شکستگی ہی سے تو عشق ہے۔ اس کی فنکارانہ نظر تو ہر شیشے میں اپنے محبوب کردار کو کسی نئے روپ میں جلوہ گر دیکھنا چاہتی ہے۔

زندگی آئینہ بردوش کھڑی ہے کب سے
مجھ کو نیری ہی کوئی شکل دکھانے کے لئے

لیکن کیا ان شیشوں کی مسیحائی قتیل کے بس کا روگ ہے۔ کیا قرنہا قرن سے آج تک کوئی معاشرہ بھی اس کچلی ہوئی عورت کے درد کا درماں پیش کر سکا ہے۔ کیا موجودہ سائنسی دور کی تمام تر ترقی کے باوجود آج بھی کسی نہ کسی صورت میں یہ مسئلہ موجود نہیں ہے اس مسئلے کی سنگینی کو تسلیم کرنے کے بعد ذہن میں یہ کرید شروع ہو جاتی ہے کہ اس کا حل کیا ہے کیا محض ایک معاشی اور معاشرتی مسئلہ ہے اور کیا طبقاتی تفریق ختم ہونے کے بعد ایک خوشحال معاشرے میں عورت بازار سے اٹھ کر گھر کی تمام تر ذمہ داریاں ہنسی خوشی قبول کرے گی؟ یا اس مسئلے کے کچھ اور بھی پہلو ہیں۔

فرائیڈ کا خیال ہے کہ حیاتیاتی طور پر مرد کے مقابلے میں عورت ایک انفعالی کردار ہے اور ہم جانتے ہیں کہ مرد ہمیشہ عورت کی انفعالیت پر غالب آکر، اسے اپنی برتری کا احساس دلاتا رہا ہے۔ نتیجۃً عورت اپنے احساس کمتری کو چھپانے کی کوشش میں غیر شعوری طور پر کئی جنسیاتی پیچیدگیوں کا شکار ہو جاتی ہے۔ یہیں سے عورت کی نفسیات میں بھی حیرت انگیز تبدیلیاں رونما ہونے لگتی ہیں۔ اور یوں یہ مسئلہ ایک نفسیاتی مسئلہ بھی بن جاتا ہے۔ جو کسی بیمار معاشرے میں سلجھنے کی بجائے اور الجھتا چلا جاتا ہے۔ قتیل اس سلسلے میں طبقاتی تفریق ختم کرنے پر بھی زور دیتا ہے۔ اور اپنی اپنی پسند کے اصول کو بھی اپناتا ہے مستقبل میں طبقاتی تفریق شاید ختم ہو جائے لیکن اپنی اپنی پسند کا اصول جتنا عمدہ ہے۔ محبت کی دنیا میں اس کا اطلاق اتنا ہی مشکل ہے۔ اگر اس اصول کو اپنا لینا اتنا آسان ہوتا تو دوسرے شاعروں کی طرح محبت میں قتیل کی ناکامی محض ایک سانحہ سا، بن کر رہ جاتی ۔۔ اگر قتیل کسی سانولی کو چاہتے اور سانولی کسی اور سانوریا، کے فراق میں کوئل کی طرح کوکتی رہے۔ تو آپ ہی بتائیے اس سارے کھیل میں کون کون گھائل ہوا

اور کس کس کی جان گئی ۔ طبقاتی بندوبست کو ختم کرنے کے عوامل تو انسان کے اختیار میں ہیں ۔ اور وہ ان سے کام بھی لے رہا ہے لیکن حیاتیاتی ، نفسیاتی اور داخلی طور پر ہر مرد و عورت کا جنسی مسئلہ تو اس کا ذاتی مسئلہ بھی ہے جس کے اظہار کی کم و بیش صورتیں اتنی ہی ہیں جتنی کہ کرہ ارض میں انسانوں کی آبادی ہے تو پھر کیا اس مسئلے کا حل ممکن نہیں ۔ رسوا کے کردار امراؤ جان ادا نے عمر بھر کی آوارگی کے بعد آخری خط میں لکھا تھا ۔

”میرے خیال میں مرد و عورت دونوں اپنے اپنے رستے اور اغراض کو سمجھ لیں تو ان میں ہرگز ملال نہ ہو بہت سی آفتیں ٹل جائیں اور بہت سی دور ہو جائیں ۔ قتیل کی نظر میں اس گتھی کو یوں سمجھایا جا سکتا ہے کہ حقائق سے پردہ ہٹا کر پورے اخلاقی نظام کو از سر نو تسلیم کیا جائے ۔

راتوں کو جسم بیچ کر گجر دم کی ہوا میں
گجروں کی یہ جھنکار جھروکے میں رہے گی
جب تک نہ حقائق سے ہٹا دے کوئی پردہ
عورت یوں ہی اخلاق کے دھوکے میں رہے گی

اگرچہ قتیل نے اپنے مخصوص انداز میں زیر بحث کردار کی داخلی اور نفسیاتی تحلیل کرنے کی بھی کوشش کی ہے لیکن اس نے اس کردار کے المیئے کے پس منظر میں زیادہ تر سرمایہ نظام کو ہی سزاوار ٹھہرایا ہے یہ ایک کھلی صداقت ہے اور اس سے انکار ممکن نہیں لیکن اس کی تکرار سے بعض اوقات قتیل کے داخلی جذبوں کی شدت رو بہ زوال بھی ہوئی ہے ان مواقع پر قتیل کی آواز کا زیر و بم ، اس کے بوتے رنگوں کی نقش گری اور فنکارانہ چابکدستی اس کے کام آتی ہے ۔ اور وہ اپنے بنیادی کردار کی شخصیت کے سجاؤ کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے ۔ سعادت حسن منٹو کا پسندیدہ کردار بھی یہی ہے لیکن اس کے ہاں معاشی ناہمواری کی تکرار نظر نہیں آتی جس کی وجہ سے اس کے ہاں جرم و سزا اور جبر و اختیار کی کشمکش اور تصادم کا عمل قتیل کے مقابلے میں شدید تر ہو جاتا ہے دراصل اس میں منٹو کی شخصیت کی زہرناکی کا بھی بڑا ہاتھ ہے ۔

حقائق سے پردہ اٹھانے اور مروجہ نظام اخلاق میں انقلاب برپا کرنے کے دونوں ہی قائل ہیں مگر قتیل ایک شاعر ہے ۔ وہ حقائق کا پردہ چاک کرتے ہوئے پھر خوابوں کی دنیا میں کھو جاتا ہے جس سے اس کے شاعرانہ لب و لہجہ میں زہر کے ساتھ امرت بھی گھل مل جاتا ہے ۔ اور یہی وہ میٹھا زہر ہے جسے قتیل عمر بھر ہنس ہنس کر پیتا رہا ہے ۔ اگر قتیل کے لب و لہجہ میں زہر خند کے ساتھ گھلی ملی یہ مٹھاس نہ ہوتی تو وہ بھی منٹو کی طرح عدل و انصاف کے کٹہرے میں ایک آدھ بار تو ضرور ہی نظر آ جاتا ۔

تاہم شخصیتوں اور آہنگ کے اس اختلاف کے باوجود جہاں تک موضوع کے انتخاب اور یگانگت کا تعلق ہے ۔ موجودہ دور میں قتیل کو جدید شاعری کا سعادت حسن منٹو کہا جا سکتا ہے ۔ مستقبل طوائفیت کا کوئی حل تلاش کر سکے گا یا نہیں اس کا مثبت یا منفی جواب تو خود مستقبل دے گا ۔ پھر بھی منٹو اور قتیل ایسے فنکاروں کی پرخلوص کاوشوں اور نیم محکوم اور نو آزاد ممالک کی انقلاب آفریں صورت حال سے یہ امید ضرور بندھتی ہے ۔ کہ مستقبل میں اس مسئلے کی سنگینی اور گھناؤنا پن ختم ہو جائے گا ۔

حیاتیاتی اور نفسیاتی طور پر اس مسئلے کی پیچیدگیاں شاید بہت دیر میں ختم ہوں یا کسی نہ کسی صورت میں ہمیشہ باقی رہیں لیکن اس بات کو تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ مستقبل میں عورت اور مرد کے مابین تمام رشتے افہام و تفہیم کی بنیادوں پر استوار ہوتے چلے جائیں گے۔

ہم نے قتیل کی شاعری کے مرکزی کردار کو گوناں گوں صورتوں میں دیکھا ہے اور اس کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے یہ ایک متحرک پہلودار اور زندہ کردار ہے جو اپنے سینے میں ماضی کی خونیں تاریخ سمیٹے ہوئے ہے جس سے مستقبل کی امیدیں وابستہ ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ آج یہی کردار پکار پکار کر کہہ رہا ہے "مجھے بچاؤ" ورنہ خود تباہ ہو جاؤ گے۔ میں شکست کا اشارہ ہوں۔ میں زوال کی علامت ہوں قتیل یہ فریاد سن کر خاموش تماشائی کی طرح آنکھیں بند کر کے نہیں گزر جاتا۔ اس کی نظر میں تو یہ کردار اپنی بیچارگی اور آوارگی کے باوجود قدرت کا شہپارہ ہے۔ وہ خود بھی تو از خود رفتہ مسافر ہے۔ اس کی عظمت یہ ہے کہ وہ سرِ بازار اس کردار کو بڑھ کر سینے سے لگا لیتا ہے آخر اسے بھی تو منزل پر پہنچنے کے لئے ایک دردمند شریکِ سفر کی ضرورت ہے۔

کام لیا ہے تو نے اک سوچی سمجھی نادانی سے
نام مٹایا تو نے اپنا جنت کی پیشانی سے
اونچی ہے انسان کی عظمت، گندم کی سلطانی سے
اے آدم کی پہلی بھول
تیرا میرا ایک اصول

قتیل خود بھی دامودر گپت، فلابیر، مرزا رسوا، اور سعادت حسن منٹو کے قبیلے کا ایک باشعور، حساس اور منفرد کردار ہے۔ جسے عورت اور مرد کے ازلی اور ابدی رشتے سے عشق ہے۔ جو جنم جنم کے ساتھی ہیں اور اپنی گمراہیوں اور رسوائیوں کے باوصف عظیم ہیں۔

سب دنیا کو چھوڑ کے جس نے مجھے بنایا میت
سنتا ہوں دن رات میں جس کی سانسوں کا سنگیت
چھائے میرے ذہن میں اکثر بن بن کر الہام
سانولی سی اک عورت جس کا مردوں جیسا نام　　(سانولی سی ایک عورت)

نظمیں



آئینے کے سامنے

ترے شبستاں کی نکہتوں میں ہزاروں سانسیں مہک رہی ہیں
مگر تری سیج کا کوئی داغ، کوئی گُل مطمئن نہیں ہے
اگرچہ کتنے جسیم سائے گھلے ہیں بستر کی سلوٹوں میں
مگر ترے بے کراں ارادوں کا کوئی بھی سال و سن نہیں ہے

کھلے کواڑوں کے بند ہونٹوں میں دفن ہیں بے حساب نغمے
مگر ترے ساز نے کسی گیت کا کبھی ساتھ بھی دیا ہے؟
کھلے رہے ہیں ہزاروں آغوش صبح ہونے کے بعد تک بھی
مگر ترے حسن نے کسی دل کے ہاتھ میں ہاتھ بھی دیا ہے؟

کبھی تصور کے دائرے کو کچھ اور پھیلا کے دیکھ لیتی،
کہ ابتدائے شباب کا اولیں کرشمہ جواں ہے اب تک
تری امنگوں کا گرم لاوا، جو کسمسا کر اُبل پڑا تھا،
ترے شبستاں کی شعبدہ بازیوں میں شعلہ فشاں اب تک

ترے تبسم کے سرد شعلوں کی زد میں آتی رہی ہے دنیا
ہلال و خنجر، صلیب و زنّار تیرے ہونٹوں سے جل چکے ہیں
تعیناتِ حدودِ کونین بارہا تو نے توڑ ڈالے،
ترے بدلتے ہوئے تقاضے ہر ایک سانچے میں ڈھل چکے ہیں

یہ آئینے کا اداس چہرہ تجھے تسلی نہ دے سکے گا !
اب آئینہ توڑ دے کہ تیری نظر نہ یہ بار سہہ سکے گی
کئی مراحل، کئی فسانے ابھی ترے انتظار میں ہیں
یونہی چلی چل وگرنہ تیری یہ سیج قائم نہ رہ سکے گی

نظارے نظر کو چھو کے روپوش ہوئے
پنچھی بھی چہک چہک کے خاموش ہوئے
اُن لمحوں کا وقت کر رہا ہے ماتم
جو صبح کے لاشے سے ہم آغوش ہوئے

حالات کے ہر موڑ پہ مڑ جاتے ہیں
پانی کی طرح ٹوٹ کے جڑ جاتے ہیں

یہ وقت کے بندے، یہ خیابان زادے
شبنم کی طرح دھوپ میں اُڑ جاتے ہیں

لڑھکتا پتھر

روشنی ڈوب گئی، چاند نے منہ ڈھانپ لیا
اب کوئی راہ دکھائی نہیں دیتی مجھ کو
میرے احساس میں کہرام مچا ہے لیکن
کوئی آواز سنائی نہیں دیتی مجھ کو!

رات کے ہاتھ نے کرنوں کا گلا گھونٹ دیا
جیسے ہو جائے زمیں بوس تِنوالا کوئی
یہ گھٹا ٹوپ اندھیرا، یہ گھنا سناٹا
اب کوئی گیت ہے باقی نہ اجالا کوئی!

جس نے آنکھوں میں ستارے سے کبھی گھولے تھے
آج احساس پہ کاجل سا بکھیرا اس نے
جس نے خود آ کے ٹٹولا تھا مرے سینے کو
لے لیا غیر کے پہلو میں بسیرا اس نے

وہ تلوّن کہ نہیں جس کا ٹھکانہ کوئی!
اس کے اندازِ کہن آج نئے طور کے ہیں
وہی بیباک اشارے، وہی بھڑکے ہوئے گیت
کل مرے ہاتھ بکے، آج کسی اور کے ہیں

یہ مہکتا سا، چہکتا سا، لہکتا سا بدن
اس کی معیاد ہے دو روز لپٹنے کے لئے
زلف بکھری ہوئی بکھری تو نہیں رہ سکتی،
پھیلتا ہے کوئی سایہ تو سمٹنے کے لئے

عورت

جب کبھی چاند گھٹاؤں میں گھرا ہوتا ہے
میں ترے کاکل و رُخسار میں کھو جاتا ہوں
جب خلاؤں میں ابھرتی ہے ابابیل کوئی
میں تری یاد میں بے چین سا ہو جاتا ہوں
جب کبھی آنچ ستاروں کی ستاتی ہے مجھے
تیری یادوں کی خنک سیج پہ سو جاتا ہوں
جب کہیں دورِ تصور میں نکل جاتا ہو
میں تری زلف میں کچھ اشک پرو جاتا ہوں

حسرتیں مہر بہ لب دیکھ رہی ہیں مجھ کو
میرے احساس میں کہرام مچانے کے لئے
آرزوؤں کی چبھن دل میں گھلی جاتی ہے
میری سوئی ہوئی راتوں کو جگانے کے لئے
ولولے نقش بہ دیوار ہوئے جاتے ہیں
میرے انجام کی تلخی میں سمانے کے لئے
زندگی آئینہ بردوش کھڑی ہے کب سے
مجھ کو تیری ہی کوئی شکل دکھانے کے لئے

وقت اڑتا ہی چلا جاتا ہے جھونکا بن کر!
اور میں تیرے خیالوں سے نکلتا ہی نہیں

کائنات ایک نئے حُسن کی ضو مانگتی ہے
اور یں جادۂ افکار یہ چلتا ہی نہیں
روحِ آلام یلغار سے چلّاتی ہے
اور یں پیار کے انداز بدلتا ہی نہیں
تُو مرے پیار سے انکار کئے جاتی ہے
اور یہ آس کا پتھر کہ پگھلتا ہی نہیں

تُو کہ زرکار جھروکے میں سجی بیٹھی ہے
تجھ کو رُسوا سحروشام کیا جائے گا
تیرے جلوؤں کی تمازت میں نہا لینے پر
تیرے ماحول کو بدنام کیا جائے گا
خلوتِ خاص میں ہونٹوں کی صبوحی پی کر
صُبح ہوتے ہی تجھے عام کیا جائے گا
کھنکھناتی ہوئی جیبوں کے سُنا کر نغمے،
تیرے پندار کو نیلام کیا جائے گا

تُو کہ ہر محفلِ رنگیں میں چلی آتی ہے
اپنے چہرے پہ سیہ رات کا غازہ مل کے
اپنے آنچل میں چھپائے ہوئے دھڑکن دل کی
اپنی پلکوں پہ سجائے ہوئے سپنے کل کے
ان گنت رنگ ترے چشمۂ عارض میں گھلے
نو بہ نو جام ترے قلب و نظر میں چھلکے،
بارہا جسم کا بازار سجایا تُو نے!
اُف! مگر کوئی خریدار نہ آیا چل کے

تو کہ بازار میں پہلی سی اب تری قدر نہیں

اتنی ارزاں ہے مگر پھر بھی خریدار کہاں؟
تیرے ہونٹوں سے ہے عنقا وہ تبسم کی مٹھاس
تیری آواز میں وہ نقرئی جھنکار کہاں؟
مطلق الحکم جوانی کے وہ انداز گئے
اب ترے حسن میں پہلی سی وہ للکار کہاں؟
"نرخ کچھ اور بڑھا دے کہ یہ ارزاں ہے ابھی"
آج وہ جنس کہاں؟ آج وہ بازار کہاں؟

تو کہ ماضی کی بہر طور پرستار نہیں
کیوں گئے وقت کی باہوں پہ گری جاتی ہے؟
کیوں کسی ڈار سے بچھڑے ہوئے پنچھی کی طرح
آسماں بوس محلات میں کرلاتی ہے؟
کیوں زبوں حال شرابی کا بڑھاپا بن کر
اپنے جوبن کی حکایات کو دہراتی ہے؟
کیوں کسی بستر زرکار پہ کروٹ لے کر!
اپنے ٹوٹے ہوئے انگ انگ کو سہلاتی ہے؟

تو کہ احساس کی رانی ہے، مہارانی ہے!
تیرا جوبن نہیں در در پہ بھٹکنے کے لئے
تیرے آنسو نہیں دامن پہ ڈھلک جانے کو
تیری صورت نہیں آنکھوں میں کھٹکنے کے لئے
تیری نظریں نہیں جھک جھک کے بہکنے والی
تیرا لہجہ نہیں باتوں میں اٹکنے کے لئے

تو کسی پیار کے دھوکے میں نہ لانا دل کو
یہ ترے ہاتھ ہیں دامن کو جھٹکنے کے لئے

مجھ کو ہرچند ترے حسن نے دھتکار دیا
لیکن اس دل پہ مرا زور تو چلتا ہی نہیں
جب تلک میں تری یادوں کا نہ جھولا جھولوں
جی کسی طرح جدائی میں بہلتا ہی نہیں
میں وہ زردار نہیں جس کا گلستانِ حیات
حرص کی آنچ بناں پھولتا پھلتا ہی نہیں
تو مرے پیار سے انکار کیئے جاتی ہے
اور یہ آس کا پتھر کہ پگھلتا ہی نہیں

میں کہ افلاس کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر
چُور ہوتا ہوں تو روتے ہوئے سو جاتا ہوں
جب مجھے تیری جوانی کا خیال آتا ہے
جانے کیا سوچ کے بے چین سا ہو جاتا ہوں
جب کہیں مُدّر تصوّر میں نکل جاتا ہو
میں تری زُلف میں کچھ اشک پرو جاتا ہوں

وقت نے مجھ سے تجھے چھین لیا ہے لیکن
میں جیوں گا ترے خوابوں میں سمانے کے لئے
میں جیوں گا تری عظمت کا نگہباں بن کر
میں جیوں گا تجھے ذِلّت سے بچانے کے لئے
میں ترے دل پہ کوئی آنچ نہ آنے دوں گا
میں بڑھوں گا تجھے سینے سے لگانے کے لئے
زندگی آئینہ بر دوش کھڑی ہے کب سے
مجھ کو تیری ہی کوئی شکل دکھانے کے لئے

بانجھ

کتنے ہی سال ستاروں کی طرح ٹوٹ گئے
میرے آنگن میں کوئی چاند جنم لے نہ سکا
ٹکٹکی باندھ کے افلاک پہ، روئی برسوں،
آج تک کوئی بھی واپس مرا غم لے نہ سکا

وہ زمیں، جو کوئی پودا نہ اُگل سکتی ہو
قاعدہ ہے کہ اسے چھوڑ دیا جاتا ہے
گھر میں ہر روز یہی ذکر، یہی شور سنا
شاخ سوکھے تو اسے توڑ دیا جاتا ہے

مجھے باہوں پہ اٹھالے، مجھے مایوس نہ کر
اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں سجالے مجھ کو،
اپنے احساں کے صلے میں مرا جوبن لے لے
(کر دیا سب نے مقدر کے حوالے مجھ کو)

ایک، دو، تین ـــ کہاں تک کوئی گنتا جائے
ان گنت سانس مہکتے ہیں مرے سینے پر
میرے لب پر کوئی نغمہ، کوئی فریاد نہیں
لوگ انگشت بدنداں ہیں مرے جینے پر

کتنے ہاتھوں نے ٹٹولا مری تنہائی کو
کوئی جگنو، کوئی موتی، کوئی تارا نہ ملا
کتنے جھونکوں نے جھلایا مرے ارمانوں کو
دل میں سوئی ہوئی مستی کو سہارا نہ ملا

کل بھی خاموش تھی میں آج بھی خاموش ہوں میں
میرے ماحول میں طوفان نہ آیا کوئی!
کتنے ارمان مٹے ایک تمنا کے لیے
گھر لٹانے پہ بھی مہمان نہ آیا کوئی

کتنے ہی سال ستاروں کی طرح ٹوٹ گئے!

رباعی

•

یوں شاخِ نشیمن پہ نہ بجلی ٹوٹے
اِس طرح شگوفوں کو نہ صرصر لوٹے

گلشن پہ جو ہم سایہ فگن ہو جائیں
کانٹوں کے مسامات سے خوشبو پھوٹے

البم

یہ میری جوانی کی پہلی کرن ہے!
جسے میری تقدیر نے ایک تاریک دل میں سجایا
جسے میں نے تاریکیوں سے بچانے کی خاطر پتنگا بنایا
پتنگا بن کر کسی شمعِ نَو پر گرایا، جلایا
مگر اب وہ شمعِ فروزاں کہاں ہے؟

یہ میری محبت کی پہلی خطا ہے!
جسے میری انمول عصمت کے گل رنگ سائے نہ بھائے
جسے میں نے اپنے بدن کے گلابی ترانے سنائے
سرِ عام جس کے لئے میں نے گیتوں کے گجرے بنائے
مگر اب وہ گیتوں کا رسیا کہاں ہے؟

یہ ہنستا ہُوا زندہ دل نوجواں ہے!
مگر اس کی زندہ دلی کا ہر اک جذبۂ بیکراں مر چکا ہے
مری شوخ، چنچل جوانی سے اب اس کا جی بھر چکا ہے
مرے نت بدلتے ہوئے شوقِ بیباک سے ڈر چکا ہے
مگر میں اسے یاد کرتی ہوں اب تک!

یہ بھنورے ہیں میری جوانی کے پیاسے!
یہ بھنورے مرے پھول سے عارضوں پر لپکتے رہے ہیں

جوانی کا رس چوسنے کو ہمیشہ بھٹکتے رہے ہیں !
مرے پاس آکر بھی اکثر مری راہ تکتے رہے ہیں
مگر اب نہ جانے کہاں اٹھ گئے ہیں؟

یہ میری ہوس کا شریکِ سفر ہے !
اسے رقص گاہوں کی آلائشوں سے چرایا ہے میں نے
اسے اپنے حسن و جوانی کا تاجر بنایا ہے میں نے
اسے آسماں کی حدوں تک اٹھا کر گرایا ہے میں نے
مگر اب مجھے اس پہ رحم آ رہا ہے !

یہ وہ ہے جسے میں نے چھپ چھپ کے پوجا!
یہ بھوکے وطن کا ہوس کار انساں، یہ سادہ سلونا
بنایا تھا جس کے لئے میں نے انگڑائیوں کا بچھونا
جوانی کی نادانیوں سے بنی جس کی خاطر کھلونا
وہی دیوتا اب کہاں جا چھپا ہے؟

یہ نو عمر، یہ نو گرفتار پنچھی !
یہ بھولا مسافر، یہ گیتوں میں، سپنوں میں کھویا ہوا سا
یہ آزاد انساں محبت کے چھینٹوں سے دھویا ہوا سا
اسے دیکھنا چاہتی ہوں ابد تک میں سویا ہوا سا
مگر تا بہ کے یہ بھی سوتا رہے گا؟

راستے کا پھول

نچوڑ لو، مرے جواں لبوں کا رس نچوڑ لو
مرے اداس عارضوں کے پھول توڑ لو

نفس نفس میں خوشبوؤں کے جال بُن رہی ہوں میں
نظر نظر سے جگنوؤں کے گیت چُن رہی ہوں میں
مری جبیں پہ رقص کر رہی ہیں بے حجابیاں
چھلک رہی ہیں میری بات بات میں گلابیاں
لپک رہی ہیں مستیاں بدن کی ہر اٹھان سے
لچک رہے ہیں ابروؤں کے خم عجیب شان سے

یہ وقت رائیگاں نہیں، ہوس کا نخل سینچ لو
مرا گداز جسم اپنے بازوؤں میں بھینچ لو

مرا بدن ہزار زمزموں کو تولتا رہا
مرا شباب زندگی کے راز کھولتا رہا
میں ان گنت جوانیوں سے پھاگ کھیلتی رہی
میں ہر نئے ایاغ میں شراب انڈیلتی رہی
کئی چراغ جل کے میری انجمن میں کھو گئے
ہزاروں گیت خامشی کے بازوؤں پہ سو گئے

نہ جانے کیا کمی تھی میرے حُسن کے خمار میں
کہ زندگی نہ رل سکی کسی کو میرے پیار میں

فریب کھا رہی تھی میں، فریب کھا رہی ہوں میں
ابھی تک اپنی حسرتوں کو آزما رہی ہوں میں
مذاق سا بنی ہوئی ہوں کائنات کے لئے،
پکارتا ہے ہر کوئی بس ایک رات کے لئے
میں سوچتی ہوں بے بسی کا کچھ تو حق ادا کروں
یہ رات بھر کی بھیک آؤ تم کو بھی عطا کروں

نچوڑلو، مرے جواں لبوں کا رس نچوڑلو!
مرے اداس عارضوں کے پھول توڑلو

●

جوانی کو سزائے لذتِ احساس دے دینا
میں اس حد پر خدا کو آدمی محسوس کرتا ہوں

فلک پر آخرِ شب ٹمٹما کر ڈوبتے تارے
میں اپنے ساتھ تیرا درد بھی محسوس کرتا ہوں

●

کھنڈر

وہ مکاں، جس کے دریچے مدتوں سے بند ہیں
کچھ دنوں سے چھا رہا ہے میرے احساسات پر
زندگی کی دھڑکنیں آلودۂ تاثیر ہیں
وقت کے ماتھے پہ اک اُجلی چمک پیدا ہوئی
تیرہ و تاریک راہوں میں ستارے بچھ گئے
اِن اجالوں میں اندھیرے لائقِ تعزیر ہیں
زندگی نے دو قدم پیچھے کو پلٹا کھا لیا
پھر وہی پیماں، وہی سہمی ہوئی سرگوشیاں
سُن رہی ہوں اب بھی ماضی کے رسیلے قہقہے،
ٹمٹماتا ہے ابھی تک میری کٹیا کا دیا!
وہ گٹھیلا سا بدن ابریشمی ملبوس میں
آتے جاتے آنکھوں آنکھوں میں سندیسے پیار کے
بھول سکتے ہیں کبھی؟ اُن کو بھلا سکتی ہوں میں؟
اُف وہ آنکھیں، دو دیئے جلتے ہوئے فانوس میں
میں نے دیکھی تھی انہی آنکھوں میں تاروں کی چمک
اک مسلسل کیف، اک پیہم مسرت کی نمود
والہانہ عشق کی اک غیر فانی یادگار
ہلکی ہلکی سی خلش، اک میٹھی میٹھی سی کسک
آہ وہ خونی سحر، میری محبت کی رقیب
اُف وہ فراٹے بھرتی ہوئی موٹر کا بل کھاتا دھواں

آخری آہوں میں وہ ڈوبا ہوا لمبا سفر
ایک نادیدہ وطن میں کھو گیا میرا حبیب
دیکھ کر کیتھا میں مجھ کو کروٹیں لیتے ہوئے
غرق ہو جاتے ہیں احساسات گہری سوچ میں
رینگتی ہے دل کے اک تاریک گوشے میں امید
آ رہے ہوں جیسے وہ مجھ کو صدا دیتے ہوئے
جن کے پس منظر میں میری جنتیں آباد ہیں
مسکراتے ہیں ابھی تک ان دریچوں کے کواڑ
جیسے میری زندگی بازیچۂ تقدیر ہے
جیسے میرے جھونپڑے کا کوئی مستقبل نہیں
میرا ننھا ہے کہ فردوسِ بریں کا پھول ہے
رات کی تنہائیوں میں ڈرے سے اس کو لیے
"لو وہ ابا آ گئے" کہتی ہوں جانے کس لیے
وہ نہ آئیں گے، نہ آئیں گے، یہ میری بھول ہے.

●

اے دل کے ولولو شبِ وعدہ فریب ہے
تا زندگی سویرا سویرا کرو گے تم!

ایکٹریس

تھرتھراتی رہی چراغ کی لو
اشک پلکوں پہ کانپ کانپ گئے
کوئی آنسو نہ بن سکا تارا
شب کے سائے نظر کو ڈھانپ گئے

کٹ گیا وقت مسکراہٹ میں
قہقہے روح کو پسند نہ تھے
وہ بھی آنکھیں چرا گئے آخر
دل کے دروازے جن پہ بند نہ تھے

سونپ جاتا ہے مجھ کو تنہائی
جس پہ دل اعتبار کرتا ہے
بنتی جاتی ہوں نخلِ صحرائی

تو نے چاہا تو میں نے مان لیا
گھر کو بازار کر دیا میں نے
بیچ کر اپنی ایک ایک اُمنگ
تجھ کو زردار کر دیا میں نے

اپنی بے چارگی پہ رو رو کر
دل تجھے یاد کرتا رہتا ہے
قمقموں کے سیہ اُجالے میں
جسم فریاد کرتا رہتا ہے

شمع انجمن

میں زندگی کی ہر اک سانس کو ٹٹول چکی
میں لاکھ بار محبت کے بھید کھول چکی
میں اپنے آپ کو تنہائیوں میں تول چکی
میں جلوتوں میں ستاروں کے بول بول چکی
——— مگر کوئی بھی نہ مانا

وفا کے دام بچھائے گئے قرینے سے
مگر کسی نے بھی روکا نہ مجھ کو جینے سے
کسی نے جام چرائے ہیں میرے سینے سے
کسی نے عطر نچوڑا مرے پسینے سے
——— کسی کو خبر نہ جانا

مری نظر کی گرہ کھل گئی تو کچھ بھی نہ تھا
جو بازوؤں میں کہیں تل گئی تو کچھ بھی نہ تھا
مرے لبوں سے شفق ڈھل گئی تو کچھ بھی نہ تھا
جواں رہی سو رہی گھل گئی تو کچھ بھی نہ تھا
——— کہ لٹ چکا تھا خزانا

رہی نہ سانس میں خوشبو تو بھاگ چھوٹ گئے
گیا شباب تو اپنے پرائے چھوٹ گئے
کوئی تو چھوڑ گئے، کوئی مجھ کو لوٹ گئے
محل گرے سو گرے، جھونپڑے بھی ٹوٹ گئے
——— رہا نہ کوئی ٹھکانا!

ہرجائی

کھیت سے دور دہکتے ہوئے دورا ہے پر
ایک سرشار جواں میں نے کھڑا پایا تھا
تمتماتے ہوئے چہرے پہ سُلگتی آنکھیں
جیسے بہکے ہوئے گلزار کا خواب آیا تھا

سر پہ گاگر کے چھلکنے سے جو تارے ٹوٹے
آسماں جھانک رہا تھا مجھے حیرانی سے
تن سے کنکر جو پڑا میری حسیں گاگر پر
ایک نغمہ سا اُبھرنے لگا پیشانی سے

لوٹتی رات گئے گھر کو پلٹنا میرا
اک لپکتے ہوئے سائے نے ڈرایا تھا مجھے
"تم؟ اری تم؟" (وہی سرشار جواں تھا شاید)
"جی یونہی ایک سہیلی نے بلایا تھا مجھے"

کھیت بھرپور جوانی کو لُٹا بیٹھے تھے
ہر دراتی پہ تسلسل کا جنون طاری تھا
جانے کیا دیکھ رہا تھا وہ مرے چہرے پر
اس قدر یاد ہے انگلی سے لہو جاری تھا

کانچ کی چوڑیاں کل رات نہ ہوں باہوں میں
اتنی اونچی تری پازیب کی جھنکار نہ ہو
سرسراتا ہُوا ملبوس نہ لہرا جائے
کسی سایے کا گماں بھی پسِ دیوار نہ ہو

جب کبھی چاند سے پگھلی ہوئی چاندی برسی
اونگھتی رات کے شانے کو جھنجھوڑا ہم نے
بھُول کر بھی کبھی پلکیں نہ جھپکنے پائیں
اِس قدر نیند کو آنکھوں سے نچوڑا ہم نے

اب مگر چاندنی رات آ کے گزر جاتی ہے
پوچھتا ہی نہیں کوئی مِری تنہائی کو
کھیت سے دُور، دمکتے ہوئے دوراہے پر
ڈھونڈتی ہیں مِری آنکھیں کسی ہرجائی کو

•

چاندنی رات، بِسکرِ شعر و سخن
میں نے چاندی کے بُت تراشے ہیں
ان میں تم رُوح پھونک دو، ورنہ
میرے افکار سرد لاشے ہیں

•

قتیل شفائی نمبر

کے لئے

نیک خواہشات کے ساتھ

پرکاش چھابڑا





اظہارِ خیال

سید عابد علی عابد۔ مرحوم

زیر نظر تصنیف "مطربہ" جس پر میں ایک اور جگہ اظہار خیال کر چکا ہوں قتیل کی متعدد مطبوعات میں سے ایک ہے۔ میں ان نقادوں میں سے نہیں جو شعری تصنیفات کو اصناف میں بانٹ دیتے ہیں۔ ذہن جہاں ایک رنگ ہوگا ہر تصنیف میں ہم آہنگ ہوگا۔ قتیل کے ذہن کی جو خصوصیت میں اس کی تمام تخلیقات میں نمایاں طور پر پہچانتا ہوں وہ یہ ہے کہ حقائق کے جواہر تابناک کے جو پہلو زیادہ تابناکی کی وجہ سے نظروں سے اوجھل رہتے ہیں وہ اس زر کی دھند کو چیر کر حقیقت کو دیکھتا ہے اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس کا اسلوب نظر ہمیشہ منفرد ہوتا ہے۔ انداز فکر ہمیشہ نیا اور تعمق تا شر بے نظیر۔

یوں تو اس کی مطبوعات کا کوئی مجموعہ ایسا نہیں جس میں مجھے وحدت تخلیق کا سراغ نہ ملتا ہو لیکن مطربہ کا عنوان خیال کے ایک خاص سلسلے کے پیچ و خم کا اظہار کرتا ہے۔ جس طرح گبن (Gibbon) نے عروج و زوال سلطنت روما میں اس انحطاط کی تصویر کھینچی تھی قوموں کی غارت گری اور بربادی کا موجب بنتا ہے قتیل نے بھی مطربہ کو علامت بنا کر فنون لطیفہ کے عروج و زوال کی تصویر کشی کی ہے۔ چونکہ کتاب کا نام مطربہ ہے اس لیے رقص اور نغمے کے ساتھ جسم اور جنس کے جو حسی تاثرات وابستہ ہیں ان سے بھی تعرض کرنا اس کا فریضہ ہوتا ہے۔ ورنہ کتاب محض علامتوں کا انبار ہو جاتی اور جذبہ ہے کی جس گری نے نغموں کو باب زر یا باب سوختن بنا دیا ہے وہ ہم تک نہ پہنچتی۔ قتیل نے خود اپنی ذات کے ساتھ کیا سلوک کیا کہ عذاب و اضطراب کے کن جہنموں سے گزر کر یہ ماورائی مقام حاصل کیا ہے کہ وہ اسے اپنے آپ کو دیکھے اور بہ یک سو علامت کے ساتھ اور بہ سوئے دیگر اپنی اجتماعی معنویت کے ساتھ اپنا رشتہ برقرار رکھے۔ وہ غالب کے اس شعر کی تفسیر ہے۔ ع

مقدم سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے
خانۂ عاشق مگر ساز صدائے آب ہے

ظاہر ہے کہ جل ترنگ مراد ہے۔ جوں جوں پانی کا شور چڑھتا گیا ہے اور مکان سے گرتا گیا ہے شور نے غالب کے تخیل میں موسیقی کی صورت اختیار کر لی ہے (دیکھئے مضمون "شور کی اہمیت" مسعود پرویز مطبوعہ نئی تحریریں)

مطربہ نسبتاً مختصر کتاب ہے یعنی صرف ۸۰ صفحات پر محیط ہے اس میں صرف ایک غزل ہے۔ مجھے اس سوال کا جواب دینا ہے کہ منظومات کے

اس دور میں غزل کا کیا مقام ہے اس کا جواب یہ ہے کہ منظومات میں قتیل کا جذبہ اس دائرہ اعتدال کے اندر ہے جسے کلاسیکی کے بہے ہوئے دیئے رہنے کا مزاج کہتے ہیں لیکن غزل نے اس اعتدال میں ذات و صفات کے حریر و پرنیاں کو جلا کر خاک کرکے جو شعلہ روشن کیا ہے اس میں ہمیں بہ یک لمحہ مطربہ کے تمام رخ نظر آتے ہیں۔ یہی وہ لمحہ وجدان ہے جس میں فنکار جزو میں کل کو دیکھتا ہے یہی وہ ساعت گریزاں ہے جس کی راہ میں وہ آنکھیں بچھا کر بیٹھ رہتا ہے کیونکہ جب اس لمحے پر فن کار کی گرفت مضبوط ہوتی ہے تو اسے جو کچھ کہنا ہے اس کا خلاصہ روشن اور منور ہو جاتا ہے۔ غالب نے اس کیفیت کو یوں بیان کیا ہے۔

موج سراب دشت وفا کا نہ پوچھ حال
ہر ذرہ مثل جوہر تیغ آب دار تھا

کتاب کی اشاعت کے بعد جب اس کی منظومات کے عنوانات کی اپچ نے اندرونی آہنگ کے، مطالب دقیق کی تشریح نے، دقت نظر نے، اک شور اطاماں برپا کیا تو کچھ لوگوں نے اس تخلیق کے محرکات سے بحث کرنے کی کوشش کی۔ وہ اس بات سے غافل تھے کہ تخلیق کا صرف ایک محرک ہوتا ہے۔ نمائش۔ ذات اور صفات حسن اور دینوں کا ارتباط ہے انسان جو دنیا میں صرف تین چیزوں سے آگاہ ہے۔ خود انسان کائنات اور خدا۔ جو شاعر ان تینوں کے ارتباط کی رمز پا لیتا ہے اس کا شمار اکابر میں ہوتا ہے۔

●

قتیل شفائی کی فنکارانہ انفرادیت اتنی واضح ہے کہ اس کا کوئی
ایک شعر دوسرے شعرا کے تیسرے شعر میں شامل کر دیجئے اور کسی
شعر شناس سے کہئے کہ ان میں سے قتیل کا شعر چن لے تو وہ اس میں
یقیناً کامیاب ہوگا۔ کیونکہ قتیل سینکڑوں کے ہجوم میں بھی اپنی
ایک الگ پہچان رکھتا ہے۔ اس کے الفاظ کھنکتے ہیں، اس کی تشبیہیں
گنگناتی ہیں۔ اسے حسن کا شاعر بھی کہا گیا ہے اور عشق کا شاعر بھی
اور یہ دونوں باتیں درست ہیں مگر میری رائے میں اس نے ایک اور کارنامہ بھی انجام دیا ہے
اور یہ شاعری اور موسیقی کے ٹوٹے ہوئے رشتوں کو جوڑنے کا کارنامہ ہے ———

● احمد ندیم قاسمی

مطربہ

ڈاکٹر وحید قریشی لاہور پاکستان

اردو شاعری میں غالباً یہ پہلی مثال ہے کہ کسی شاعر نے اپنی ایک ہی موضوع سے متعلق نظموں کو یکجا کر کے شائع کیا ہے۔ طوائفین کا موضوع اردو ادب کے ہر دور میں کسی نہ کسی شکل میں زندہ رہا ہے۔ لیکن ثقہ حضرات کا رویہ عموماً لذت آمیز فطرت سے آگے نہ بڑھ سکا۔ بلکہ اس ترقی یافتہ زمانے میں بھی ایسے کی کمی نہیں جو طوائف پر نظمیں چھاپتے ہیں۔ لیکن بوجوہ عنوان بدل کر رقاصہ کر دیتے ہیں۔ قتیل نے طوائف کے کردار کے دونوں پہلو سامنے رکھے ہیں۔ جسمانی کاروبار کے علاوہ فنون لطیفہ سے اس کی دلبستگی کو بھی اس کے پیشے کا لازمی جزو مانتے ہیں۔ اس لیے انھوں نے اس کردار کے لیے "مطربہ" کا عنوان تجویز کیا جو لذت کی تمام صورتوں پر حاوی ہے۔

طوائف ہماری اردو شاعری کا ایک اہم کردار ہے شعراء اس سے بالواسطہ اور بلاواسطہ شعری تحریک حاصل کرتے رہے ہیں۔ سبب شاید یہ تھا کہ قدیم معاشرے میں بعض سماجی پابندیاں عورت اور مرد کے باہمی روابط پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ عورت اور مرد کے میل جول کی وہ سہولتیں جو موجودہ مشرقی زندگی میں ممکن ہیں۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے کے پاک و ہند میں ان کا قیاس بھی نہیں کیا جا سکتا تھا حتیٰ کہ میاں بیوی کا دن میں گفتگو کرنا بھی ساس اور نند کی نظر میں شامل حرام تھا۔ ایسے میں اردو شاعری میں محبوب کا جو تصور ابھرا اس میں کچھ تو عجمی روایات کے زیر اثر مرجانی ہیں۔ بے وفائی اور جفا کاری کے عناصر نمایاں تھے جن میں سلجوقی دور کی طرز زندگی شامل تھی اور ترکوں کی اہمیت اور سپاہیانہ زندگی میں ان عناصر کی موجودگی سے ایک ایسا محبوب تراشا جس نے ہندوستان پہنچ کر بعض قریبی مماثلتوں کی وجہ سے طوائف کو اہمیت دے دی خصوصاً اس وقت جب پاک و ہند کی سیاسی زندگی ڈانواڈول تھی اور مذہبی، سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی اقدار کی شکست و ریخت کا سلسلہ چل رہا تھا۔ درون خانہ کی بجائے بیرون در کی زندگی شعراء ادباء اور شرفاء کے لئے گوشۂ عافیت تھی۔ تو مقامی تمدنی زندگی سے ایسے وہی کردار میسر آ سکتا تھا جو سہل الحصول بھی ہو اور جو گھر کے باہر کی زندگی میں ذہنی اور روحانی تعیش کا سہارا ہو سکے۔ لکھنؤ میں جہاں دولت کی فراوانی تھی اور اس دولت کا کوئی مصرف افراد سے لے کر ارباب حکومت تک کسی کو معلوم نہ تھا۔ وہاں مطربہ نے سماجی زندگی پر اگر غلبہ پا لیا تو یہ کوئی اچنبھے کی بات نہ تھی۔ لکھنؤ کی طوائف دلی کے گلی کوچوں میں نظر آتی ہے۔ محمد شاہی عہد اور شجاع الدولہ کے عہد کے لکھنؤ میں کوئی بہت بڑا فرق نہ رہا۔ عام معاشرتی زندگی میں اس اقتدار کی وجہ سے اردو غزل کا سانچہ بھی محبوب کے پیکر اور اس کی آرائش و زیبائش میں لگ گیا۔ ایران کا روایتی معشوق ہماری شاعری کو

محبوب کے بارے میں ایک تصور تو رسمی ہی گیا تھا۔ اس نئی معاشرتی زندگی نے اس معشوق کو خصوصاً اس کے بیرونی خد و خال کو اور بھی زیادہ نکھار دیا۔ شعرائے گھریلو عورت کی نفسیات سے آگاہ نہیں ہو سکتے تھے۔ انھوں نے عورت کی نفسیات کے بارے میں جو رائے قائم کی وہ یا تو اردو اور فارسی کے سرمائے سے اخذ شدہ تھی یا پھر گھر سے باہر کی اس زندگی سے حاصل کی گئی تھی جس میں طوائف کا کوٹھا مجلسی آداب کی درسگاہ بن گیا تھا۔ محبوب کا یہ تصور جو اس کی بے وفائی اور جفا کاری پر زور دیتا ہے، انسانی زندگی اور اس احساس مسرت کا یک طرفہ بیان ہے لیکن ۱۸۵۷ء سے پہلے کے مرد کے لیے عورت کی نفسیات کا تصور طوائف کی ذات سے الگ نہیں ہے۔ اردو غزل کا معشوق غالب کی ستم پیشہ ڈومنی سے مختلف نہیں۔ طوائف کی زندگی اور اس زندگی سے متعلق مسائل ہمارے ادب سے اوجھل رہے اس لیے ہماری قدیم شاعری کا یہ خاکہ بڑی حد تک دھندلا اور اصل سماجی پس منظر سے ہٹا ہوا نظر آتا ہے۔ اور اردو غزل معشوق کی نفسیات کے بارے میں کسی بہت گہری بصیرت کا پتہ نہیں دیتی۔ اس کے مقابلے میں عاشق اور اس کی نفسیات زیادہ ملیں گی۔ ہماری غزل اس حد تک داخلی ہو چکی تھی کہ اس میں معشوق محض ایک جذباتی سہارا تھا۔ اور غزلوں کے اشعار معشوق کی واضح تصویریں پیش کرنے کی بجائے صرف عاشق کا ردعمل پیش کرتے تھے۔ اور اس ردعمل کی عملیات کا ذریعہ بنتے تھے۔

میر تقی میر سے لے کر غالب تک کہیں بھی ہمیں معشوق کی نفسیات کے بارے میں کسی بہت گہری بصیرت کا پتہ نہیں ملتا۔ معشوق کے بارے میں عاشق کے رویے کی تفصیلات بہت کچھ مل جاتی ہیں۔ لیکن عاشق کا رویہ بھی لذت کشی اور لذت اندوزی سے آگے نہیں بڑھتا۔ نظیری نیشاپوری کا معشوق پتھر کا بت ہے جس پر عاشق کی گریہ زاری کا اثر ہوتا ہے اور نہ وہ محبت کا جواب محبت سے دے سکتا ہے۔ نہ وہ ایک شخص تک اپنے تعلقات کو محدود کرنے کا عادی ہے۔ عشق و محبت کے مسائل میں اس کا رویہ سراسر کاروباری اور سطحی نوعیت کا ہے۔ اس لیے شاعروں کے یہاں اس کی تفصیلات میں سے کسی گہرے جذباتی تجربے کی توقع نہ تھی۔ یہ پتھر کا بت محض ایک سہارا ہے، شاعر کے جذبات و احساسات کو حرکت میں لانے کا مقصد یہ ہے کہ اردو شاعری میں آپ کو عاشق کی تصویر زیادہ تفصیل کے ساتھ ملتی ہے۔ اور معشوق کا پیکر کچھ پس منظر میں ڈوب جاتا ہے۔

۱۸۵۷ء کے بعد جہاں اور معاشرتی تبدیلیاں آئیں وہاں زندگی کے بارے میں بھی تصورات بدلے اور ان کے ساتھ ساتھ ہماری شاعری میں معشوق کے بارے میں بھی شاعروں کا رویہ بدل گیا۔ کچھ عرصہ تک سرسید کی اصلاحی تحریک اپنے شباب پر رہی اور مولانا حالی نے معشوق کو پابند صوم و صلوٰۃ بنا دیا۔ سرسید کی تحریک کے اس پہلو سے پیکر و دوعا ضر کے اصلاحی ادب کے باعث تک ایک کمزوری ہر چلتی رہی ہے جس میں معشوق کبھی اخلاقی قدروں کا پابند ہوتا ہے۔ اور کبھی اس سے کوئی قابل نفرت چیز بن گیا ہے۔ بیوی اور محبوبہ کا ذکر عظمت اللہ کی شاعری میں ملتا ہے۔ لیکن بیوی بطور محبوبہ اردو شاعری میں ابھی تک نہیں آسکی۔ اخلاقی قیود سے ہٹ کر اردو شاعری کا محبوب کا تصور گوشت پوست کے انسان کا تصور ہو گیا۔ تاہم اب آئیڈیل محبوب کی بجائے ہمیں عام انسان لگنے لگتا ہے۔ جو گوشت پوست کا محبوب ہے۔ ہنستا ہے بولتا ہے۔ اس دنیا میں رہتا بستا ہے۔ اور اسی معاشرتی زندگی میں رہنے کی وجہ سے اس کے مسائل اس کی امنگیں اس کی آرزوئیں، اس کی دلچسپیاں اس کے روابط ان سب میں بدلی ہوئی زندگی کا شعور ملتا ہے۔ اب محبوب بھی زندگی کے عام مسائل سے دوچار ہوتا۔ اور اس کے حل کی تدبیر بھی کرتا ہے۔ اس کے ہاں بھی جذبات کی موج سبک خرام جاری و ساری ہے۔ وہ پرانے تصورات جو ہماری شاعری کے مستقل موضوع ہو گئے تھے انہیں بڑی حد تک بدل دیا گیا اور اب معشوق کی نفسیات بھی ہمارے شعر و ادب میں دکھائی دینے لگیں۔ اردو شاعری حالی کے اخلاقی پیمانوں کو اس سختی سے نہ اپنا سکی جس سے مرد و عورت کا امتیاز تک اٹھ جائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اردو شاعری میں طوائف اور اس کے متعلقہ مسائل میں بھی ہمارے لکھنے والوں کا رویہ بدل گیا۔ رومانوی تحریک کے فوراً بعد ہماری شاعری اور افسانوی ادب نے

اس نئی صورت حال کو محسوس کیا اور جہاں کہیں بھی طوائف کا تذکرہ آیا اس کے بارے میں "۱۸۵۷ء سے پہلے کا بعد قائم رہ سکا نہ سرسید اور حالی کے زمانے کی اخلاقی تعلیمات نے طوائف کے بارے میں بری طرح نفرت و حقارت کا زہر بویا۔ یہ وہ دور ہے جب اس راندہ درگاہ مخلوق کے بارے میں ہمارے لکھنے والوں کا رویہ بدل گیا۔ اب طوائف ظالم نہیں مظلوم ہستی تھی اس کی ذات کو معاشرتی پس منظر میں رکھ کر جانچا گیا۔ اسے جان دار مخلوق سمجھ کر مشاہدے کی آنکھیں زیادہ روشن ہو گئیں۔ اس کو زندہ مخلوق قرار دینے کے بعد اس کے جذبات و احساسات کی دنیا میں بھی داخل ہوا گیا۔ اور طوائف کی زندگی اور اس سے متعلقہ مسائل بھی گہرے تجزیے کی زد میں آ گئے۔

اس بدلی ہوئی حالت میں قتیل کی نظموں کے اس مجموعے کو دیکھا جائے تو ہمیں طوائف کے دو روپ ملتے ہیں۔ ایک وہ جو ابتدائی نظموں میں نمایاں ہے اور جس پر دور سرسید کی اخلاقی قدروں کی گرفت زیادہ ہے۔ یہاں طوائف کو محبوبہ کے روپ میں نہیں بلکہ صرف اخلاقی قدروں کے حوالے سے پہچاننے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ نظمیں طوائف کے مسائل سے ضرور بحث کرتی ہیں لیکن شاعر کا نقطہ نظر ایک طرف تو اخلاقی پیمانے سے اسے ناپتا ہے۔ دوسری طرف اقتصادی مسائل کے ترازو میں رکھ کر اسے تولتا ہے اس لیے یہاں پر شاعر کا لب و لہجہ ہمدردانہ اور تجزیاتی نہیں۔ اس منزل پر اس کی نظر طوائف کے مسائل کی طرف تو جاتی ہے۔ لیکن اس کے رویے میں وہ ہمدردانہ خلوص موجود نہیں جس کی مدد سے طوائف کا کردار اس روایتی پیکر سے جدا کیا جا سکے جو اردو غزل کو طوائف نے عطا کیا تھا۔ ابتدائی نظموں کے بعد قتیل کے ہاں طوائف کا ایک دوسرا پیکر ابھرتا ہے سانولی سی ایک عورت جو محض طوائفوں کی برادری کی عام عورت نہیں ہے بلکہ اس کی ذات بعض اعتبارات سے زیادہ اہم اور زیادہ جاندار ہے قتیل کی شاعری میں داخل ہوتی ہے۔ اس کے بعد کی تمام نظموں میں سانولی عورت شاعر کی محبت کا محور ہے یہ عورت اپنے رنگ و روپ ناک نقشے اور چال ڈھال کے اعتبار سے بعض انفرادی خصوصیات رکھتی ہے۔ اس عورت کے لیے شاعر کے دل میں بے پناہ محبت موجود ہے۔ حتیٰ کہ وہ اس سے جدا ہونے کے بعد بھی اور اس کی بے وفائی سے آشنا ہونے کے بعد بھی اس کا پرستار رہتا ہے۔

شاعر اپنی اس جان طرب کے ماضی کو بھی جانتا ہے۔ اس کے حال سے بھی غافل نہیں اور آخر کار اس کے مستقبل سے بھی واقف ہے۔ اس کے باوجود اس کے دل میں پرخلوص محبت لہریں لیتی رہتی ہے۔ اسے اپنی محبوبہ کی یادیں اور اس کی بے وفائیاں تک عزیز ہیں۔ "تیرے خطوط کی خوشبو" "اے میری جان طرب" "منزل بہ منزل" "کلیوں کی پرستار" "انوکھی جیہ"۔ ان سب میں شاعر اس مطربہ کے قدموں میں عقیدت کے بیشتر پھول ڈالتا ہے۔ اسے اپنی بے زری کے جرم کا احساس ہے لیکن یہ غم اپنی محبوبہ کے بارے میں کسی انتقامی کارروائی کا پیش خیمہ نہیں ہے۔ "مجبوری" "تجوری" اور "کس کے لیے" اگرچہ شاعر کے اخلاقی نقطہ نظر کا پتہ دیتی ہیں لیکن ان میں مبلغ الاخلاق کے رویے کی درشتی اور تلخی نہیں پائی جاتی۔ جو نظموں کے رعنائی پہلو کو مجروح کر دے۔ قتیل کا یہ غم اور یہ رکھ رکھاؤ بیسویں صدی کے مزاج احساس کی نمائندگی کرتا ہے۔ شاعر اپنی ناکامی کو آسمان اور مقدر کو گالیاں دے کر بیان نہیں کرتا اور نہ اسے کسی انتقامی کارروائی کی بنیاد بناتا ہے۔ زندگی کے بارے میں بھی اس کا رویہ ایسا نہیں کہ وہ ترک دنیا کی تعلیم دینے کے اور روحانی قدروں کا نقیب ہو جائے۔ فرار اختیار کرنے کی بجائے قتیل اپنی محبت کو اس دور کی مقدر کی زندگی میں رکھ کر دیکھتا ہے۔ وہ ناکامی کے اسباب و علل سے بھی آگاہ ہے۔ اور اسے طوائف کے داخلی انتشار کا بھی علم ہے محبت کو وہ دوسرے سماجی مسائل کے ساتھ ملا کر دیکھتا ہے اور اسی طرح اس کی نظموں میں غم اور محرومی کا احساس مادی زندگی اور اس کے تقاضوں کے ساتھ منسلک ہے۔ اس لحاظ سے سانولی سی ایک عورت، تیرے خطوط کی خوشبو، مطربہ، مجبوری، کلیوں کی پرستار، منزل بہ منزل، انوکھی جیہ اور کس کیلئے اس مجموعے کی نہایت حسین نظمیں ہیں۔ تیرے خطوط کی خوشبو، مجبوری اور منزل بہ منزل میں ایک فنی خصوصیت بھی قابل ذکر ہے۔ یہاں شاعر جذبات و احساسات کو خارجی منطقی رشتوں کے علاوہ ایک داخلی آہنگ سے بھی باہم مربوط کرتا ہے۔ مصرعوں کی تکرار نظم کے تاثر کو ایک بنیادی نقطے پر مرکوز کرتی ہے اور جذبات و احساسات کی لہریں تاثر کی وحدت کو استوار کرتی ہیں۔ قتیل کی یہ نظمیں اردو کے شعری سرمائے میں گراں قدر اضافہ ہیں۔ (ڈاکٹر وحید قریشی سمن آباد، لاہور

ادبی محبتیں

ضیاء ساجد لاہور پاکستان

محبت کا ذکر جب بھی چل نکلے گا اس کی تان ہمیشہ ہیر رانجھا، سوہنی مہینوال، شیریں فرہاد، لیلےٰ مجنوں، سسی پنوں میں سے کسی ایک عاشقوں کی جوڑی پر ٹوٹتی ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اپنے عہد کے عاشق معشوق کے باہمی ارتباط کو کوئی بطور مثال پیش کرے اور فخر سے کہے کہ فلاں مرد اور عورت نے محبت کرنے کی ساری حدیں ختم کر دی ہیں۔ اتنی مہنگائی، اتنی کڑی نگرانی، پولیس اور مولویوں کی اتنی دہشت کے باوجود ان کے صادق حوصلوں میں دراڑیں نہیں پڑیں۔ انہوں نے ظالم سماج کا بڑی پامردی سے مقابلہ کیا ہے۔ پیٹ کاٹ کاٹ کر اور لواحقین کو بھوکے مار مار کر ہوٹلوں اور سینماؤں کا خرچ برداشت کیا ہے۔ اور مخالفتوں، دشمنیوں اور محاسبوں کے سارے نانگا پربت سر کر کے بالآخر منزل کو چوم لیا ہے اور اب جلد ہی "آباؤ" کہلانے والے ہیں۔ یا انہوں نے خود کو ناکام ہوتے دیکھ کر خودکشیاں کر لی ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ مذکرہ بالا عشاق خیالی اور فرضی ہیں۔ اپنے عہد کے پیار کرنے والوں کو غیرت دلانے اور بعد والوں کو عشق محبت سے باز رکھنے کے لیے کچھ دانا لوگوں کے ذہنوں کی پیداوار ہیں۔ تبھی پولیس، مولوی، تحفے تحائف، والدین، بے روزگاری، کنوینشن، مہنگائی، گرمی، بارش، سردی، طوفان، محلے داروں جیسی ہمت شکن رکاوٹوں کے باوجود ان کے سروں پر سے عشق کے بھوتوں نے اترنے کا نام نہیں لیا تھا۔ اگر حقیقی ہوتے تو اتنی سختیاں اور صعوبتیں سہنے کے بجائے جہاں ان کے ماں باپ کہتے شادیاں کر لیتے۔ حقیقت تو یہ ہوتی ہے کہ قتیل شفائی نے جس خاتون کے بارے میں کہا تھا۔

بھیج رہی ہے اب تک مجھ کو چاہت کے پیغام
سانولی سی اک عورت جس کا مردوں جیسا نام

کے متعلق کچھ ہی عرصے بعد اسے یہ کہنا پڑا۔

میرے انکار کا اب کوئی بھی دمساز نہیں
ساز موجود ہیں لیکن تری آواز نہیں

گونج باقی ہے سو وہ پیار کی غماز نہیں
مطربہ اب وہ تری سوچ کا انداز نہیں

چناں چہ جہاں جہاں بھی لیلیٰ مجنوں جیسے پریم پیار کی لوک داستانیں سنائی جاتی ہیں، من گھڑت اور انسانی ذہنوں کی اختراع ہوتی ہیں مثنوی سحرالبیان اور گلزار نسیم کی طرح۔ ان مثنویوں اور ان کہانیوں میں فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ یہ مثنوی پریوں اور شہزادوں کے معاشقوں پر مبنی ہیں جب کہ عشقیہ قصوں کے سارے کردار انسانی ہوتے ہیں، ورنہ اصل زندگی میں پیار کرنے والوں کا حال قتیل شفائی جیسا ہی ہوتا ہے۔ محبوبہ خود ہی کچھ مدت بعد آنکھیں بدل لیتی ہے۔ سو سال پہلے کی محبوبہ بھی یہی کرتی تھی۔ تبھی مرزا غالب نے کہا تھا۔

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

قتیل شفائی تو پھر خوش قسمت ہے کہ اس کی محبوبہ نے کچھ دنوں تو اسے پیار کیا۔ خواہ قتیل شفائی کے بقول

کیا اس کا گلہ کیجئے اسے پیار رہی کب تھا
وہ عہد فراموش وفادار رہی کب تھا

حالانکہ قتیل کی قاتل کا تعلق اس بازار سے تھا جہاں وفا کا گزر قبر میں ہوا کے گذر کے مانند ناممکن ہوتا ہے جیسے بازار میں صبح و شام ..... بے گانگیوں، بے مہریوں، بے التفاتیوں بے وفائیوں اور بے ایمانیوں کے پتھر برس رہے ہوں۔ اس کے باوجود اگر اس مغنیہ نے ایک ایسے شاعر کو ..

میں صرف قتیل تھا بے چارہ نواب نہ تھا مہاراج نہ تھا
میں کوئی رئیس شہر نہ تھا میں والیٔ تخت و تاج نہ تھا

پرا پنی ابریشمی انگڑائیاں نچھاور کر دی تھیں اپنے شنگرفی خوابگاہ سرں کے درکھول دیئے تھے تو یہ بھی اس کی نوازش تھی ورنہ اسے مردوں اور زردداروں کی کون سا کمی تھی ایک قتیل خستہ تن کے بغیر اس کے کون سے کام بند تھے۔ مانا کہ اس پر اس کی غزل . . .

الفت کی نئی منزل کو چلا باہوں کو ڈال کے باہوں میں

گانے کے بعد شہرتوں کی بارش ہوگئی تھی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ قتیل کو اس کی رائلٹی کے نام پر عمر بھر کی وفا پیش کر دیتی۔ اسے زندگی بھر کے لیے اپنی بھینی بھینی سرگوشیوں کے سمن زار میں سمیٹ لیتی جب کہ قتیل اس کی فطرت، اس کی مجبوری، اس کے پیشے اس کے کردار کو بخوبی جانتا تھا۔

کس کس کا نام لاؤں زباں پر کہ تیرے ساتھ
ہر روز اک شخص نیا دیکھتا ہوں میں
پہنچا جو تیرے در پہ تو محسوس یہ ہوا
لمبی سی اک قطار میں جیسے کھڑا ہوں میں

پھر اس کا اس کی بے مروتی اور عہد فراموشی کا شکوہ کرنا دو وجوہات کی بنا پر ہی ہو سکتا ہے ایک یہ کہ ایک طوائف کے ہاتھوں اس کی انا کو ٹھیس کیوں پہنچی ہے اور دوسری یہ کہ اسے واقعی اس سے شدید محبت ہو اور اس کی جدائی اس کے لیے سوہان روح بن گئی ہو۔

جہاں تک پہلے منتقمانہ رویے کا تعلق ہے اس کی قتیل جیسے بھولے بھالے، انسان دوست اور ہمدرد نسواں شخص سے توقع رکھنا حماقت ہے۔ قتیل ان منتقم المزاج انسانوں میں سے نہیں ہے جو محبوباؤں کے نظرانداز کرنے پر جھنجلا اٹھتے ہیں اور سٹین گن سے فائر کرکے ان کے جسموں کے سوراخوں میں اضافہ کر دیتے ہیں یا تیزاب پھینک کر ان کے گلاب سا چہروں کو بے نور کر دیتے ہیں۔ قتیل تو خود جل جل کر دوسروں کو روشنیاں مہیا کرنے والا شاعر ہے۔ اس کی پہلی شاعری کو دیکھا جائے تو ہمیں عورت کا اس سے بڑا حمایتی اور کوئی نہیں ملتا۔ یہ غالباً پہلا شاعر ہے جس نے عورت کی مظلومیت عورت بن کر پیش کی ہے۔

اے مکرر چاندنی رات   آکے گزر جاتی ہے
پوچھتا ہی نہیں کوئی   مری تنہائی کو
کھیت سے دار دیکھنے   ہوئے دوراہے پر
ڈھونڈتی ہیں مری آنکھیں   کسی ہرجائی کو

جب کہ دوسرے شعراء نے جو ریختیاں کہی ہیں ان میں عورت کو مظلوم یا ستم زدہ نہیں بلکہ رنگین مزاج اور تماش بین دکھایا ہے۔ البتہ بازاری دنیا میں آ کر اس کا عورت کے بارے میں نظریہ تبدیل ہو گیا ہے۔ اور یہ اس کی نہیں ہماری بدقسمتی ہے کہ یہاں اسے ایسی آبرو باختہ عورتوں سے سابقہ پڑا ہے جنہوں نے اس کی شاعری کو یکسر بدل دیا ہے" اسے "وہ گھر پر نہیں ہے" "رسم شبستانِ طرب" "اندیشہ ہائے دور دراز" "منزل بہ منزل"، "شعراء اور موسیقی"، غرض "مطربہ" جیسی عورت بیزار کتاب لکھنے پر مجبور کر دیا ہے۔ حالانکہ بنیادی طور پر یہ مردم بیزار اور عورتوں کا مونس و غمگسار ہے۔

یہ ہیں شوہر ان میں   کوئی باپ یا بھائی نہیں
ان کی بیٹی یا بہن پر   سوت ابھی آئی نہیں
آئے تو ان کے لئے   کچھ وجۂ رسوائی نہیں
رہگزاروں میں وفا کے   یوں تم پڑی رہو
بیویو روتی رہو

لہٰذا قتیل شفائی کی اقبال بانو سے نفرت اور شکوہ دیکھ کر یہ فیصلہ کر تا کہ اسے چونکہ اس سے ہزیمت ہوئی ہے اس لیے وہ اس پورے انسٹی ٹیوشن کے خلاف تلخیاں اچھال رہا ہے، غلط ہے۔ چونکہ اس نے اس عرصے کو جب دونوں قرمزی غنودگیوں میں اترے ہوئے تھے، حیاتِ آوارگی کہا ہے۔ پھر ایسی صورت حال میں قتیل شفائی کا اقبال بانو کے اجنبی بن جانے پر جھلانا اور ساری طوائفوں کو جلی کٹی سنانا ذاتی دکھ قطعی نہیں ہو سکتا۔ اسے تو علم تھا کہ

ہم کو ان سے وفا کی ہے امید   جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ اسے اس بات کا قلق ہوا ہو کہ اس نے ایک طوائف کو گندے اور بدبودار ماحول سے نجات دلانے کی کوشش کی تھی جس میں حریری بدنوں کو بدصورت زردار ایسے پامال کرتے ہیں جیسے بھوکے بکرے گندم کے کنوارے کھیتوں کا بانکپن لتاڑ کر رکھ دیتے ہیں، جس میں تازہ تازہ اور خستہ خستہ گلابی شہابی گوریوں کی شریانوں سے سیمابی سویرے یوں نچوڑ لیے جاتے ہیں جیسے دودھ فروش بھینسوں کے تھنوں سے دودھ نچوڑ لیتے ہیں اگر ہم قتیل شفائی کے ماضی کو کھنگالیں تو اس میں ہمیں ایک ایسا پاکیزہ پیکر جھلملاتا ہوا نظر آتا ہے جسے شروع سے عورت کے تقدس کا شدید احساس ہے، جو عورت کے ساتھ اس کی رضا و رغبت سے ہم آغوشیوں کا تو قائل ہے لیکن دھوکے اور فریب اور جبر و تشدد سے کام لیکر گلاب زاروں کو ویرانوں میں تبدیل کر دینے

کے سخت خلاف ہے۔

دیتے ہیں اجالے مرے سجدوں کی گواہی
میں چھپ کے اندھیرے میں عبادت نہیں کرتا

اس کی شروعات کی شاعری کا زیادہ حصہ اپنے دیس کی کنواریوں اور سہاگنوں کے دکھ درد اور شکائیتوں سے گراں بار ہے اسی لیے جب اسے شہر کی مصلحت آمیز محبتوں اور کاروباری عورتوں کے پھیکے اور چپٹے ناز و عشوے سے واسطہ پڑا تو اس کے اندر کا فرشتہ سیرت قتیل پھانک پھانک ہوگیا۔ عورت کی وفا اور اس کی جاں نثاری اس کے معصوم یقینوں کی ٹہنیوں سے اڑ گئی یہ جو اپنے گاؤں کی وفا شعار موی مورتیوں کو، یدہ شہزادوں کے حضور اپنی تملاتی جوانیوں کو پگھلاتے ہوئے دیکھ چکا تھا ایک ہی برگزیدہ پیمبر کی بارگاہ میں اپنی ساری سجاوٹیں قربان کرتے ہوئے چکھ چکا تھا، شہر کی زر پرست عورت کے بے رنگوں کو دیکھ کر چیخ اُٹھا۔

کہاں ہو وادیٔ سرِبن کی سرد سرد ہواؤ
جھلس رہی ہے جوانی تم اپنے پاس بلاؤ

اقبال بانو جب اس کے ساحل پر لنگر انداز ہوئی ہوگی تو لازمی بات ہے وہ اسے مسخر کرنے کے لیے اپنے سارے بازاری حربے بروئے کار لائی ہوگی۔ دوسری طوائفوں کی مانند اس نے اس کی سادگیوں اور شاعرانہ کمزوریوں کو ایکسپلائٹ کیا ہوگا۔ اس کی تمام حسوں کو اپنی صندلی سانسوں کے سیلاب میں ڈبو دیا ہوگا۔ اس کی موجودگی میں اس کے انگ انگ سے وفا ٹپکتی ہوگی، اس کے بدن کی روش روش رنگین راگنیوں سے مہک اٹھتی ہوگی، وہ فلمی دنیا میں اپنا مقام بلند کرنے کی آرزو میں اس کے کاندھے استعمال کرنے کے لیے اس کے سامنے ہمہ وقت لطیف پائلوں کی طرح بجتی رہی ہوگی، اس کے وجود کے سرد گنبدوں پر اطلس دھوپ کی طرح پھیل جاتی ہوگی، اپنی معطر آنسوؤں سے اس کے ادھ کھلے جذبوں میں شہد آگیں شہنائیاں جگا دیتی ہوگی۔

نچوڑ لو، مرے جواں لبوں کا رس نچوڑ لو
میرے اُداس اداس عارضوں کے پھول توڑ لو

کبھی اسے قسمیں کھا کھا کر اپنی شفاف محبتوں کا یقین دلاتی ہوگی کبھی رو رو کر اس کے درد اور ضبط ماحول سے بیزاری کا اظہار کرتی ہوگی کبھی اس کے دیر سے آنے پر روٹھ روٹھ جاتی ہوگی اور کبھی اس کے جلدی واپس آجانے پر کھلا کھلا اٹھتی ہوگی۔ چنانچہ یہ جس کے حربے پہلے ناپتے بھی ہوں گے۔ اور جس کا کبھی ڈانے سے پیشتر رنگ زرد رہا ہوگا۔ آنکھیں بند کر کے اقبال بانو کے ساغروں میں تحلیل ہوگیا اور فلم سازوں اور موسیقاروں سے سفارشیں کر کر کے اسے فلمی گیت دلانے لگا۔ جنہیں گا کر اقبال بانو کی ہر طرف دھوم مچ گئی۔

ع پریشاں رات ساری ہے
ستارو تم تو سو جاؤ

ع تو لاکھ چلے رے گوری تھم تھم کے
ہوا کی ڈالیوں پہ جھلنا جھلا جا

جیسے گیت اسے شہرت کی بلندیوں پر لے گئے۔

قتیل شفائی شادی شدہ ہونے کے باوجود اس پر اپنی سچی محبتیں نچھاور کرنے لگا۔ محض اس لیے کہ اس مُطربہ نے اسے اپنی اداکاری سے یقین دلا دیا

تھا کہ وہ طوائف کی ـــــــــ حیثیت سے زندگی گزارنے کو گناہ تصور کرتی ہے اس کے بجائے وہ مغنیہ بن کر حق حلال کی روزی کمانا چاہتی ہے، یہ تو پھر بیچارہ شاعر تھا جو فطرتاً رحمدل ہوتے ہیں ان مقتلوں میں تو بڑے بڑے کائیاں اور گھاگ اور بےحس مردان عشوہ طراز سولیوں کی نذر ہو جاتے ہیں۔ یہ امر بیلیں تو پتھروں کو ریت میں تبدیل کر دیتی ہیں۔ یہ گوشت پوست کی خوشبودار گھٹڑیاں جب کھلتی ہیں تو آسمان یوں طرے اور کلتے زمین پر اتر آتے ہیں۔ ان کی بزم سے جو کبھی نکلا ہے پریشان نکلا ہے۔ لہٰذا یہ جراثیماں بانو کو مرزا ہادی رسوا کی امراؤ جان ادا جان کر لی۔ ہاتھا کچھ مدت بعد اس کی حقیقی صورت دیکھ کر کانپ گیا۔ وہ جو اس کی بھٹکی ہوئی تنہائیوں میں دل آویز سنگو نے بیدار کر رہی تھی اسے بڑی ڈھٹائی اور بےرخی سے ماتم سراؤں میں پھینک گئی۔ اس نے اس کی آنکھوں سے سارے ناتراشیدہ خواب نچوڑ لئے مطلب نکال کر وہ اس سے بالکل کنارہ کش ہو گئی جس سے یہ تمہد کر رہ گیا۔

میں فسیرانہ تیرے در پہ چلا آیا تھا
یہ سمجھ کر کہ مرے عہد کی فنکار ہے تو

لیکن اس فن کارہ کا مشن مکمل ہو چکا تھا چنانچہ اس نے قتیل کی گلوگیر صداؤں کی طرف سے کان بند کر لیے اور دعدوں کی وادی سے پرے بے گانگیوں کے بادوں میں روپوش ہو گئی اور یہ بے وطن شاعر چیرا کر رہ گیا اور اس چرکے کو مندمل کرنے کی خاطر اپنے آپ کو یونہی تسلیاں دینے لگا۔

وہ تیری بھی تو پہلی محبت نہ تھی قتیل
پھر کیا ہوا اگر کوئی ہرجائی بن گیا

اس طرح بات نہ بنی۔ دل کا گھاؤ نہ بھرا۔ حقت دنجالت میں کمی واقع نہ ہوئی تو اس متاع غیر کو نصیحتیں کرنے لگا۔ اپنی انا کو تسکین دینے کے لیے اسے بڑا بن کر سمجھانے لگا۔

میرے بعد وفا کا دھوکہ
اور کسی سے مت کرنا
گالی دے گی دنیا تجھ کو
سر میرا جھک جائے گا

عاشقوں پر ایسا وقت آیا ہی کرتا ہے۔ قتیل کو دھوکا تو پھر ایک طوائف نے دیا تھا جس کی گھٹی میں ہی نمک حرامی پڑی ہوتی ہے جس کا ضمیر اس خزاں آلود مٹی سے اٹھا ہوتا ہے جو صرف رہزن پیدا کرتی ہے۔ لہٰذا قتیل کی حالت اس سے زخم کھا کر ایسی ہو جانا کوئی اچنبھے والی بات نہیں تھی جبکہ وہ شروع سے کہتا آ رہا تھا۔

زندگی بھر کی پرستش اسے منظور نہیں
وہ تو لمحوں کی پرستار بنی بیٹھی ہے

اسے تو خبر تھی کہ ان حسن کے بازاروں میں . . . .

بھیک میں مانگو تو کوئی پیار نہ ڈالے جھولی میں
بن مانگے مل جاتے ہیں رسوائی کے سامان یہاں

عام عاشق بھی پردہ نشینوں، فلک نشینوں، زہرہ جبینوں، مقدس نازنینوں کے لکھے ہوئے آخری خط کہ "جان میرے گھر والوں نے زبردستی میری

شادی ایک بینک منیجر سے طے کر دی ہے۔ جو اگلے ہفتے مجھے بیاہنے آ رہا ہے چنانچہ مجھے بھول جایئے۔ میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں کہ میری زندگی تباہ کرنے کی کوشش نہ کیجئے گا۔ بس یہ سمجھ لیجئے گا کہ وہ شمع جس نے آپ کے ساتھ مرنے جینے کی قسمیں کھائی تھیں کب کی مر گئی ہے۔ چاند میں آپ کو بتا نہیں سکتی کہ یہ سب کچھ لکھتے ہوئے میرا کیا حال ہو رہا ہے یقین کیجئے میں نے صبح سے ایک پیالی چائے تک نہیں پی، آنسو ہیں کہ رکنے کا نام نہیں لے رہے ہیں۔ کیا سوچا تھا، کیا ہو گیا۔ کاش ایسا ہونے سے پہلے ہی میں مر گئی ہوتی اب میں ساری عمر ایک لاش کی مانند زندہ رہوں گی، نہ ہنس سکوں گی نہ اچھے کپڑے پہن سکوں گی، نہ زندگی سے لطف اٹھا سکوں گی۔ بس بچے پیدا کرنے والی مشین بنی رہوں گی۔ شہزادے تم میرا غم نہ کرنا اور فوراً کسی اچھی سی لڑکی سے شادی کر لینا تاکہ میری بیقرار روح کو کچھ تو سکون مل جائے فقط شمع جو تمہاری نہ ہو سکی" پڑھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑتے ہیں۔

یہ محبت، یہ وفائیں　　　　یہ مروت، یہ خلوص

ان کو سرمائے نے　　　　بے کار بنا رکھا ہے

پھر جب ان کے دل کی کسک مضمحل ہوتی ہے تو نفرت اور غصے میں بھی کمی آجاتی ہے اور بے چارے تھکی تھکی آواز میں راہ میں چھوڑ جانے والی محبوباؤں کو کوسنے لگتے ہیں۔

ایک ایسی راہ پہ ڈالا ہے

تیرے غم نے کہ ہم

کسی بھی شکل کو دیکھیں

تو رک کے آہ بھریں

ایسے ہی جیسے کوئی بس والا اگر کسی مسافر کو اس کی منزل سے ایک دو میل پیچھے ہی بس سے اتار دے تو وہ پہلے شدتوں سے احتجاج کرتا، بلبلاتا ہے، پھر منہ ہی منہ میں بڑبڑ کرتا ہوا پیدل چلنا شروع کر دیتا ہے اور پھر کچھ عرصہ اور گزر جائے پہ عاشق اپنی اس دیوانگی کو حماقت سے محمول کرنے لگتے۔ ایسے جوانی کی لغزش قرار دینے لگتے ہیں، کوئی ان کا نام معاشقے کے بارے میں استفسار کرے تو مسکرا کر کہتے ہیں" وہ تو میں یوں ہی شغل کر رہا تھا۔ میں تو خود اس مصیبت سے جان چھڑانا چاہتا تھا، اچھا ہی ہو گئی تھی۔" قتیل شفائی بھی ایک طرف اپنے ان ہیجان انگیز لمحات کو جذبات آوارگی کہتا ہے دوسری طرف اقبال بانو کو بھول نہیں پا رہا۔ بار بار اس سے پوچھتا ہے

مانا جیون میں عورت　　　　ایک بار محبت کرتی ہے

لیکن مجھ کو یہ تو بتا دے　　　　کیا تو عورت ذات نہیں

کبھی اس کے پتھریلے الفاظ سے زچ ہو کر "ان ایم آئی کی تصویر" جیسی نظم سپرد قلم کرتا ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے اس کے گلوں شکووں کے پیچھے انتقامی جذبہ کام نہیں کر رہا بلکہ دوسری وجہ محرک ہے وہ یہ کہ اقبال بانو بجلی کے کرنٹ کی طرح اس کے وجود میں سے گزر کر زمین میں اتر گئی ہوئی ہے۔ عام عورتوں کی نسبت اس نے طوائف ہونے کے علاوہ اس کی ممنون و متشکر ہونے کے باعث اس کے بازوؤں میں پوری نسوانی سپردگی اور لذتوں کے ساتھ شب و روز بسر کئے ہیں۔ عام عورتوں کو اتنے داؤ پیچ کہاں آتے ہیں چنانچہ قتیل کا نشہ اترنے میں نہیں آ رہا۔ اسے وہ رہ کر وہ یاد آجاتی ہے جس کی وجہ سے جب یہ پریشانی کے عالم میں ہوتا ہے تو اسے جلی کٹی سنانے لگتا ہے مطمئن اور مسرور ہوتا ہے تو اس کی یاد کا لائٹ سا اثر لیتا ہے۔

یہ ٹھیک ہے نہیں مرتا کوئی جدائی میں　　　　خدا کسی کو کسی سے کبھی جدا نہ کرے

سو اس کی رنجشیں اور بے پروائیاں اس کے موڈ پر ڈپینڈ کرتی ہیں۔ خوش ہو گا تو اقبال بانو کو یاد تک نہیں کرے گا۔ نئے نئے رومانوں کے واسطے سرگرداں رہے گا۔

ہیر کا پیار تھرک سا جائے   مست چناب کی لہروں پر
کونج سی وہ مٹیار وہ   بانکی نار جو ہو سے پنجابی
کاش کبھی مجھ کو اسکی   معصوم توجہ حاصل ہو
کاش کبھی معلوم ہو اسکو   میرے دل کی بے تابی

اور ناراض ہو کر دکھی ہو کر اور صبر سے گھونٹ گھونٹ کر کے پینا شروع کر دے گا ...

صدمے دیئے قتیل کو کیا کیا نہ آپ نے   اس پر بھی آپ کا ہو بھلا آپ خوش رہیں

یہ حالت انسان کی مجبوری ہے ورنہ سب کسی شے جذباتی حادثے کے شگاف کو ڈھانپنے کے لیے ساری عمر نئے نئے راہ گیروں سے تعاون مانگتا رہتا ہے مگر وہ شگاف اس کا ہمیشہ ہی چڑاتا رہتا ہے۔ بعض فنکاری شخصیتیں اس شگاف کو مظلومیت کا کشکول بنا لیتی ہیں اور اس کے بل بوتے پر جی بھر کے بھیک وصول کر لیتی ہیں۔ اپنے پہلے ناکام معاشقے کو یاد دوراتی جاتی ہیں اور ہری بھری ہرنیوں کو ہڑپ کرتی جاتی ہیں۔ اپنے زخم خوردہ اور مظلوم ہونے کا ڈھول پوری قوت سے پیٹتی ہیں اور بے شمار متاثر ہونے والی حسینوں کو بیک وقت دیگر سے ان کے بچھائے ہوئے دام ہمرنگ زمین میں پھنس کر اپنی پاکیزگیاں پاش پاش کرا لیتی ہیں مگر قتیل شفائی نے یہ راہ اختیار نہیں کی۔ اس نے اقبال بانو سے ٹوٹ کر محبت کی ہے اور اب بھی کئے جا رہا ہے۔ اس نے اس سے دھوکا کھا کر اپنی ٹانگوں پر پلستر نہیں چڑھایا، سر میں خاک نہیں ڈالی، آنکھوں میں سرخ ڈوریاں نہیں ڈالیں، نہانے دھونے اور صاف ستھرے کپڑے پہننے سے ہاتھ نہیں کھینچے، داڑھی، سر اور بغلوں کے بال اور ناخنوں کو بڑھا کر اور ناکسوں کے پاؤں میں رہ کر۔ کانوں میں نہیں چھدوائے، گلے میں مالائیں نہیں پہنیں اور ہاتھوں میں چمٹا نہیں پکڑا بلکہ نارمل انسانوں کی طرح قدرتی ردعمل ہے اس دکھ کو دل میں سمو کر، چپکے چپکے گاہے گاہے آہستگی سے آہ بھر لیتا ہے۔

وہ جس کی آغوش میں مگر   کچھ بھی مجھے حاصل نہ تھا
وہ اک ایسا لمس تھا   جس میں بدن شامل نہ تھا

اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ دونوں محب و محبوب عمر کے اس دور سے گزر رہے تھے جس میں جذبات کا موج عقل و شعور کے تابع ہوتا ہے۔ انسان عشق کم کرتا ہے اس میں جو قدم اٹھاتا ہے سوچ کر۔ سود و زیاں کا حساب زیادہ رکھتا ہے۔ اپنے بجٹ کے مطابق پیر پھیلاتا ہے۔ جونہی دیکھتا ہے کہ بجٹ ڈسٹرب ہونے لگا ہے وہیں کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر راہ فرار اختیار کر لیتا ہے۔ اقبال بانو نے بھی جو اپنے سماج سے بغاوت نہیں کی۔ نیلا تھوتھا کھا کر لاش کی بے حرمتی نہیں کرائی، اپنے زیوروں کو پوٹلی میں باندھ کر قتیل شفائی کے ساتھ راولپنڈی، ملتان یا کوئٹہ کراچی جانے والی ٹرین نہیں پکڑی تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ وہ کوئی چھٹی کا کی یا بچی نہیں تھی تو پھر بھی روز کسی مقامی تھانے میں تھانیدار کو رو رو کر بیان قلمبند کرا رہی ہوتی کہ "میں حاجت رفع کرنے کے واسطے کھیتوں میں جا رہی تھی کہ ملزم قتیل شفائی نے ایک بڑا سا چاقو میری ناف پر رکھ کر مجھے دہشت زدہ کر دیا اور قتل کر دینے کی دھمکی دے کر لسبوں والے اڈے پر لے گیا اور مجھے دوسرے شہروں نہروں گھماتا رہا اور میری عصمت لوٹتا رہا۔ آخر ایک روز جب یہ خوراک کی تلاش میں کہیں گیا ہوا تھا میں موقعہ غنیمت جان کر دوبارہ بھاگ کر گھر آنے میں کامیاب ہو گئی۔" بلکہ وہ بھی سرد و گرم چشیدہ عورت تھی۔ لہٰذا قتیل شفائی کو یوں بھول گئی جیسے نزاک میں اس کے کوئی تجربہ نہ تھا چونکہ

کس نے دیا ہے سدا کسی کا ساتھ قتیلؔ
ہو جانا ہے سب کو آخر کار جُدا

کا اسے علم تھا۔ لہٰذا اسے خواہ مخواہ کا روگ پال کر کیا لینا تھا۔ قتیل شادی شدہ تھا۔ آج نہیں تو کل اس کے بیٹوں نے اس کے پاؤں میں زنجیریں ڈال دینی تھیں کہ ابو اب بس بھی کیجیے۔ حد ہوتی ہے محبت کی۔ کیوں ہمیں بدنام کر رہے ہیں۔ آئندہ سے گھر میں رہا کیجیے اور تفہیم القرآن کا مطالعہ کیا کیجیے۔ ورنہ ہم آپ کے کمرے کو باہر سے تالا لگا دیں گے۔ اور اسے تھوڑی سی اون آن کے بعد جوان بیٹوں کے آگے ہتھیار پھینکنے پڑنے تھے۔ پھر جو اقبال بانو کو اس کی راہ دیکھنی پڑنی تھی ابتی بالوں کے بنیرے اُتنے رکھنی پڑتی ۔

سینجے دل والے بوہے
اجے میں نیئوں ڈھوئے
دسے توں جم جم آویں
چنّاں تاریاں دی لوئے

کیا کرا اپنے حسن جوانی کی تابش تباہ کرنی پڑتی تھی تو کیوں نہ وہ اس بھیانک انجام کو پہلے ہی سوچ کر ٹھانگیں سکیڑ لیتی۔ آخر اللہ نے اسے عقل و دانش کس لیے دی تھی۔ قتیل نے ہی اسے سمجھایا تھا۔

پودا پودا پال کے وقت نہ ضائع کر — کاغذ کے کچھ پھول سجا گلدانوں میں

اس پہ وہ آخر تک آنکھیں کھولے رہی اور خود کو ایک ممتاز گلوکارہ کی حیثیت سے سٹیبلش کرنے میں مصروف رہی جب کہ قتیل اپنی معصومانہ اور مخلصانہ فطرت کے ہاتھوں مارکھا گیا ہے اس کے پیار کو شک کی نگاہوں سے دیکھتا دیکھتا بالآخر اس کے مشک بار کالوں کی بھول بھلیوں میں رینگ گیا۔ حالانکہ اسے اچھا بھلا تجربہ تھا کہ اس میکانکی دور میں تو بہت دور کی بات ہے دھات اور پتھر کے ادوار میں بھی حسینوں کے ہاں وفا ناپید رہی ہے ۔۔۔ ع

عمر گزری ہے ساحلوں پر — سیپیاں چنتے ہوئے
جس میں گوہر بھی ہو کوئی — وہ صدف نایاب ہے

تبھی تو پیار لوگوں نے دلوں کو بہلانے کے لیے لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، ہیر رانجھا، جیسی کہانیاں گھڑی ہوئی ہیں حسینوں کا تو کام ہی یہی ہوتا ہے کہ قربانیاں مانگتے جاتے ہیں۔ چاہنے والوں کو ہو بہان کرتے جاتے ہیں اور انھیں وعدہ فردا پر ٹرخاتے جاتے ہیں۔ ایک اجنبی اور ان دیکھی جنت کی چوسنی انہیں تھما دیتے ہیں جسے فریب خوردہ مرتے دم تک چسکے لے لے کر چوستے رہتے ہیں۔ اور حسن والوں کے حضور ہٹ ہٹ کر سجدے کرتے رہتے ہیں اسی میں ان کی ساری زندگی بسر ہو جاتی ہے وہ کوئی اور کام نہیں کر پاتے۔ بےچارے جلتے کڑھتے آنسو بہاتے ماتم کرتے دیواروں سے سر ٹکراتے لب گور جا پہنچتے ہیں اور پھر کچھ نہ کر سکنے کا سوچ کر کف افسوس ملنے لگتے ہیں کہ ہمارے ساتھ سراسر دھوکا ہوا ہے۔

اڑتے اڑتے آس کا پنچھی — دور افق میں ڈوب گیا
روتے روتے بیٹھ گئی — آواز کسی سودائی کی

لیکن اس وقت سودائی کو آئی ہوئی عقل اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ چنانچہ صحت مند انسان ہمیشہ نارمل رہتے ہیں۔ وہ محبت کرتے بھی ہیں تو اس

میں شکست کھا کر بقیہ عمر اس کے نام نہیں لکھ دیتے بلکہ شادیاں کر لیتے ہیں اور اپنی پوری توجہ بچوں کی پیدائش اور پرورش پر مبذول کر دیتے ہیں اس طرح انھیں ان کا ماضی کچھ نہیں دیتا۔ قتیل شفائی نے بھی اچھا کیا ہے جو اس مردوں جیسے نام والی سے ٹھوکر کھا کر جنگلوں، بیابانوں، صحراؤں کی طرف نہیں گیا الٹا ہوٹلوں، سینماؤں، دوستوں کی طرف آ نکلا ہے۔ اور کائنات کی دوسری خوب صورتیوں، رعنائیوں، رنگینیوں، لطافتوں، صباحتوں، دلچسپیوں اور ذمہ داریوں کی ورق گردانی کر رہا ہے۔ نہیں تو کل کو اسے بھی حسرت دیاس سے بادیدۂ نم اس جہان رنگ و بو کو خیرباد کہنا پڑتا تھا۔ اور دوستوں کو دکھ ہوتا تھا کہ..

اڑتے اڑتے آس کا پنچھی　　　　دور افق میں ڈوب گیا
روتے روتے بیٹھ گئی　　　　آواز قتیل شفائی کی

اقبال بانو نے اس سے وفا نہیں کی یہ اس کو چاہے مار رہا ہے۔ اس کا ظرف ہے۔ معاملہ بس یہاں تک ہی رہنا چاہیے۔ ایک اقبال بانو اگر اسے نہیں ملی تو کیا غم۔ مقامات آہ و فغاں اور بھی ہیں۔ مانا کہ مضبوط محبت کرنے والوں کو بہت کچھ کر گزرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ مگر مزہ تو تب ہے جب دل میں آگ لگی ہوئی ہو اور انسان اس کا دھواں باہر نہ نکلنے دے، زندہ رہے مگر زندگی سے شرمندہ نہ ہو۔ اقبال بانو کو اس کی وعدہ خلافی کی سزا مل چکی ہے۔ قتیل کے نغموں سے جدا ہو کر اس کی کوئی وقعت　　　　نہیں رہی اس کے واسطے سب سے بڑی اذیت یہی ہے کہ وہ ہمیشہ اس کے نام سے پہچانی جائے گی۔

جب بھی کوئی اس کا نام لے گا قتیل کا نام خود بخود اس کے تعلق کے بوسے لینے لگے گا۔ دوسری طرف اس کی سارے عزت کرتے رہیں گے کہ اس نے ایک گانے والی کو　مغنیہ اور مطربہ بنا دیا تھا۔ وہ گلوکارہ کہلانے لگی تھی۔ چنانچہ آنے والے لوگ قتیل شفائی کی پرستش کیا کریں گے اور اقبال بانو کو ملعون کہا کریں گے جس طرح صاحباں کو برا بھلا کہا جاتا ہے کیونکہ اس نے بھی مرزے کو دھوکا دے دیا تھا۔

●

قتیل کی ندرت اور اثر آفرینی کا کمال ہے کہ ہر جذبے سے آزادی اور شگفتگی کا اظہار ہوتا ہے اور دل میں آرزو ایک ایسی کسک پیدا کر دیتی ہے جو فراموش نہیں کی جا سکتی۔ ہر موضوع جو آپ کے سامنے آتا ہے محض تقلید پرستی نہیں، اس میں والہانہ جوش و مستی نظر آتی ہے، جو شعر و شاعری کی سچی تعریف ہے۔

● ——— عبدالرحمان چغتائی

مطربہ کا مطرب

فکر تونسوی

قتیل شفائی ـــــــ "مطربہ" کا مطرب ہے۔ اور اس مطرب کو میں بیس سال سے جانتا ہوں۔

بیس سال پہلے وہ مجھے لاہور میں پہلی بار ملا تھا۔ اس نے پوچھا "کیا شاعری کو "نانِ جویں" میں بدلا جا سکتا ہے؟"

اور بیس سال بعد وہ مجھے دہلی میں ملا۔ اُس کے ہاتھ میں "مطربہ" تھی جس پر سماج نے اُسے پاکستان کا اہم ادبی انعام "آدم جی پرائز" عطا کیا تھا وقت اور فاصلہ کی یہ منزلیں زکوٰۃ اور جان گُسل تھیں قتیل شفائی نے کیسے طے کیں، سماج کو اُس لئے کیوں کر تسلیم کرا دیا کہ تم جس کی نانِ جویں پر اک پھول چڑھاتے تھے وہ تو وقت کے باوقار ادبی انعام کا اہل تھا۔ وہ جس کا اقبال زندہ کرتا اور نا قابلِ یقین پاتا ہے۔ دیں مقدس کی ناشاعرانہ سرد مہری کا غماز تھا۔ وہ تو سماج کی روح کا نباض تھا۔ تم جسے سمجھ نہ سکے لیکن تمہیں جو سمجھ گیا وہ "مطربہ" تھا کہ ہماری روح پر پڑے ہوئے زنگ برق اور چکا چوند، دبیز سانس کو تمہیں جس نے یوں اُتارا ہے کہ تم کہہ اُٹھے "قتیل! تم عظیم ہو۔ آؤ تمہیں گلے لگا لیں۔"

سماج نے قتیل کو اُس وقت اعزاز بخشا جب اُس نے سماج کے راز فاش کئے۔ اور ہمارے سماج کا یہی مزاج ہے۔ یہی طبعی ٹریجڈی ہے کہ وہ تو قربانی، اسی کی گردن میں ڈالتا ہے جو اُس کے کھونٹے، در غلیظ نقش و نگار کی تصویر کھینچ دے ـــــــ آرٹسٹ اور سماج کے درمیان یہ رشتہ بظاہر بڑا ہی افسوسناک لگتا ہے۔ لیکن کیا کیا جائے کہ سماج کو اسی قسم کا رشتہ مرغوب ہے کیوں کہ جب قتیل اپنے غیظ اور جذبے کی پوری شوکت کے ساتھ ہیرا منڈی شبستانِ طرب کا حُلیہ بیان کرتے ہوئے کہتا ہے۔

رقص کر ہاں رقص اس بہروپئے کے روبرو

عصمتیں لٹتی ہیں اب بھی جس کی عشرت گاہ میں
خوب صورت جسم بِچھ جاتے ہیں جس کی راہ میں
خلوتوں میں جس کو ہے مرغوب شغلِ ناؤ و نوش
مہرباں تجھ پر ہُوا ہے آج وہ تربت فروش
تو اسی مجذوب کے آگے دما دم رقص کر

رقص کر اے مطربہ! چھم چھم چھا چھم رقص کر

تو آرٹسٹ کے اس بپھرے ہوئے، زخمی سے لہجہ پر سماج کے تربت فروش "مرحبا، مرحبا" کہہ اٹھتے ہیں اور بانہیں پھیلا کر آرٹسٹ کو مسند اعزاز پر بیٹھنے کی دعوت دیتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ مسند اعزاز پر بیٹھ کر بھی قتیل شفائی انہیں تربت فروش کہنے سے باز نہیں آیا کیونکہ آرٹسٹ اپنے جذبات کا مول تول نہیں کر سکتا۔ (میرا مطلب صرف حقیقی آرٹسٹ سے ہے غیر حقیقی آرٹسٹ اپنے اشعار کی تربت بنا کر بلا شبہ فروخت کر سکتے ہیں)

میں ایک بار پھر بیس سال پہلے کی طرف لوٹنا چاہتا ہوں۔

اُن دنوں قتیل شفائی پٹھانوں کے دیس صوبہ سرحد سے لاہور کے ادبی قلعے پر حملہ کرنے کے لئے وارد ہوا تھا ـــ چوڑا چکلا سینہ، سُرخ و سفید بیضوی چہرہ، گھنے گھنگھریالے بال، بھاری بھرکم پٹھانی خدوخال ـ اور اُسے دیکھ کر ہم (ہماں پاں قسم کے شہری لوگوں) نے اندازہ لگایا کہ وہ ابھی ابھی اپنے تھیلے سے پستے بادام نکالے گا اور ممکن ہے سود کا کاروبار بھی شروع کر دے۔ اس کی کمر میں لمبے چُغے کے نیچے چھپا ہوا چاقو بھی ہوگا۔ بچے اُسے دیکھ کر سہم جائیں گے۔ بڑے اس سے کنی کترا کر نکلیں گے اور حسینائیں کھڑکیوں کے پٹ بند کر دیں گی۔

لیکن ہماری حیرت کی کوئی حد نہ رہی، جب اس سُرخ و سفید پٹھان نے اپنے جذبات انگیز ہاتھوں کی لرزش کے ساتھ تھیلے میں سے بادام اور پستے کی بجائے ایک غزل نکالی اور نہایت نرم و نازک اور نغمہ بار لہجہ میں کہنا شروع کیا۔

تم اس کو مرے نام سے یارو نہ پکارو
یہ نام اُسے باعث آزار ہی کب تھا

ہم ڈوب گئے جاگتی راتوں کے بھنور میں
ہاتھ اُس کا ہمارے لئے پتوار ہی کب تھا

تو بزرگانِ شعر و ادب نے ایک دم چونک کر اپنا سر اٹھایا اور قتیل شفائی کی طرف دیکھا۔ یہ پٹھان اور یہ درد و سوز! یہ چوڑا چکلا سینہ اور یہ لہجے کی رسیلی گھلاوٹ! یہ بھاری بھرکم کندھے اور یہ پیاری پیاری نرمی اور نغمگی! پٹھان کے اندر یہ شاعر کہاں چھپا بیٹھا تھا۔ اس کے سر اور ہاتھ اور ترنم کیا ہو گئے۔ یہ پٹھان تو بھنور میں پتوار پتوار پکارتا پھرتا ہے۔

چنانچہ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے قتیل شفائی کی گرہیں کھلتی گئیں، شعر و ادب کی محفلوں میں اس کی مخمور اور مخلص آوازیں تیرنے لگیں۔ اس کے احساس میں شوخی اور نزاکت تھی۔ اس کے الفاظ میں بے ساختگی اور بے تکلفی تھی۔ اُس کے گلے میں ٹھہراؤ اور لچک تھی۔ اخلاص زدہ قمیص کے اندر شعریت کا سرمایہ مار چھپا ہوا تھا۔ اُس پر قتیل شفائی کے برتاؤ میں خلوص کی گرمی اور طبیعت کی سادگی نے قیامت ڈھا دی۔ شہر لاہور کے ادبی ماحول میں یہ خلوص اور سادگی قریب قریب نایاب چیز سمجھی جاتی تھی۔ اور اسی لئے لاہور میں ہر نایاب چیز کو اجنبی سمجھا جاتا تھا۔ شروع شروع میں تو یہ اجنبیت اور نامانوسیت انہیں کھٹکتی رہی، لیکن قتیل شفائی معصوم بچوں کی سی مقدس مسکراہٹ کے ساتھ کہتا رہا "اے شہر کے طرار باسیو! میں کوہ سلیمان کی پہاڑیوں سے تمہارے لئے یہ تحفہ لایا ہوں۔ اپنے آرٹ کو اس اجنبی شے کی "پیوند" دو۔ اور پھر دیکھو کہ آرٹ کی کوکھ سے کیسی خوب صورت چیز جنم لیتی ہے"

اور پھر بیس سال بعد ہم نے دیکھا کہ آرٹ کی کوکھ سے "مطربہ" نے جنم لیا جس میں آرٹ کی شوخی بھی ہے اور تندی بھی ہے، اور خلوص اور سادگی کی نرمی اور گھلاوٹ بھی۔ معصوم اور مقدس قتیل شفائی جب شہر کی مکار، اور پُرتکلف اور جھوٹی محبت کے ساتھ ٹکرایا، تو اس تصادم سے "مطربہ" کا ظہور ہوا۔ ثبت اللہ

منفی کے ٹکراؤ کا یہ کتنا خوب صورت نتیجہ ہے؟ جو اس وقت آپ کے سامنے ہے۔

قتیل شفائی نے "مطربہ" کیوں لکھی؟ کیسے لکھی؟ اس کی بھی ایک کہانی ہے۔ کہانی جو آپ بیتی ہے۔ کہانی جو جگ بیتی بھی ہے۔ شاعر نے نظموں کی اس کڑی کو غمِ ذات کی بھٹی میں پگھلا پگھلا کر ڈھالا۔ اور جب یہ کڑی ڈھل کر نکل تو غمِ ذات کی حد دوری سے نکل کر غمِ جہاں تک پھیلتی چلی گئی۔

اسی لئے اس کہانی کا ہیرو اگرچہ قتیل شفائی ہے۔ مگر قتیل شفائی کا تجربہ چونکہ ہم سب کا تجربہ ہے اس لئے ہم سب "مطربہ" کے ہیرو ہیں۔ قتیل شفائی تو ہم سب ہیروؤں کا ایک نمائندہ سمبل (علامت) ہے۔ آپ ان نظموں کو پڑھ کر دیکھئے تو آپ یہ محسوس کرکے متعجب ہوں گے کہ قتیل شفائی کے دل کی دھڑکنیں آپ کی دھڑکنیں ہیں .... وہی سُر، وہی تال۔ وہی آہنگ۔

مگر اس کہانی کی ہیروئن کون ہے؟ —

شاعر قتیل شفائی نے اس ہیروئن کا تعارف یوں کرایا ہے۔

سانولی سی اک عورت جس کا مردوں جیسا نام
چھوڑ کے عصمت کی منڈی اور جسموں کا بازار
پیش کرے اونچے محلوں میں وہ فن کے شہکار
زیب نہیں دیتا اب اس کو وہ گندا بیوپار
اوروں کی مانند بھلا کب ہوتی ہے نیلام
سانولی سی اک عورت جس کا مردوں جیسا نام

اس تعارف میں تحسین کی بے ساختہ لہریں کیوں اُبھر رہی ہیں؟ کیونکہ شاعر ایک انوکھے تجربے سے دوچار ہونا چاہتا ہے۔ روایتی طوائف کو دولت کے شہکاروں میں بدلتے ہوئے دیکھ رہا ہے یا دیکھنے کا آرزومند ہے۔ اس تبدیلی میں ایک حسین خواب کی سی کیفیت ہے۔ اس لئے تحسین کا لہجہ اختیار کرکے وہ خواب کے حُسن کو بچا بچا کر رکھنا چاہتا ہے۔ اور اپنے ڈیفینس میں کسی فاتح کی طرح کہہ اُٹھتا ہے۔

اپنے پیارے میں نے اُس کے بدل دیئے دن رات
دولت والے اُسے خریدیں، کب اُن کی اوقات
میری ہی چاہت کا لے گی اپنے سر الزام
سانولی سی اک عورت جس کا مردوں جیسا نام

مگر اس کہانی کا ہیرو خالص آدرش وادی نہیں ہے۔ روایتی طوائف کو اپنے خلوص کے نغمے عطا کرکے وہ سمجھتا ہے کہ وہ اُسے گندے بیوپار کی دَل دَل سے نکال کر فن کے بلند مینار پر بٹھا دے گا۔ اور عشق کی بھرپور تابندگی سے اُسے قابلِ رشک بنا دے گا اور پھر دنیا کو چیلنج دے گا کہ عشق کی معراج اور مینار کی بلندی سیم و زر کی کمندیں پھینک کر دکھاؤ، خطا کھاؤ گے۔

لیکن آدرش وادی کی کہانی جب تھوڑی سی آگے بڑھتی ہے تو پہلے حقیقت کی چھوٹی چھوٹی کنکریوں سے ٹکراتی ہے۔ کنکریوں کے بعد پتھر، پتھر کے بعد گرشمے، پھر چٹانیں۔ اور پھر آدرش واد کا حقیقت کی سنگ دلی سے پے در پے تصادم ہونے لگتا ہے۔ اور تصادموں کی خوف ناک اور لرزہ خیز آوازیں

فن اور شخصیت

"مطربہ" کی آدھی سے زیادہ نظموں میں شنائی دیتی ہیں۔ اور شاعر چیختا ہے، چلاتا ہے، تڑپتا ہے، بھڑکتا ہے، کہیں طعنے دیتا ہے۔ کہیں پیار سے سمجھاتا ہے۔ کہیں اپنی محبت کا واسطہ دیتا ہے۔ کہیں ماضی کے گیتوں بھرے لمحات کی سوگند دیتا ہے، ڈراتا ہے، مشتعل ہوتا ہے، کبھی کبھی صداقت کے اتنے نزدیک پہنچ جاتا ہے کہ اپنے خلوص اور محبت اور آدرش پر خفیف ہو جاتا ہے۔ منہ چھپا لیتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک آدھ بار تو حقیقت کے ہاتھوں پاش پاش ہو کر آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ اور پھر بدستور کبھی موہوم امید کے جھولے میں جھولنے لگتا ہے۔

آدرش وادی کی شکست کی سینکڑوں کیفیتیں "مطربہ" کی نظموں میں پورے تنوع، پورے زور اور پوری تندی کے ساتھ موجود ہیں کیوں کہ یہی کیفیتیں ہی اس کہانی کا حاصل ہیں۔ ٹوٹتے ہوئے خواب اور اُبھرتی ہوئی حقیقت کے یہ درمیانی لمحے، ایک پوری داستان ہیں، جو غم ذات کو غم جہاں میں ڈھالنے کا عمل ہیں۔ کیونکہ وہ مدینۃ طوائف جیسے شاعر نے گندے بیوپار سے اٹھا کر سیم وزر کی طاقتور اور ہوسناک آغوش سے چھپا کر اپنے گیتوں کے شیش محل میں لا بٹھایا تھا۔ اس کے گنگھرو پھر جزلوں کے زرق برق قالینوں پر تھرکنے لگے تھے۔

اور شاعر "آدرش وادی" جیسر کا خواب ٹوٹ جاتا۔

سماج پر پیسے کی حکمرانی ہے، وفا کی نہیں۔

پیسے کی حکمرانی میں جسم ہی نہیں بکتے، نغمے بھی بکتے ہیں۔

اور شاعر اپنی شکست کا اعتراف کرتے ہوئے رو اُٹھتا ہے اور کہتا ہے۔

تیرے اسلاف نے کھولی تھی جو نغموں کی دکان

اس میں ایک شاعر نادار کی توقیر کہاں

یہی بہتر ہے کہ خاموش رہے میری زبان

"مطربہ" کی کہانی ایک آدرش وادی کی فتح اور ایک حقیقت پسند کی شکست کی کہانی ہے۔ اور یہی اس کہانی کا حُسن ہے کہ اس میں ایک ہی فرد بیک وقت آدرش وادی بھی ہے اور حقیقت پسند بھی۔ وہی جیتتا بھی ہے اور ہارتا بھی ہے۔ جیت اور ہار کا یہی سنگم اس کہانی کو ایک مکمل حسن عطا کرتا ہے۔ دونوں کیفیتوں کے ایسے دلآویز تجربے اس میں موجود ہیں، جو شاید ہی کسی شاعر نے آج تک اس گوناگوں تکملیت کے ساتھ بیان نہیں کئے۔ جیت اور ہار کے اس اتار چڑھاؤ میں جتنے بھی نمائندہ کردار ممکن تھے قتیل شفائی نے اپنے فن کے البیلے اور تند دونوں اسالیب کے ساتھ بڑے تاثر انگیز لہجہ میں پیش کر دیئے ہیں۔ اس نے کچھ نہیں چھپایا سب کچھ بتا دیا۔ تبسم، چیلنج، سنبھالا، امید، جدوجہد، طنز، اُداسی، بے بسی، کرب ـــــــ ہر شمع اس نے اپنے احساسات کی آگ سے جلائی اور وقت کے ایک بہت بڑے ـــــــ یعنی طوائف کے مسئلے کے اردگرد روشنی کے ہالے پھیلا دیئے۔

اور یہی آرٹ کی صداقت ہے۔

اور اسی لئے "مطربہ" ایک بلند پایہ اور لافانی تخلیق ہے۔

لیکن "مطربہ" کی یہ پوری شاعرانہ کہانی پڑھنے کے بعد میرے دماغ میں ایک سوال بار بار گونجتا رہا کہ اس رومانٹک حقیقت پرست شاعر کے اس عظیم تجربہ کا حاصل کیا ہے؟

طوائفیت ـــــــ ایک قدیم ترین انسٹی ٹیوشن ہے۔ بلکہ ایک زمانہ میں تو یہ ادارہ سماج کی تہذیب کا ایک ممتاز حصّہ بن گیا تھا۔ سماج

کے حکمراں طبقہ نے اُسے سماجی تہذیب میں شامل کرکے اس ادارہ کے منفی کردار کو آنکھوں سے اوجھل کردیا تھا۔ تاکہ طوائفیت پر بداخلاقی کا لیبل چسپاں نہ ہوسکے کیوں کہ یہ ادارہ اونچے طبقہ کے لئے سامانِ عیش و تفنن مہیا کرتا تھا۔ مگر سماج کی مروجہ اخلاقی قدریں اس سامانِ عیش کے راستے میں حائل تھیں۔ لہٰذا اونچے طبقہ کے سامنے رُکاوٹ دور کرنے کا واحد طریقہ یہ تھا کہ طوائفیت کو بھی اخلاق اور تہذیب کی مقدس صفوں میں شامل کرلیا جائے اور اسے آرٹ اور موسیقی اور کلچر کا شوخ و شنگ رنگ عطا کردیا جائے۔

چنانچہ اس کے بعد طوائفیت کی انسٹی ٹیوشن دو حصوں میں منقسم ہوگئی۔ ایک حصّہ پر بداخلاقی کا لیبل چپکا دیا گیا۔ اور اسے نچلے طبقہ کے لئے مخصوص کردیا گیا۔ اور دوسرے حصّہ کو تہذیب اور آرٹ کی صف میں لے جایا گیا اور وہ اونچے طبقہ کی "فن پرستی" کے سایۂ عاطفت میں پرورش پاتا رہا۔

اور اس میں طوائف کا یہ پہلو نکلتا ہے کہ طوائفیت کا جنم داتا یہی اونچا طبقہ ہے۔ اُسی کے سماجی نظام کی غلاظتوں، خامیوں اور تاریکیوں میں سے طوائف پیدا ہوئی ہے۔ اور یہی اونچا طبقہ ہی سماج کو دھوکا دینے کے لئے کبھی کبھار اس انسٹی ٹیوشن کے خلاف نعرے بھی لگاتے دیکھا گیا ہے۔

قتیل شفائی کی "مطربہ" اسی اونچے طبقہ کے سماجی نظام کی پیداوار ہے۔ اور طوائفیت کی انسٹی ٹیوشن کے جن دو حصّوں کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے وہ ان کے درمیان ایک بے گھر طائر کی طرح بھٹکتی پھرتی ہے۔ وہ پہلے نچلے طبقہ کے لئے مخصوص تھی، اس پر بداخلاقی کا لیبل چپکا ہوا تھا۔ مطربہ کے ہیرو نے اُسے اُٹھا کر تہذیب اور آرٹ کی صف میں لے جانا چاہا۔ اور اپنی فن پرستی کے سائے میں اُس کی پرورش کرنے لگا مگر مطربہ ایک دم اُس کے ہاتھ سے مچھلی کی طرح نکل گئی اور اونچے طبقہ کی جاگیر میں جاگری اور اونچے طبقہ کے لئے سامانِ عیش و تفنن کا ذریعہ بن گئی۔

"مطربہ" کی ہیروئن کی سب سے بڑی ٹریجڈی یہی ہے۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ یہ "مطربہ" کے ہیرو کی ٹریجڈی ہے کہ اس نے اپنی ہیروئن کو ممتاز مقام دینے کے لئے وہی تکنیک اختیار کی، جو اونچے طبقہ نے اپنے مقاصد کے لئے ایجاد کی تھی۔ قتیل شفائی نے پیمانہ تو اونچے طبقہ سے لیا اور پرکھا اُسے اپنے پیمانہ پر نتیجے کی ٹریجڈی سامنے ہے کہ اونچے طبقہ والے اس کی ہیروئن کو چھین کر لے گئے اور قتیل شفائی کے لئے صرف شاعرانہ احتجاج چھوڑ گئے۔

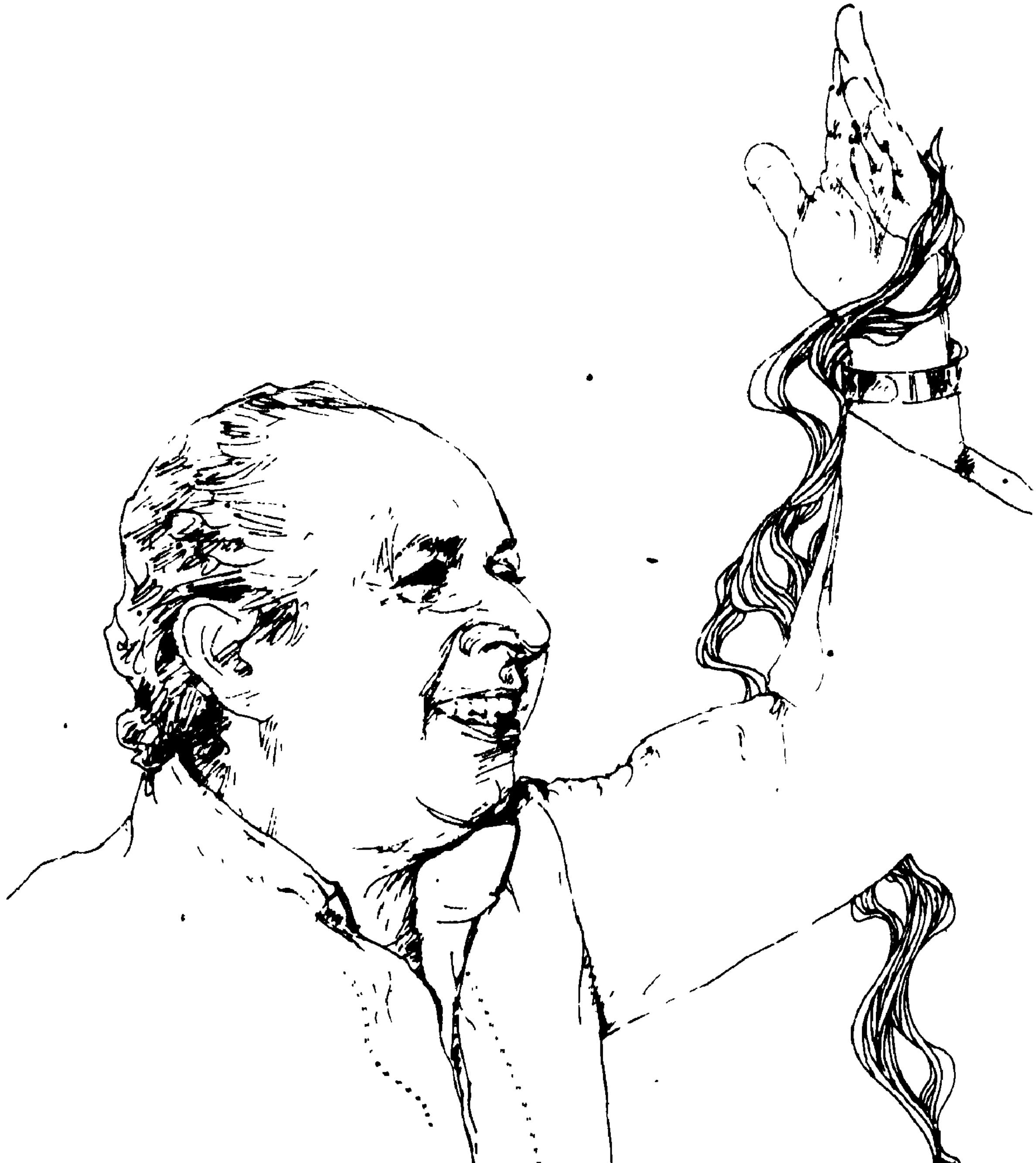
اور یوں طوائفیت کا مسئلہ جوں کا توں قائم رہا۔

اس لئے وہ سماجی نظام جس نے طوائف کو جنم دیا جس کے لئے اس نے دو حلقے بنائے۔ جس کے پاس اخلاق اور تہذیب کے اپنے مقصدی پیمانے اور جس کے پاس سیم و زر کی طاقت ہے وہ صرف "مطربہ" کے ٹریجک ہیرو کے عشقِ صادق، خلوص، فن، سپردگی اور خوبصورتی کی طاقت سے شکست نہیں کھا سکتا۔ "مطربہ" کی نظموں کا تجربہ ہمیں بتاتا ہے کہ اس سماجی نظام کو بدلے بغیر طوائف کو بدلا نہیں جاسکتا۔

ہاں قتیل شفائی کی "مطربہ" کا تجربہ ایک ٹریجڈی ہے۔ اور یہ نظمیں اس ٹریجڈی کو کامیڈی میں بدل دینے کا ایک تاریخی مطالبہ بن کر آپ کے سامنے آتی ہیں اور یہی مطالبہ اس کا حاصل ہے۔

اور قتیل شفائی خود بھی اس کا اعتراف کرتا ہے..

یک موضوعی نظمیں



عصمت پوشی

میں نے پوچھا
منّے! تم کیوں اپنی امّی جان کو باجی کہتے ہو
منّا بولا
باجی بھی تو نانی جی کو آپا آپا کہتی ہیں
میں نے سوچا
اس بازار کا جو کوٹھا ہے اس کی ریت نرالی ہے
یہاں تو ماں کو ماں کہہ دینا سب سے گندی گالی ہے

چکلے

رات گئے تک گھائل نغمے کرتے ہیں اعلان یہاں
یہ دنیا ہے سنگدلوں کی کوئی نہیں انسان یہاں
عزت والوں کی ذلت کا سب سے بڑا بازار ہے یہ
چکتے ہیں غیرت کے سودے، بکتے ہیں ایمان یہاں
بھیک میں بھی مانگو تو کوئی پیار نہ ڈالے جھولی میں
بن مانگے مل جاتے ہیں رسوائی کے سامان یہاں
زر داروں کو نغموں میں جب جسم دکھائی دیتا ہے
اک مہکی سیج پہ اکثر ٹوٹتی ہے ہر تان یہاں
ممتا کے ہونٹوں پر جب چاندی کی مہریں لگتی ہیں
ماں خود اپنی بیٹی کو کر دیتی ہے قربان یہاں
اپنا خون ہی بڑھ کر اپنے خون کی بولی دیتا ہے

کس نے کس پر ہاتھ بڑھایا کوئی نہیں پہچان یہاں
پاپ کے اس مندر میں کیا کیا بھاؤ بتلائے رام جنی
شام ڈھلے جب آن براجیں سونے کے بھگوان یہاں
رات گئے تک جاگے سانوری کالے چوروں کی خاطر
اور اگر انکار کرے کہلائے نافرمان یہاں
جھلس کرتی پوشاکوں سے چاہے بدبو آتی ہو
خود جل کر محفل کو خوشبو دیتا ہے لوبان یہاں

نائیکہ

دیکھ بٹیا یہ ترے ہی فائدے کی بات ہے
دیکھ جھٹلایا نہیں کرتے بڑے بوڑھوں کی بات
تو نہ مانے گی تو اِس بازی میں کھا جائے گی مات

واری جاؤں یہ جہاں جو کچھ بھی کہتا ہے کہے
تجھ میں کوئی عیب ہے جو ایک کی ہو کر رہے

اِس طرح محدود ہو جانے سے تو انکار کر
جو بھی اپنی جیب کھنکائے اُسی سے پیار کر

پیار کر اُس سے جو تیری چاہ میں غرقاب ہو
چاہے وہ گھُبرو ہو، نیلا ری ہو یا قصاب ہو

تیری پرنانی، خدا بخشے بڑی ہشیار تھیں
ایک دو کیا وہ تو سارے شہر کی دلدار تھیں

پھر بھی لیکن آرزوئے راہِ آزادی نہ کی
اُن بہشتن نے تو مرتے دم تلک شادی نہ کی

تیرے دل میں ہے اگر کچھ اپنے بچوں کا خیال
اپنے بیٹے کو وفاداری کے جھنجھٹ میں نہ ڈال

دیکھ بیٹیا یہ ترے ہی فائدے کی بات ہے

مَعصُوم

امی پیاری پیاری امی
یہ تو مجھے بتلا دو نا
تم میری کیا لگتی ہو؟

پُوچھتے ہیں میرے ہمجولی
جب میں اُن سے کھیلتا ہوں
تیرے باپ کا نام ہے کیا؟

میں کہتا ہوں امی سے کل پُوچھ کے تمہیں بتا دوں گا
لیکن پیاری امی مجھ کو اتنا بھی معلوم نہیں
تم میری کیا لگتی ہو؟

ماں ہوتیں تو مجھ کو تنہا چھوڑ کے لمبی راتوں میں
دیر دیر تک مجھ سے دور دور نہ تم رہتیں
پھر تم میری کیا ہو امی؟

اندیشہ

عنبریں جسم کی خوشبو سے مہکتی ہوئی رات
مجھ سے کہتی ہے یہیں آج بسیرا کر لے

گر تری نیند اُجالوں کی پرستار نہیں
اپنے احساس پہ زُلفوں کا اندھیرا کر لے
میں کہ دن بھر کی چکا چوند سے اُکتایا ہوا
کسی غنچے کی طرح دھوپ میں کملایا ہوا

اِک نئی چھاؤں میں سستانے کو آبیٹھا ہوں
گردشِ دھر کے آلام سے گھبرایا ہوا
سوچتا ہوں کہ یہیں آج بسیرا کر لوں
صُبح کے ساتھ کڑی دھوپ کھڑی ہے سر پر
کیوں نہ اس ابر کو کچھ اور گھنیرا کر لوں

جانے یہ رات اکیلے میں کٹے یا نہ کٹے
کیوں نہ کچھ دیر شبستاں میں اندھیرا کر لوں

لیکن اِس رات کی یہ بات نہ بڑھ جائے کہیں
تجھ سے مِل کر یہ مرے دل کو لگا ہے دھڑکا

راکھ ہو جاؤں گا میں صبح سے پہلے پہلے
گُھل کے سینے میں جو احساس کا شعلہ بھڑکا

رسمِ شبستانِ طرب

کون یہ اُن کے شبستاں میں چھپا بیٹھا ہے
کوئی فاتح ہے مگر دل میں ہے گھبرایا ہوا
اُس نے جس لشکرِ جرار پہ کی تھی یلغار
اُس نے پھر پرچمِ زرکار ہے لہرایا ہوا

دُور تا حدِّ نظر کوئی بھی اپنا تو نہیں
ایک پرچم کے تلے جمع ہیں سارے اغیار
مقصدِ جنگ یہاں سب کا جُدا ہے لیکن
سب کے ہاتھوں میں چمکتی ہے سُنہری تلوار

وَسوسے دل میں لئے سوچ رہا ہے فاتح
کِس طرح مملکتِ حُسن رہے زیرِ نگیں
چند راتوں کی حکومت کا یہ بیکار غرور
چیختی روح کی تسکین کا ضامن تو نہیں

اِس سے پہلے بھی تو آئے ہیں کئی لوگ یہاں
حُسن اور حُسن کی سرکار پہ قابو پانے
فتح کے بعد بھی لیکن اُنھیں تسکیں نہ ملی
آخرِ کار تہِ تیغ ہوئے دیوانے

فاتحِ حُسن کئی دن سے اسی سوچ میں ہے
اس کی بھی موت کا پیغام نہ آ پہنچا ہو

کسی قارون کی دولت کے خزانوں کی عوض
اُس کی تذلیل کا ہنگام نہ آپہنچا ہو

آہٹیں تیز ہوئیں خوف نے گھیرے ڈالے
تھرتھراتے ہیں شبستاں کے پُراسرار دیئے
سر پہ آپہنچا ہے شاید کوئی خوں خوار غنیم
ہاتھ میں زر کی چمکتی ہوئی تلوار لیئے

دو خبر مملکتِ حُسن کے دربانوں کو
اب اُجالوں کے بھی چہروں پہ سیاہی ہوگی
دفن ہو جائے گا یادوں میں پُرانا فاتح
اب یہاں اور کسی اور کی شاہی ہوگی

انوکھی

وہ عجیب عورت ہے
اُس کے دِل رُبا نغمے
چار سو بکھرتے ہیں
لوگ اُس کے نغموں کی
دِل کشی پہ مرتے ہیں
کچھ تو قدرداں بن کر
اُس کی جیب بھرتے ہیں
کچھ اُسے لُبھانے کو
بے طرح سنورتے ہیں
اور کچھ امارت کی
راہ سے اُبھرتے ہیں

بیویوں سے چھپ چھپ کر
عرضِ شوق کرتے ہیں
ساغروں کی حدّت سے
جب کبھی نکھرتے ہیں
پیار بھی جتاتے ہیں
تہمتیں بھی دھرتے ہیں
جو نہ زیب دے اُن کو
وہ بھی کر گزرتے ہیں
اُس کے زمزمے لیکن
سب سے پیار کرتے ہیں
سب کی بھول پر اُس کے
قہقہے بکھرتے ہیں
منزلوں پہ سب اُس کا
انتظار کرتے ہیں
وہ عجیب عورت ہے

سانولی سی اِک عورت

بھیج رہی ہے اب تک مجھ کو چاہت کے پیغام
سانولی سی اِک عورت جس کا مردوں جیسا نام

وہ عورت جس کے ہونٹوں پر ناچیں میرے گیت
جس کی بڑھتی شہرت کو، میں سمجھوں اپنی جیت
سب دُنیا کو چھوڑ کے جس نے مجھے بنایا میت
سُنتا ہوں دن رات میں جس کی سانسوں کا سنگیت
چھائے میرے ذہن پہ اکثر بن بن کر الہام
سانولی سی اِک عورت جس کا مردوں جیسا نام

اُبھرے اُبھرے ہونٹ ہیں اُس کے کھلتے سُرخ گلاب
اُس کی رنگت مستقبل کا دُھندلا دُھندلا خواب
اُس کے نغموں کی لے پر بہتا ہے مست چناب
اُس کی چال چکوروں جیسی، اس کا بدن کمخواب
پیاس بھڑکتی ہے جب میری بن جاتی ہے جام
سانولی سی اِک عورت جس کا مردوں جیسا نام

میں جب اس کا ذکر کروں تو چونک پڑیں سب لوگ
کوئی نصیحت کرے مجھے اور کوئی منائے سوگ
دیکھ سکا ہے کب کوئی دو روحوں کا سنجوگ
اُس بے چاری کو سب جانیں میری جان کا روگ
میری خاطر سہتی ہے سب دُنیا کے دُشنام
سانولی سی اِک عورت جس کا مردوں جیسا نام

میں کہتا ہوں اِن پگلوں سے چھوڑو پچھلی بات
اپنے پیار سے میں نے اُس کے بدل دیے دن رات
دولت والے اُسے خریدیں؟ کیا اُن کی اوقات
برسے گی اب میرے ہی آنگن میں یہ برسات
میری ہی چاہت کا لے گی اپنے سر الزام
سانولی سی اِک عورت جس کا مردوں جیسا نام

چھوڑ کے عصمت کی منڈی اور جسموں کا بازار
پیش کرے اُونچے محلوں میں وہ فن کے شہکار
مان لیا ہے سب نے اُس کو اک سچی فن کار
زیب نہیں دیتا اب اُس کو وہ گندا بیوپار
اوروں کی مانند بھلا کب ہوتی ہے نیلام
سانولی سی اِک عورت جس کا مردوں جیسا نام

مان لیا کچھ اور تھی پہلے اس کے پیار کی ریت
ایک ہی سُر پر کبھی نہ قائم تھا اُس کا سنگیت
پھر بھی سب کچھ چھوڑ کے اُس نے مجھے بنایا میت
جب تک وہ چلے گی اندھے رہیں گے میرے گیت
اپنے ساتھ لئے پھرتی ہے وہ میرا انجام
سانولی سی اِک عورت جس کا مردوں جیسا نام

اے مری جانِ طرب

خیال تھا کہ تجھے بھول جاؤں گا میں بھی
کیے ہزار جتن پر تجھے بھلا نہ سکا
سُنا تھا لوگ کھلونا تجھے سمجھتے ہیں
مگر میں اپنی نظر سے تجھے گرا نہ سکا
سُنائے لاکھ رقیبوں نے تیرے افسانے
مگر کبھی مرا احساس ڈگمگا نہ سکا

مجھے خبر ہے کہ ہر شام تیرے ہونٹوں نے
ہزار گیت بکھیرے ہیں اہلِ زر کے لئے
مجھے خبر ہے کہ مہکا ہوا بدن تیرا
بنا ہے دعوتِ نظارہ ہر نظر کیلئے
بُرا نہ مانے تو کہہ دوں خدا کے گھر کی طرح
کھُلا رہا ہے ترا در بھی ہر بشر کے لئے

ترے حریمِ طرب میں ہوس کے سوداگر
بنامِ نغمہ و فن تجھ سے بار ہا کھیلے
ردائے زر میں چھپا کر ذلالتوں کے جذام
ملے ہیں تجھ سے کئی بد قماش البیلے
تجھے بھی زر کی طلب تھی ترے بھی جلووں نے

لگا دیے سر بازار پیار کے میلے

مجھے خبر ہے کہ میں وہ رئیسِ شہر نہیں
کہ جس کی جیب میں ذلت کھنکتی رہتی ہے
وہ جس کے حجلۂ عشرت کی بے طلب اولاد
خود اپنے باپ کے دل میں کھٹکتی رہتی ہے
وہ جس کی دولت و ثروت غلیظ کوٹھوں پر
خبیث روحوں کی صورت بھٹکتی رہتی ہے

اگر میں ایسا ہی ہوتا کوئی رئیس تو پھر
ترے خیال کو دل سے بھلا بھی سکتا تھا
براہِ عشرت و ثروت جو تو ملی ہوتی
تجھے میں اپنی نظر سے گرا بھی سکتا تھا
تری نظر میں جو ہوتا نہ خوابِ مستقبل
تو میں وفا کو تماشہ بنا بھی سکتا تھا

گلاب کے پھول

تجھے گلاب کے پھولوں سے کیوں نہ ہو رغبت
کہ اُن سے آتی ہے خوشبو ترے بدن کی سی
ملا ہے رنگ اُنہیں تیرے پیرہن کا سا
عطا ہوئی ہے اُنہیں چھب کسی دُلہن کی سی

وہی دلہن کہ ہر اک من میں جس کی مورت ہے

تجھے گلاب کے پھولوں سے یوں بھی الفت ہے

کہ وہ بھی صرف بہاروں کا ساتھ دیتے ہیں

خزاں رسیدہ چمن میں اگر صبا نہ رہے
تو بس وہ اپنے ہی خاروں کا ساتھ دیتے ہیں

• انہیں کسی سے نبھانے کی کیا ضرورت ہے

تیرے مزاج کی بے مہریوں کو مہکانے
مری طرف سے بھی حاضر ہیں کچھ گلاب کے پھول

اگر یہ طنز نہ بن جائیں تیری فطرت پر
تو میری نذرِ عقیدت کو بخش رنگِ قبول

یہی اب اپنے بہلنے کی ایک صورت ہے

اوقاف ایکٹ

رقص کر اے مطربہ! چھم چھم چھما چھم رقص کر
بارگاہِ مُرشدِ کامل میں پیہم رقص کر

رقص کر ہاں رقص، اس بہروپیے کے روبرو
زہد کا بہروپ بھر رکھا ہے جس نے مو بہ مو
مکر و فن سے ہے عبارت جس کے چہرے کا جلال
جاہلوں کو لوٹنے میں جس کو حاصل ہے کمال

پاک تر ہے جس کا ظاہر، جس کا باطن ہے پلید

لب پہ توقیرِ حسینؓ اور دل میں تصویرِ یزید

عصمتیں لٹتی ہیں اب بھی جس کی عشرت گاہ میں
خوب صورت جسم بچھ جاتے ہیں جس کی راہ میں

خلوتوں میں جس کو ہے مرغوب شغلِ نائے و نوش
مہرباں تجھ پر ہوا ہے آج وہ تربت فروش

تو اسی مجذوب کے آگے دما دم رقص کر
رقص کر اے مطربہ! چھم چھم چھا چھم رقص کر

عیش و عشرت، جاہ و حشمت، مال و زر، دُنیا و دیں
آج اس محفل میں تیرے واسطے کیا کچھ نہیں

دیکھ یہ ہے بارگاہِ مرشدِ عالی مقام
ہو چکی ہے آج پھر جس کی طہارت بے لگام

حرص کی سب گرم بازاری اسی کے دم سے ہے
قحبہ خانوں کا بھرم بھی قبلۂ عالم سے ہے

شیطنت کا رنگ کس شدت سے غالب آگیا
تیرے قدموں میں ترے جلووں کا طالب آگیا

جذب کے عالم میں وہ کچھ تجھ سے فرمانے کو ہے
ایک رہزن تیرے ہاتھوں آج لٹ جانے کو ہے

لوٹ کر اس راہزن کو جانِ عالم رقص کر
رقص کر اے مطربہ! چھم چھم چھما چھم رقص کر

مطربہ! اندھی عقیدت کا صنم خانہ ہے یہ
ذبح ہوتا ہے جہاں مذہب وہ کاشانہ ہے یہ

رات دن ایمان کی گردن پہ چلتی ہے چھری
تو یہاں پہنے گی ہر قصاب کی نیت بُری

بوٹیاں تک نوچ لینے کو سبھی تیار ہیں
جس قدر درویش ہیں اس بزم میں عیار ہیں

لوٹتے ہیں مال یہ جتنا خدا کے نام پر
سب لٹا دیتے ہیں آخر گیسوؤں کی شام پر

لیکن اب یہ گیسوؤں کی شام ڈھل جانے کو ہے
اک چھری ان کے کلیجے پر بھی چل جانے کو ہے
اب یہ محفل بن رہی ہے بزمِ ماتم، رقص کر
رقص کر اے مطربہ! چھم چھم چھما چھم رقص کر

مُطربہ

جسم کی آبرو جو ہوئی سو ہوئی، روح کو اب نہ مجروح کر مطربہ!
کیوں بھکاری کے مانند پھر آجکل تیرے نغمات ہیں دربدر مطربہ!

تیرے ماحول کے نرم کشکول میں بھیک بن کر گریں گی ہوس کاریاں
تیرے حالات کے خوشنما ہاتھ پر لوگ رکھ دیں گے چاندی کی چنگاریاں

تیرے انجام کی سانولی شام تک یوں تو ہوں گی تری خوب دل داریاں
ڈوب جائے گی جب حُسن کی چاندنی تجھ سے کترائے گی ہر نظر مطربہ!
جسم کی آبرو جو ہوئی سو ہوئی، روح کو اب نہ مجروح کر مطربہ!

جانتا ہوں کہ نغموں کی تاجر ہے تُو، یہ تجارت بھی تجھ کو نہ راس آئیگی
دے گی آواز جب تو خریدار کو تیرے لہجے سے زخموں کی باس آئے گی
مُسکراتی ہوئی جائے گی تو جہاں لوٹ کر تو دہیں سے اُداس آئے گی
تیرے نغمات بے موت مر جائیں گے، قبر بن جائے گا تیرا گھر مطربہ!
جسم کی آبرو جو ہوئی سو ہوئی روح کو اب نہ مجروح کر مطربہ!

ایک سے ایک بڑھ کر ترے شہر میں چیختی صنعتوں کا خریدار ہے
کوئی تن من سے پروانۂ چشم و لب، کوئی دیوانۂ زلف و رخسار ہے
تیرے ناموسِ فن سے انہیں کیا غرض جن کی نظروں میں تو جنسِ بازار ہے
سب کے مانند تجھ کو بھی معلوم ہے یہ لُٹاتے ہیں کیوں سیم و زر مطربہ!
جسم کی آبرو جو ہوئی سو ہوئی روح کو اب نہ مجروح کر مطربہ!

ترے چہرے پہ اب تک نہ سہرا بندھا، تیرے ہاتھوں میں اب تک نہ مہندی رچی
شہر بھر کی ہے تو بن بیاہی دُلہن جو بیاہی ہے تری نہ معصوم گھر گرہستی
تو کبھی جاہلوں کو پسند آ گئی، تو کبھی احمقوں کی نظر میں جچی
تجھ کو فن کے پرستار بن کے ملے کتنے بے ذوق اور بے ہنر مطربہ!
جسم کی آبرو جو ہوئی سو ہوئی، روح کو اب نہ مجروح کر مطربہ!

کھیتوں سے چُرائے ہُوئے بَن بھی تھے، کارخانوں سے لوٹا ہوا مال بھی

تیرے بدنام عشاق لاتے رہے اپنے تحفوں کے ساتھ اپنے اعمال بھی
قوم کے ہمدموں کا تو کیا ذکر ہے ان میں شامل تھے مذہب کے دلال بھی
ان شریفوں کی دل بستگی کے لئے تو کھلونا بنی عمر بھر مطربہ!
جسم کی آبرو جو ہوئی سو ہوئی، روح کو اب نہ مجروح کر مطربہ!

اور تیرے اسی شہر میں وہ بھی ہیں جن کی تقدیر میں چاندی سونا نہیں
جن کی غیرت کے اونچے محلات میں کھردرا سا بھی کوئی بچھونا نہیں
وہ کھلونا سمجھتے ہیں تقدیر کو خودکشی کے لئے بھی کھلونا نہیں
کوئی زردار آئے تو وہ تھوک دیں اپنی عزت نہ بیچیں مگر مطربہ!
جسم کی آبرو جو ہوئی سو ہوئی، روح کو اب نہ مجروح کر مطربہ!

اُف! مگر میں کہاں سے کہاں آگیا، کون زردار کیسی ہوس کاریاں
کیا غرض اس سے مجھ کو دکھتی پھریں تیرے ہاتھوں پہ چاندی کی چنگاریاں
میں بہک سا گیا ہوں وگرنہ مجھے خود بھی مرغوب ہیں تیری چلبلاریاں
میری باتوں سے اتنی پریشاں نہ ہو جانتے ہیں سب اہل نظر مطربہ!
کیوں بھکاری کے مانند پھر آجکل تیرے نغمات ہیں دربدر مطربہ!

اندیشہ ہائے دُور دراز

یہ جھومتی ہوئی تیرے خلوت کدے کی شام
میں تیرے سامنے ہوں، مرے سامنے ہے جام
وہ جام جس کی لوح پہ لکھا ہے تیرا نام
کچھ سوچنے لگا ہوں میں یہ جام دیکھ کر

یہ جام جس میں تو نے بھری ہے شراب ناب
کیوں آج بن رہا ہے مری روح پر عذاب

لے کر بھی تیرے ہاتھ سے نذرانۂ شباب
تھرّا رہا ہوں روح میں کہرام دیکھ کر

یہ جام مجھ پہ قہقہہ زن ہے کچھ اس طرح
میں بھی کسی فریب کی زد میں ہوں جس طرح
حیران ہوں کہ اب اسے جھٹلاؤں کس طرح
میں اپنے پیشروؤں کا انجام دیکھ کر

وہ میرے پیش رو، وہ ترے طالبِ جمال
کرتے رہے ادا جو تری قیمتِ وصال
یہ جام بھی انہیں کی نوازش کا ہے کمال
جو ہنس رہا ہے مجھ کو تہہ دام دیکھ کر

میں سوچتا ہوں وہ مرا مجموعۂ کلام
منسوب کر چکا ہوں جسے میں بھی تیرے نام
کیا جانے میرے بعد بسائے گا کس کی شام
مجھ کو اسیرِ گردشِ ایّام دیکھ کر

سترہواں سنگار

توڑ کے گھنگھرو
چھوڑ کے محفل
چُپ کا برن کیوں پہنا ہے

پیٹ پہ کُھجلی
مُنہ پر دانے

واہ تیرا کیا کہنا ہے

کیوں شرمائے
کیوں گھبرائے
یہ دُکھ ہنس کر سہنا ہے

پیاری بٹیا
یہی مرض تو
اس پیشے کا گہنا ہے

فن کار

میں نے اُس کے گیت سُنے
اُس نے مجھ کو جیت لیا
کتنی بڑی فن کار تھی وہ

میں نے اُس کی پوجا کی
اور دامن جب پھیلایا
سر تا پا انکار تھی وہ

دھن دولت کے مندر میں
دیوی بن جانے کے بعد
پتھر کی دیوار تھی وہ

جس جس نے چھنکائی جیب
راگ رنگ کی بولی میں
اُن سب کی غمخوار تھی وہ

اُس نے بھر لی رُسوائی
اپنے فن کی جھولی میں

کتنی بڑی فن کار تھی وہ

بھُول

میں فقیرانہ ترے در پہ چلا آیا تھا
یہ سمجھ کر کہ مرے عہد کی فنکار ہے تو
میں نے سوچا تھا کہ احساس ہے بیدار ترا
مجھ سے بس نقدِ محبت کی طلبگار ہے تو
مجھ کو اس بات کا خود تو نے دلایا تھا یقیں
اپنے ماحول کے دستور سے بیزار ہے تو

داشتاؤں کا چلن تجھ کو نہیں ہے منظور
ایک بس ایک ہی پہلو کی پرستار ہے تو
مال و زر جاہ و حشم کچھ بھی نہیں تیرے لئے
پیار کی راہ میں ایثار ہی ایثار ہے تو
بند ہے در ترا عیاش رئیسوں پہ مگر
میری آغوش میں ڈھل جانے کو تیار ہے تو

میں نے سوچا تھا تری محفلِ رُسوائی میں

دِل مرا کاکلِ عصیاں کا اسیر اچھا ہے

اس میں کچھ بھی نہیں سلسلۂ نام و نسب
وہی اچھا ہے یہاں جس کا ضمیر اچھا ہے
ایک تسکین تو ملتی ہے ہر اک ٹیس کے ساتھ
تو نے جو مجھ پہ چلایا ہے وہ تیر اچھا ہے

جو کسی کو نہیں حاصل وہ ہے مجھ کو حاصل
بادشاہوں سے کہیں مجھ سا فقیر اچھا ہے

آج یکسر ترے بدلے ہوئے حالات کے ساتھ
طعنے دیتی ہے مری شانِ فقیرانہ مجھے
میں تو بے لے کے گیا کاسۂ معراجِ دنا
بھیک میں بھی نہ ملا پیار کا نذرانہ مجھے
بے زری جرم ہے اس محفلِ رسوائی میں
لاکھ سمجھاتے رہے شیشہ و پیمانہ مجھے!
میں بہر حال ترے پیار کا دم بھرتا ہوں
غور سے دیکھتی ہے جرأتِ رندانہ مجھے
کیسے آیا مجھے مستقبلِ زریں کا خیال
یاد تھا جب ترے ماضی کا بھی افسانہ مجھے
آج کچھ ہوش میں آیا ہوں تو میں سوچتا ہوں
اب تو دیوانہ بھی کہہ سکتا ہے دیوانہ مجھے

غزل

کیا اس کا گلہ کیجئے اُسے پیار ہی کب تھا
وہ عہد فراموش وفادار ہی کب تھا
اُس نے تو سدا پوجے ہیں اُڑتے ہوئے جگنو
وہ چاند ستاروں کا پرستار ہی کب تھا
ہم ڈوب گئے جاگتی راتوں کے بھنور میں
ہاتھ اُس کا ہمارے لئے پتوار ہی کب تھا
آموں کی حسیں رُت کے سوا بھی تو وہ کُوکے
لیکن کسی کوئل کا یہ کردار ہی کب تھا
آواز جو میں دوں تو کسی اور کو چھو لے

اُس آنکھ مچولی سے وہ بیزار ہی کب تھا
تم اُس کو بُرے نام سے یارو نہ پکارو
یہ نام اُسے باعثِ آزار ہی کب تھا
مشہور زمانہ ہیں قتیلؔ اُس کی اُڑانیں
وہ دامِ محبت میں گرفتار ہی کب تھا

لمحوں کی پرستار

میں نے چاہا تھا اُسے روح کی راحت کے لئے
آج وہ جان کا آزار بنی بیٹھی ہے

میری آنکھوں نے جسے پھول سے نازک سمجھا
اب وہ جلتی ہوئی تلوار بنی بیٹھی ہے

ہم سفر بن کے جسے ناز تھا ہمراہی پر
رہزنوں کی وہ طرف دار بنی بیٹھی ہے
کسی افسانے کا کردار بنی بیٹھی ہے

اُس کی معصومیت دل پہ بھروسہ تھا مجھے
عزمِ سیتا کی قسم، عصمتِ مریم کی قسم
یاد ہیں اُس کے وہ ہنستے ہوئے آنسو مجھ کو
خندۂ گل کی قسم، گریۂ شبنم کی قسم
اُس نے جو کچھ بھی کہا میں نے وہی مان لیا
حُکمِ حوا کی قسم، جذبۂ آدم کی قسم
پاک تھی روح مری چشمۂ زمزم کی قسم

میں نے چاہا تھا اُسے دل میں چھپا لوں ایسے
جسم میں جیسے ہو سیپ میں جیسے موتی
عمر بھر میں نہ جھپکتا کبھی اپنی آنکھیں
میرے زانو پہ وہ سر رکھ کے ہمیشہ سوتی
شمع یک شب تو سمجھتا ہے اُسے ایک جہاں
کاش بن جاتی وہ میرے لئے جیون جوتی
دربدر اس کی تمازت نہ پریشاں ہوتی

میں اُسے لے کر بہت دُور نکل جاؤں مگر
وہ مری راہ میں دیوار بنی بیٹھی ہے
زندگی بھر کی پرستش اُسے منظور نہیں
وہ تو لمحوں کی پرستار بنی بیٹھی ہے
میں نے چاہا تھا اُسے روح کی راحت کیلئے
وہ مگر جان کا آزار بنی بیٹھی ہے
کسی افسانے کا کردار بنی بیٹھی ہے

منزل بہ منزل

جانے تجھ پر کیا گزری ہے ؟
آج تیری چاہت سے جب انکار کیا ہے اس نے
تیری وفا کو بھول کے مجھ سے پیار کیا ہے اس نے
جانے تجھ پر کیا گزری ہے ؟

جانے مجھ پر کیا گزرے گی ؟
آج کا یہ افسانہ کل بھی جب دُہرایا جائے گا
مجھ کو چھوڑ کے اور کسی سے پیار جتایا جائے گا

جانے مجھ پر کیا گزرے گی؟

جانے اُس پر کیا گزرے گی؟
تیرے میرے بعد بھی جس کے پیار کو وہ ٹھکرائے گی
جس کی لاش پہ رکھ کر پاؤں وہ آگے بڑھ جائے گی
جانے اُس پر کیا گزرے گی؟

انوکھی عید

احباب پوچھتے ہیں بڑی سادگی کے ساتھ
میں اب کے سال عید مناؤں گا کس طرح؟

پہلے تو ہر برس ترے نغموں کی اوٹ سے
ہوتا رہا طلوع میرے شوق کا ہلال
میں ہر برس ترے ہی تبسم کی چھاؤں میں
لیتا رہا شباب سے پیمانۂ جمال
تو نے سدا کیا مجھے ممنونِ دلبری
کرتا رہا ہوں میں بھی ادا قیمتِ وصال

بازارِ عاشقی میں وہ جنس نہاں تھی تو
طالب ہے کون کون؟ کسی کو پتہ نہ تھا
میں بھی تھا اک فقیر، تری زلف کا اسیر
مجھ کو بھی تیرے پیار سے کوئی گلہ نہ تھا
کرتے ہیں جیسے اب بھی ترا اعتبار لوگ
جب بھی کسی کے ذہن پہ بارِ جفا نہ تھا

وہ تحفہ ہائے زر تجھے کیا اب بھی یاد ہیں
میں نے کئے جو نذر بطور خراج فن
بھولا نہ ہوگا تجھ کو وہ ملبوس ریشمیں
سجتا رہا ہے جس سے ترا بے وفا بدن
اس بار بھی خرید کے ایسا ہی اک لباس
میں اپنے اعتماد کا سلواؤں گا کفن

اور دل میں حسرتوں کا بناؤں گا اک مزار
میں آپ کے سالگرہ مناؤں گا اس طرح

کِس کے لیے

میں تازہ غزل کس کے لئے؟
میرے افکار کا اب کوئی بھی دمساز نہیں
ساز موجود ہیں لیکن تری آواز نہیں
گونج باقی ہے سو وہ پیار کی غماز نہیں
مطربہ! اب وہ تری سوچ کا انداز نہیں

پھر مرا جوشِ عمل کس کے لئے؟
میں لکھوں تازہ غزل کس کے لئے؟
سالہا سال رہی ہے مرے شعروں کی اساس
تیرے لہجے کی گھلاوٹ، ترے ہونٹوں کی مٹھاس
تو نے پہنا دیا نغموں کو تعیش کا لباس
اب ترے غم کے سوا کچھ بھی نہیں ہے مرے پاس
اب کھلاؤں میں کنول کس کے لئے؟
میں لکھوں تازہ غزل کس کے لئے؟

تیری آواز کا جادو تھا برا حسنِ کلام
کر دیا تُو نے اُسے کوچہ بہ کوچہ نیلام
دولتِ شعر و سخن لُٹ گئی آخر سرِ عام
کیوں کسی شعر کو منسوب کروں اب ترے نام

ذہن میں آئے خلل کس کے لئے؟
میں لکھوں تازہ غزل کس کے لئے؟

تیرے اسلاف نے کھولی تھی جو نغموں کی دُکاں
اس میں اِک شاعرِ نادار کی توقیر کہاں

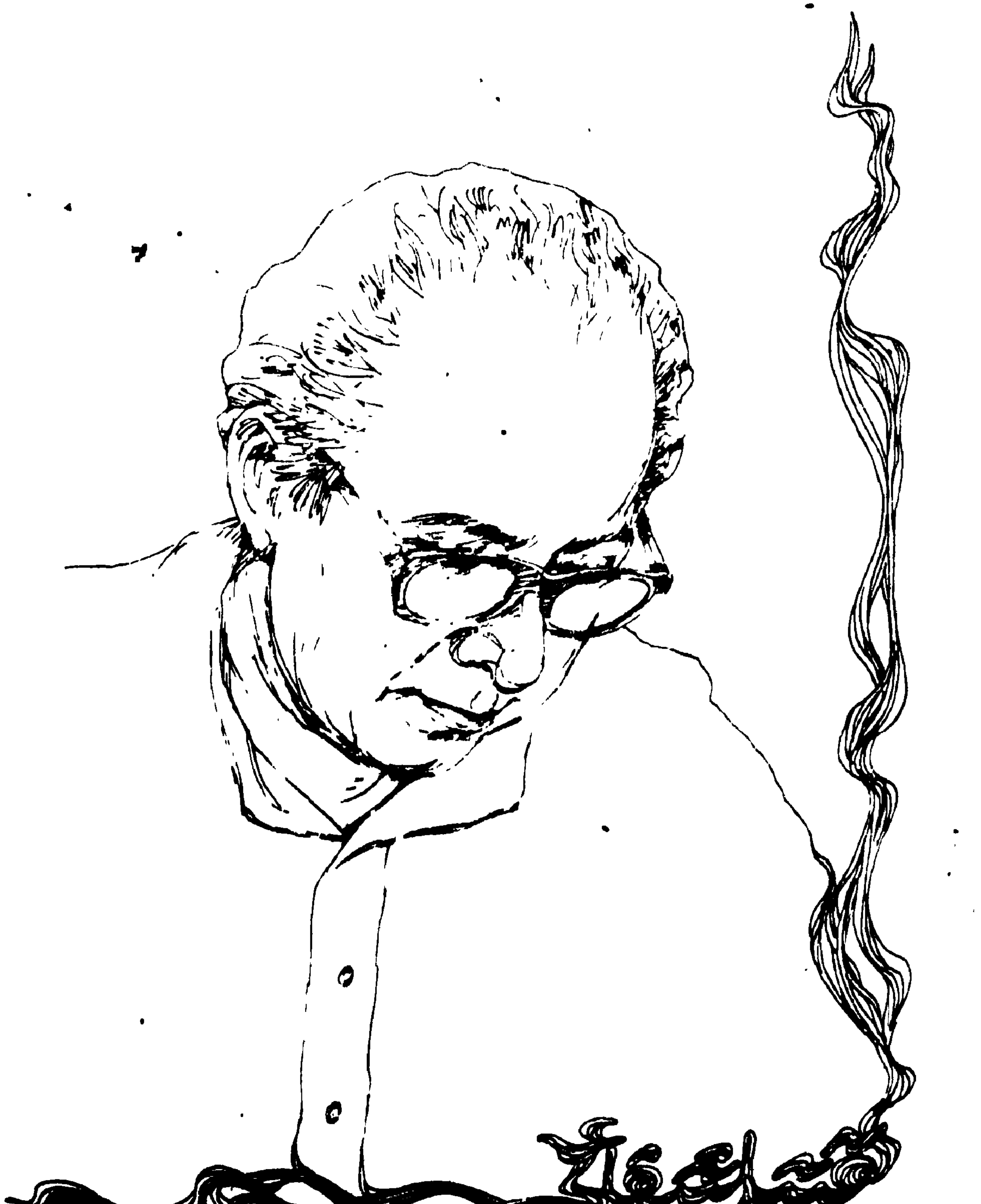
یہی بہتر ہے کہ خاموش رہے میری زباں
نہ تو ممتاز ہے تُو اور نہ میں شاہجہاں

پھر کوئی تاج محل کس کے لئے؟
میں لکھوں تازہ غزل کس کے لئے؟

★

مطمئن کوئی نہیں ہے اس سے
کوئی برہم ہے تو خائف کوئی
نہیں کرتی یہ کسی سے بھی وفا
زندگی ہے کہ طوائف کوئی


محمد حسن عسکری



قتیل شفائی کا مجموعہ کلام

ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ لاہور

جدید اردو شاعری میں قتیل شفائی ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے موضوع اور فن دونوں اعتبار سے جدید شاعری میں گراں قدر اضافے کیے ہیں۔ وہ انسانیت کے شاعر ہیں۔ اس لیے کہ شاعر کو انسانیت ہی کا شاعر ہونا چاہیے۔ ان کے موضوعات میں زندگی ہی کا سا پھیلاؤ ہے، زندگی ہی کی سی وسعتیں ہیں، زندگی ہی کا سا رچاؤ ہے۔ انھوں نے باہر کی طرف بھی دیکھا ہے لیکن ان کی آنکھیں اندر کی طرف بھی کھلی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے انسانی زندگی کی پُر پیچ کیفیت کا سراغ لگایا ہے، اس کی نبض کو ٹٹولا ہے اس کی گہرائیوں میں دور تک جھانکنے کی کوشش کی ہے، اور اس کو اپنا اور اپنی شاعری کا مزاج بنا لیا ہے۔ وہ طبعاً رومانی ہیں لیکن انھوں نے حقائق کے چہرے سے بھی نقاب کشائی کی ہے۔ اور اس نقاب کشائی میں ان کا زاویۂ نظر ہر اعتبار سے ہمیشہ ترقی پسندانہ رہا ہے۔ وہ صداقت کی تلاش میں ہمیشہ سرگرداں رہے ہیں۔ زندگی کے حسن و جمال کے وہ شیدائی ہیں۔ زندگی انھیں خوبصورت دکھائی دیتی ہے لیکن وہ اس کو مزید خوبصورت بنانا چاہتے ہیں۔ کیونکہ زندگی ان کے نزدیک حسین ہے، اور حسن زندگی۔ یہی سبب ہے کہ جب زندگی کے حسن کو کوئی چیز گہناتی ہے تو وہ ان کو ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ جہاں پہ جبر، ظلم، سفاکی، دولت کی غلط تقسیم اور طبقاتی تفریق انہیں زندگی کے حسین چہرے پر بدنما داغ نظر آتے ہیں۔ وہ زندگی میں اخوت، محبت اور مساوات کا دور دورہ دیکھنے کے خواہش مند ہیں کہ یہی ان کے نزدیک انسانیت اور انسانی زندگی کے لیے حسن ہے۔

"چھتنار" ان کی نظموں کا نیا مجموعہ ہے۔ اس میں جو نظمیں شامل ہیں، ان میں کسی نہ کسی زاویے سے ان کی شاعری کی یہی خصوصیات اپنے آپ کو رونما کرتی ہیں۔

انسان کی عظمت کا احساس قتیل شفائی کے یہاں بہت شدید ہے۔ زندگی کی مشاطگی ان کے خیال میں انسان اور آدمی ہی کی مرہون منت ہے۔ ارتقا کا سارا عمل، اسی انسان اور آدمی کے ہاتھوں انجام پاتا ہے۔ زندگی کو خوبصورت بنانا اس کی زندگی کا بنیادی مقصد ہے۔ انتہائی ناسازگار حالات میں بھی اس کا یہ عمل جاری رہتا ہے، اور اسی میں اس کی بڑائی ہے۔ آدمی ان کی ایک مختصر سی نظم ہے لیکن اس مختصر سی نظم میں انہوں نے انسان کی عظمت اور زندگی کی جدلیاتی کیفیت میں اس کے عمل کی نہایت ہی خوبصورت تصویر کھینچی ہے مثلاً ؎

لبوں پہ مسکراہٹیں سجا رہا ہے آدمی
کوئی تو زخم ہے جسے چھپا رہا ہے آدمی

پڑے پھوار ہند کی تو جلتے رنگ کے اٹھیں
چشم نم بھی گیت گنگنا رہا ہے آدمی
وہ حادثوں کی شب گئی نہ زندگی کی پو پھٹی
پھر امید کا ملگجا بجا رہا ہے آدمی

لیکن آدمی اور انسان اپنی اس جد و جہد کے باوجود حادثات کا شکار اور زمانے کا زخم خوردہ ہے کہ یہ اس کا مقدر ہے۔ انسان کی اس محرومی کی شکایت تو ہر شاعر نے کسی نہ کسی زاویے سے کی ہے اور اس موضوع نے تاریخ کے ہر دور میں بڑی شاعری کو پیدا کیا ہے۔ قتیل شفائی بھی اس حقیقت کا شدید احساس رکھتے ہیں۔ چنانچہ اپنی ایک نظم "ایک نوحہ" میں انہوں نے اس خیال کو بڑے ہی خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے ؎

شہر وفا کی ایک پرانی گلی میں ہیں
یاروں تنے رنگ رنگ دریچے کھلے ہوئے
دل میں سسک رہی ہے تمنائے بازدید
آنکھوں میں بدلیوں کے ہیں سائے گھلے ہوئے
شاید کسی افق پہ بھی آئیں نہ اب نظر
چاہت کی چاندنی میں وہ چہرے ڈھلے ہوئے
جب آئی ہم کو روندگئی موج حادثات
گویا ہم آدمی نہ ہوئے بلبلے ہوئے

یہ انسان کی زندگی کا شاید سب سے بڑا المیہ ہے کہ اتنی طاقت اور توانائی رکھنے کے باوجود وہ مجبور اور معذور ہے۔ حادثات کو وہ روک نہیں سکتا، تم کے حمل سے وہ دامن نہیں بچا سکتا۔ موت ہر وقت اس کے سامنے کھڑی رہتی ہے اور بالآخر وہ اس کے ہاتھوں زیر بھی ہو جاتا ہے۔ وہ تو دراصل پانی کا بلبلا ہے۔

قتیل شفائی صاحب کی بڑائی اس میں ہے کہ وہ ان حقائق کا شعور رکھنے کے باوجود انسان کو حزن و یاس اور قنوطیت کی تاریکیوں میں نہیں بھٹکنے دیتے بلکہ اس حقیقت کو زندگی کی بنیادی حقیقت سمجھ کر تسلیم کر لیتے ہیں۔ اس خیال سے ایک احساس غم ان کے یہاں ضرور پیدا ہوتا ہے لیکن بجائے مایوس ہونے کے زندگی کو بسر کرنے کی طرف اپنا رجحان ظاہر کرتے ہیں۔ اور جو لمحہ مسرت کا انسان کو مل جائے اس کو غنیمت جانتے ہیں۔ ایک مختصر سی نظم غم دل کی وادیوں میں اسی خیال کو انہوں نے کس خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ کہتے ہیں۔ ؎

غم دل کی وادیوں میں　　　یہ خوشی کے چند لمحے
انہیں جان لو غنیمت　　　کہ یہ کل نہ ہوں گے
ابھی چاند حسرتوں کا　　　لب جاں چمک رہا ہے
ابھی سانس ہے منور　　　ابھی دل دمک رہا ہے
ابھی دھڑکنوں کی آہٹ　　　کوئی گیت گا رہی ہے

ابھی قربتوں کی لذت — ہمیں گدگدا رہی ہے
مگر ایک دن یہ گھڑیاں — یہ حسین پل نہ ہوں گے
انہیں جان لو غنیمت — کہ یہ لمحے کل نہ ہوں گے

بات یہ ہے کہ قتیل اپنے تمام احساس غم کے باوجود زندگی اور اس کی مسرتوں کے شاعر ہیں۔ وہ حسن و جمال کا شدید احساس رکھتے ہیں۔ اس کی تلاش میں وہ سرگرداں پھرتے ہیں۔ وہ مل جائے تو اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ نہ ملے تو اس کو تخلیق کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ بھی ممکن نہ ہو تو اس کے لئے اداس ہو جاتے ہیں اور خیالوں اور یادوں کے سہارے حسین دنیائیں بسا لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی وہ "چھبیل چھبیلی ایک حسینہ" اور "تذبذب" کی ایسی نظموں کی تخلیق کر سکتے ہیں جن میں زندگی کی خوبصورتی کا کیسا شدید احساس اور اس کی مسرتوں سے اپنے سینے کو بھر لینے کی کیسی خواہش ان نظموں میں نظر آتی ہے۔ پہلی نظم کے یہ چند شعر کتنے خوبصورت ہیں ؎

چھبیل چھبیلی ایک حسینہ ہونٹ ہیں جس کے عنابی
ابھی بات کرے وہ مجھ سے چھوٹے جیسے مہتابی
ہرنی جیسی چال ہے اس دل والوں کو پامال کرے
رک جانے تو بڑھ جائے کچھ اور دلوں کی بے تابی
اس کے نین سمندر جیسے گہرے نیلے پُراسرار
کتنی ہو گی اس کے سر کتنے لوگوں کی غرقابی
صحرا صحرا لہرائے ہیں اس کی زلفوں کے بادل
گلشن گلشن چھائی ہے اس کے چہرے کی شادابی
ہیر کا پیار تھرک سا جائے مست چناب کی لہروں پر
یہی وہ مٹیار وہ بانکی نار جو بولے پنجابی

ظاہر ہے کہ ان اشعار میں جو خوبصورتی ہے، وہ شاعر کے احساس کی خوبصورتی بھی ہے، صرف مشاہدے کی خوبصورتی نہیں ہے۔ شاعر کی نگاہ مشاہدہ نے اس خوب صورتی کے احساس کو پیدا کیا ہے، اور یہ احساس بہ ذات خود بھی بے حد خوب صورت ہے۔

اس قبیل کی دوسری نظم جس کی طرف میں نے اشارہ کیا تھا، وہ "تذبذب" ہے۔ اس نظم کا موضوع شاعر کے ذہن کی ایک کشمکش ہے۔ ایک طرف اس کی نگاہ شباب ہے جو ایک مجسمہ حسن و شباب کا نظارہ کرتی ہے اور دوسری طرف شاعر کا یہ احساس کہ یہ حسن و شباب تو موم کا پیکر ہے، چھونے سے اس کے پگھل جانے کا امکان ہے۔ یہ دونوں پہلو اپنے اندر حسن کی دنیائیں رکھتے ہیں۔ قتیل صاحب نے اس کشمکش کو میدان کر جن پہلوؤں کی تصویر کشی کی ہے اس میں حسن کی کتنی دنیائیں آباد ہیں۔

موم کی اک مورتی بیٹھی ہے میرے سامنے — میرے خوابوں کی حرارت میری امیدوں کی آنچ
لمحہ لمحہ بڑھ رہی ہے سوچتا ہوں کیا کروں — دور رہتا ہوں تو میرے مضطرب جذبات پر
اس کی زلفوں کا خنک سایہ نہ پڑنے پائے گا — اور میں نے چھو لیا تو اس کی بانہوں کا گداز

قطرہ قطرہ ہو کے میری گود میں گر جائے گا　　　　رات ڈھلتی جا رہی ہے سوچتا ہوں کیا کروں

یہ نظم کیا ہے مصوری کا ایک شاہکار ہے۔ مختصر لیکن بامعنی، حقیقت کی ترجمان لیکن رمز و ایما سے بھرپور، سنگینی کے احساس کی ترجمان لیکن حسن و شباب کے احساسات سے معمور۔

قتیل صاحب نے اس قسم کی کئی خوب صورت نظموں کی تخلیق کی ہے، اور ان نظموں سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ وہ مشاہدے اور محسوسات کے شاعر ہیں۔ ان کے یہاں حسن کا احساس شدید ہے۔ لذت اور مسرت کے خیالات میں بھی ان کے اِن نمایاں ہیں۔ زندگی اور اس کے مسائل کی سنگینی کا شعور بھی موجود ہے۔ البتہ اس میں کوئی گہری فکر نہیں ہے اور میرے نزدیک ایسے مواقع پر شاعری میں اس کی کوئی خاص ضرورت بھی نہیں۔ شاعری تو مشاہدے اور محسوسات ہی سے حسن کی ایسی بلندیوں کو چھو لیتی ہے جو اس کو زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے۔

دیکھو شفق بکھری ہے افق پر ہلکی ہلکی لال گلابی
سرخوں سے پوچھ کے بتلا
رنگ شفق کا آگ ہے یا اس رات کی ٹھنڈک
جس میں گوندھی جاتی ہے دلہن کی مہندی
وہ مہندی جو آگ نہیں ہے
آگ تو ہے وہ نفرت جس میں جلتے ہیں دل مخبروں کے
چاہت آگ نہیں ہے
تیرے میرے مدھر ملن کی ٹھنڈک آگ نہیں ہے　　(آگ)

زندگی کی شاخ سے ٹوٹا ہوا پتہ ہوں میں
کتنے جھونکے ساتھ ہیں میرے مگر تنہا ہوں میں　　(خشک پتہ)
باغ میں رہ کر بھی خوشبو کے لئے ترسا ہوں میں
زندگی کی شاخ سے ٹوٹا ہوا پتہ ہوں میں

اجنبی لوگو مجھے شاید نہیں تم جانتے
تم نے وہ عالم مرا دیکھا نہیں
جب کہ تا حدِ نظر، زلفوں کا ریشم، عارضوں کے رنگ تھے، بکھرے ہوئے سائے لئے
جب مرا بھرپور ماضی
بے نیاز انہ گذر جاتا رہا ہر کوچہ و بازار سے

(زلف و لب و رخسار سے آگے کی بات)

ان اشعار میں زندگی اور اس کے مختلف پہلوؤں کے ساتھ قرب کا کتنا شدید احساس ملتا ہے اور اس کے بنیادی مسائل کے ساتھ کس درجہ وابستگی نظر آتی ہے۔ قتیل صاحب کے اس رویے نے انہیں زندگی اور اس کے انفرادی اور اجتماعی معاملات کا مزاج داں بنا دیا ہے، اور وہ ان سے اتنی دلچسپی لیتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ ان پر زندگی کے عاشق صادق ہونے کا گمان ہوتا ہے۔

وضعداری قتیل صاحب کی گھٹی میں پڑی ہے۔ ان کی شاعری سے صاف ظاہر ہے کہ وہ جدید ذہن رکھتے ہیں۔ نئے شعور کے مالک ہیں۔ ترقی پسندانہ زاویہ نظر ان کے خیالات کی بنیاد ہے لیکن وہ اظہار و ابلاغ میں روایت سے رشتہ نہیں توڑتے۔ آزاد نظموں تک کی تخلیق میں انھوں نے وضع داری کو برتا ہے اور روایت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ "اردو شاعری میں ایک رجحان نئے پن کی نمائش کا بھی موجود ہے۔ نیا پن صرف یہ نہیں ہوتا کہ ہم تاج محل کو پرانا قرار دے کر گرا دیں اور اس کے سامنے امریکی طرز کی ایک ایسی عمارت کھڑی کر دیں جس کی عجیب و غریب ساخت سے ہم ہونک چونک جائیں۔ نئی سے نئی طرز تعمیر تہذیبی ارتقا کے لئے بہت ضروری ہے لیکن تاج محل کے چاندی سے بنے ہوئے سنگ مرمر کا حسن بھی نئی عمارات میں شامل رہے تو کیا حرج ہے۔ وہ جدیدیت بڑی توانا ہوتی ہے جس کے بدن میں صحت مند روایات کا خون گردش کر رہا ہو۔"

قتیل صاحب کی شاعری میں فنی اعتبار سے جدت پسندی کے باوجود روایت کا یہ خون گردش کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اسی وجہ سے اس میں رنگینی اور پرکاری کے ساتھ وہ توانائی نظر آتی ہے جو حسن و شباب کے امتزاج سے مناسبت اور مشابہت رکھتی ہے۔

قتیل شفائی کی شاعری میٹھے جذبات اور رسیلی نغمگی کے امتزاج کا عمدہ نمونہ ہے۔ انہوں نے ہماری فلمی شاعری کو شعریت سے روشناس کیا ہے۔ اُن کے گیت بے ساختگی اور شگفتگی کا رنگ لئے ہوئے ہیں۔

——— سعادت سعید

زمینی پھیلاؤ کا شاعر

انتظار حسین۔ لاہور

"ان نظموں کا لہجہ اور موضوعات خلائی نہیں ہیں بلکہ ان کا تعلق زمین پر پھیلی ہوئی رنگا رنگ زندگی ہی سے ہے اور یہ نظمیں انہی انسانوں کے لئے لکھی گئی ہیں جو ان نظموں کے کردار بھی ہیں، اور قاری بھی، اور جو خلا میں نہیں زمین پر بستے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ زمین پر بسنے والوں سے غیر زمینی لہجہ میں بات کرنا بہت بڑی بے انصافی ہے اگر زمین سے ہمارا ناطہ ابھی تک ٹوٹا نہیں تو ہمیں اس کی مٹی کے مزاج سے آنکھیں نہیں پھیرنا چاہئیں۔"

یہ اس مجموعہ کے مصنف قتیل شفائی کا اپنا بیان ہے اور اب ان کی ایک چھوٹی سی نظم "پلاسٹر کے بعد" ملاحظہ کیجئے

کیسی اب سورج کی شعاعیں
کیسی پیڑ کی چھاؤں
دیکھوں صرف جھروکے سے میں
چلتا پھرتا گاؤں
مجھ میں اور دھرتی میں حائل
پتھر جیسا پاؤں

اس سے یہ ظاہر ہوگا کہ شاعر نے جو بیان دیا ہے وہ محض ایک دعویٰ نہیں۔ یہ نظمیں سیدھے سچے زمینی لہجہ میں ہیں۔ زمین پر پھیلی ہوئی رنگا رنگ زندگی ان نظموں میں بکھری ہوئی نظر آتی ہے۔ شاعر اسی سیدھی سچی روزمرہ زندگی میں سفر کرتے ہوئے ایک بصیرت حاصل کرتا نظر آتا ہے۔ اس زندگی کی مختلف صورتیں حقیقت نگارانہ انداز میں سیدھے اسلوب میں اس طرح بیان ہوتی ہیں کہ انسانی زندگی کا ایک گوشہ تصویر بن کر ہماری نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔ یہ تصویریں آدمی کے دکھ سکھ کو مسرتوں کو اور محرومیوں کو اجاگر کرتی ہیں۔ اور انسانی زندگی کی ایک بامعنی تعبیر پیش کرتی ہیں۔ مثلاً ایک نظم "آم کے پیڑ" یوں شروع ہوتی ہے :۔

اس کوٹھی کے باغیچے میں
کچھ پیڑ لگے تھے آموں کے
جب پہلے پہل ان پیڑوں کو مل جُل کر ہم نے سینچا تھا
اک ٹھنڈی میٹھی راحت کا احساس ہُوا تھا دونوں کو

یہ آغاز تھا اور انجام یہ ہے ؎

اس کوٹھی کے باغیچے میں
پیڑوں سے لگے تھے آم مگر
افسوس کہ ایک بھی دانے پر لکھا ہُوا میرا نام نہیں

یہ اس قسم کی نظم ہے جسے آپ مختصر افسانہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس مجموعے میں ایسی نظمیں اور بھی نظر آئیں گی کہ نظمیں بھی ہیں اور مختصر افسانہ بھی! قتیل شفائی اس سے پہلے ہماری شاعری میں ایک گیت لکھنے والے شاعر کی حیثیت سے ممتاز رہے ہیں۔ ان کے گیت اردو شاعری میں ان کی انفرادیت کا اعلان ہیں۔ پھر انھوں نے غزل گو کی حیثیت سے بھی اپنی انفرادیت کا سکہ منوایا ہے۔ یہ نظمیں نظم کے میدان میں ان کے الگ اسلوب کا پتہ دے رہی ہیں۔ گیت اور غزل میں انھوں نے اظہار کے جو مراحل طے کئے ہیں وہ ان نظموں کو کمک پہنچا رہے ہیں۔ بلکہ یہ نظمیں ایک طرح سے دیکھیے تو رنگا رنگ زندگی کا گیت ہیں۔

میں نے [illegible] لکھا ہے [illegible] میں قتیل کو [illegible] کا شاعر کہا ہے۔ میری اب بھی ان کے بارے میں یہی رائے ہے۔
——— رحیم گل

روشنی کا قبولِ عام

محمد علی صدیقی کراچی

قتیل شفائی کے بارے میں ایک بات بہت وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ وہ ایک شاعر ہیں اور اگر شاعر نہیں تو کچھ بھی نہیں، دوسری بات یہ کہ ہمارے ادب پر پچھلے دس بارہ سال "ناشاعر" حضرات کی یورش رہی ہے ان لوگوں نے نئی زبان، نئی لسانیات اور مانوس موسیقی کیخلاف بہت کچھ کہا۔ میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ، فراقؔ، فیضؔ اور قاسمیؔ کی ادبی اہمیت کے سلسلے میں ایسے ایسے حملے پیش کئے کہ بس الاماں والحفیظ۔ لیکن اب دھند چھٹ رہی ہے اور شعری انتقادیات کی باگ ڈور پھر سے ان لوگوں کے پاس آرہی ہے۔ جو شاعری کو ذاتی یا گروہی تعصبات کی عینک سے دیکھنا نہیں چاہتے۔ وہ شعر کو شعر اور نثر کو نثر کے پیمانوں سے ناپنا چاہتے ہیں اور بوقتِ موازنہ وانتقاد ان ہر دو کے لئے روایت کے تخلیقی ارتقا اور اس کے انمٹ حصہ کی گرہ اپنے ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہتے۔

قتیل شفائی پر اب تک فراقؔ، فیض احمد فیضؔ اور قاسمیؔ کی تحریریں سامنے ہیں۔ ان سب حضرات کا احترام کرتا ہوں لیکن اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ ہمارے بزرگ شعراء اور نقاد اپنے کم عمر ہم عصروں کے بارے میں ہمت افزا جملے لکھ جاتے ہیں اور بعض اوقات یہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔ کم عمر ہم عصر اگر پُرنم آنکھوں سے ہمہ سوال ہو تو پھر بزرگ کچھ نہ کچھ لکھ دیا کرتے ہیں۔ لیکن بہت سے حضرات اپنے حقیقی قارئین کے سامنے اپنی پُرنم اور التجا کا ذکر نہیں کرتے اور دوسروں پر ان آراء کو تھوپنا چاہتے ہیں تو اس وقت یہ خیال آتا ہے کہ بزرگوں سے اپیل کی جائے کہ خدارا آپ نوجوانوں کا خیال کریں جو اپنا مستقبل سنوارنے کی فکر میں ہیں اور اس لئے وہ آپ جیسی سخاوت کے متحمل نہیں ہوسکتے۔

لیکن ہمارے بزرگوں نے قتیل شفائی کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ درست لکھا ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ روایتی شاعری کے دائرہ کار میں نغمگی اور وضعداری کے ساتھ ساتھ قتیل شفائی نے تقسیم برصغیر سے قبل ہی بہت سے اہل نظر کو اپنی طرف متوجہ کرلیا تھا۔ اب تک ان کے آٹھ شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں، اور شاعری کی دنیا کے لئے یہ ایک ایسے شاعر کا گرانقدر تحفہ ہے جو کبر ونخوت سے بہت دور رہ کر اپنی روشنی طبع کے مطابق شعر کہتا ہے اور عوامی مقبولیت کماتا ہے۔ قتیل عوامی شاعر ہے۔ عوام کی زبان میں لکھتا ہے۔ اس کے یہاں حسن وعشق کی واردات

کو ایک مؤثر کن پیرایۂ اظہار مل گیا ہے۔

زیر تبصرہ مجموعہ میں مختلف مسائل اور واقعات پر ۶۰ نظمیں ہیں۔ شخصی، ملکی اور بین الاقوامی — اور معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اپنی کہی میں براہ راست ہے اور از دل خیزد و بر دل ریزد کے مصداق بہت سرعت کے ساتھ قاری کے ذہن میں اتر جاتا ہے۔ لیکن کچھ قارئین شاعری کے باب میں طے شدہ تعصبات رکھتے ہیں اور وہ اگر قتیل شفائی میں بہت کچھ نہ پا سکیں تو در اصل اس کا سبب ان کی مخصوص ذہنی اپج ہے۔

"چھتنار" ایک ممتاز شاعر کا قابلِ توجہ مجموعہ ہے اور قتیل شفائی قابلِ مبارکباد ہیں کہ وہ زمانہ کی پیہم رستخیز کے باوجود اپنے سینے میں ایک دردمند دل اور وسیع ہمدردیوں کا تناظر رکھتے ہیں۔

قتیل شفائی کی شاعری انسان کے دل و دماغ پر نرم و کومل پھوار کی طرح برستی ہے اور انسان کے سارے وجود کو بھگو کر رکھ دیتی ہے۔ قتیل کے اشعار صرف گنگنانے ہی کے لئے نہیں ہیں بلکہ ان کے تہ در تہ معانی دلوں کو گرمانے کی خاصیت بھی رکھتے ہیں۔

——● تاج سعید

غریبوں کا امیر دوست

قمر ہاشمی، کراچی

قتیل شفائی بلاشبہ اردو کے بڑے شاعر ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ بڑے شریف النفس انسان بھی ہیں۔ انھوں نے انسانی عظمت کے ترانے ہمیشہ خون دل میں انگلیاں ڈبو کر لکھے ہیں اور اپنے دردمند سینے پر انسانی دکھ درد بھی سمیٹے ہیں جن کا کسک۔ وہ مرفہ الحالی کی زندگی گزارنے کے باوجود محسوس کرتے ہیں اور نظریاتی اعتبار سے ہمیشہ ترقی پسند اور ذہنی چابک دستی کے معاملہ میں ہمیشہ جوان و مشاق شاعر ہیں۔

چھتنار۔ قتیل شفائی کی دلکش نظموں کا تازہ ترین مجموعہ ہے۔ جسے مکتبہ عالیہ لاہور نے بڑی آب و تاب کے ساتھ شائع کیا ہے۔

مندرجہ بالا تاثرات کے تحت میں اس مجموعے کی نظم "بلڈ بنک" قارئین کی دعوت نظر کے لئے پیش ہے۔

مرا خون جتنی بھی مقدار میں چاہیئے آپ لے لیں
مرا خون۔ جس میں سموئی ہوئی وہ حرارت ہے
جس نے ہمیشہ توانائی بخشی ہے انسانیت کو
مرا خون میرے بدن میں اسی واسطے آج بھی گردش کر رہا ہے
کہ میں اپنے اجداد کی یہ امانت
کسی ایسے انسان کے جسم میں منتقل کر انڈیلوں
جو اس خون کو نسل در نسل آگے بڑھائے
ابد تک ہر انسان میری طرح مسکرائے
مرے خون کا اس سے بہتر تو کوئی بھی مصرف نہیں ہے
مرا خون جتنی بھی مقدار میں چاہئے آپ لے لیں

زیرِ نظر مجموعہ نفیس شفائی کا آٹھواں شعری کارنامہ ہے جو ان کی خیال آفرینیوں سے دمک رہا ہے۔ وہ شعری تخلیقات کے معاملے میں جتنے سنجیدہ ہیں اس کا اندازہ آپ اس تعداد سے کر سکتے ہیں کہ انھیں شاعری سے کس درجہ شغف ہے۔ اس تسلسل نے ان کے ہاں جو متنوع آفرینی و اثر انگیزی کے حیات افروز عنصر کو ابھارا ہے وہ ان کی ترقی پسند تحریک سے وابستگی کی واضح علامت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نفیس نے اپنی شاعری کا رشتہ بزدل شعرا کی طرح ابہام سے نہیں جوڑا، بلکہ اردو شاعری کی صحت مند روایات اور اظہار کے مانوس پیرایوں سے قائم رکھا۔ نفیس شفائی کی غزلیں بھی ان کی نظموں اور خود ان کی دل آویز شخصیت کی طرح پُرکشش ہوتی ہیں۔ یہ غزلیں صرف مشاعروں کی مقبولیت ہی سے پسند نہیں کی جاتیں بلکہ ازلی و ابدیت بھی رکھتی ہیں۔ انھوں نے اپنے رومانوی تخیل اور جدید شاعرانہ مقاصد کے تحت حال اور مستقبل کے انسانی خوابوں کی ایسی رنگ آمیزی کی ہے جو چلتے پھرتے انسانوں کے جذبوں کی عکاسی ہے۔ انھوں نے خود بھی 'حقیقت' کے آغاز میں 'مختصر سی دو باتیں' میں کہا ہے کہ "ان نظموں کا لہجہ اور موضوعات خلائی نہیں ہیں بلکہ ان کا تعلق زمین پر پھیلی ہوئی رنگا رنگ زندگی ہی سے ہے اور یہ نظمیں انھی انسانوں کے لئے کہی گئی ہیں جو ان نظموں کے کردار بھی ہیں اور قاری بھی۔"

اس مجموعے کی تقریباً سب نظمیں حال کی کیف بدوش اور متنوع رنگوں کی آئینہ دار ہیں۔ ان رنگوں میں شوخ بھی ہیں، ہلکے بھی۔ جن نظموں کا انداز طنزیہ ہے وہ بھی اپنی تلخی کے باوجود قاری کے ذہن پر ایسا اثر چھوڑتی ہیں جس سے شاعر کی فنی عظمت کا بخوبی احساس ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر 'محترمہ'، 'خشک پتے'، 'مسیحا خون مہنگی شراب'، 'سبحان اللہ'، 'پلاسٹر کے بعد'۔ موخر الذکر نظم اپنے ہی زخمی ہو کر معذور ہو جانے کے بعد کہی گئی ہے جس میں پلاسٹر بندھے پاؤں کو کائنات کی نیرنگیوں اور اپنے درمیان حائل بتا کر اپنی بے بسی کا بڑے منفرد انداز کے ساتھ اظہار کیا ہے۔

نظم 'رخصتی' روایتی طرزِ ادا کے باوجود اپنا بھرپور تاثر قائم کرتی ہے۔ 'غمِ دل کی وادیوں میں' بھی اسی قبیل کی نظم ہے جس میں زندگی کے ولولے اور قربتوں کی آنچ حساس اور گداز دل کے تاروں کو چھیڑ چھاڑ کر انجانی کسک میں تبدیل ہو جانے والی محرومی سے جا ملتی ہے اور وقت کی بوجھل فضا کی نشاندہی کے علاوہ غم آگیں سپردگی کا بے ساختہ اظہار بھی ہے

نفیس بڑے اچھے شاعر اور زندگی کو اس کے صحیح خد و خال میں پیش کرنے والے بڑے فن کار ہیں جن کے دستِ فن تراش سے شاعری اور بساطِ زیست دونوں ہی کو گراں قدر فائدے پہنچ رہے ہیں۔۔۔!

نفیس شفائی ہمارے ان لکھنے والوں میں سے ہیں جنھوں نے ادب کو زندگی بنایا ہے۔ ان کے یہاں وقتی کی چیز نہیں۔ وہ ہیئت پرست بھی نہیں ہیں۔ اپنا ایک فلسفۂ زندگی اور اندازِ نظر رکھتے ہیں جس کی بنیاد انسان دوستی پر ہے۔ اس باب میں ان کا ثبات قابلِ داد ہے۔

——— ابنِ انشا

دیدۂ بینا کی حسّاسیت

محشر بدایونی

قتیل شفائی دنیائے شعر و ادب کی مقبول و معروف شخصیت ہیں۔ فکر و فن کے ارتقاء میں ان کا بڑا حصہ ہے! اور انھوں نے شاعری کی جن اصناف میں اپنی جودت طبع کے کمالات دکھائے ہیں انھیں خاصی توانائی بخشی ہے۔ قتیل کے گیتوں میں تاثیر بھی ہے نغمگی بھی اور رسیلا پن بھی۔ ان کی غزلوں میں روایت و جدت کا حسین امتزاج ہے اور اسلوب لہجہ اور بیان کا انداز ان کا اپنا ہے۔ ان کی خدمات کا سرمایہ اتنا زیادہ ہے اور انھوں نے ادب کو اتنا کچھ دیا ہے کہ تاریخ ادب ان کو فراموش نہیں کر سکتی۔

چھتنار ان کی نظموں کا مجموعہ ہے اور اس صنف میں بھی ان کی شخصیت نمایاں خصوصیات کی حامل ہے۔ اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے جناب قدرت اللہ شہاب نے لکھا ہے۔۔

"غزل اور گیت میں آبشاروں کا ترنم اور ندیوں کا بہاؤ سمو دینے والا یہ شاعر اب اپنی نظموں میں سمندروں کی وسعتیں اور گھنے جنگلوں کے سائے رچا کر "چھتنار" پیش کر رہا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ مجموعہ بھی قتیل شفائی کے انفرادی رنگ اور خصوصیات کا بڑا دل نواز مرقع ہے۔"

انسان چاہے کتنی بلندیوں پر اڑے فضاء خلا میں پرواز کرے لیکن زمین سے اس کا رشتہ ہمیشہ مضبوط و استوار رہے۔ زمین انسانوں کی آبادی کی عرصہ گاہ ہے ہر گوشے میں زندگی کے گوناگوں رنگ ہیں ایک فن کار انھیں رنگوں کو اپنے خیالوں میں سمیٹتا اور لفظ و معنی کا پیرہن دیتا ہے۔ قتیل شفائی کے اس مجموعے کی تمام نظمیں اس پہلو کی عکاس ہیں۔ اپنے مجموعے کے بارے میں انھوں نے اپنے خیالات کی ترجمانی اس طرح کی ہے۔

"چھتنار" میری نظموں کا مجموعہ ہے ان نظموں کا لہجہ اور موضوعات خلائی نہیں ہیں بلکہ ان کا تعلق زمین پر پھیلی ہوئی رنگا رنگ زندگی ہی سے ہے اور یہ نظمیں انہی انسانوں کے لئے لکھی گئی ہیں جو ان نظموں کے کردار بھی ہیں اور قاری بھی۔ اور جو خلاء میں نہیں زمین پر بستے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ زمین پر بسنے والوں سے غیر زمینی لہجے میں بات کرنا بہت بڑی ناانصافی ہے۔ اگر زمین سے ہمارا ناطہ ابھی تک ٹوٹا نہیں تو ہمیں اس کی مٹی کے مزاج سے آنکھیں نہیں پھیرنی چاہئیں۔

انھوں نے نظموں کے ذریعہ زندگی کے چہرے کی نقاب کشائی کر کے اس کے نئے نئے رخ دکھائے ہیں اور انسان کے جذبۂ عمل اور قوت تسخیر کا

ہے

مشاہدہ کرایا ہے۔ فرماتے ہیں:

وہاں وہاں سے آندھیوں نے اپنے رخ بدل دیئے
جہاں جہاں کوئی دیا جلا رہا ہے آدمی

شاعر کا احساس بھی دیدہ بینا کا کام کرتا ہے اور لمحوں کے دل کی دھڑکن کو تصویر بنا لیتا ہے۔ ایسی خوبی کا اظہار قتیل کی نظموں میں بڑے حسن اور صداقت سے ہوتا ہے نظم "ہواؤں کی سرگوشیاں" کا ایک حصہ ملاحظہ ہو:

میں گھبرا گیا ہوں
ہواؤں کی سرگوشیاں سنتے سنتے
اگر جمع کر پاؤں میں ان دلآویز سرگوشیوں کو
تو مجھ میں سمٹ آئے شورِ قیامت
جسے بعد از مرگ ہونا ہے برپا
مگر ہو چکا ہے جو برپا میری زندگی میں
یہی گر میری زندگی ہے تو میں سوچتا ہوں
کہ میں مر چکا ہوں
ہواؤں کی سرگوشیاں سنتے سنتے

ان کی نظم "پلاسٹر کے بعد" چھ سطروں کی نظم ہے، لیکن کتنے بھرپور تاثر کی حامل ہے:۔

کیسی اب سورج کی شعاعیں
کیسی پیڑ کی چھاؤں
دیکھوں صرف جھروکے سے میں
چلتا پھرتا گاؤں
مجھ میں اور دھرتی میں حائل
پتھر جیسا پاؤں

یہ چند نقوش ان کی اس کتاب کے مجموعی تاثر کو ظاہر کرنے کے لئے کافی ہیں۔

چھتنار سے قبل قتیل شفائی صاحب کے جو شعری مجموعے شائع ہوئے وہ ہمارے ادب کا گراں قدر سرمایہ ہیں۔ ہریالی، گجر، روزن، جھومر، جلترنگ، مطربہ اور گفتگو ان کی وہ تخلیقات ہیں۔ جن کی عظمت کو ناقدین نے تسلیم کیا۔ اور اہلِ ذوق میں جن کی بے حد پذیرائی ہوئی "چھتنار" میں ان کی نظم "شاعری سچ بولتی ہے" خود ان کی تخلیقاتِ شعری پر صادق آتی ہے:۔ لاکھ پردوں میں رہوں بھید مرے کھولتی ہے ، شاعری سچ بولتی ہے
میں نے دیکھا کہ جب میری زبان ڈولتی ہے ، شاعری سچ بولتی ہے

گھنے جنگلوں سے دُور

اظہر قادری کراچی

"چھتنار" سے قبل قتیل شفائی کی نظموں، غزلوں، اور گیتوں کے سات مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ شاعر کی حیثیت سے قتیل شفائی اب شہرت کی ان منزلوں میں ہیں جہاں اُنھیں کسی خاص تعارف کی ضرورت نہیں۔ اُنھوں نے اپنی غزلوں اور نظموں کے ذریعہ سے جدید اُردو شاعری کے لہجے اور تیور کو متعین کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کا شمار ان چند باشعور شعراء میں ہوتا ہے۔ جنہوں نے صحت مند روایات کو گالی دینے کے بجائے ان سے اکتساب فیض کر کے حال اور مستقبل کو سنوارنے میں اپنا خونِ جگر صرف کیا ہے۔ روایات سے کسب، کیا ہوا جمال ان کی فکر جدید کے رخ پر وہ غازہ ہے جس سے ان کی شاعری کا رنگ، روپ قائم ہے وہ ترقی پسند ہیں اور فکر کی بلند پروازی کے باوصف زمین سے اپنا رشتہ قائم رکھنے کے قائل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے موضوعات اور کردار خلائی نہیں بلکہ زمینی ہیں۔ ان کی نظمیں بقول ان کے" انہی انسانوں کے لئے لکھی گئی ہیں جو ان نظموں کے کردار بھی ہیں اور قاری بھی اور جو خلا میں نہیں زمین پر بستے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ زمین پر بسنے والوں سے غیر زمینی لہجے میں بات کرنا بڑی بے انصافی ہے اگر زمین سے ہمارا ناطہ ابھی تک ٹوٹا نہیں تو ہمیں اس کی مٹی کے مزاج سے آنکھیں نہیں پھیرنا چاہئیں" ابلاغ کے مسئلے میں بھی قتیل شفائی کا ذہن صاف اور واضح ہے۔ وہ صاف ستھرے لہجے کے قائل ہیں۔ وہ قاری کو ابہام کے گھنے جنگلوں میں بھٹکانے اور گمراہ کرنے کے بجائے اسلوب کی پر بہار وادیوں کی سیر کراتے ہیں۔

زیر نظر مجموعہ، چھتنار، قتیل شفائی کے ترقی پسند شعور اور نظریاتی صفائی کا بڑا روشن ثبوت ہے۔ اس میں مختلف موضوعات پر نظمیں ہیں۔ موضوع کے لحاظ سے لہجے اور اسلوب، کا انتخاب قتیل کی شاعرانہ سلیقہ مندی پر دال ہے۔ "آخر شب کا نقارہ" "ویٹ نام" "بلڈ بینک" "سامراج" اور "نئی تقویم" چھتنار کی بڑی جاندار نظمیں ہیں۔

"نئی تقویم" کا آخری بند۔ یقین و عزم کا بڑا ولولہ انگیز اظہار ہے۔

یہ نو عمر پل، یہ جواں سال گھڑیاں ۔۔۔۔ یہ بوڑھے۔ پہر حسب دستور ہونگے
مگر ہم رہیں گے نہ پابند ان کے ۔۔۔۔ یہی اپنی طاعت پہ مجبور ہونگے
عناں وقت کی اپنے ہاتھوں میں ہوگی ۔۔۔۔ ہم اپنے تہور پہ مغرور ہونگے

وہی ضابطے ہوں گے تقویم کے اب　　　جو اِس دور میں ہم کو منظور ہوں گے

چھتنار" جدید اُردو شاعری میں ایک گراں قدر اضافہ ہے جس کا مطالعہ عام قاری کے علاوہ ادب کے طلباء کے لئے بھی فائدہ سے خالی نہیں!

قتیل ——————

فلمی شاعری کو عزت دینے والا جس کے گیت اس لیے BAN ہو گئے کہ ان میں "ہندی" الفاظ تھے۔ جس کا ایک شعر مجھے بہت دیر ہوئی اچھا لگا اور آج بھی یاد ہے۔

اس بازار کا جو کوٹھا ہے اس کی ریت نرالی ہے
یہاں تو ماں کو ماں کہہ دینا سب سے گندی گالی ہے

—————● دلدار پرویز بھٹی

تیرا قلم لہو رقم

عزیز اثری، لاہور

"ہریالی" سے "چھتنار" تک کا سفر اکیلے قتیل شفائی کا سفر نہیں بلکہ یہ ہماری اردو شاعری اور اس کی پوری روایات کا انوکھا، پرپیچ اور ارتقائی سفر ہے۔ فنی ارتقا کے زینے اتنے صاف ستھرے اور ہم سطح نہیں ہوتے کہ ان پر پاؤں دھرا اور اٹھتے چلے گئے، ان پر قدم رکھنے جمانے اور اوپر اٹھانے کے لئے بار بار خونِ جگر کے چھینٹے دینا پڑتے ہیں۔ اور گزشتہ کچھ عرصے میں جب کہ بڑے بڑوں کا پتہ پانی ہو گیا ہے۔ قتیل بڑی بے جگری اور ثابت قدمی کے ساتھ آگے بڑھتا اور اوپر اٹھتا رہا ہے۔ "چھتنار" اس کی فنی رفعت، نظر کی وسعت اور فکر کی گہرائی کا دلنواز اور منہ بولتا ثبوت ہے۔

قتیل نے اپنی زندگی اور شاعری دونوں میں ایک ساتھ اور مسلسل ریاضت شروع کی تھی۔ اسی دو طرفہ ریاضت کے طفیل زندگی کے کسی حصے میں نہ تو الفاظ کی شعبدہ بازی ہی دکھائی ہے اور نہ اسے سوداگری کا وسیلہ ہی بنایا ہے، بے شک اُس نے آسائشیں بھی پائی ہیں، لیکن ان آسائشوں کے ہجوم میں یا ان کی خاطر کسی مصلحت کی دہلیز پر اپنے فن کی ناک نہیں رگڑی۔ اُس نے جوانی بلکہ نوجوانی ہی کے عالم میں زخم کھائے اور خوب خوب کھائے، پھر جب ان زخموں پر وقت نے مرہم رکھا تو اُسے یہ عمل اندمال پسند نہیں آیا۔ اُس نے بارہا ان زخموں کو کریدا اور ان کے رستے ہوئے لہو کو نوکِ قلم سے ٹپکا ٹپکا دیا، کہ وہ زندہ رہ سکے اور شعر کہہ سکے۔

احساس کے شعلوں میں ہر آن جلتا ہوا شاعر جب ادراک کی سرحد میں داخل ہوتا ہے تو اس سرزمین میں بہت آگے نکل جاتا ہے۔ قتیل کے اندر سسکتا ہوا آدمی باہر کے اَن گنت پھٹے حال انسانوں سے گلے ملتا ہے تو وہ کہہ اٹھتا ہے ؎

مارے گا شب خون کبھی تو اندھیاروں پر اجیارا
بول مغنی کب گونجے گا آخرِ شب کا نقارا

اندھیاروں پر شب خون مارنے کی لگن اور تمنا قتیل کو اتفاقی یا معجزاتی طور پر ودیعت نہیں ہوئی۔ بلکہ یہ سب کچھ اس کے اس آدرش کی روح ہے جو اُس نے اپنے جذبہ و فکر کی مکمل ہم آہنگی سے حاصل کیا ہے۔

قتیل انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام اور ادبی تاریخ کی اس سب سے بڑی تحریک میں شروع ہی سے بدل و جان شریک رہا۔ اس وادیٔ پرخار میں آبلہ پائی کرتے ہوئے اس نے کئی چیزوں کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور پھر جب آج وقت کی گردنے ان میں سے بعض چیزوں کے نقوش دھندلا دیئے تھے قتیل کے نظریۂ فن میں کوئی تغیر رونما نہیں ہوا۔ دھندلے یا مسخ ہونے والے ایک ایسے ہی چہرے کو دیکھ کر اس کا قلم شکن قلم پکارتا ہے ؎

آج کہ ہیں نو دولتیوں کے پانچ سواروں میں شامل
چودھری صاحب سوشلزم کے سخت مخالف ہیں
اور پانچوں وقت مصلے پہ لاکھوں کی باتیں کرتے ہیں!

قتیل نے پچھلی چوتھائی صدی کے پُر آشوب اور تخلیق کش دور میں بھی، جہاں چاروں طرف سے ترغیبات اور الائشوں کی یلغار تھی، اپنے فنکارانہ صداقت کو محفوظ اور قائم رکھا ہے۔ وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی ادب کے ترقی پسندانہ نظریۂ حیات کو سینے سے لگائے ہوئے ہے۔ اسی کے طفیل اس کا بیدار شعور جب اسے دورِ حاضر کا آئینہ دکھاتا ہے تو وہ ضمیر کا نوحہ لکھے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اللہ کو پیارا ہونے والا یہی ضمیر ؎

کچھ ایسے نارروا اپاہجوں کے پیٹ بھر گیا
کہ جن کے کاسۂ ہنر کی دھوم دور دور ہے

قتیل کے سینے پر جیسے جیسے زخموں کے تمغے سجتے گئے، جیسے جیسے معاشرے میں خیر و شر کی آویزش شدید اور ظالم اور مظلوم کے درمیان ٹکر نمایاں ہوتی گئی ویسے ویسے قتیل کا جرمِ صداقت بڑھتا اور اس کا نشترِ طنز تیز سے تیز تر ہوتا گیا ہے۔
نظم "سُبحان اللہ"، "ضمیر" اور "یہی کہانی" اسی گہرے اور تیکھے طنز کی مثالیں ہیں؛

قتیل کا بیدار تاریخی شعور "سامراج" کو "زندگی کا غلیظ دشمن" قرار دے کر اُسے اذنِ فنا دیتا ہے۔ اور دوسری طرف ویٹ نام کے جیالے مجاہدوں کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین ادا کرتا ہے ؎

ظلم سے وہ کب ڈرتے ہیں
ظالم سے کب ہرتے ہیں
بستے ہیں جن کے ذہنوں میں
لینن، ماؤ، ہوچی منہ

قتیل نے نہ تو کبھی اپنے جذبۂ دل کی آنچ مدھم ہونے دی ہے اور نہ کبھی فکر و نظر کے چراغ ہی بجھنے دیئے ہیں۔ وہ "سناٹا" میں اپنی بیٹی کی سماعت سے دائمی محرومی پر اپنی روح کا صاعقہ کرب اور بے بسی کے آنسو کاغذ پر بکھیر کر ایک حسین نظم کو جنم دیتا ہے۔ دوسری طرف اپنے وطنِ عزیز میں ہونے والے ناٹک کا یہ منظر دکھاتا ہے ؎

ہائے کیسا اپنا دیس ہے کہ جہاں
خون سستا، شراب مہنگی ہے

اور پھر اسی دیس کے باسیوں کو جو اُن کی "بہبود اور دفاع" کی خاطر یہ مشورہ دیتا ہے ؎

کاغذ کا یہ لبادہ سہی

پہ سینے سے سارے لوگو!

بہتے ہو تو اپنے تن لبادے سے ڈھانپو

کاغذ کے اس دور میں جینے کا اک ڈھنگ یہی ہے

پیشِ نظر ... کی نظمیں پڑھتے ہوئے جیسے جیسے میں آگے بڑھتا ہوں مجھے محسوس ہوا ہے کہ قتیل کا سفرِ ملال، اور ان میں کافی دور اور ادراک تک چلا گیا ہے۔ اس کے احساس کے الاؤ میں سے فکر و شعور کا ایک نیا اور البیلا نور پھوٹنے لگا ہے اس کا علم خود قتیل کو بھی ہے ۔

؎ میرے احساس کے ہاتھوں پہ ہے رعشہ طاری

حسنِ معنی میرے اعصاب پہ چھایا جب سے

اور ...... ـــــــ

؎ وسعتِ ارض پہ اک تشنہ لبی سی ہے

مصرفِ خونِ جگر پوچھ رہا ہوں جب سے

آج میں یہ کہنے کی جسارت کرتا ہوں کہ قتیل کا تیشہ اب زیادہ دیر تک بے ضرب نہیں رہے گا۔ اس کا فن بعد اُسی انسان کی تحسین کرے گا جو خود اُس کے انا کا میں نسل در نسل اسے آگے بڑھاتا رہا۔ اور یہی شخص وہ کوہ کن ہو گا جس کا تیشہ ریزہ سنگ پہاڑوں کا سینہ چیرے گا۔ جو اپنا سر پھوڑنے کی بجائے غاصبوں کا پیٹ مروڑ کر اپنی مسرتوں کی شیرینی کو چھین لے گا ــــ اور ٹھیک اسی لمحے آخرِ شب کا نقارہ گونجے گا، اور ــــ قتیل کے شعروں کی طرح حسین، ہنستی کلیاں، مسکراتی ہوئی صبح طلوع ہو گی ــــ پھر کبھی غروب نہ ہونے کے لئے :

ہنر میں یکتا

ذوالفقار احمد تابش لاہور

شاعری چاہے علامتی ہو، چاہے ہلکی پھلکی، لیکن دیکھا یہ جاتا ہے کہ وہ ماورائی تو نہیں ہے۔ کیونکہ شاعری تو محض ایک پیرایہ اظہار ہے۔ اس میں بیان تو وہی ملتا ہے جس کا صریحاً تعلق انسانوں اور ان کے احساسات سے ہوتا ہے۔ قتیل شفائی غزل، گیت اور نظم کے ایک یکتا اسلوب شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں خیالات کی نفاست کے ساتھ ساتھ فن کی بلندیاں بھی ہیں۔ لیکن شاعری کی جڑیں اسی زمین میں پیوستہ رہتی ہیں کہ جس پر انسانوں کا اژدہام انسانوں کے انسانوں سے رشتے ناطے ہیں، یہی وجہ ہے کہ قتیل صاحب اپنی شاعری میں اظہار و ابلاغ کو شعوری اور لاشعوری طور پر اولیت دیتے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب "چھتنار" میں ان کی اکثر نظمیں ابلاغ ہی کے وسیلے سے گیتوں کے قریب ہو جاتی ہیں۔ اور اس طرح نظم اور گیت کے ملاپ سے ایک نیا آہنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ جس سے ترنم میں بھی مزید صوتی حسن انگڑائی لینے لگتا ہے۔

نظم کے اس عصری بہاؤ میں قتیل شفائی نے اس مجموعے کی نظموں کو دانستہ علامتی ثقالتوں یا مبہم اشاروں میں نہیں۔ انھوں نے اپنی سوچ کو شاعرانہ رعنائیوں کے ساتھ منظوم کر دیا ہے۔ شاید قتیل شفائی سمجھتے ہیں کہ شاعری بھی اگر فریضۂ ابلاغ و اظہار ادا کرے تو وہ بھی ثواب کے زمرے میں آجاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے ایک عزیز دوست کی وفات پر فرماتے ہیں کہ : ؎

یا رب سزا نہ دینا روزِ حساب اس کو
اپنی غزل کا میں نے بخشا ثواب اس کو

قتیل شفائی کی "چھتنار" میں شامل اکثر نظمیں واضح طور پر اپنے اندر تعمیر اور رجائیت کا جذبہ لئے ہوئے ہیں۔ مثلاً اس کا پرتو تو پہلی ہی نظم "آدمی" میں ملنے لگتا ہے کہ :

وہاں وہاں سے آندھیوں نے اپنے رُخ بدل دیئے
جہاں جہاں کوئی دیا جلا رہا ہے آدمی

قتیل شفائی نے اسی مجموعے کی نظموں میں انسانی مجبوریوں اور ہوس کاریوں کو بھی اُجاگر کیا ہے بلکہ اکثر مقامات پر زندگی کی حقیقتوں کو مجسم کر دکھایا ہے۔ وہ ایک نظموں میں انسانی فطرت پر چوٹ بھی کی ہے۔ کہ اس میں گوری کے جسم کا ایک ایک انگ تقسیم ہو جاتا ہے۔ صرف دل رہ جاتا ہے جسے شاعر کہتا ہے کہ :

اس کا سائن مجھے سمجھ لے
اس کا سائن میں ہوں چاہے صرف وہ تیرا دل ہے
دل جو کسی نے آج تلک مجھ سے نہیں مانگا
دل جو دھڑکنا بھول چکا ہے
شاید تیرا دل دھڑکے میرے سینے میں

شاعر اپنے آپ کو اس آباد عالی کے عہد میں شامل تو ضرور کرتا ہے لیکن وہ انسانیت کے نام پر شاعرانہ منصب سے نرم جذبات کے تحت الگ ہو کر سراسر انسانوں کا مونس اور غم خوار بن جاتا ہے۔ شاعر روانی میں ناصحانہ انداز بھی اپنا لیتا ہے۔ اس کا یہی جذبہ کئی اور نظموں میں بھی کار فرما نظر آتا ہے۔ "کل کا رشتہ" "دروازے کے پیچھے" "تعجب" اور "تعدد ازدواج" ایسی ہی نظمیں ہیں :

قتیل شفائی کے اس مجموعے میں ایک مختصر ترین نظم

بچے - !
کیسے - ؟

بھی ہے -

قتیل صاحب کے اس مجموعہ شاعری میں ساٹھ رنگا رنگ نظمیں اپنے اپنے پس منظر اور عنوان کے تحت شاعرانہ تخیل سے معمور ہیں۔

قتیل شفائی ایک ایسا شاعر ہے جس نے فلمی نغمات کو حسین شاعری کا رنگ دیا۔
——— ڈاکٹر صابر آفاقی

ردِ عمل کی اثر آفرینی

اسرار زیدی۔ لاہور

کیسی اب سورج کی شعاعیں
کیسی پیڑ کی چھاؤں
دیکھوں صرف جھروکے سے
چلتا پھرتا گاؤں
مجھ میں اور دھرتی میں حائل
پتھر جیسا پاؤں

قتیل شفائی کے تازہ شعری مجموعے "چھتنار" کی اس نظم "پلاستر کے بعد" کا میں نے یہاں بطورِ خاص یوں ذکر کیا ہے کہ اس نظم سے اس کی پوری شاعری کے ایک مخصوص رویے کا سراغ ملتا ہے۔ اور یہ رویہ اس کے پورے فکری نظام میں "ردِ عمل" کے اظہار کا ہے۔ ایک "چھتنار" پر ہی موقوف نہیں، قتیل کے دوسرے شعری مجموعوں میں جو نظمیں، غزلیں یہاں تک ـــــ کہ گیتوں تک میں بیشتر یہی بنیادی رویہ جاری و ساری نظر آتا ہے، اور ان کی شانِ نزول اجتماعی یا جزوی طور پر کسی نہ کسی چھوٹے بڑے واقعے یا حادثے کا ردِ عمل ٹھہرتی ہے۔ میرے نزدیک یوں بھی کسی تخلیقی عمل میں ردِ عمل کی آمیزش بطورِ خاص اس کی اثر آفرینی میں اضافے کی موجب بنتی ہے۔ اوپر درج شدہ نظم "پلاستر کے بعد" حسبِ معمول ایک سنگین حادثے کا ردِ عمل لئے ہوئے ہے جو مینارِ پاکستان پر قتیل کو پیش آیا اور جس کے سبب طویل عرصے تک اس کا ایک پاؤں پلاستر کا مرہونِ منت رہا، اور اسی باعث اُسے کئی ماہ تک صاحبِ فراش رہنا پڑا، چنانچہ اس صورتِ حال میں جو کیفیت اس نے اپنے طور پر محسوس کی اس کا ردِ عمل "پلاستر کے بعد" میں پوری شدت کے ساتھ موجود ہے۔ یہ رویہ قتیل کی اس نظم تک ہی محدود نہیں بلکہ یہ اس کے ہاں بنیادی حیثیت کا حامل نظر آتا ہے اور اس کے شعری قالب میں ایک توانا عنصر کی حیثیت سے اُبھرتا ہے۔

قتیل شفائی کا شمار اُردو کے ان چند مقبول اور ممتاز شعراء میں ہوتا ہے جو کم از کم ربع صدی سے اپنی عظمت اور شہرت کا پرچم لہرائے ہوئے ہیں اور جن کا کلام اس دور سے لیکر آج تک مقبولِ خاص و عام ہے۔ زیرِ تبصرہ تصنیف "چھتنار" سمیت اب تک قتیل کے آٹھ شعری مجموعے "ہریالی"،

جلترنگ۔ روزن۔ گجر۔ جھومر۔ مطربہ۔ اور گفتگو شائع ہو کر منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ اس ضمن میں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ان مجموعوں میں سے کم و بیش ہر ایک کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اور اب بھی اہلِ ذوق کو بدستور ان کی طلب ہے۔ اس لحاظ سے قتیل ان خوش قسمت شعراء میں سے ہے جو قاری کے علاوہ خود ناشر کی بھی بوجوہ ضرورت بن چکے ہیں ورنہ اس حقیقت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ اس دور میں شاعری کی کتب کی اشاعت بڑی حد تک ناممکن ہو چکی ہے اور اپنے مجموعے شائع کرانے والے شعراء کی اکثریت اس امر پر مجبور ہے کہ ان کی اشاعت کے مصارف بھی خود ہی برداشت کرے۔

قتیل شفائی کی پوری شاعری عملاً ایک طویل سفر سے عبارت ہے۔ وہ اس سفر میں خوب صورت منظروں سے بھی گزرا ہے۔ اور کٹھن منزلوں سے بھی انہی منزلوں اور منظروں کو گرفت میں لیکر وہ اپنے قاری تک پہنچتا ہے۔ بظاہر یہ صورت حال تو چونکا دینے والی ہے نہ اس میں کوئی خاص انفرادیت کہ یہ عمل تو قریب قریب ہر باشعور شاعر کے ہاں نظر آتا ہے لیکن میرے نزدیک یہاں قتیل کی انفرادیت یہ ہے کہ اس عمل سے وہ تنہا نہیں گزرا بلکہ اس نے اس میں اپنے قاری اور سامع کو بھی شریک کیا ہے اور اس طرح شریک کیا ہے کہ یہ لوگ بھی شاعر کے ساتھ ساتھ اس سفر کے ایک اہم کردار بن گئے ہیں، چنانچہ یہی وہ رویہ ہے جس کی بنا پر بڑے اعتماد کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ قتیل کی مقبولیت کا راز اس کی یہی انفرادیت ہے اور یہی انفرادیت اس کے تشخص کی علامت بنتی ہے۔ یہ انفرادیت اس کے لہجے کو جو اعتماد فراہم کرتی ہے وہ اس کے اسلوب اور طرزِ اظہار کا بنیادی جزو ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب "چھتنار" کی قریب قریب تمام نظموں کے بارے میں اپنے ذاتی علم کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان کی تخلیق اس حادثے کے بعد عمل میں آئی جس کا سطور بالا میں ذکر آچکا ہے چنانچہ علالت کے دوران قتیل شفائی وقتاً فوقتاً جن کیفیات سے گزرا ان کا اظہار اپنے ردِّ عمل کے ساتھ بالعموم ان نظموں میں ملتا ہے۔ اس ضمن میں تو اس کی اکثر نظموں کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے لیکن یہاں میں بطورِ خاص محض چند کا اشارتاً ذکر کروں گا جن کے مطالعے سے یہ امر قطعی طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ ان نظموں کا اپنا پس منظر ہے اور اس پس منظر میں واقعات و حادثات کا ایک طویل سلسلہ ہے جو شاعر کے تاثر کا مرکزی نکتہ ہے۔ چنانچہ "استغراق، ایک نوحہ، غم دل کی وادیوں میں، آگ' وہ گھر پر نہیں ہیں۔ خشک پتہ۔ مینارِ پاکستان کے آس پاس، محترمہ، مجید امجد، گنتی روتی کا جھونکا اور ایسی تبدیل کی متعدد نظمیں اپنے طور پر کسی نہ کسی ردِ عمل کا اظہار کرتی محسوس ہوتی ہے۔

قتیل کی نظموں کے حوالے سے یہ بھی کہتا چلوں کہ نئی نسل کے ایک طبقے کی طرف سے یہ جو ماضی سے بغاوت حال سے عدم مفاہمت اور مستقبل کے بارے میں غیر یقینی صورتِ حال کا اظہار ہو رہا ہے اور جس کا آجکل بہت چرچا ہے۔ فی الواقع یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر سنجیدگی سے غور کیا جانا ضروری ہے، لیکن اس بحث میں پڑے بغیر اتنا ضرور کہوں گا کہ حال سے عدم مفاہمت اور مستقبل کے بارے میں غیر یقینی تشکیک کا رویہ تو جزوی طور پر سمجھ میں آتا ہے لیکن ماضی کا جو ادب اور شاعری ہم تک پہنچ سکی ہے وہ بڑی چھان پھٹک اور احتساب کے بعد پہنچی ہے۔ لہٰذا اسے رد کرنے کا بظاہر کوئی جواز نہیں ہے چنانچہ قتیل جب اس رویے کے خلاف آواز بلند کرتا ہے اور وہ اپنی نظموں کے حوالے سے یہ کہتا ہے تو غلط نہیں کہتا کہ

"وہ جدیدیت بڑی توانا ہوتی ہے جس کے بدن میں صحت مند روایات کا خون گردش کر رہا ہو!"

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ حساس اور باشعور شاعر کی حیثیت سے قتیل شفائی اس سے پوری طرح آگاہ ہے کہ ایک ارتقاپذیر معاشرے میں اس کی ذمہ داریاں کیا ہیں؟ چنانچہ اس کی پوری شاعری اور "چھتنار" کی نظموں کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے منصب سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کی مایوسانہ صورتِ حال کے باوجود وہ اس پر یقین رکھتا ہے کہ

وہاں وہاں سے آندھیوں نے اپنے رُخ بدل لئے   جہاں جہاں کوئی دیا جلا رہا ہے آدمی

زمانہ پھر سے آ رہا ہے نفرتوں کی ہار کا
کہ آدمی کو پھر گلے لگا رہا ہے آدمی

اسی طرح ایک دوسری نظم سیپیاں کا ایک ٹکڑا:

وہ قہقہے:
جو آنسوؤں کے ایک بے پایاں سمندر کی تہوں سے
سیپیاں بن بن کے آتے ہیں کنارے پر
جنھیں بھرنے کو آجاتے ہیں اپنی اپنی جھولی میں
سمندر کے کنارے سیپیاں چنتے ہوئے بچے!

نظم کا یہ ٹکڑا ایک مایوسانہ صورتِ حال کے ساتھ رجائیت کا آئینہ دار بھی ہوتا ہے اور اس امر کا غماز بھی کہ ہر وہ شاعر و فن کار جو باحوصلہ ہے اور باشعور بھی اس کے روبرو صورتِ حال کیسی بھی ہو حوصلہ شکن کیوں نہ ہو وہ مایوسی کو بہر حال گناہ سمجھتا ہے۔

میں قتیل کی نظموں میں اسلوب کے تنوع اور نغمگی کے بارے میں کہنا چاہنے کے باوجود بھی کچھ نہ کہوں گا کہ اس مسئلے پر کافی کچھ پہلے ہی لکھا جا چکا ہے۔ ہاں اتنا ضرور عرض کروں گا کہ شاعری کی یہی وہ کیفیات ہوتی ہیں جو ہر لمحے قاری یا سامع کو اپنی گرفت میں لیے ہوتی ہیں۔ آخر میں "چھتنار" کی خوبصورت طباعت و معیاری اشاعت کے بارے میں یہ کہنا ہی کافی ہوگا کہ یہ کتاب ممتاز اشاعتی ادارے "مکتبہ عالیہ" کے زیر اہتمام حسب معمول نہایت معیاری انداز میں شائع ہوئی ہے۔

قتیل شفائی کا فن گنگناتی ہوئی پائل کے نغموں سے لبریز ہے۔ اس میں رسیلا پن بھی ہے اور من کی کوکتی گرلاتی شہنائی کی سسکتی ہوئی تانیں بھی۔

رضا ہمدانی

مُثبت قدروں کا ترجمان

سحر انصاری۔ کراچی

قتیل شفائی اُردو کے ان چند ممتاز شعراء میں سے ایک ہیں، جو شاعروں کی شہرت کے باوجود ادب کی تسلیم شدہ روایت میں بھی ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ "ہریالی" سے "چھتنار" تک ان کے آٹھ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں، اور ایک نواں مجموعہ "آوازوں کے سائے" زیرِ طبع ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شاعری کے باب میں کس قدر سنجیدہ ہیں اور شاعری کو زیادہ سے زیادہ معتبر بنانے میں اُن کا انہماک کس نوعیت کا ہے۔ قتیل شفائی کی غزل، گیت اور نظم یکساں خوبی اور رعنائی کے مظہر ہیں۔ وہ زندگی کے عام تجربوں سے ایک انوکھا مضمون پیدا کرنے اور اسے شاعری کا دل آویز آہنگ بنا دینے پر اچھی طرح قادر ہیں۔

قتیل شفائی ذہنی طور پر جو کچھ ہیں جذبے اور احساس کی سطح پر بھی وہی ہیں۔ وہ زندگی کی مثبت اور بامقصد قدروں کی طرف ایک اندرونی تقاضے اور داخلی ضرورت کے تحت آتے ہیں۔ گرد و پیش کی زندگی کے تغیرات، مسائل اور مصائب نے ان میں دل دردمند کے ساتھ ساتھ دیدۂ بینا بھی پیدا کر دیا ہے اسی لئے ان کی نظموں میں دل اور عقل کا خوشگوار توازن ملتا ہے۔ وہ انفرادی اندازِ سخن کو اس طرح برتتے ہیں کہ اسمیں روایت کی دھنک کے رنگ بھی نظر آتے ہیں اور جدید اسالیبِ بیان کی دھوپ چھاؤں بھی۔ لیکن جیسا کہ وہ خود بھی کہتے ہیں ان کی بنیادی شرط ابلاغ ہے اور وہ ابہام اور الجھاؤ کو پسند نہیں کرتے نثر میں اُنھوں نے ایک خوبصورت بات بڑے ایقان اور سچائی کے ساتھ کہی ہے:

"میں سمجھتا ہوں کہ زمین پر بسنے والوں سے غیر زمینی لہجے میں بات
کرنا بہت بڑی بے انصافی ہے؟"

دراصل یہی اصول ان کی شاعری کا بنیادی منشور ہے۔ شاید اسی کے زیرِ اثر وہ زندگی کے عام تجربوں کو بھی بڑی خوبی سے شاعری کا دلکش روپ بخش دیتے ہیں۔ "چھتنار" صرف نظموں کا مجموعہ ہے اس سے ان کی نظم گوئی کا مطالعہ ایک تسلسل اور یکسوئی سے ہو سکتا ہے۔ اس میں کئی نظمیں ایسی ملیں گی، جن سے میرے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ وہ عام سے واقعات و تجربات کو اپنی نظم میں کتنا انوکھا بنا دیتے ہیں۔ ان کی ایک نظم ہے "پلاسٹر کے بعد" حادثات میں کتنے پاؤں استخوانِ شکستہ کے المیے سے دوچار ہوتے ہیں لیکن قتیل شفائی نے شاید پہلی بار اس قسم کے حادثے پر

اتنی موثر اور خوبصورت نظم کہی :

کیسی اب سورج کی شعاعیں
کیسی پیڑ کی چھاؤں — ؟
دیکھوں صرف جھروکے سے میں
چلتا پھرتا گاؤں —
مجھ میں اور دھرتی میں حائل
پتھر جیسا پاؤں

ان چھ مختصر سطروں میں ایجاز اور اعجاز بیک وقت کارفرما ہیں، اور نئے پن کی بے اساس خواہش کرنے والوں کے لئے ایک نمونۂ تقلید بھی ۔۔ اس مجموعے کی ایک اور موثر نظم "سناٹا" بھی ایک ذاتی المیے کی شعری تصویر آفرینی ہے — اس نظم کی خوبی یہ ہے کہ شاعر کہیں جذبات سے مغلوب نہیں، اس پر رقت یا رحم طلبی کی کوئی کیفیت طاری نہیں۔ اس نظم کا یہ بند ملاحظہ کیجئے :

تیری رحمت کے توکُل میں نے صدمے اٹھائے ہیں
یہ خطا میری ہے اُس کا کوئی پاپ نہیں
تو نے کیوں بخش دی پھر اُس کو وہ دنیا جس میں
کوئی آہنگ ، کوئی چنگ ، کوئی چاپ نہیں
میری مانند ترے دل میں بھی چبھتے کانٹے
تو کسی پھول سی بیٹی کا مگر باپ نہیں

قتیل شفائی کی تمام نظموں میں براہِ راست اظہار کے ساتھ ساتھ نغمگی، اثر آفرینی اور خلوص پوری طرح نمایاں ہوتا ہے۔ وہ آزاد نظم بھی لکھتے ہیں، معرا بھی اور پابند بھی۔ اسی طرح موضوعات میں بھی ان کے یہاں رومان بھی ہے، مسائل حیات بھی اور گردو پیش کی دنیا کے واقعات بھی۔ "چھتنار" نظموں کا ایک حیات آموز مجموعہ ہے۔ اس کی چند نظمیں بطور خاص مجھے پسند آئیں۔ مثلاً استغراق، کھلا مکان، تعاقب، ہواؤں کی سرگوشیاں، پلاسٹر کے بعد سناٹا، خشک پتہ، آخر شب کا نقارہ اور نئی تقویم، مجھے یقین ہے کہ "چھتنار" کو ابلاغ کے حامی ضرور قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

— ÷ —

ابلاغ پسندوں کا محبوب

★ ——— شان الحق حقی، کراچی

نظم ہو یا غزل ہو یا گیت، ان تینوں اصناف میں سے کوئی قتیل شفائی کے دستِ قدرت سے باہر نہیں۔ گیت کو انھوں نے وہ آبرو بخشی کہ یہ ایک مستقل ادبی صنف شمار ہونے لگی۔ موسیقی کی تابع یا تابع مہمل ہونے کی بجائے ادبیات میں داخل ہو گئی بلکہ نظم میں بھی سرایت کر گئی۔ ان کی نظموں میں بھی اکثر گیت کا مزا شامل ہوتا ہے۔ اس بات کو اہل ذوق خوب محسوس کر سکتے ہیں۔ مضامین اگر تلخ بھی ہوں تو منہ کا مزا بگڑنے نہیں پاتا۔ شاعری منہ کا مزا بگاڑنے کے لئے ہوتی بھی نہیں۔ کسی کلام یا تقریر یا آواز کے دل نشیں اور مؤثر یا حقیقی ہونے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ کان کے پردوں پر خراشیں ضرور ڈالے۔ اپنے قلم سے کیوں کر کام لے۔ کب کس پینترے سے اور کب وار کرے، کیوں کر ہنسائے، کیوں کر رلائے۔ یہ شاعر ہی خوب جانتا ہے۔ ناقد یہ باتیں اسے نہیں سکھاتے۔

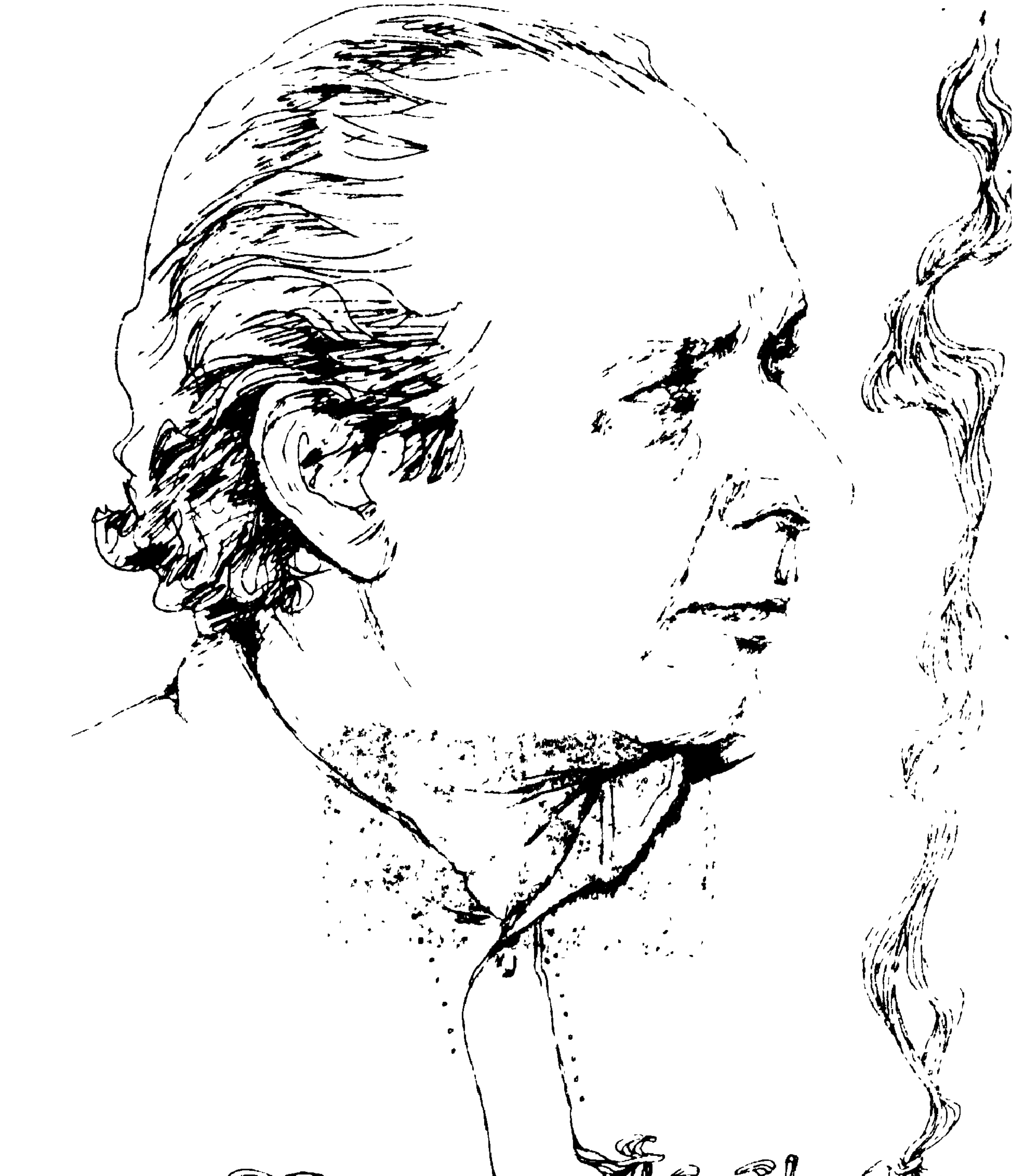
چھتنار قتیل شفائی کا آٹھواں مجموعہ ہے، جو ساٹھ نظموں پر مشتمل ہے۔ اس میں ایک مختصر ترین نظم کا تجربہ بھی شامل ہے، جسے یہاں نقل کرنا طوالت کا موجب نہ ہو گا۔ نظم یہ ہے:

پیسے ؟
کیسے ؟

یہ مختصر نظم ہی نہیں شاید مختصر ترین افسانہ بھی ہے۔ جو محض مبہم نہیں خاصا بولتا ہوا ہے۔ اس کے بعد اختصار کی ایک ہی منزل اور رہ جاتی ہے۔ یعنی "آہ"، جس میں عنوان بھی سمایا ہوا، انجام بھی مگر ابہام سے خالی نہیں۔ اور امکانات لامحدود ہیں۔ عجب نہیں کہ اس کی داد ان ابہام پسندوں سے مل جائے جن کی طرف قتیل نے اپنے دیباچے میں اشارہ کیا ہے۔ انھوں نے سچ کہا ہے کہ بعض ترقی پسند ادیب بھی ابہام کے چکر میں پھنس گئے ہیں۔ حالانکہ یہ روش ترقی پسندی سے بالکل میل نہیں کھاتی جیسا کہ کرسٹن کارڈیل نے چالیس بیالیس سال پہلے آگاہ کیا تھا۔ یہ رجعت پسندی کی آخری ہچکیاں ہیں۔

چھتنار کی نظموں میں افسانوی رنگ غالب ہے، اور فکر صحت مند ترقی پسندی میں رچا ہوا۔ انداز مؤثر بھی ہے دلکش بھی۔ ایسا کہ بار بار پڑھیں اور ہر بار ان کا نقش گہرا ہوتا جائے۔ بعض تو پڑھتے ہی دل میں اتر جائیں گی، اور بھول نہیں سکیں گی۔

نظمیں



آدمی

لبوں پہ مسکراہٹیں سجا رہا ہے آدمی
کوئی تو زخم ہے جسے چھپا رہا ہے آدمی

پڑے پھوار درد کی تو جلترنگ بج اٹھیں
بچشمِ نم بھی گیت گنگنا رہا ہے آدمی

کھنچا یہ جس بھی دار پر وہ سنگِ میل بن گئی
ازل سے جادۂ بقا دکھا رہا ہے آدمی

جھکی ہوئی کمر سہی غم و الم کے بوجھ سے
بلندیوں کی سمت پھر بھی جا رہا ہے آدمی

نہ حادثوں کی شب کٹی نہ زندگی کی پو پھٹی
چراغِ امید کا مگر بجا رہا ہے آدمی

زمیں کی وسعتوں کو دیکھ کر بہت قریب سے
خلاء میں اب نصیب آزما رہا ہے آدمی

وہاں وہاں سے آندھیوں نے اپنے رخ بدل دیئے
جہاں جہاں کوئی دیا جلا رہا ہے آدمی

زمانہ پھر سے آ رہا ہے نفرتوں کی ہار کا
کہ آدمی کو پھر گلے لگا رہا ہے آدمی

تجلیاں بکھیرنے کو دوسروں کے واسطے
قتیلؔ اپنے آپ کو جلا رہا ہے آدمی

بلڈ بینک

میرا خون جتنی بھی مقدار میں چاہیئے آپ لے لیں
میرا خون — جس میں سموئی ہوئی وہ حرارت ہے
جس نے ہمیشہ توانائی بخشی ہے انسانیت کو
میرا خون میرے بدن میں اسی واسطے آج بھی گردشیں کر رہا ہے
کہ میں اپنے اجداد کی یہ امانت
کسی ایسے انسان کے جسم میں مسکرا کر انڈیلوں
جو اُس خون کو نسل در نسل آگے بڑھائے
ابد تک ہر انسان میری طرح مسکرائے
مرے خون کا اس سے بہتر تو کوئی بھی مصرف نہیں ہے
میرا خون جتنی بھی مقدار میں چاہیئے آپ لے لیں

ابہام

آرزوؤں کے گھنے جنگل میں
رقصِ طاؤس نہیں نغمۂ بلبل بھی نہیں
ہر طرف راج ہے خونخوار درندوں کا ـــــ مگر
میرا منصب یہ نہیں ہے
کہ درندوں کو درندہ میں کہوں
میرا منصب یہ نہیں ہے
کہ درندوں کے شہنشاہ کو آمر سمجھوں
میں تو فنکار ہوں، فنکار کا منصب یہ ہے
استعارات و علامات کے صد رنگ غباروں پہ لکھے ایسے حروف
جن کی پرواز سے ابلاغ کے گلزاروں میں
ذائقہ سارے مفاہیم کا عنقا ہو جائے

ضمیر

وہ مر گیا
مجھے اُداس کر گیا
مگر نہیں
وہ جنتی
کچھ ایسے نامور اپاہجوں کے پیٹ بھر گیا
کہ جن کے کاسۂ ہنر کی دھوم دُور دُور ہے

وہ مر گیا
پر اس کی موت کا تمام فائدہ
انھیں ملا
کفن سے جسم ڈھانپنے پہ جن کو ناز ہے بہت
بچے ہیں جن کے جسم ہر لباس میں
یہی تو ان کی شانِ امتیاز ہے

بہی کھاتہ

موٹر کار کے آٹھ ہزار
وِسکی کے اٹھارہ،
باسٹھ ہیرا منڈی کے
اور باقی رہ گئے بارہ

بارہ میں اُنچاس ملائے
کالی منڈی والے
اُنتالیس کے بیچے ہم نے
نقلی مرچ مسالے

ڈال رہے ہیں آٹے میں ہم
اِک مدت سے راکھ
اُنتالیس، اُنچاس اور بارہ
ہو گئے پورے لاکھ

بلیک آؤٹ

گھُپ اندھیرے میں سیہ پوش ہے قریہ قریہ
ماتمِ مشعل و قندیل بپا ہو جیسے
پا بہ زنجیر ضیا ہو جیسے

شہر سنسان ہے ویران پڑے ہیں در و بام
صرف اپنے ہی خیالوں کی صدا آتی ہے
یا دبے پاؤں ہَوا آتی ہے

وسوسے رینگ رہے ہیں مری شریانوں میں
سائرن چپ ہیں مگر زندگی خاموش ہے کیوں
جسم آواز کا رُوپوش ہے کیوں۔

یا خدا چھایا ہے کیوں آج کی شب اِتنا سکوت
یہ خموشی کِسی اپنے کی نوازش تو نہیں
یہ خموشی کوئی سازِش تو نہیں

سستا خون، مہنگی شراب

چھوڑ اصرار یار جانے دے
اتنی مہنگی شراب کون پیے

سو سوا سو کی بات خواب ہوئی
اب تو اسکاچ ڈھائی سو میں ملے
اور اگر بائی لینڈ پر ہو گزر
وہ بھی نوّے سے کم نہیں پڑتی
اور اس وقت ہسپتالوں میں
اپنی مجبوریوں کے سوداگر
ہر خریدار باوقار کے ہاتھ
اپنے گلرنگ خون کی بوتل
اس سے کچھ کم میں بیچ دیتے ہیں

ہائے کیا اپنا دیس ہے کہ جہاں
خون سستا، شراب مہنگی ہے

چھوڑ اصرار یار جانے دے
خون کی جب ہو اتنی ارزانی
اتنی مہنگی شراب کون پیے،

آم کے پیڑ

اُس کوٹھی کے باغیچے میں
کچھ پیڑ لگے تھے آموں کے

جب پہلے پہل ان پیڑوں کو مل جل کر ہم نے سینچا تھا
اک ٹھنڈی میٹھی راحت کا احساس ہوا تھا دونوں کو
ہم دونوں نے مستقبل کے اُس پھل کا ذائقہ وقت سے پہلے
اپنی زباں پر پایا تھا۔
وہ پھل کہ جسے پیڑوں نے ابھی اُگلا بھی نہ تھا
ہم دونوں کو (یا صرف مجھے) اُس موسم کے آنے کی بڑی اُمیدیں تھیں
جس موسم میں ہر قسم کے آموں کی فصلیں پک جاتی ہیں

وہ موسم آیا۔
لیکن کوئی آم مری قسمت میں نہ تھا
وہ فصل مری قسمت میں نہ تھی
میں دبتا گیا
میں دبتا گیا محرومی کے انبار تلے

اور آج مرا یہ عالم ہے
اب سنتا ہوں میں اوروں سے
اس کوٹھی کے باغیچے میں
پیڑوں پہ لگے ہیں آم مگر
افسوس کہ ایک بھی دانے پر لکھا ہوا میرا نام نہیں

اے میری انا جاگ

میں نے تجھے ماضی کے دریچے میں سجا کر
سوچا تھا، تجھے دیکھنے آئے گا زمانہ
اک بھیڑ سی لگ جائے گی یادوں کی گلی میں

میں آج بصد یاس تجھے دیکھ رہا ہوں
اب تیرے خد و خال پہ اک دھول جمی ہے
پہلی سی چمک اب نہیں سونے کی ڈلی میں

اس دورِ خزاں میں ہے مجھے تیری ضرورت
بادل ہے تو سوکھی ہوئی دھرتی پہ برس جا
خوشبو ہے تو اچھل سی پھیلا بند گلی میں

اے میری انا جاگ!

ہواؤں کی سرگوشیاں

ہواؤں کی سرگوشیاں سنتے سنتے
میں اکتا چکا ہوں

کبھی ایک جھونکا مری سانس میں آنے والی بہاروں کا رس گھولتا ہے
کبھی دوسرا، دینے آتا ہے میرے سلگتے بدن پر پھواروں کی دستک
دکھاتا ہے کوئی مری تشنگی کو نئی خوشبوؤں کے حسیں ابر پارے
کوئی آکے دیتا ہے میری بصارت کو موہوم رنگینیوں کے سہارے

میں گھبرا گیا ہوں۔
ہواؤں کی سرگوشیاں سنتے سنتے

اگر جمع کر پاؤں میں ان دلآویز سرگوشیوں کو
تو مجھ میں سمٹ آئے شورِ قیامت
وہ شورِ قیامت۔
جسے بعد از مرگ ہونا ہے برپا
مگر ہو چکا ہے جو برپا مری زندگی میں
یہی گر مری زندگی ہے تو میں سوچتا ہوں
کہ میں مر چکا ہوں
ہواؤں کی سرگوشیاں سنتے سنتے

ایک رند مشرب دوست کی وفات پر

یارب سزا نہ دینا روزِ حساب اس کو
اپنی غزل کا میں نے بخشا ثواب اس کو

دنیا میں تھا وہ پیاسا لیکن اب اس جہاں میں
خالی کبھی نہ دینا جامِ شراب اس کو

میں اتنا جانتا ہوں پھر وہ کبھی نہ سنبھلا
اک بار کر دیا تھا دل نے خراب اس کو

گلرنگ عارضوں سے تھی اس کو خاص نسبت
بھیجے مری دعا نے برگِ گلاب اس کو

وہ جس کی زندگی میں چمکا نہ کوئی تارا
اب ڈھونڈنے چلے ہیں سو ماہتاب اس کو

اس نے قتیل دیکھا اک خواب زندگی بھر
اب جھیلنی پڑی ہے تعبیرِ خواب اس کو

وہ گھر پر نہیں ہیں

حسیں قہقہوں کی صدا آ رہی تھی
پھر آج اُن کے در پر جو دی میں نے دستک
خلافِ توقع یہ آواز آئی
"وہ گھر پر نہیں ہیں"

ابھی کل کی ہے بات جب اس مکاں سے
مرے در ان کے تکلم میں ڈوبے ہوئے قہقہے دور تک جا رہے تھے
کسی نے جو ایسے میں دی آ کے دستک
تو میری ہی مانند اس سے یہی بات کہہ دی گئی تھی
"وہ گھر پر نہیں ہیں"

ارے آج کے سادہ دل' نیک اطوار مہماں
جو کل تو بھی دے گا یہاں آ کے دستک
تو شاید تجھے بھی خلافِ توقع یہ آواز آئے
"وہ گھر پر نہیں ہیں"

سوچ، سمندر سے بھی گہری!

سمندر کی تہ میں اتر تو گیا ہوں
میں اپنے بدن جسم سے باندھ کر ایک خوش رنگ پتھر
یہ پتھر جو مجھ کو سمندر کی تہ سے
ابد تک ابھرنے نہ دے گا
یہ پتھر جو زنجیرِ پا بن گیا ہے

یہ مانا سمندر کی شفاف تہ میں
مرے واسطے اک حسیں جل پری نے
صدف ہی صدف موج در موج بکھرا دیئے ہیں
جدھر دیکھتا ہوں
چمکتے دمکتے خوش رنگ موتی
مرے راستے میں بچھے جا رہے ہیں
مگر ان حسیں موتیوں کی جواں جگمگاہٹ سے آگے
طلسماتِ صد رنگ کی سیڑھیوں سے اُتر کر
چٹانوں کے نیچے
پُراسرار نادیدہ گہرائیوں میں
کوئی بدنما و بد اندیش عفریت سویا ہوا ہے
خود اپنے ہی خوابوں کی لذت میں کھویا ہوا ہے

سمندر کی نادیدہ گہرائیوں کا یہ منظر

ابھی تک تو اوجھل ہے میری نظر سے
ابھی تک تو عفریت جاگا نہیں ہے
ابھی تک تو میں سانس روکے کھڑا ہوں
کہ گہرے سمندر کے اِن پُرسکوں پانیوں میں
مرے جسم کی آنچ سے بلبلے بن رہے ہیں
یہ بنتے ہوئے بلبلے آس کے وہ محل ہیں کہ جن میں
ارادوں کی رنگین شہنائیاں بج رہی ہیں
مجھے ڈر ہے شہنائیوں کی صدا سے
یہ خونخوار عفریت اگر جاگ اُٹھا
تو سارے سمندر میں، ہلچل مچے گی
نہ میں بچ سکوں گا نہ میری کوئی آرزو بچ سکے گی

اگر میں نے گھبرا کے چاہا پلٹنا
تو مجھ کو ابد تک ابھرنے نہ دے گا سمندر کی تہ سے
یہ خوش رنگ پتھر
یہ پتھر جو زنجیرِ پا بن چکا ہے
یہ پتھر جو میرا خدا بن چکا ہے

رخصتی

چھوٹی سی دلہن تو ہے بڑے باپ کی بیٹی
اللہ کرے تیرے بھی اوصاف بڑے ہوں

سسرال کے آنگن میں جو اترے تری ڈولی
تعظیم کو خود تیرے ہی اوصاف کھڑے ہوں

چمکیں ترے جھومر میں مقدر کے ستارے
سکھ چین کے گجرے تری بانہوں میں پڑے ہوں

گر رنگ بکھرتی ہو تری خوشیوں کی شفق سے
کردار کے ہیرے ترے آنچل میں جڑے ہوں

اڑتا ہو تخیل ترا چاہت کے پروں پر
اور پاؤں شرافت کے شبستاں میں گڑے ہوں

دنیا کے نئے پن کا تصور ترا حق ہے!
بھولے سے مگر جامۂ مشرق نہ بدلنا

خود جل کے جو کرتی ہے فضاؤں کو منور
اس شمع کی مانند نئے گھر میں بھی جلنا

جس پھول سے بنتی ہے جو گلزار کی زینت
اس شاخِ ثمرور کی طرح پھولنا پھلنا

چومے گی قدم تیرے تمناؤں کی منزل
ماں باپ کی دکھلائی ہوئی راہ پہ چلنا

تیرے لیے سسرال ازل بھی ہے ابد بھی!
ڈولی سے چلی ہے تو جنازے سے نکلنا

سنّاٹا

اِس سے بڑھ کر بھی کوئی اور ستم کیا ہوگا
میں کہوں پیار کے دو بول تو وہ سُن نہ سکے
میرے ہونٹوں پہ دمکتے ہوں صدا کے موتی
اور وہ بے بس و ناچار انھیں چُن نہ سکے
میرے لفظوں میں دھڑکتا ہو مرا دل لیکن
وہ کسی بات کے مفہوم پہ سر دُھن نہ سکے

تیری رحمت کے تو گُن میں نے صدا گائے ہیں
یہ خطا میری ہے اُس کا تو کوئی پاپ نہیں
تو نے کیوں بخش دی پھر اس کو وہ دُنیا جس میں
کوئی آہنگ، کوئی چنگ، کوئی چاپ نہیں
میری مانند تیرے دل میں بھی چبھتے کانٹے
تو کسی پھول سی بیٹی کا مگر باپ نہیں

تو ہے قہار تو لے میری بھی اُمیدوں نے
آج ، میں ان کی دہلیز پہ سر پھوڑ لیا
بے نیازی ترا شیوہ ہے تو سُن تجھ سے بھی
میری مجبور تمناؤں نے منہ موڑ لیا
کون پھر اُس کے گنبد سے پکارے گا تجھے
میں نے اشکوں سے اگر رشتۂ غم جوڑ لیا

جن پہ تکیہ تھا وہ بے کار مسیحا نکلے
اب تو خوش ہو گئی تری سطوت یکتائی بھی

تو نے دے دی ہے جسے میرے گناہوں کی سزا
اس پہ روتی ہے مری روح کی گہرائی بھی
تو اگر اس کو سماعت نہیں لوٹا سکتا
چھین لے مجھ سے میری قوتِ گویائی بھی

تاکہ میں تیری عنایات کے گن گا نہ سکوں
آپ بہکا ہوں کسی اور کو بہکا نہ سکوں!

اپنی بیٹی کے محرومِ سماعت ہونے پر

غمِ دل کی وادیوں میں

غمِ دل کی وادیوں میں　　یہ خوشی کے چند لمحے
انھیں جان لو غنیمت　　کہ یہ لمحے کل نہ ہوں گے

ابھی چاند حسرتوں کا　　لبِ جاں چمک رہا ہے
ابھی سانس ہے منوّر　　ابھی دل دمک رہا ہے

ابھی دھڑکنوں کی آہٹ　　کوئی گیت گا رہی ہے
ابھی قربتوں کی لذّت　　ہمیں گدگدا رہی ہے

مگر ایک دن یہ گھڑیاں
یہ حسیں پل نہ ہوں گے
انھیں جان لو غنیمت
کہ یہ لمحے کل نہ ہوں گے

تمھیں اپنی جاں بنا کر　　تہِ دل سے میں نے چاہا
مرے سامنے ہے لیکن　　یہ عجیب سا دوراہا!

کبھی دل خوشی سے جھومے　　کبھی ڈوب ڈوب جائے
مرے سامنے نکھر کر　　کوئی راستہ نہ آئے

مرے غم کے یہ مسائل
کسی طرح حل نہ ہوں گے
انھیں جان لو غنیمت
کہ یہ لمحے کل نہ ہوں گے

استغراق

کر رہی تھی دعوئ پیغمبری
کل رات میری شاعری
سہما سہما سا دکھائی دے رہا تھا آسماں
معجزہ سرزد ابھی ہونے نہ پایا تھا کوئی
ٹکڑے ٹکڑے ہو کے مجھ پر آگرا پونم کا چاند

آگ

پیار کو آگ سمجھنے والی
ایک بار پھر سوچ
ایک بار پھر سوچ کہ شاید محتسبوں نے بھڑکایا ہے تجھ کو
ورنہ چاہت آگ نہیں ہے
آگ تو ہے وہ نفرت جس میں جلتے ہیں دل محتسبوں کے
تیرے میرے مدھر ملن کی ٹھنڈک آگ نہیں ہے

میں نے تیرے جسم کو، تیری روح کو چھو کر دیکھ لیا ہے
ایک ہی رنگ ملا ہے مجھ کو ان دونوں میں
ہلکا ہلکا لال گلابی
میں تیری آنکھوں میں جھانک کے دیکھ چکا ہوں
رنگ ترے بے کل سپنوں کا
اندھیارے میں جگنو سی ہو جیسے مہتابی
یہ مہتابی آگ نہیں ہے
رنگ گلابی آگ نہیں ہے

میں نے تیرے جسم کو، تیری تکلع کو چھو کر دیکھ لیا ہے
تو نے بھی تو میرے ہاتھ، مرے جذبات کی حدت پرکھی ہو گی
ان دونوں کی آنچ کا بھی تو رنگ وہی ہے
ہلکا ہلکا لال گلابی

تُو نے میری آنکھوں کے پیچھے بھی جھانک کے دیکھا ہوگا
چھوٹ رہی ہے یہاں بھی اک بیکل مہتابی
یہ مہتابی آگ دکھائی دیتی ہے پر آگ نہیں ہے
رنگ گلابی آگ سے ملتا جلتا ہے پر آگ نہیں ہے

آگ تو ہے وہ دُوری جس نے جھلسایا ہے برسوں تک مجبور دلوں کو
آگ تو ہے وہ نفرت، جس میں جلتے ہیں دل محتسبوں کے
چاہت آگ نہیں ہے

دیکھ شفق پھُولی ہے اُفق پر ہلکی ہلکی لال گلابی
محتسبوں سے پوچھ کے بتلا۔
رنگ شفق کا آگ ہے یا اُس رات کی ٹھنڈک
جس میں گوندھی جاتی ہے دُلہن کی مہندی
وہ مہندی جو آگ نہیں ہے
آگ تو ہے وہ نفرت جس میں جلتے ہیں دل محتسبوں کے
چاہت آگ نہیں ہے
تیرے میرے ملن کی ٹھنڈک آگ نہیں ہے

چھیل چھبیلی ایک حسینہ

چھیل چھبیلی ایک حسینہ ہونٹ ہیں جس کے عنابی،
ایسے بات کرے وہ مجھ سے چھوٹے جیسے مہتابی

ہرنی جیسی چال سے وہ دل والوں کو پامال کرے
رک جائے تو بڑھ جائے کچھ اور دلوں کی بےتابی

اس کے نین سمندر جیسے گہرے نیلے پُراسرار
آتی ہو گی اس کے سر کتنے لوگوں کی غرقابی

صحرا صحرا لہرائے ہیں اُس کی زُلفوں کے بادل
گلشن گلشن چھائی ہے اُس کے چہرے کی شادابی

ہیر کا پیار تھرک سا جائے مست چناب کی لہروں پر
گونج سی وہ مٹیار، وہ بانکی نار جو بولے پنجابی،

پہلے اُس کا حسن تھا چاندی، اب سونا ہی سونا ہے
چڑھتے نرخ کے ساتھ ہی بڑھتی جائے اُس کی نایابی

کاش کبھی مجھ کو اُس کی معصوم توجہ حاصل ہو
کاش کبھی معلوم ہو اُس کو میرے دل کی بےتابی

چاہے صرف وہ تیرا دل ہو

گوری! سب نے تجھے پسند کیا ہے
سب کو تیری کوئی نہ کوئی چیز پسند آئی ہے
آنکھیں، ابرو، زلفیں
الگ الگ ہر شخص نے تیری شان میں باتیں کی ہیں
بہتر ہے تو خود ہی منصف بن کر
اِن سب سے انصاف کرے
سب کو تیری کوئی نہ کوئی چیز پسند آئی ہے ـــــ الگ الگ
کسی کو آنکھیں،
کسی کو ابرو،
کسی کو زلفیں،
کسی کو بازو،
اور کسی کو پلکیں،
اِک اِک کر کے۔
بانٹ دے ان میں سب کچھ اپنا ـــــ الگ الگ
اور اگر کچھ اِن کے ہاتھ سے بچ جائے تو
اُس کا سائل مجھے سمجھ لے!
اس کا سائل میں ہوں چاہے صرف وہ تیرا دل ہو

ایک نوحہ

شہرِ وفا کی ایک پرانی گلی میں ہیں
یادوں کے رنگ رنگ دریچے کھلے ہوئے
دل میں سسک رہی ہے تمنائے بازدید
آنکھوں میں بدلیوں کے ہیں سائے گھلے ہوئے

شاید کسی اُفق پہ بھی آئیں نہ اب نظر
چاہت کی چاندنی میں وہ چہرے دُھلے ہوئے
جب آئی ہم کو روند گئی موجِ حادثات
گویا ہم آدمی نہ ہوئے بلبلے ہوئے

"ابنِ انشا کے لئے چند اشعار"

(مرثیہ)

یہ کس نے کہا تم کوچ کرو
باتیں نہ بناؤ انشا جی!
یہ شہر تمہارا اپنا ہے
اسے چھوڑ نہ جاؤ انشا جی!
جتنے بھی یہاں کے باسی ہیں
سب کے سب تم سے پیار کریں
کیا اُن سے بھی منہ پھیروگے
یہ ظلم نہ ڈھاؤ انشا جی!
کیا سوچ کے تم نے سینچی تھی!
یہ کیسر کیاری چاہت کی
تم جن کو ہنسانے آئے تھے
اُن کو نہ رلاؤ انشا جی
تم لاکھ سیاحت کے ہو دھنی
اک بات ہماری بھی مانو
کوئی جاکے جہاں سے آتا نہیں
اُس دیس نہ جاؤ انشا جی
بکھراتے ہو سونا حرفوں کا
تم چاندی جیسے کاغذ پر
پھر ان میں اپنے زخموں کا
مت زہر ملاؤ انشا جی
اک رات تو کیا وہ حشر تلک
رکھے گی کھلا دروازے کو
کب لوٹ کے تم گھر آؤگے
سجنی کو بتاؤ انشا جی
نہیں صرف قتیلؔ کی بات یہاں
کہیں ساتھ ہے کہیں خالی ہے

تم اپنے پرانے یاروں سے
دامن نہ چھڑاؤ انشا جی!

مَعاشرہ

شہر میں جب بھی ہُوا قتل کوئی
میں نے گھبرا کے یہ سوچا دل میں
مرنے والا کہیں میں ہی تو نہیں

معراجِ فن

آج کل اک یہ بھی ہے معراجِ فن
اپنے جتنے جرم ہیں اُن کو نمایاں کیجئے
داد لینی ہے جو اہلِ ذوق سے
تتلیوں کو مار کر کاغذ پہ چپاں کیجئے

•

عقل وہ رہزن ہے جس نے آج کے انسان سے
پہلے دھرتی چھین لی پھر چاند پر جانے دیا





یہ انتخاب ——————

مدیر "فن اور شخصیت" نے مجھ سے قتیل کے گیتوں کے انتخاب کے لئے کہا اور مطمئن ہو گئے شاید اس لئے کہ میں خود ایک عرصہ سے فلموں میں گیت لکھتا رہا ہوں اور گیت نگاری کی تکنیک پر یقیناً میری نظر ہوگی۔ لیکن میرے روبرو کچھ اور دشواریاں بھی تھیں جن کا احساس میرے شب و روز کو بوجھل بنا گیا۔

میرے سامنے سب سے بڑی الجھن یہ تھی کہ قتیل کے گیتوں کا انتخاب کس طور پر کیا جائے ایک طرف یہ بات ذہن میں تھی کہ گیت برصغیر کے باسیوں کی گھٹی میں شامل ہے چنانچہ شادی بیاہ کی تقریبات ہوں یا نوحہ و بین کی کیفیتیں، اُن کے اظہار کے لئے گیتوں کا میڈیم ہی مقبول خاص و عام رہا۔ دوسری طرف یہ حقیقت تھی کہ اردو شاعری کی روایات کو گیت کی اُس فضا کے ساتھ کبھی کوئی میل نہیں رہا جو ہندی میں گیتوں کے پنپنے کا سبب رہی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ بھی نہیں نکالا جانا چاہئے کہ گیت کسی ایک زبان کی میراث ہوتے ہیں بلکہ لوک گیت ایک ناقابل انکار سچائی کی صورت ابھرتے ہیں اور مختلف زمانوں میں مختلف زبانوں میں اپنا عکس و رنگ چھوڑ جاتے ہیں۔

بالآخر یہ قضیہ یوں حل ہوا کہ میں نے قتیل کی شاعرانہ شخصیت کو مدنظر رکھا اور کوشش کی کہ گیتوں کا انتخاب اُن کی فکری سمت و رفتار کی مناسبت سے کیا جائے چنانچہ پہلے اُن کے ابتدائی دور کے گیت چُن لئے۔ اس کے بعد اُن گیتوں کو شامل کیا جو اُس وقت قتیل کے قلم سے پھوٹے جب وہ ذہنی پختگی کی نئی منزلیں طے کر چکے تھے۔ اور آخر میں فلمی گیتوں کو جگہ دی۔ کیونکہ عصر حاضر کی جمہوری اقدار کے پیشِ نظر گیتوں کا منتہا بہر کیف فلموں ہی میں ہے۔

—————— راجندر کرشن

قتیل کی فنکارانہ استقامت

احمد ندیم قاسمی

قتیل شفائی کے ساتھ نقادوں نے جو سلوک کیا، اسے آنے والا نقاد کبھی معاف نہیں کرے گا، مگر نقادوں کے علاوہ میں نے شعروادب کے اچھے خاصے خوش ذوق قارئین کو دیکھا ہے کہ وہ قتیل کی نازک خیالی، انسان دوستی، زندگی سے محبت اور حیرت انگیز فنی گرفت پر داد دینے کی بجائے اس ٹوہ میں لگے رہتے ہیں کہ قتیل کی فلمی سرگرمیوں نے اس کی شاعری کو کس حد تک متاثر کیا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ انہیں یہ محسوس کر کے بڑا غصہ آتا ہے کہ قتیل اپنی شاعری کو اپنی فلمی سرگرمیوں سے متاثر ہونے نہیں دیتا اور جب وہ نظم یا غزل کہنے بیٹھتا ہے تو اس شخصیت کو جیسے وہیں کہیں فلم اسٹوڈیوز میں چھوڑ آتا ہے جو اس سے فلمی گانے لکھواتی ہے۔ ادب کے اس خیال کے قارئین سے میں نے ہمیشہ یہ عرض کیا ہے کہ قتیل اپنے آپ کو دو شخصیتوں میں بانٹنے کا قائل نہیں۔ وہ جس طرح عام زندگی میں سچا، کھرا اور بے تکلف ہے، اسی طرح فن کی دنیا میں بھی صداقت پسند اور حقیقت پسند ہے۔ اس کی فلمی شاعری اور "ادبی شاعری" (میں اس اصطلاح کے لئے آپ سے معذرت خواہ ہوں مگر دونوں میں امتیاز کے لئے یہ عجیب سی اصطلاح وقتی طور پر قبول کر لیجئے) میں صرف لہجے کا فرق ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس نے ہماری فلمی شاعری کو سلیقہ سکھایا ہے۔ آج خالص ادبی شاعری کو فلموں میں رائج کرنے کے سلسلے میں ہندوستان کے بعض شاعروں کا نام بار بار لیا جاتا ہے۔ مگر کسی کو یہ سوچنے کا حوصلہ نہیں کہ فلموں کو معیاری شاعری سے روشناس کرانے کا سہرا دراصل قتیل شفائی کے سر ہے۔ آرزو لکھنوی کی سی شخصیتوں نے ہی فلمی گانوں میں صرف ہندی بولی کے سہارے نام پیدا کیا مگر قتیل نے صاف ستھری اردو میں فلمی گیت لکھ کر ثابت کر دیا کہ اردو گیت کی سی نرم و نازک صنف شاعری کا بھی ذریعہ اظہار بن سکتی ہے۔ قتیل سے پہلے صرف حفیظ جالندھری نے کامیاب اور مؤثر اردو گیت لکھے مگر یہ گیت فلموں کے لئے نہیں لکھے گئے تھے۔ قتیل نے تو ہماری مضحکہ خیز فلمی کہانیوں کی مضحکہ خیز ترسیچوئشنوں کے لئے اردو میں اعلیٰ درجے کی شاعری کی اور وہ یہ کارنامہ گذشتہ ربع صدی سے انجام دے رہا ہے۔ یہی حقیقت اس امر کا ثبوت ہے کہ قتیل کو فلمی گیت لکھنے کے لئے اپنی سطح سے نیچے کبھی نہیں اترنا پڑا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے اور اس لحاظ سے تو قطعی غیر معمولی بات ہے کہ قتیل کا ذریعۂ معاش صرف اور محض فلمی شاعری ہے۔ اس صورت میں اگر وہ مجبور ہو کر فلم پروڈیوسروں اور ڈائریکٹروں کے مطالبات پورے کرنے میں لگ جاتا تو جب بھی ہم اسے موردِ الزام نہ ٹھہراتے کہ جس معاشرے میں

ہم زندہ ہیں وہاں اہل قلم کو پیٹ پوجا کرنے کے لئے کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا۔ یہاں تو لوگ محض دو ٹکے کی آمدنی کی خاطر پُرانی وابستگیوں پر لعنتیں بھیجتے ہیں اور پرانے دشمنوں کے قصیدے لکھ ڈالتے ہیں۔ مگر آفریں ہے قتیل کی فن کارانہ استقامت پر کہ اس نے کسی بھی مجبوری سے ہار نہ مانی اور پاکستان کی فلمی دنیا میں فن شعر کا علم ہمیشہ بلند رکھا۔ ہمارے ہاں بعض بڑے بڑے شعرا کی مثالیں موجود ہیں جن کی فنی عظمت میں کسی کو کلام نہیں مگر جب وہ فلمی گانے لکھنے بیٹھتے ہیں تو محسوس ان سے بہتر شاعر محسوس ہونے لگتا ہے خود میں نے ایک فلم کے دو تین گانے لکھے ہیں۔ یہ فلم ریلیز ہو گئی تو دیکھئے گا کہ میں بھی انہی شعرا کی صف میں شامل ہوں۔ مگر قتیل ہے کہ اپنے فنی معیاروں پر چٹان کی طرح ڈٹا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی فلمی سرگرمیوں سے اس کی شاعری ناگوار انداز میں ذرا سی متاثر نہیں ہو پاتی۔ اس نے فلمی شاعری اور ادبی شاعری میں صرف لہجے کی حد فاصل رکھی ہے وہ جانتا ہے کہ سنیما ہال میں جو لوگ اس کے مخاطب ہیں انھیں سادہ اور سلیس زبان ہی متاثر کر سکے گی، مگر اس سادگی اور سلاست پر اس نے اپنے نظریہ فن اور نظریہ حیات کو کبھی قربان نہیں کیا۔ نتیجہ یہ کہ جہاں تک موضوع اور مواد کا تعلق ہے۔ وہ سنیما دیکھنے والوں کے سامنے بھی وہی نرم و نازک اور پاکیزہ خیالات پیش کرتا ہے جو اس کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہیں۔ میں سمجھتا ہوں یہ قتیل کا بہت بڑا کارنامہ ہے (اور اس کارنامے کی اہمیت دو چند ہو جاتی ہے) جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس طرح اس نے نہ تو اپنے آپ کو دھوکا دیا ہے اور نہ اپنے قارئین اور سامعین کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے اور وہ ایک بڑے فن کار کی سیر چشمی کے ساتھ ایسے فن کی تخلیق میں مگن ہے جو اس وقت تک زندہ رہے گا جب تک انسانی ذہن اس حد تک مشین نہیں بن جاتا کہ اس کے لئے شعر و فن کی لطافت ختم ہو جائے اور باقی اگر کچھ رہ بھی جائے تو صرف کھوکھلی اور نمائشی نعرہ بازی رہ جائے۔

اس دور کے جن بہت کم شاعروں کو بھرپور کامیابی نصیب ہوئی ہے۔ ان میں قتیل شفائی کا نام قابل رشک حیثیت کا مالک ہے۔ معلوم ہوتا ہے مترنم اور مؤثر نغموں کے زیر و بم قتیل شفائی کے لہو کے ساتھ گردش کرتے ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان میں شاید ہی کوئی شہر یا قصبہ ایسا ہو گا جہاں بہت بڑی تعداد میں لوگ قتیل شفائی کے نغمے نہ گنگناتے ہوں۔ حالانکہ ان نغموں میں سستی عمومیت کہیں بھی نہیں ہے۔ یہ سادگی و پرکاری، یہ بے خودی و ہشیاری ان نغموں کو امر بنا دیتی ہے۔ ان نغموں میں حیات بٹ رہی ہے۔

فراق گورکھپوری

رم جھم جذبات کا دلنواز شاعر

★ قدرت اللہ شہاب

[illegible] شاعر ہیں غزل میں ان کا انداز فنی روایات کا حامل ہونے کے باوجود ایک خاص [illegible] ہے۔

[illegible] بنیادی خصوصیات ہیں۔ سادگی اور نغمگی۔ گیت کے الفاظ اور بندشوں کے چناؤ میں قتیل کا اپنا [illegible] الفاظ اور تراکیب کا انتخاب کرتے ہیں کہ گیت بوجھل نہیں ہو پاتا۔ الٹا اس میں ایک ہلکی پھلکی [illegible] ہے۔

قتیل [illegible] جذبات کی رم جھم کا سماں بڑا دل نواز ہوتا ہے۔ یہی سماں ان کی غزلوں کو بھی ایک خاص سوز اور لہرائی عطا کرتا ہے۔
قتیل صاحب غالباً ہمارے واحد شاعر ہیں جو عرصہ دراز سے فلمی دُنیا سے بھی وابستہ ہیں لیکن فلم کی وابستگی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکی۔ اس کے برعکس ان کے گیتوں نے فلم میں ادبی رنگ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور یہ بہت بڑی بات ہے۔
[illegible] آبشاروں کا ترنم اور ندیوں کا بہاؤ سمو دینے والا یہ شاعر اب اپنی نظموں میں سمندروں کی وسعتیں اور گھنے [illegible] ہے۔

[illegible] میں [illegible] کے ہجوم میں شعر کہنا شاید خود سیکھا مگر میرے بہت سے گیتوں بلکہ لفظوں کا ترنم [illegible] قتیل شفائی کی [illegible] ہے۔ سیفیر تو میں ہی لکھتے بھی بہت اچھا ہیں۔ مجھ سے کہیں بہتر۔
جمیل الدین عالی

قتیل کے گیت

میرزا ادیب

غالب کی شاعرانہ عظمت کا بیشتر حصہ یقیناً ان شعری تجربات سے وابستہ ہے جو کائنات رنگ و بو میں کراں تا کراں پھیلے ہوئے ہیں مگر اس سلسلے میں اس انداز بیان کی اہمیت بھی مسلم ہے جو بقول اس کے اپنے دنیا کے سخنوروں سے مختلف نظر آتا ہے۔ مصنف اپنے محسوسات کی ہمہ گیر معنویت اور انسانی زندگی کے گوناگوں حقائق کیساتھ ان کی گہری وابستگی کے سبب فکر و نظر کی دنیا میں نئے نئے جزیرے دریافت کرتا رہتا ہے۔ مگر ان محسوسات کے ابلاغ کا مسئلہ اپنے اندر ان تمام اجزا کو سمیٹ لیتا ہے۔ جن سے مصنف کی شخصیت عبارت ہوتی ہے کہا گیا ہے۔ بہت اہم چیز ہے مگر کہا کس طرح گیا ہے۔ اس کی اہمیت کو بھی کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا خاص طور پر گیتوں کے معاملے میں۔ جہاں الفاظ کے دروبست سے داخلی مترنمانہ کیفیت سب سے زیادہ اہم حیثیت لئے ہوئے ہے! جس طرح ایک چابک دست مصور رنگوں کے ہلکے اور گہرے خطوط سے کام لے کر ایک فنکارانہ تخلیق بروئے کار لے آتا ہے۔ اور ہمارے تمام حواس رنگوں کی ننھی سی دنیا میں مختلف خارجی کیفیات سے اکتساب لذت کرنے لگتے ہیں۔ اسی طرح گیت لکھنے والا لہجے کے اتار چڑھاؤ، الفاظ کی نشست و برخاست اور ان کی خاص ترتیب سے اس کیفیت کے تمام تشکیلی عناصر کو اپنے شعری سانچے میں ڈھال لیتا ہے جس کا ابلاغ مقصود ہے۔ قتیل کے گیتوں میں جو چیز بہت نمایاں ہے وہ وہی ہے جسے میں گیت کی روح کہتا ہوں اور جس سے میری مراد وہ حسن نغمگی ہے، جس کے بغیر کوئی گیت۔ گیت کہلانے کا مستحق ہو ہی نہیں سکتا! وہ لہجے کے اتار چڑھاؤ اور الفاظ کی نشست و برخاست کی کیفیت آفرینی کے فن سے پوری طرح واقف ہے چنانچہ وہ ہر ایک لفظ اس ماہرانہ چابک دستی سے استعمال کرتا ہے جو آتش کی زبان میں مترادف مرصع سازی ہے، اس نے ترنم کے التزام کیلئے اپنے ہاں ہیئت کے تجربات کی گنجائش نہیں نکالی۔ اس کی کوئی خاص ضرورت بھی نہیں۔ اصل شئے گیت کی روح کو اسکی تمام تر لطافتوں اور نزاکتوں کیساتھ اپنے مزاج میں سمو دینا ہے اور اس باب خاص میں قتیل کا مقام اپنے ہمعصر گیت لکھنے والوں میں سب سے بلند ہے اس کا ہر ہر مصرع اپنی خارجی ترتیب اور داخلی آہنگ کے اعتبار سے موسیقانہ ہے۔ یوں تو ہر صنف شعر کا ایک خاص مزاج ہوتا ہے اور مزاجی کیفیات ہی ایک

صنف کو دوسری اصناف ادب سے الگ کرتی ہیں مگر مزاجوں کی یہ حد بندی اردو کے اور شعری اصناف میں اس قدر شدید نہیں جس قدر گیت میں معلوم ہوتی ہے۔ گیت کا مزاج حقیقتاً ہندی الاصل ہے جو ہلکے ہلکے سایوں اور ہلکی ہلکی روشنی کا مزاج ہے۔ بجلی کی ایک ذرا سی بھی تیز کرن اس کی جبین نزاکت پر شکن ڈال سکتی ہے۔ جہاں برسات آتی ہے مگر جل تھل عالم نہیں دکھاتی بلکہ پھوار میں پپیہے کی دردناک آواز کی ہلکی ہلکی لہروں میں ڈوب جاتی ہے۔ یہاں شعلۂ خاکستر ساز کا کوئی مقام نہیں۔ دھیمی دھیمی آگ کی ضرورت ہے اور یہاں دریا کی شوریدہ سری بھی نہیں چاہئے، ندی کے مترنم خرام کی حاجت ہے۔ یہ گیت کا مزاج ہے اور اسے قتیل نے اپنے گیتوں میں نہایت کامیابی کیساتھ اپنایا ہے۔

نظم ہو یا غزل۔ قتیل شفائی کی آواز، قتیل کا لب و لہجہ، قتیل کا انداز نظر ہر جگہ الگ، ہر جگہ منفرد نظر آتا ہے اور یہی حالت اس کے گیتوں کی ہے۔ گیتوں میں بھی اس نے دوسروں سے الگ ہو کر اپنی آواز بلند کی ہے اور یہ آواز گیت کے مزاج کا تمام دھیما پن، تمام بلیغ ترنم، تمام رس، تمام مٹھاس سے بھرپور ہے۔ اور اس سے زیادہ مجھے اس نہایت مختصر دیباچے میں قتیل کے گیتوں کے متعلق اور کچھ نہیں کہنا۔

●

قتیل شفائی صاحب کا نام اور کلام اپنے اندر بڑی کشش رکھتے ہیں میں نے پاکستان سے باہر بھی جن ملکوں میں ان کا کلام پیش کیا وہاں قتیل صاحب کے قدردان پہلے سے ہی موجود تھے۔

قتیل صاحب نے فلم کے میدان میں جو کارنامے سر انجام دیئے انھیں فلم کی تاریخ کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔ انہوں نے بے تکے لفظوں کے جنگل میں بامعنی شاعری کے گلاب کھلائے اور فلمی شاعری کو بھی ایک نیا نرالا انداز عطا کیا۔ مجھے قتیل صاحب کے کلام اور اپنی آواز کے رشتے پر بڑا ناز ہے خدا کرے یہ رشتہ ہمیشہ قائم رہے۔

مہدی حسن

کرب کی لذّت کا آشنا

خواجہ عبدالغفور

پیارے صابر جی!

ایک کے بعد ایک نمبر، ابھی فیض احمد فیض نمبر کے مطالعہ سے فارغ نہ ہوا تھا کہ قتیل شفائی نمبر کی نوید ملی۔ اگر اسی طرح یکے بعد دیگرے نمبروں کی قطار لگاتے رہے تو بہت جلد اردو ادب کے نمبردار کہلانے لگو گے۔

فیض احمد فیض کے بعد قتیل شفائی!

سرحد پار کے ان دو مشہور اور اہم شاعروں کا انتخاب اس بات کا ثبوت ہے کہ تم ادب کی حد بندی اور تقسیم کے قائل نہیں ہو، تم برصغیر کے پورے اردو ادب کو ایک ہی کانٹے پہ تولتے اور ایک ہی کسوٹی پر پرکھتے ہو۔ فن اور شخصیت کے مختلف شماروں میں پھیلے ہوئے ہند و پاک کے قابلِ قدر ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات سے بھی اس کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ اس دور میں جب ہمارے ہاں تمام تر اردو ادب ہندوستانی اور پاکستانی خانہ بندی تک سمٹتا جا رہا تھا اور یہ رجحان روایت بنتا جا رہا تھا تو تم نے یہ روایت توڑ دی۔ اور فیض کے بعد قتیل پر بڑی محنت اور لگن سے فن اور شخصیت کا دوسرا شمارہ مرتب کرنے بیٹھ گئے، تم اپنا ہر شمارہ بڑے عقیدت اور محبت سے ترتیب دیتے ہو، یہی سبب ہے کہ فن اور شخصیت کا ورق ورق خلوص سے روشن اور محنت سے آراستہ نظر آتا ہے۔

مجھے حیرت ہے کہ تم نے قتیل کا انتخاب کیوں اور کیسے کیا۔ جبکہ یہ ہمارے ناقدینِ ادب کی فہرست کا ناپسندیدہ نام ہے، عام گفتگو میں بھی قتیل کا نام آتے ہی ان کے منہ کا ذائقہ بگڑ جاتا ہے۔ مگر سچی بات تو یہ ہے کہ قتیل کی شاعری ہمارے احساسات، جذبات اور کیفیات کا جیتا جاگتا مرقع ہے، وہ غزل میں کہتا ہے تو زمین کی سوندھی سوندھی خوشبو، آسمان کے جھلکتے جھلملاتے تارے، دریا میں ہر لمحہ اٹھتی بکھرتی موجوں اور فضا میں بسی بے نام مہک کو الفاظ کا پیکر پہنا دیتا ہے۔ اور جب نظمیں لکھنے بیٹھتا ہے اپنے اور گرد کے کربناک اور سناک واقعات کو اپنے مزاج کی اداسی اور المناکی ملا کر تاثر کی آخری سرحد پر لے جا کر چھوڑ دیتا ہے۔ قتیل کی ہر نظم ایک کہانی ہوتی ہے۔ اس کی نظموں کا ایک بڑا حصہ عورت کی محرومی اس کی نفسیاتی خوبی و خامی اس کی بستی اجڑتی دنیا کی منظر کشی جاری پوری اردو شاعری میں عورت کے جذبات، احساسات اور کیفیات کا جتنا خوبصورت بیان قتیل کے ہاں ہے غالباً کسی اور کے یہاں نہ ہو۔

مشہور ادیب آرتھر او لاوجائے نے اپنے قابلِ قدر مقالے ON THE DESCRIPTION OF ROMTICISM میں ایک جگہ لکھا ہے کہ "لفظ رومانیت کے کثیر معانی پیش کیے گئے ہیں۔ اور معانی کے ہجوم میں اس کے اصلی معنی گم ہو گئے ہیں، اس مقالے میں آگے چل کر آرتھر لکھتا ہے، ایک ملک کی رومانیت دوسرے ملک کی رومانیت سے کم ہی مطابقت رکھتی ہے، قتیل کی شاعری

بھی اس قسم کے رومانی مزاج کی نمائندہ ہے ، اس کا رشتہ زمین اور زمین کے نیچے پھیلی ہوئی جڑوں سے بہت گہرا ہے ۔ وہ تصور اور تخیل کی آمیزش سے ہمیں ایسی وادی میں لے جاتا ہے جو شعر و سخن و شعر کے قاری کے لئے ایک نئی دریافت ہوتی ہے یہاں مجھے ہندی کے ایک عظیم رس ناقد رام چندر شکل کا وہ مضمون یاد آتا ہے جس میں انھوں نے کہا تھا کہ شاعری صرف چیزوں کی ہی شکل و صورت میں ہی حسن کی دلکشی نہیں دکھاتی بلکہ عمل اور انسانی تحریکات کے وقعتوں کی بھی نہایت حسین منظر کشی یا مرقع نگاری کرتی ہے دراصل ادب کسی نہ کسی قسم کے تاثرات کے اظہار کا نام ہے ۔ اور قتیل اپنے غزلوں ، نظموں اور گیتوں کے ذریعہ خالص رومانی تاثرات کے خوبصورت نمونے پیش کرتا ہے ۔

قتیل کا ایک بڑا کمال یہ بھی ہے کہ اس نے زندگی کو اس کے جذبات کیفیات اور کرب کو لذت کا وسیلہ بنا دیا ہے ، جذبات و احساسات کی ایسی نازک گھڑیاں جو انسان کو غم سے بے بس اور اداسی سے ملول کر جاتی ہے قتیل کے یہاں پہنچ کر لطیف اور حسین ہو جاتے ہیں ۔ ان کی شاعری دل پر گذرنے والی دشوار اور کٹھن مراحل کو جھیلنے اور جینے کا حوصلہ دیتی ہے ۔ میں نے اوپر کہیں قتیل کی نظموں کے تعلق سے لکھا ہے کہ عورت اس کی شاعری کا جیتا جاگتا اور زندہ کردار ہے ۔ لیکن اس کے گیتوں سے یہ بات اور بھی کھل کر سامنے آجاتی ہے اپنے گیتوں میں وہ عورت کی ہر سانس اور دل کی ہر دھڑکن کا راز دار بن گیا ہے ۔ عورت اس کے یہاں حاکم بھی ہے اور محکوم بھی ، وہ روپ بدل بدل کر سامنے آتی ہے ۔ اور اپنی فطرت کا کوئی نہ کوئی اچھوتا پہلو دکھلا کر جاتی ہے ۔ قتیل نے اپنی شاعری کا آغاز گیتوں ہی سے کیا تھا ۔ اور مقبولیت گیتوں ہی کی وجہ سے حاصل کی تھی ـــ مگر بعد میں رفتہ رفتہ گیتوں کی تعداد کم ہوتی چلی گئی ۔ اور حال میں شائع ہونے والے مجموعوں میں بالکل معدوم ہو گئی ۔

بہرحال گیتوں میں قتیل کی اپنی انفرادیت مسلّم ہے ۔ ہلکی پھلکی رومانی فضا ، بہتی ہوئی لہروں کی سی روانی عام بول چال کے سائے الفاظ ، اور بھرپور نغمگی نے ان کے گیتوں کا امتیازی وصف رہا ہے ثبوت میں آزادی کے موقعہ پر لکھے ہوئے ان کے گیت کا ایک ٹکڑا سن لیجئے ،

سوامی سمجھے گھونگٹ پیچھے ہوگا چاند کا ٹکڑا
گھونگھٹ کے پٹ کھلے تو نکلا مرجھایا سا مکھڑا
ڈھانپ کے روئے مرجھائے سے مکھڑے کو البیلی (دلہن نئی نویلی)

سچ بتایئے ، تقسیم کے سانحہ پر مسرت و غم کے ملے جلے جذبات کا اظہار اور وہ بھی گیت میں ممکن تھا ؟ شاید نہیں ! مگر قتیل کی زبان کا ایچ پیچ نے گیت میں حالات کا رنگ کھول دیا ۔ ایک اور گیت میں انھوں نے عورت کے ایک بہت ہی نازک اور لطیف حس کو چھیڑا ہے ۔

سہیلی ترا بانکپن لٹ گیا آئینہ توڑ دے
تری آرائشوں کا چمن لٹ گیا آئینہ توڑ دے
تیری نیند یں نہیں
ترے سپنے سلئے !

مو بھی سنے سپنے تیرے اپنے سپنے
تیرا تن لٹ گیا تیرا من لٹ گیا
تو ٹھی اور تیرا چین لٹ گیا آئینہ توڑ دے
سہیلی تیرا بانکپن لٹ گیا آئینہ توڑ دے

ایسا نہیں کہ قتیل صرف عورت کی بربادی اس کی محرومی ہی کا نوحہ خواں ہے وہ عورت کے چلبلاہٹ، شوخی، شرارت اور تیکھی اداؤں کا بھی دیوانہ ہے۔ وہ عورت کے ہزار عشوؤں اور اس کی تازہ اداؤں پر بھی فریفتہ ہے۔

میرا دوپٹہ لہرا رہا ہے
ساون کا بادل یاد آ رہا ہے
پیتم نے مجھ کو ململ منگادی میری خوشی کی دنیا بسادی
رنگ اس کی خاطر میں نے لگایا ابرک ملا کر اس کو لگایا
تارے فضا میں چمکا رہا ہے
میرا دوپٹہ لہرا رہا ہے

یا پھر گاؤں کی گوری کی اپنے ساجن سے صدیوں سے ہوئی چھیڑ چھاڑ اور فرمائشیں!

مو ہے چاندی کی پائل منگادو سجن
خالی پیروں سے پنگھٹ کو میں کیا چلوں
اپنی سکھیوں کو دیکھوں تو من میں جلوں
وہ تو ناچیں میں شرما کے منہ پھیر لوں
مو ہے پنگھٹ کی رانی بنا دو سجن
کل کو میلا لگے گا سجن گاؤں میں
ہو گی جھنکار ہر آم کی چھاؤں میں
پھر تو کانٹے چبھیں گے سہاں پاؤں میں
مورے قدموں میں چاندی بچھا دو سجن

یا پھر چاندنی رات کے رومان پرور ماحول میں محبوب کا اپنے چاند کا دُلار۔

آکاش کے چاند کو جانے دو
دھرتی کے چاند کو آنے دو
وہ دور پہ اپنی گود میں ہے

اس چاند کو میں نے اپنایا
اک چاند گیا اک چاند آیا

گیت اپنے پس منظر، الفاظ، اور جذبے کے بے تکلف بیان سے اپنی اہمیت منواتا ہے۔ دجوہات میں جانا نہیں چاہتا، مگر اتنا یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ پاکستان میں ہندوستان کے مقابلے میں زیادہ اچھے اور خوبصورت گیت لکھے گئے ہیں۔ ہمارے یہاں تو لے دے کے فلموں میں لوگ گیت کے چربے اور بقول کسے " ریڑھ ماری گئی ہے "۔ یا پھر مکھی پہ مکھی ماری گئی۔ قتیل نے فلموں کے لئے ہی گیت لکھے ہیں جو خاصے مقبول بھی ہوئے۔ اقبال بانو کا وہ مشہور گیت (جس سے اقبال بانو آج بھی جانی اور پہچانی جاتی ہے)

دل توڑنے والے دیکھ کے چل
ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں

یا پھر مشہور زمانہ مکھڑا

موہے آئی نہ جگ سے لاج
میں ایسے زور سے ناچی آج کہ گھنگھرو ٹوٹ گئے

جس کے بہتیرے ہندوستانی چربے آپ نے بھی سنے ہوں گے فلموں میں گیت لکھتے وقت جس بہت سی پابندیوں کا خیال رکھنا ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ سبھی کو ہے۔ مگر ان مشکلات کے باوجود قتیل پاکستانی فلموں کے صف اوّل کے نغمہ نگاروں میں گنے جاتے ہیں۔ اپنے ایک گیت انھوں نے خوابناک ماحول میں جنم لیتی دو دلوں کی خواہشات کی کتنی خوب صورتی سے تصویر کشی کی ہے۔

دور بہت دور چلو آؤ چلیں
چاندنی رات جہاں کیف لٹانے آئے
نور کی رو میں جوانی کو بہانے آئے
مے کے دامن میں محبت کے خزانے آئے

ہو کے مسرور چلو آؤ چلیں
دور بہت دور چلو آؤ چلیں

میکدہ یا شراب خانہ اردو شاعری اور دو غزل کا بہت پرانا موضوع ہے۔ ساقی کی بے اتفاتی اور دریا دلی کے تذکرے شاعری کے ذریعہ ہم تک پہنچتے رہے ہیں۔ مگر قتیل کے گیت سے آج کے پس منظر میں میکدہ کی ایک اور معنویت ابھر کر سامنے آئی ہے۔

سنسار جسے ٹھکراتا ہے ترپاتا ہے
وہ میخانے میں آکر جی بہلاتا ہے
لے پی لے تو بھی دکھیارے کہتی ہے سلونی شام
اک جام کھنکتا جام اٹھا لے جام کھنکتا جام

قتیل نے جتنے ہمہ جہت موضوعات اپنے گیتوں کے رنگ اور رس سجایا ہے اس کا احاطہ اس مختصر سے وقت میں ممکن نہیں مگر ضرورت اس بات کی ہے کہ اپنی غزلوں اور نظموں کی انفرادی خصوصیت کے باوجود گیت گذشتہ کل بھی قتیل سے پہچان تھے۔ آئندہ اور کل بھی رہیں گے۔

تمہارا۔
خواجہ عبدالغفور

●

"رونے روتے سودائی کی آواز تو بیٹھ گئی تھی مگر قتیل شفائی کی آواز تخلیقِ فن کرتے کرتے اور نکھر گئی ہے۔
مجھے اس تخاطب کا حق حاصل نہیں کہ میں نے اپنی تخلیق "کا گجر" قتیل شفائی کی گجر کے دم سے فروزاں کیا ہے۔
زندگی اور وارداتِ عشق، ایک ہی کیفیت کے دو نام تو نہیں مگر ایک ہی آئینے کے دو رُخ ضرور ہیں جن کا امتزاج شعر میں ہو تو باطنی کیفیات، افتادِ زمانہ کے تمام زخم ماتھے پہ سجا کر بھی رقصِ بسمل اور نوکِ خار پر جنوں کے اظہار کا اسلوب بنتی ہیں۔ قتیل شفائی نے ہمیں، خود کو زنجیر کر کے بھی نعرۂ منصور ادا کرنے کا حوصلہ دیا ہے۔

ترقی پسند تحریک کے دوران شاعری نے دو جہت اختیار کی تھیں۔ ایک مقصدی شاعری کہ جو شعری رمز اور ایمائیت سے بھی ماورا، صرف پروپیگنڈے کے لوازمات تک محدود رہا۔ دوسری جانب ایک گروہ ان شعرا کا تھا کہ جنہوں نے رومانوی اسلوب میں رچ کر زمانے کی چیرہ دستیوں کی نقاب کشائی کی ———— یہ الگ بحث ہے کہ حقیقت کے اظہار کے لئے ملمع کاری کی ضرورت ہے کہ برہنہ حقیقت ہی اس کی مقصدیت کی شہادت ہوتی ہے۔ مگر یہ حقیقت واضح ہے کہ شعرا اپنے عہد کا ابلاغ کرتا ہے اور قتیل شفائی نے ہمارے دور کے لئے اظہار کی اس منزل کی نشاندہی کر دی ہے۔

● ———— کشور ناہید

قتیل شفائی کے گیت

پریمی رومانی

قتیل شفائی اردو کے ایک اہم اور معروف شاعر ہیں۔ انہوں نے غزل اور نظم کے علاوہ گیت بھی تخلیق کئے ہیں۔ شعر و شاعری کی ان تمام اصناف میں ان کی منفرد رنگ شخصیت نمایاں طور پر جھلکتی ہے ان کا لب و لہجہ صاف ستھرا اور میٹھا ہوا ہے۔ اسی لئے ان کی شاعری خصوصاً ان کے گیت بہت مقبول ہو گئے ہیں۔ قتیل شفائی نے اس زمانے میں اپنی شاعری کا آغاز کیا جب شاعری میں اختر شیرانی کی رومانی نظموں کا بول بالا تھا اور ان کی نظموں کا سلمیٰ توجہ کا مرکز بن چکی تھی۔ رومانی نظموں کی یہی کیفیت قتیل کے دل و ذہن پر حاوی رہی اور اسی کیفیت کی رنگا رنگی نے ان کی شاعری کو جنم دیا۔ جہاں وہ اقبال۔ جوش اور فراق کی شاعری سے خاص طور پر متاثر ہیں وہاں انہوں نے اختر شیرانی۔ احمد ندیم قاسمی اور ن م۔ راشد کا اثر بھی واضح طور پر قبول کر لیا۔ چنانچہ ایک جگہ خود فرماتے ہیں ؛ اقبال۔ جوش۔ فراق۔ اختر شیرانی۔ احمد ندیم قاسمی۔ ن۔م۔ راشد نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے قتیل نے اپنی شاعری میں کئی نئے تجربے کئے ہیں۔ یہ تجربے ان کے گہرے مشاہدات اور داخلی اور خارجی واقعات پر مبنی تھا اور یہی سنسنی خیز اور ان کا نیا اور انوکھا معصومانہ رجحان بھی ان کے اشعار میں ڈھل کر شبنم سے دھلے ہوئے صبح نو کی طرح آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگتے ہیں۔ قتیل کی شاعرانہ — عظمت کے بارے میں نرمل کمار شاد تحریر فرماتے ہیں۔

> ان کی مقبولیت کا راز ان کے لب و لہجہ کی شیرینی اور گہری رومانیت میں مضمر ہے اس رومانیت کا اکتساب انہوں نے احمد ندیم قاسمی کے اثرات سے کیا ہے لیکن اپنے انفرادی تجربوں اور ذاتی کاوشوں کی رنگ آمیزی سے ان اثرات کو نیا حسن اور نئی دلکشی عطا کی ہے۔ [1]

قتیل ایک کامیاب گیت کار ہیں۔ ان کے گیتوں میں تازگی، مٹھاس اور اپنا پن ہے۔ ان گیتوں میں جہاں ایک طرف رقص و موسیقی کا ایک حسین منظر جلوہ گر ہوتا ہے وہاں دوسری طرف یہ گیت کیف و سرور و سرمستی سے بھی سرشار ہیں۔ قتیل نے اپنے الو کھے اسٹائل کو بیدار کر کے ان گیتوں میں نغمگی کا حسن پیدا کر دیا ہے۔ اس نغمگی سے قاری کے ہونٹ خود بخود رقص کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ گیت نگاری میں قتیل کی آواز کوئی نئی نہیں بے شمار شعرا نے اچھے اچھے گیت تخلیق کئے ہیں، لیکن قتیل نے عام روش سے ہٹ کر جو منفرد

تجربات کئے ہیں جن میں ایک نیا اور انوکھا تجربہ ان کے گیتوں میں تال اور سرگم کا ہے۔ ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی تحریر فرماتے ہیں:۔

> ۔ قتیل کے یہاں پنجاب کا صحت مند رومان ہے اور ان کی وہی نظمیں انکی انفرادیت متعین کرتی ہیں جن کا تعلق عشقیہ جذبات سے ہے یا صحت کی زندگی کے کسی روپ کو پیش کیا گیا ہے ان کی شاعری، ہلکی پھلکی غنائی شاعری ہے اور ان کے مزاج کو گیتوں سے بہت مناسبت معلوم ہوتی ہے۔ ؎

قتیل کے مندرجہ ذیل گیتوں میں بے قراری، محبوب کی یاد، ہجر و وصال کی کیفیت، چپ چپ کے آنسو بہانے اور اپنے ساز دل کو ان آنسوؤں کو چھپانے کے جذبات کا احساس اپنے پورے قد و مد کیساتھ ابھرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس میں سے ننھے منے بول ہیں جو دلوں کو تڑپانے اور بہلاتے ہیں۔

بیتے برس میں جتنی چاندنی راتیں ہیں،
بکھری ہوئی ان سب میں اپنی باتیں ہیں
تجھ سے مل کر پریت مری لہرائی تھی
پاس سے ہو کر میں گنگنا گائی تھی
چپ چپ سے رہتے ہیں اب گنگناتے
شام سویرے سے اوجھا

●

ذرا تم جھانک کر دیکھو کہ باہر کی فضا کیا ہے
جہاں بھی کوئی منظر ہے وہاں اک حشر برپا ہے
ذرا سی دیر میں جب یہ گھڑی بھی ٹوٹ جائیگی
نہ ہم کو نیند آئے گی نہ تم کو نیند آئے گی

●

گوری پیا پکار نا ہے
من ہی من میں تڑپے پھر بھی کس کے سنگار نا ہے
گوری پیا پکار نا ہے

قتیل شفائی کے ان گیتوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہاں ساز اور نغمگی کا ایک متوازن انداز ملتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا، قتیل کے گیتوں میں اس کیفیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> ۔ قتیل شفائی کے گیتوں کا امتیازی وصف ان کی نغمگی اور جھنکار ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ رقص اور گیت کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور گیت کی لے میں رقص کرتے ہوئے قدموں کی جھنکار بھی شامل ہوتی ہے۔ لیکن جس طرح رقص کی جھنکار نے قتیل شفائی کے گیتوں کا احاطہ کیا ہے۔ اس کی مثال عام طور سے نہیں ملتی ؎

قتیل کے گیتوں میں منظر کشی کا بسط اور پھیلا ہوا رجحان پایا جاتا ہے اور یہ ان کو کامیاب گیت کار تسلیم کرانے کی سب سے بڑی ضمانت ہے وہ اپنے گیتوں میں خوبصورت اور زیادہ سے زیادہ دلکش مناظر پیش کرنے کے روادار ہیں۔ اس طریقہ کے اپنانے سے انہوں نے اپنے قارئین کا دل موہ لیا ہے قتیل نے فضا سازی کا یہ رجحان اپنا کر اپنے گیتوں کا رنگ اور بھی تیکھا کر دیا ہے۔ وہ سارے قصے کو بڑے ہی دلنواز انداز اور سلیقے سے سمجھاتے اور پیش کرتے ہیں۔ اس کے گیتوں میں ان تین چیزوں کا خاص طور پر احساس ہوتا ہے۔

(۱)۔ تمہید

(۲)۔ مرکزی خیال

(۳)۔ اختتامیہ

قتیل شفائی ارد گرد کے مناظر کو تمہید کے طور پر سمیٹ لیتے ہیں اس طرح سے قاری کو ایک نئے عالم کے وجود کا احساس ہوتا ہے اس احساس سے قارئین کو مرکزی خیال کی جانکاری میں زیادہ دشواری پیش نہیں آتی ہے بلکہ وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور اختتامیہ تک پہنچتے پہنچتے ان کے گیت سارے مناظر اپنے اندر سمیٹ لیتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے اکثر گیتوں میں کبھی پگھلتی ہوئی چاندنی فضاؤں میں نمودار ہوتی ہے اور کبھی ہواؤں میں تیرتی ہوئی بے چینیاں محسوس ہوتی ہیں۔ کبھی پربت کے دامن سے آہستہ آہستہ چاند ظاہر ہونے لگتا ہے اور کبھی سورج کی سنہری کرنیں سارے عالم کو اپنی پیٹ میں لیتی ہیں۔ کبھی بھیگی راتوں میں تن بدن کی آگ خود بخود بجھ جاتی ہے اور کبھی پہاڑوں اور جھیلوں کے پر بہار مناظر سامنے آجاتے ہیں۔ انہی کیفیات کا سنگم بار بار سامنے آتا ہے۔ چند مثالیں۔

قدرت نے کیا رنگ دکھایا۔
دکھیا کے گھر دکھیا آیا
اک دو جے سے مانگ رہے ہیں خوشیوں کی خیرات
دیا جلے ساری رات

●

بکھر جائے گی جب پگھلی ہوئی چاندی فضاؤں میں
تو کچھ بے چینیاں سی تیر جائیں گی ہواؤں میں
یہ کیف ہو اک سوئی تمنا کو جگائے گی
نہ ہم کو نیند آئے گی نہ تم کو نیند آئے گی

●

جیسے شبنم پہ تھرکتی ہے سورج کی کرن آج پھر جھوم رہا ہے میرا من
کوئی تصویر خیالوں میں نظر آتی ہے
پاس کوئی نہیں آواز مگر آتی ہے

چاپ قدموں کی بن جاتی ہے دل کی دھڑکن　　آج پھر جھوم رہا ہے میرا من
میرے مچلے ہوئے خوابوں کا مہکتا چمن　　آج پھر جھوم رہا ہے میرا من

قتیل کے گیتوں کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ ان کے گیت پیکروں میں ڈھل کر سامنے آجاتے ہیں ان پیکروں کے استعمال سے ان کے گیتوں میں محاکاتی عمل پیدا ہوگیا ہے۔ مثلاً انہوں نے چاندنی راتیں۔ بے سدھ۔ ہرجائی پن۔ پیلی چاندنی۔ پربت کا دامن۔ برہن کیساتھ۔ تاج اگن کا۔ آنسوؤں کی سوغات۔ آس کا جگنو۔ بھیگی پلکیں۔ آشا کی کلیاں وغیرہ جیسی تراکیب کو استعمال کر کے ان گیتوں میں اور بھی روح پھونک دی ہے۔ ان تراکیب کے استعمال سے ان کے گیتوں میں اور بھی جان پیدا ہوگئی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ایک امیج بھی۔ جو کافی دیر تک دل و دماغ پر حاوی رہتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ قتیل شفائی نے نئے نئے الفاظ کو شعری قالب میں ڈھال کر ایک انوکھا تخیل پیدا کر دیا ہے۔ یہ تخیل ان کے گیتوں میں ڈھل کر مجرد تصورات کی شبیہہ سازی کے اعلیٰ نمونے پیش کرتا ہے۔ اگرچہ قتیل ان تراکیب کو استعمال کرنے میں کہیں کہیں بہک بھی گئے ہیں پھر بھی وہ ان میں ایک ایسی جان پیدا کر دیتے ہیں کہ گراں نہیں گذرتیں۔ ڈاکٹر حامدی کاشمیری قتیل کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنی کتاب میں لکھتے ہیں

"قتیل شفائی کے اسلوب میں بہرکیف، انفرادیت کے نشان ملتے ہیں وہ لفظوں اور ترکیبوں کی چھپی ہوئی معنویت کا شعور رکھتے ہیں۔" [1]

اس بیان سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ قتیل کے کلام میں جہاں گہرائی ہے وہاں ان کے یہاں گیرائی بھی ملتی ہے۔ خاص طور پر ان کے گیتوں کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ان میں یہ عمل صاف نظر آتا ہے۔ مثلاً

وہ دیکھو چاند بھی پربت کے دامن سے نکل آیا
بہت گھبراؤ گے ایسے میں گر ماتھے پہ بل آیا
الگ رہنے سے دونوں کو یہ تنہائی ستائے گی
نہ ہم کو نیند آئے گی نہ تم کو نیند آئے گی

●

بھولنے والے یاد تجھے میں کرتی ہوں
پر تیرے ہرجائی پن سے ڈرتی ہوں
الٹا تو الزام نہ مجھ پر دھرتا ہو
یاروں میں مجھ کو بدنام نہ کرتا ہو
میں نے تو سکھیوں میں گائے گن تیرے
شام سویرے ——— او سجنا

●

میرے بچھڑے ہوئے خوابوں کا مہکتا ہے چمن آج پھر جھوم رہا ہے میرا من
کھو گئی پیار کی ٹھنڈک میں جلن آج پھر جھوم رہا ہے میرا من
میرے شانوں پہ ہے بکھری ہوئی زلفوں کی گھٹا
جانے کیا کہتی ہے مجھ سے تیرے آنچل کی ہوا
اپنے ہی سائے سے شرمانے لگا میرا بدن آج پھر جھوم رہا ہے میرا من

قتیل شفائی کے گیتوں کا ایک اہم وصف یہ بھی ہے کہ ان کے یہاں ارضی تشبیہات اور استعارات کا کثیر تعداد میں استعمال ملتا ہے بہت سارے گیت کاروں کے گیتوں میں تشبیہات اور استعارات کی جھلکیاں اپنی پوری شد و مد کے ساتھ ابھرتی ہیں جن میں شکیل بدایونی ۔ مجروح سلطانپوری ۔ ساحر لدھیانوی ۔ منیر نیازی ۔ تنویر نقوی ۔ تاج سعید ۔ جمیل الدین عالی ۔ اور ناصر شہزاد وغیرہ کے نام بطور خاص لئے جاسکتے ہیں ۔ ان گیت کاروں نے جہاں ایک طرف قدیم شعرا کی استعمال شدہ تشبیہات اور استعارات کو اپنے گیتوں میں جگہ دے کر روایتی انداز بیان کو برقرار رکھا وہاں دوسری طرف اپنے زور قلم سے اس میں ایک ایسا خوابوں کا تاج محل تعمیر کردیا ہے کہ پڑھنے والے جھوم اٹھتے ہیں ۔ جہاں تک قتیل کے گیتوں میں اس عمل کے دخل کا تعلق ہے وہ ایک نئے ڈھنگ اور ایک نئے انداز سے روایت پر قابو پاتے ہیں ۔ ان کے ابتدائی گیتوں میں اگرچہ روایتی تشبیہات اور استعارات بھی ملتی ہیں لیکن جہاں تک ان کے نئے گیتوں کا تعلق ہے ۔ ان میں نیاپن اور انوکھاپن ضرور ملتا ہے ۔ وہ روایت سے بغاوت بھی نہیں کرتے ہیں اور عصری حیثیت سے منہ بھی نہیں موڑ لیتے ہیں ۔ اس لئے اس کے پیش نظر اگر یہ کہا جائے کہ ان کی شاعری قدیم اور جدید تجربات کا نچوڑ ہے تو بے جا نہ ہوگا ۔ ان کے گیتوں میں جدت کے ساتھ ساتھ روایت کی چنگاری بھی کہیں کہیں شعلہ فگن ہو جاتی ہے ۔ ساول احمد کی نظر میں، قتیل شفائی کے یہاں جذباتیت کی آنچ کچھ ضرور ... سے زیادہ تیز ہے ۔ لیکن شاعرانہ بے ساختگی اور تغزل کے پختہ عناصر نے انہیں منضبط رکھا ہے ۔ ان کے یہاں جدید استعاروں کے ساتھ ہندی کے سبک اور نرم لفظوں کا استعمال بھی فنکارانہ ڈھنگ سے کیا گیا ہے جو غنائیت کا حسن ہے اور گیت جیسی کیفیت پیدا کرتا ہے اور ایک طرح سے تخیلی واقفیت کی پہچان ہے ۔ اس بیان سے معلوم ہو جاتا ہے کہ قتیل کے گیت رنگا رنگ تشبیہات ، انوکھے استعارات اور نرم اور سبک الفاظ کے مرقع ہیں ۔ ان وصفوں کے علاوہ ان میں غنائیت اور تغزل کے سچے جذبات بھی پائے جاتے ہیں ۔ چند گیت پیش خدمت ہیں :۔

سوامی سمجھے گھونگھٹ پیچھے ہوگا چاند کا ٹکڑا
گھونگھٹ کے پٹ کھلے تو نکلا مرجھایا سا مکھڑا
ڈھانپ کے رونے مرجھائے مکھڑے کو البیلی
دلہن نئی نویلی

●

کیوں بنسی کوئی بجاتا ہے
اب تان اگر کوئی گونجے گی میں موت کا راگ سناؤں گی
بنسی نہ اگر خاموش ہوئی میں تڑپ تڑپ مر جاؤں گی

بیتے دن یاد دلاتا ہے
کیوں سینی کوئی بجاتا ہے
تیرا میرا دل دھڑکن کا ناتا تھا
میں نہ ملوں تو چین تجھے کب آتا تھا
یاد تو ہوں گے پیار بھرے وہ دن تجھکو
دنیا سونی لگتی تھی مجھ بن تجھ کو
کرتا رہا تو میری گلیوں کے پھیرے

شام سویرے ۔ او سجنا

قتیل شفائی کی گیت نگاری کا بنیادی وصف ان کی زبان کی تازگی اور مٹھاس ہے۔ اس زبان کے استعمال سے ان کے گیتوں میں ایک نئی کیفیت اجاگر ہوتی ہے۔ قتیل اردو زبان کی تو مہندی کے میٹھے اور رسیلے الفاظ کو بھی خوب برتتے ہیں۔ ان کے گیتوں میں اس زبان کا استعمال سے ایک نئی فضا کا احساس ہوتا ہے زبان و بیان کے استعمال کا یہ رویہ قتیل کا ایک اہم اور صحت مند تجربہ ہے۔ احساس تجربے کی کیفیت ان کو اپنے ہم عصروں میں سے ایک ممتاز مقام دلاتی ہے مثلاً ان کے گیتوں میں افلاک ۔ قاعدہ ۔ صلہ ۔ انگشت ۔ جنوں ۔ ایما ۔ منو گفن ۔ معنوم ۔ لوتی ۔ خس و خاشاک ۔ نم آلود ۔ عجز ۔ مرد و زندگی ۔ آبدیدہ ۔ انبوہ غفیر جیسے الفاظ کے ساتھ ساتھ ۔ دیا ۔ نیر ۔ برہن ۔ اگن ۔ اندھیارے ۔ دکھیا ۔ دو ہے ۔ باجی نین ۔ دیپک ۔ موہے ۔ آنسا ۔ پابت ۔ چھنک ۔ چھن چھن ۔ گوری ۔ بوندیں ۔ سجنا ۔ برسے ۔ پریت ۔ گگنا ۔ سکھیاں وغیرہ جیسے ہندی کے نرم اور سبک الفاظ کا استعمال کبھی تقریباً ہر جگہ پر کی دیکھا جاسکتا ہے قتیل کے گیتوں میں الفاظ کا یہ خوبصورت اور قابل توجہ منظر کافی متاثر کرتا ہے ۔ چند مثالیں ۔

ہم سے روٹھ کر گدگدایا ۔ ہنسایا ۔ ہنسا کر ۔ مجھ کو بتایا ـــــ کہ وہ آ گئے ہیں
جھکے ہوئے نینوں نے جگایا ۔ جگایا ۔ جگا کر یہ مجھ کو بتایا ـــ کہ وہ دن آ گئے ہیں

مہکنے لگا پھر گلابی سویرا
ملا مجھ سے چھڑا ہوا پیار میرا

محبت بھرا گیت گنگنا دیا ۔ ۔ سمجھایا سمجھا کر یہ مجھ کو بتایا ـــ کہ وہ آ گئے ہیں

●

میں جو انگڑائی لوں دل میرے ہو کے اٹھے
میری ہر سانس میں کوئی سی دھڑکن اٹھے
کیا اسی چیز کو کہتے ہیں محبت کی لگن
آ کے پھر جھوم رہا ہے میرا من

کیوں ہنسی کوئی بھاتا ہے
برگد کے گھنیرے سائے میں جب گونجے گی آواز کوئی
بس جان پہ کھیل تو جاؤں گی ، پر کھل جائے گا راز کوئی
بدنامی سے دل گھبراتا ہے
کیوں ہنسی کوئی بھاتا ہے

قتیل شفائی کے گیتوں کا بنیادی موضوع عورت کی نفسیات ہے۔ وہ عورت کو ہر پہلو اور ہر زاویۂ نگاہ سے ناپنے تولنے کے روادار ہیں ان کے خیال میں عورت دنیا میں سب سے نازک اور انوکھی شے ہے اور اس شے کو سنوارنا اور سجانا مرد کا کام ہے۔ ان کے مطابق مرد میں ایک بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ عورت کو صرف جنسی زاویۂ نگاہ سے دیکھتا ہے۔ عورت صرف جنس اور طوائف کا ایک پیکر ہی نہیں بلکہ محبت پیار اور خلوص کا ایک نادر نمونہ ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا قتیل کے گیتوں میں اس رجحان کی طرف متوجہ کراتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

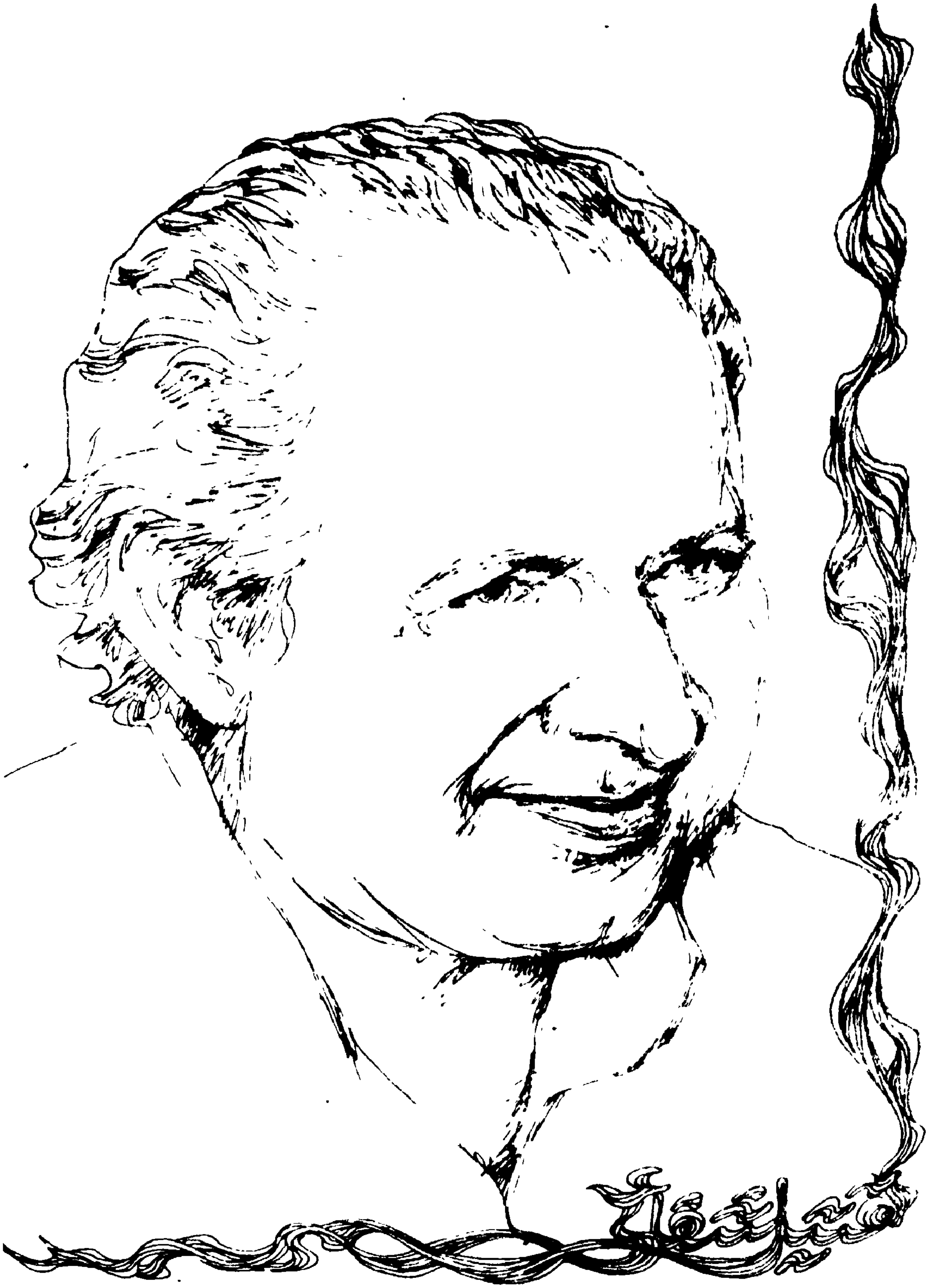
"قتیل کے گیت میں عورت اس پنچھی کی طرح ابھری ہے۔ جسے تازہ تازہ پر عطا ہوئے ہوں اور جو ابھی اڑنے کے قابل تو نہ ہوئی ہو۔ تاہم جس کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ نے نغمے میں ایک انوکھی جھنکار کا اضافہ ضرور کر دیا ہو۔" ۱؎

قتیل عورت کی سماج میں ہر طرح ترجمانی کرتے اور وکالت کرتے ہیں۔ عورت کے سسرال کا ظلم و ستم ہو یا میکے کی طرف مراجعت، اس کے خاوند سے بدگمانیاں ہوں یا شب وصل کا انوکھا منظر، گھر گرہستی ہو یا بازار میں نیلام ہونے کا منظر، رو ٹھی یا گھر کے کونے میں سہمی سہمی عورت کی تصویر کشی ہو یا میرا کی طرح سنسار تیاگ کر کے کرشن پجارن۔ قتیل جیسے شاعر کا قلم برابر چلتا رہتا ہے۔ ان تمام واقعات کو قتیل نے اپنی شاعری خصوصاً اپنے گیتوں میں جگہ دی ہے۔ اور اس میں وہ بے حد کامیاب نظر آتے ہیں۔ اس کو ان کا اپنا انوکھا طرز عمل کہیئے یا اپنے ذاتی مشاہدات اور تجربات کا ردعمل، بات برابر آگے بڑھتی ہے۔

قتیل شفائی کے گیت عشقیہ جذبات سے سرشار ہیں۔ ان میں رومان اور سیکس کی بے شمار جھلکیاں کھل کر سامنے آتی ہیں۔ قتیل اپنے گیتوں میں یہ رومان پرانے اور فرسودہ زاویۂ نگاہ سے بیان نہیں کرتے ہیں بلکہ خوبصورت سادہ اور عام فہم زبان میں خوبصورت ترکیبوں، تشبیہوں، اور استعاروں کیساتھ ایک نئے انداز سے بیان کرتے ہیں۔ ان کے گیتوں میں نہ صرف عاشق اور محبوب کے شوخ جذبات کی نشاندہی ہوتی ہے بلکہ ساتھ ہی ساتھ وہ آج کل کے سماج، حکومت، مذہب اور اخلاق کو بڑے میٹھے اور پرلطف انداز سے طنز کا نشانہ بھی بنا دیتے ہیں۔ قتیل شفائی کو اپنے وطن پنجاب سے والہانہ عقیدت ہے۔ اسی لئے ان کے گیتوں میں پنجاب کی ہی فضا اور اس ماحول کا البیلا پن نکہت فشاں ہے۔

قتیل نئی نسل کا شاعر نہیں ہے۔ لیکن اس کے نغمے سدا بہار ہیں۔ ان میں ایک عجیب البیلا پن ایک عجیب مستانہ روی، ایک عجیب نیا پن ہے۔ جو دلوں میں بے نام درد کی ٹیس جگاتا ہے ـــــ قتیل کی شاعری اپنے اچھوتے اور کنوارے اسلوب اور موضوع کے برتاؤ کی وجہ سے زندہ رہے گی۔

گیت



باج رہی شہنائی، آئی دُلہن نئی نویلی
دُلہن نئی نویلی
سیاہی جیسے گھونگھٹ پیچھے ہوگا چاند کا ٹکڑا
گھونگھٹ کے پٹ کھلے تو نکلا مرجھایا سا مکھڑا
ڈھانپ کے رونے مرجھانے سے مکھڑے کو البیلی
دُلہن نئی نویلی

نئی نویلی کا یہ سواگت؟ نند نہ ساس نہ دیور
میکے سے بھی کیا لائی ہے؟ کھوٹ کے پیلے زیور
اب کیا کسی سے آنکھ ملائے؟ سوچے پڑی اکیلی
دُلہن نئی نویلی

بین کرے یا چین سے سوئے؟ روئے یا مسکائے
آج تو گزرا، کل کیا ہوگا؟ سوچ سوچ گھبرائے
جیون کے اس الجھاوے میں بن گئی ایک پہیلی
دلہن نئی نویلی
باج رہی شہنائی، آئی دلہن نئی نویلی

دیکھ ری دیکھ سہیلی ——— میں جھولا جھولی
بن کر نئی نویلی ——— میں جھولا جھولی

وہ پردیسی ہرجائی جب لوٹ کے دیس نہ آیا
میرے بیاکل نینوں میں تب گھور اندھیرا چھایا
نینوں سے جل برس رہا تھا
دکھیارا من ترس رہا تھا
ایسے میں ایک اور چھبیلا من میں آن سمایا
چاند ستارے جس کی کایا، چاندنی جس کی چھایا،
اُس نے میرے من کی دھڑکن اپنے من میں لے لی
دیکھ ری دیکھ سہیلی ——— میں جھولا جھولی
بن کر نئی نویلی ——— میں جھولا جھولی

وہ پردیسی کیسا راجہ؟ اور میں کیسی رانی!
اب دُنیا کو جان چکی ہوں پہلے تھی دیوانی
من کے چھالے پھوڑ چکی میں
یاد کے درپن توڑ چکی میں
ہرجائی کی یاد میں کاٹوں کیوں بھرپور جوانی
مجھ کو روتا چھوڑ کے جائے آپ کرے من مانی
کب تک اپنا جی للچاؤں؟ برسوں رہی اکیلی
دیکھ ری دیکھ سہیلی ——— میں جھولا جھولی
بن کر نئی نویلی ——— میں جھولا جھولی

مجھے آئی نہ جگ سے لاج ، میں اتنے زور سے ناچی آج
کہ گھنگھرو ٹوٹ گئے

کچھ مجھ پہ نیا جوبن بھی تھا
کچھ پیار کا پاگل پن بھی تھا
کبھی پلک پلک مری تیر بنی ،
کبھی زلف مری زنجیر بنی ،
لیا دل ساجن کا جیت ، وہ چھیڑے پائلیا نے گیت
کہ گھنگھرو ٹوٹ گئے

میں بسی تھی جس کے سپنوں میں
وہ گنے گا اب مجھے اپنوں میں
کہتی ہے مری ہر انگڑائی
میں پیار کی نیند چرا لائی
میں بن کے گئی تھی چور ، پائلیا تھی میری کمزور
کہ گھنگھرو ٹوٹ گئے

دھرتی پہ نہ میرے پیر لگیں
بن پیا مجھے سب غیر لگیں ،
مجھے رنگ ملے ارمانوں کے
مجھے پنکھ لگے پروانوں کے
جب ملا پیا کا گاؤں ، تو ایسا لچکا میرا پاؤں
کہ گھنگھرو ٹوٹ گئے

موہے چاندی کی پائل منگا دو سجن

خالی پیروں سے پنگھٹ کو میں کیا چلوں
اپنی سکھیوں کو دیکھوں تو من میں جلوں
وہ تو ناچیں میں شرما کے منہ پھیر لوں
موہے پنگھٹ کی رانی بنا دو سجن
موہے چاندی کی پائل منگا دو سجن

کل کو میلا لگے گا سجن گاؤں میں!
ہوگی جھنکار ہر آم کی چھاؤں میں
پھر تو کانٹے چبھیں گے بہاں پاؤں میں
مورے قدموں میں چاندی بچھا دو سجن
موہے چاندی کی پائل منگا دو سجن

اب تو پائل بنا کل نہ جاؤں گی میں!
تو سے چاندی کی پائل منگاؤں گی میں
اپنی سکھیوں سے آنکھیں ملاؤں گی میں

مورے سپنوں کو سندر بنا دو سجن
موہے چاندی کی پائل منگا دو سجن

میرا دوپٹہ لہرا رہا ہے
ساون کا بادل یاد آ رہا ہے

پیتم نے مجھ کو ململ منگا دی
میری خوشی کی دنیا بسا دی
رنگ اس کی خاطر میں نے منگایا
ابرک ملا کر اس کو لگایا

تارے فضا میں چمکا رہا ہے
میرا دوپٹہ لہرا رہا ہے

ہلکا گلابی رنگ اس پہ آیا
جیسے شفق کا پانی میں سایا
جیسے فضا میں شعلہ سا بھڑکا
رنگت پہ اپنی اترا رہا ہے
میرا دوپٹہ لہرا رہا ہے

شبنم کے پتو اس کو ہوا دو
سورج کی کرنو اس کو سکھا دو
آئے نہ اس میں کوئی خرابی
پہلے تھا گورا اب ہے گلابی
رنگیں فسانے دہرا رہا ہے
میرا دوپٹہ لہرا رہا ہے

سہیلی! ترا بانکپن لٹ گیا — آئینہ توڑ دے
تیری آرائشوں کا چمن لٹ گیا — آئینہ توڑ دے

تیری نیندیں لٹیں!
تیرے سپنے لٹے!

جو بھی نغمے لٹے — تیرے اپنے لٹے
تیرا تن لٹ گیا — تیرا من لٹ گیا
تو لٹی اور تیرا چلن لٹ گیا — آئینہ توڑ دے
سہیلی! ترا بانکپن لٹ گیا — آئینہ توڑ دے
تیری آرائشوں کا چمن لٹ گیا — آئینہ توڑ دے

اب وہ غنچے کہاں!
اب وہ کلیاں کہاں!

وہ بہاریں کہاں — رنگ رلیاں کہاں
باغ سونے ہوئے — رنج دونے ہوئے
آج اک ایک سروسمن لٹ گیا — آئینہ توڑ دے
سہیلی ترا بانکپن لٹ گیا — آئینہ توڑ دے
تیری آرائشوں کا چمن لٹ گیا — آئینہ توڑ دے

اپنا دل بیچ کر!
اپنا گھر بیچ کر!

اپنی ہر سانس کو — دربدر بیچ کر
آج اکیلی ہے تو — اک پہیلی ہے تو
تیرا سب کچھ سرانجمن لٹ گیا — آئینہ توڑ دے

شاعرانہ سی ہے زندگی کی فضا، آپ بھی زندگی کا مزا لیجئے
میں غزل بن گئی آپ کے سامنے، شوق سے اب مجھے گنگنا لیجئے
آپ سن تو رہے ہیں مرے دل کی لے، اس میں بے نام سی اک اداسی بھی ہے
اس اداسی میں نغمہ کوئی چھیڑ کر، ایک بے چین دل کی دعا لیجئے
آپ کے پیار کا جو بھی معیار ہے، اس سے کب جانِ جاں مجھ کو انکار ہے
جس طرح آپ چاہیں نظر آؤں میں مجھ کو ہر رنگ میں آزما لیجئے

کہاں ہو تم سہیلیو ــــ جواب دو ــــ

میں سن رہی ہوں دور سے تمہاری گنگناہٹیں
فضا میں تیرنے لگی ہیں نرم نرم آہٹیں!
میں کس طرح تمہارے ساتھ ناچوں اور گا سکوں
نہ تم مجھے بلا سکو نہ میں تمہیں بلا سکوں

تڑپ رہی ہوں میں یہاں کبھی تو مجھ سے آملو
کہاں ہو تم سہیلیو ــــ جواب دو

میں جل رہی ہوں آج اپنے آنسوؤں کی چھاؤں میں
دکھائی جو نہ دے سکیں وہ بیڑیاں ہیں پاؤں میں
بجھا بجھا ہے دل مرا میں ظلمتوں کے بس میں ہوں
سبھی چمن جسے کہیں میں اس حسیں قفس میں ہوں

میں گھٹ کے مر چلی یہاں تم آکے مجھ کو تھام لو
کہاں ہو تم سہیلیو ــــ جواب دو!

اک چاند گیا اک چاند آیا
برکھا نے رنگ جمایا ہے
بوندوں نے شور مچایا ہے
اک چاند کو بدلی ڈھانپ گئی
اک چاند نے آنچل سرکایا
اک چاند گیا اک چاند آیا
جب سارا جگ سنسان ہوا
ہرا جیارا ویران ہوا
جب گھور اندھیرے پھیل گئے
اک چاند نے رین کو چمکایا
اک چاند گیا اک چاند آیا
آکاش کے چاند کو جانے دو
دھرتی کے چاند کو آنے دو
وہ دُور، یہ اپنی گود میں ہے
اس چاند کو میں نے اپنایا
اک چاند گیا اک چاند آیا

مرا دل کیوں دھڑکتا ہے
سہیلی مجھ کو بتلا دے

جو سینے میں خلش ہے تو اُسے پہچانتی ہو گی
جوانی کیا اسی کا نام ہے تو جانتی ہو گی
بتا دے کون سے موسم میں یہ شعلہ بھڑکتا ہے۔ مرا دل کیوں دھڑکتا ہے

نہ جانے میری سانسوں میں یہ اک جھنکار سی کیا ہے
بتا پائل جو میں سنتی ہوں وہ جھنکار سی کیا ہے
خیالوں میں کوئی گھونگھٹ اٹھا کر مجھ کو تکتا ہے۔ مرا دل کیوں دھڑکتا ہے

مرا دل جھومتا ہے گیت اپنے آپ سن سن کر
جوانی مسکراتی ہے کسی کی چاپ سن سن کر
میں اکثر چونک پڑتی ہوں جو پتہ بھی کھڑکتا ہے۔ مرا دل کیوں دھڑکتا ہے

انوکھی سی کوئی تصویر دل کو گدگداتی ہے
نہیں ہے سامنے کوئی مگر آواز آتی ہے
مرے سینے سے رہ رہ کر مرا آنچل سرکتا ہے۔ مرا دل کیوں دھڑکتا ہے
سہیلی مجھ کو بتلا دے

یہ سب تیری دین ہے داتا میں اس میں کیا بولوں
تو نے جیون جوت جگائی
میں نے پگ پگ ٹھوکر کھائی
جس رستے پر ڈالے تو میں اس رستے پر ہولوں
یہ سب تیری دین ہے داتا میں اس میں کیا بولوں
تو نے تو موتی برسائے
میں نے کالے کنکر پائے
میں جھولی میں کنکر لے کر موتی جان کے رولوں
یہ سب تیری دین ہے داتا میں اس میں کیا بولوں
تو نے پھول سہانے بانٹے
میرے بھاگ میں آئے کانٹے
میں جھولی میں کانٹے لے کر پھول سمجھ کر تولوں!
یہ سب تیری دین ہے داتا میں اس میں کیا بولوں!
تو نے بھیجے امرت پیالے
پڑ گئے مجھ کو جان کے لالے

میں بِس کو بھی امرت جانوں تیرا بھید نہ کھولوں!
یہ سب تیری دین ہے داتا میں اس میں کیا بولوں

تیرا آنچل رنگ رنگیلا رنگ رنگ میں باس نئی
میرے من کی آس پرانی تیرے تن کی پیاس نئی

تو بگیا کی تتلی بن کر پھول پھول پر جھولے
کلی کلی سے پیار بڑھائے رُت رُت کے دکھ بھولے
ایک سماں ہے تجھ کو ساون ہو یا سرسوں پھولے
تیرا جوبن ایک پہیلی، تیری آس نراس نئی
تیرا آنچل رنگ رنگیلا رنگ رنگ میں باس نئی

روپ ترنگ میں تیری منہ پھٹ چنچلتا اترائے
انگ انگ میں سبھی سجائی سندرتا بل کھائے
سنگ سنگ ان دیکھے سپنوں کی شوبھا لہرائے
جیون کے ہر موڑ پہ تیری آس رچائے راس نئی
تیرا آنچل رنگ رنگیلا رنگ رنگ میں باس نئی

ایک اڑان سے تو اکتائے بار بار پر تولے
ایک چال نہ بھائے تجھ کو قدم قدم پر ڈولے
اس پر بھی من مورکھ میرا تیری ہی جے بولے
میرے ساتھ پرانی چھایا، کایا تیرے پاس نئی
تیرا آنچل رنگ رنگیلا رنگ رنگ میں باس نئی

اِک جام کھنکتا جام اُٹھا لے جام کھنکتا جام

سنسار جسے ٹھکراتا ہے، تڑپاتا ہے
وہ میخانے میں آکر جی بہلاتا ہے
لے پی لے تو بھی دکھیارے کہتی ہے سلونی شام
اک جام کھنکتا جام اُٹھا لے جام کھنکتا جام

سنسار میں یہ دن رین کہاں، سکھ چین کہاں
کچھ پئے بنا یہ نیند میں ڈوبے نین کہاں
دُکھ درد کے مارے انساں کو ملتا ہے یہاں آرام
اک جام کھنکتا جام اُٹھا لے جام کھنکتا جام

جو مورکھ ہوش میں رہتے ہیں، دکھ سہتے ہیں
جو بے سُدھ ہیں وہ دُرد دکھوں سے رہتے ہیں

تو بے ہوشی میں ڈوب کے اپنا بھول بھی جا انجام

اِک جام کھنکتا جام اُٹھا لے جام کھنکتا جام

کیوں ہم سے خفا ہو گئے اے جانِ تمنّا
بھیگے ہوئے موسم کا مزا کیوں نہیں لیتے

یہ رات، یہ برسات، یہ ساون کا مہینہ
ایسے میں تو شعلوں کو بھی آتا ہے پسینہ
اس رُت میں غریبوں کی دُعا کیوں نہیں لیتے
بھیگے ہوئے موسم کا مزا کیوں نہیں لیتے

دیکھو تو ذرا جھانک کے باہر کی فضا میں
برسات نے اِک آگ لگا دی ہے ہوا میں
اس آگ کو سینے میں دبا کیوں نہیں لیتے
بھیگے ہوئے موسم کا مزا کیوں نہیں لیتے

آتا ہے کسے راس جدائی کا یہ عالم!
تڑپیں گے اکیلے میں اُدھر آپ اِدھر ہم
دِل، دِل سے، میری جان مِلا کیوں نہیں لیتے
بھیگے ہوئے موسم کا مزا کیوں نہیں لیتے

زندگی میں تو سبھی پیار کیا کرتے ہیں
میں تو مر کر بھی مری جان تجھے چاہوں گا

تو مِلا ہے تو یہ احساس ہوا ہے مجھ کو — یہ مِری عمر محبت کے لئے تھوڑی ہے
اِک ذرا سا غمِ دوراں کا بھی حق ہے جس پر — میں نے وہ سانس بھی تیرے لئے رکھ چھوڑی ہے
تجھ پہ ہو جاؤں گا قُربان تجھے چاہوں گا
میں تو مر کر بھی مری جان تجھے چاہوں گا

اپنے جذبات میں نغمات رچانے کے لئے میں نے دھڑکن کی طرح دل میں بسایا ہے تجھے
میں تصور بھی جدائی کا بھلا کیسے کروں میں نے قسمت کی لکیروں سے چرایا ہے تجھے

پیار کا بن کے نگہبان تجھے چاہوں گا
میں تو مر کر بھی مری جان تجھے چاہوں گا

تیری ہر چاپ سے جلتے ہیں خیالوں میں چراغ جب بھی تو آئے جگاتا ہوا جادو آئے
تجھ کو چھو لوں تو پھر اے جانِ تمنا مجھکو دیر تک اپنے بدن سے تری خوشبو آئے

تو بہاروں کا ہے عنوان تجھے چاہوں گا
میں تو مر کر بھی مری جان تجھے چاہوں گا

تجھ سے کیا چوری ہے ——
تیرے نینوں کی مستی میری کمزوری ہے !
چمکیلے جھیلوں جیسے نیناں ہیں تیرے سیّاں
ان میں کنول بنکے ہیں تیروں او میرے سیّاں
تیرے ہاتھوں میں میرے سپنوں کی ڈوری ہے
تجھ سے کیا چوری ہے ——
تیرے نینوں کی مستی میری کمزوری ہے
دن ہو یا رات ہمیشہ دیکھوں میں سپنے تیرے
دنیا اس پاگل پن پر کہتی ہے ساتھی میرے
اپنے چندا کی تو یہ بیکل چکوری ہے
تجھ سے کیا چوری ہے ——
تیرے نینوں کی مستی میری کمزوری ہے

نین جھروکے بیٹھ کے سپنے نسدن بین کریں
تڑپے روئے پلکوں کے اس پار کسی کی یاد
ٹوٹے سپنے کرتے جائیں نیندوں کو برباد
ایک سلگتا موتی ڈھالے ہردے کی فریاد
اس موتی کا سودا سارے جگ سے نین کریں
نین جھروکے بیٹھ کے سپنے نسدن بین کریں
پہلے تو آنچل میں لائی رنگ رنگیلے پھول
جی بھرنے پر ہرجائی نے خوب اڑائی دھول
ہم نے پھر دھوکا کھایا دیکھ ہماری بھول
غم سہہ کر بھی یاد کسی کو ہم دن رین کریں
نین جھروکے بیٹھ کے سپنے نسدن بین کریں
کر کے پیار سنہرے گھاؤ کھائے ہیں سو بار
کنگلے من پر کرتی جائے پونجی وار بہ وار
پیار کے تانے بانے کاٹے سونے کی تلوار

گھائل پنچھی ساری بگیا کو بے چین کریں
نین جھروکے بیٹھ کے سپنے نسدن بین کریں

اُک جنم جنم کا روگی اپنا روگ دکھانے آیا ۔ داتا
جنم جنم دُکھ پایا
دین دھرم کی اوٹ سے تیری کھوٹ مٹانے آیا ۔ داتا
یہ کیسا بھیس بنایا

تیرے دوارے دھنوانوں کے وارے نیارے دیکھے
تیرے چرنوں میں نردھن پر چلتے آرے دیکھے
تیرے بھوکے پریم پجاری گور کنارے دیکھے
تیری اندھی شردھا نے کیا کیا اندھیر مچایا ۔ داتا
تجھ کو دھیان نہ آیا

تو نے کالے پیلے بچھو نگر نگر میں پالے !
لوں یہ کیا اندھیر ۔ تم نے اد سانپوں کے رکھوالے
امرت نردنوں میں بانٹے مجھ کو زہر پیالے
کیا اس کارن ہی میں نے تجھ کو بھگوان بنایا ۔ داتا
کیا مانگا کیا پایا

میں تیری ان دیکھی صورت اپنے دھیان میں لاؤں
پربت کاٹ کے پتھر چاٹ کے اپنا جی بہلاؤں
آپ بناؤں تیری مورت آپ ہی پھول چڑھاؤں
میں نے اپنی بھول سے جگ جگ تیرا ڈھونگ رچایا ۔ داتا
اپنا آپ لٹایا
آج میں تیرے اونچے شیش محل کو ڈھانے آیا ۔ داتا
بات چکانے آیا

گوری کیوں سہے تو بیکل ترے گھنگھرو ٹوٹ گئے تو کیا
ناچ اری تو بن پایل ترے گھنگھرو ٹوٹ گئے تو کیا

پایل نے کب گیت بکھیرے
اصل چیز ہیں پاؤں تیرے
تھرکیں گے جب تیرے پاؤں
بچے گا کوئی شہر نہ گاؤں
مچے گی ہر دل میں ہلچل ترے گھنگھرو ٹوٹ گئے تو کیا
ناچ اری تو بن پایل ترے گھنگھرو ٹوٹ گئے تو کیا

جہاں جہاں تو پاؤں دھرے گی
دھرتی کو گلرنگ کرے گی
درد ہنسیں گے غم ناچے گا
سناٹا چھم چھم ناچے گا !!
ٹوٹا نہیں کوئی تاج محل ترے گھنگھرو ٹوٹ گئے تو کیا
ناچ اری تو بن پایل ترے گھنگھرو ٹوٹ گئے تو کیا

یہ لہراؤ تیرے بدن کا
کب نہیں مہکا کب نہیں چھنکا
تجھ کو پتہ نہیں او دیوانی
سب سے بڑا ہے گیت جوانی
تیری جوانی ہے چنچل ترے گھنگھرو ٹوٹ گئے تو کیا
ناچ اری تو بن پایل ترے گھنگھرو ٹوٹ گئے تو کیا

گوری تجھ میں ایسی لچک ہے
جس کی پہنچ ہر دھڑکن تک ہے
جب تک تجھ میں ہے یہ جادو
بجے گا ٹوٹ کے بھی ہر گھنگھرو
چھیڑے گی اپنے آپ غزل، تیرے گھنگھرو ٹوٹ گئے تو کیا
ناچ اری تو بن پایل، تیرے گھنگھرو ٹوٹ گئے تو کیا

الفت کی نئی منزل کو چلا
تو باہیں ڈال کے باہوں میں
دل توڑنے والے دیکھ کے چل
ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں

جب چاندنی راتوں میں تو نے
خود ہم سے کیا اقرارِ وفا
پھر آج ہیں کیوں ہم بیگانے
تیری بے رحم نگاہوں میں
دل توڑنے والے دیکھ کے چل
ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں

کیا کیا نہ جفائیں ہم نے سہیں
پر تم سے کوئی شکوہ نہ کیا
اس جرم کو بھی شامل کر لو
میرے معصوم گناہوں میں
دل توڑنے والے دیکھ کے چل
ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں

ہم بھی ہیں وہی تم بھی ہو وہی
یہ اپنی اپنی قسمت ہے
تم کھیل رہے ہو خوشیوں میں
ہم ڈوب گئے ہیں آہوں میں
دل توڑنے والے دیکھ کے چل
ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں

یہی نا، کہ دُنیا ملامت کرے گی — ہمیں پر بہکنے کا الزام رکھ دو
جو تم میں نہیں حوصلہ میکشی کا — خدا کے لئے ہاتھ سے جام رکھ دو

عزیز اب بھی ہے جن کو نام اپنا اپنا — اُٹھا لیں گے خود ہی وہ جام اپنا اپنا
مگر تم ذرا میکدے سے اٹھا کر — یہ رنگیں صلیبیں سرِ عام رکھ دو

یہ جلّاد موسم، یہ قاتل بہاریں — پھر اس پر گلابی گلابی پھواریں
نہ چھوڑیں جو ایسے میں بھی پارسائی — تم اُن کے لئے کوئی اِنعام رکھ دو

سحر کو بچھڑتے ہیں جتنے بھی دلبر — وہ پھر شام کو لوٹ آتے ہیں اکثر
جو لینی ہیں تم کو ہماری دعائیں — سحر کی ہتھیلی پہ اک شام رکھ دو

تمہیں حق ہے پیش آؤ تم بے رخی سے — ہمیں تو غرض ہے فقط روشنی سے
نہ چاہو دِکھانا اگر روئے زیبا — دیا ہی جلا کر لبِ بام رکھ دو

بہت مجھ پہ احسان ہوگا تمہارا — بس اتنی سی تکلیف کر لو گوارا
کِسی فیصلے پر پہنچنے سے پہلے — مرے سامنے میرا انجام رکھ دو

بہت سُن چکے آہٹیں شام سے تُم — حضور اب تو سو جاؤ آرام سے تُم
وہ آیا تو پڑھ لے گا روداد ساری — سرہانے کوئی لکھ کے پیغام رکھ دو

وہیں لوٹ آؤ چلے تھے جہاں سے — نئے دُکھ ملیں گے بھلا اب کہاں سے
قتیلؔ اس تکلف سے بہتر یہی ہے — پرانے دکھوں کا نیا نام رکھ دو

یہ وادیاں، یہ پربتوں کی شاہزادیاں
پوچھتی ہیں کب بنے گی تو دُلہن
میں کہوں جب آئیں گے میرے سجن
میرے سجن ——— چلا بھی آ

آ بھی جا کہ میں نے آج تیرے واسطے
پھر سجا دیئے ہیں زندگی کے راستے
دُور اب نہیں ہے پیار کا حسیں محل
گیسوؤں کی چھاؤں میرے ساتھ چل
گونج اٹھیں گی دِل میں جھانجھیں چھن چھن
میرے سجن — — — — —

کیوں ہوا کے ساتھ ساتھ بھاگ بھاگ کر
خواب کوئی دیکھتا ہے جاگ جاگ کر
اپنی گرم باہوؤں میں تجھ کو تھامنے
دیکھ میں کھڑی ہوں کب سے تیرے سامنے
سُن رہی ہوں تیرے سانس کی سَن سَن
یہ وادیاں — — — میرے سجن

اُڑ رہا ہے پیار بدلیوں کے بھیس میں
یہ سماں بھلا کہاں پرائے دیس میں
ہر طرف یہاں ہیں زِندگی کی راحتیں
میری دھڑکنوں میں گنگنائیں چاہتیں
کھنک رہی ہوں جیسے چوڑیاں کھن کھن
یہ وادیاں ۔ ——— — — —

جس دن سورج کی پہلی کرن اُتری تھی زمیں پر
اُس دن سے میں تجھ سے محبت کرتا ہوں

میرا پیار نئی کوئی بات نہیں
میرا پیار تھا صدیوں پہلے بھی
جو تجھ سے کیا ہے آج وہی
اقرار تھا صدیوں پہلے بھی
جب سب سے پہلا پھول کوئی مہکا تھا چمن میں
اُس دن سے میں تجھ سے محبت کرتا ہوں

آکاش کا رہنے والا تھا
اب دھرتی پر آباد ہوں میں
جنت سے جو نکلا تیرے لئے
اُس آدم کی اولاد ہوں میں
دو دل جب دو انسانوں کے مل کر دھڑکے تھے
اُس دن سے میں تجھ سے محبت کرتا ہوں

یہ دنیا جب تک باقی ہے
میں تیرا ساتھ نہ چھوڑوں گا
تیرے آنچل کے اک جھونکے سے
رخ طوفانوں کا موڑوں گا
جس دن سے پیار کی رسم چلی اے جانِ تمنا
اُس دن سے میں تجھ سے محبت کرتا ہوں

نسیم سحر نے مجھے گدگدایا۔ ہنسایا ہنسا کر یہ مجھ کو بتایا۔ کہ وہ آگئے ہیں
چہکتے ہوئے پنچھیوں نے جگایا۔ جگایا جگا کر یہ مجھ کو بتایا۔ کہ وہ آگئے ہیں
مہکنے لگا پھر گلابی سویرا
ملا مجھ سے بچھڑا ہوا پیار میرا
محبت بھرا گیت بھنوروں نے گایا۔ لبھایا، لبھا کر یہ مجھ کو بتایا۔ کہ وہ آگئے ہیں

دلہن میرے خوابوں کی سجنے لگی ہے
فضاؤں میں پائل سی بجنے لگی ہے
ترانہ کوئی بادلوں نے سنایا۔ سنایا سنا کر یہ مجھ کو بتایا۔ کہ وہ آگئے ہیں

مچلنے لگیں میرے دل کی امنگیں
جواں ہو گئیں پھر پرانی ترنگیں
کس نے مرے دل کو جھولا جھلایا۔ جھلایا، جھلا کر یہ مجھ کو بتایا۔ کہ وہ آگئے ہیں

ہوا مسکرائی، فضا گنگنائی
کس کے لئے سیج میں نے بچھائی
بہاروں نے پھر میرا گھونگھٹ اٹھایا، اٹھایا اٹھا کر یہ مجھ کو بتایا۔ کہ وہ آگئے ہیں
نسیم سحر نے مجھے گدگدایا۔ ہنسایا، ہنسا کر یہ مجھ کو بتایا۔ کہ وہ آگئے ہیں

کوئی پنکھڑی اگر پسند ہو
یہ نہ سوچ کیا کہے گا باغباں
تتلیوں کو تو بنا کے رازداں
پنکھڑی کو توڑ لے۔

جب ترا گزر کسی چمن سے ہو
مت جما نگاہ ایک پھول پر
ہر حسین کلی پہ اپنا حق سمجھ
تو بھی چل ہواؤں کے اصول پر
زندگی کا تو بھی رس نچوڑ دے

تو ٹھہر گیا جو اک مقام پر
تیرے ساتھ کیا چلے گی زندگی
ٹھہرے پانیوں کو ناچنا سکھا
پھینک جھیل میں کوئی تو کنکری
دائروں کو اپنی سمت موڑ لے

تم جو ہو گے جدا ہم کدھر جائیں گے
ٹوٹی مالا تو موتی بکھر جائیں گے
کچھ تو سوچو کہ آپس میں لڑتے ہو کیوں
عقل والے ہو پھر بھی جھگڑتے ہو کیوں
اِن جھمیلوں میں پڑنا بُری بات ہے
مفت میں ضد پہ اڑنا بُری بات ہے
گھر کو جھگڑے سے ویرانہ کر جائیں گے
ٹوٹی مالا تو موتی بکھر جائیں گے

اپنے آنگن کا رکھنا ہے تم کو بھرم
تھک گئے ہو تو حاضر ہیں خدمت کو ہم
خود بھی آگے بڑھو ہم سے بھی کام لو
ایک دوجے کے ہاتھوں کو تم تھام لو
پھر یہ مرجھائے چہرے نکھر جائیں گے
ٹوٹی مالا تو موتی بکھر جائیں گے

یہ دھرتی کیسی دھرتی ہے
جو ہر بچے ہر بالے سے ماں جیسی محبت کرتی ہے
یہ دھرتی کیسی دھرتی ہے

اس ممتا ماری دھرتی کے ہم پر لاکھوں احسان رہے
یہ ہم پہ جان چھڑکتی رہی ہم پھر بھی نافرمان رہے
یہ بھی نہ بتایا اس نے کبھی کیا اس کے دل پہ گزرتی ہے
یہ دھرتی کیسی دھرتی ہے

ہم بھائی بھائی بن کے جئیں سو بار کہا بیچاری نے
پر ہم کو گھیر لیا رنگوں اور نسلوں کی بیماری نے
ہم نادانوں کے لئے پھر بھی جینے کی دعائیں کرتی ہے
یہ دھرتی کیسی دھرتی ہے

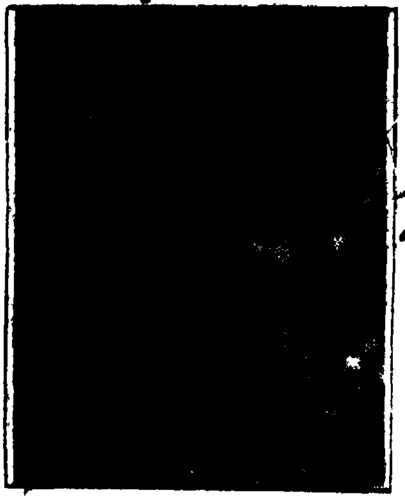
تھی آس کہ اس کا ہر بیٹا انصاف کا پرچم کھولے گا
معلوم نہ تھا ہر شخص یہاں سر دے گا جب سچ بولے گا
یہ پھر بھی جھوٹے لوگوں میں سچائی کا دم بھرتی ہے
یہ دھرتی کیسی دھرتی ہے

جب اس نے چاہا لہرائے اس کے سینے پر ہریالی

ہم نے خونخوار دھماکوں سے اس کی بنیاد ہلا ڈالی!
لیکن یہ اپنی مٹی کے غازے سے اور نکھرتی ہے
یہ دھرتی کیسی دھرتی ہے

دیتا ہے سندیسہ جینے کا ہر دن اس کا ہر رات اس کی
جو موت کے تاجر ہیں ان کے قبضہ میں نہیں حیات اس کی
جی اٹھتی ہے صدیوں کے لئے پل بھر کے لئے جب مرتی ہے
یہ دھرتی کیسی دھرتی ہے۔

ہر طرف پتھروں کا سایہ ہے   میں نے شیشے کا گھر بنایا ہے
ہو گئے ریزہ ریزہ خواب میرے
تو بھی رو مجھ پہ اے شباب میرے
تجھ کو میں نے یہ دن دکھایا ہے   میں نے شیشے کا گھر بنایا ہے
دل میرا کانچ کا کھلونا تھا
ایک دن چکنا چور ہونا تھا
دل جو ٹوٹا تو یاد آیا ہے   میں نے شیشے کا گھر بنایا ہے
کس کا شکوہ کروں خدا میرے
کوئی مجرم نہیں سوا میرے
اپنا دھوکا تو میں نے کھایا ہے   میں نے شیشے کا گھر بنایا ہے
میں ہوں اک درد تو دوا بن جا
موت آئے تو ہی آسرا بن جا
زندگی نے بہت ستایا ہے   میں نے شیشے کا گھر بنایا ہے



ہریانہ دوسرے سبز انقلاب کی راہ پر

ہریانوی عوام وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی کے بے حد مشکور ہیں جنہوں نے کہ :

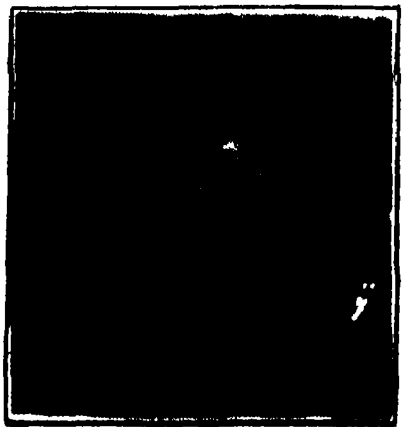
- راوی - بیاس سے ہریانہ کو 35 لاکھ ایکڑ فٹ پانی دلایا ،
- پنجاب کی حدود میں ستلج - جمنا لنک چینل بنانے کے لئے دو سال کی مدت مقرر کی۔
- بھاکڑہ - بیاس انتظامیہ بورڈ کو اس بات کی خاص طور ہدایت کی کہ متعلقہ ریاستوں کو اُن کے حصّے کا پانی ضرور ملے۔



اِقتصادی فائدے :-

اِس معاہدے کے طفیل ہریانہ

- مزید 5.67 لاکھ ہیکٹر زمینوں کو سیراب کر سکے گا
- غذائی اجناس کی پیداوار میں 100 کروڑ روپے سالانہ کا اضافہ کرے گا۔
- ایک دوسرے سبز انقلاب سے اور خوشحال ہوگا۔



اِس مُبارک موقع پر ہریانوی عوام اپنی ہر دلعزیز وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی کے نئے ۲۰ نکاتی اقتصادی پروگرام پر تیز رفتاری سے عملدرآمد کرنے کا از سرِ نو حلف لیتے ہیں۔

—— جاری کردہ : —— محکمہ تعلقات عامہ —— ہریانہ —— چنڈی گڑھ ——

میں

مُدیر فن اور شخصیت

صابر دت کو

قتیل شفائی نمبر

نکالنے پر

مُبارکباد پیش کرتا ہوں

بلدیو مِتر امرتسری

جانی بخشی فلمز کا پُرسُرور تحفہ

میرا دوست میرا دشمن

سٹارنگ: • شترو گھن سنہا • ریتا پاٹل • ڈینی اور خصوصی آمد • بیجو کمار

• ہدایتکار: راج کھوسلہ

• کہانی کار: سورج سنیم
گیت کار: آنند بخشی

• موسیقار: لکشمی کانت پیارے لال

• عکاس: پرتاپ سنہا • پروڈیوسر: جانی بخشی

جانی بخشی فلمز — محبوب سٹوڈیوز — ہل روڈ — باندرہ بمبئی ۵۰۰۰۵۰

"فن اور شخصیت"

کے

قتیل شفائی نمبر

کے لئے

نیک خواہشات کے ساتھ

رامانند ساگر

ہوئی تاخیر تو

آزاد پنچھی

منوج کمار

اس سے پہلے کہ جناب قتیل صاحب کے بارے میں اپنے جذبات لکھوں۔ میں اپنے بزرگ اور قتیل صاحب کے برسوں پرانے دوست جناب قمر جلال آبادی ۔ جو خود بہت بڑے شاعر ہیں ۔ ان کے وچار لکھتا ہوں .....

فن کا سکہ رہے ہیں فنکار ہے قتیل
ہر ایک بزم میں گل و گلزار ہے قتیل
کہتے ہیں عام دفعاں ہے اس کا سخن جواں
سچ پوچھئے تو وقت کی رفتار ہے قتیل
دو ندیوں کا ایک کنارا کہے کوئی ،
محبوب ہند ۔ و پاک کا دلدار ہے قتیل
لیکن مری نگاہ میں اس کی ہے شان اور
یاروں کا یار یارِ وفادار ہے قتیل

شہر بمبئی (بھارت)

برسوں پہلے میرے ایک عزیز دوست نے مجھے سندیسہ بھجوایا کہ تمہارے محبوب شاعر قتیل شفائی صاحب پاکستان سے تشریف لائے ہوئے ہیں ۔ اور وہ میرے ہاں ٹھہرے ہوئے ہیں ۔ تم آجاؤ ۔ تو میں ان کے دیدار کے لئے فوراً شیواجی پارک (دادر) کی طرف چل پڑا ۔ وہاں پہونچ رہا تھا ۔ منزل قریب آرہی تھی اور دل کی دھڑکن تیز ہوتی جارہی تھی ۔ خیر میں اپنے اس عزیز دوست موسیقار جناب بابل صاحب (جو آجکل پاکستان میں ہیں) وہاں پہنچا ۔ میں نے جناب بابل صاحب سے کہا ۔ میں آگیا ۔ بابل صاحب نے فرمایا ۔ قتیل صاحب گئے ۔ میں نے کہا کہاں ۔ بابل صاحب بولے ۔ شاعر کس وقت کہاں ہوتا ہے ، کہاں سے آتا ہے ، کہاں اور کب چلا جاتا ہے ۔ اس سوال کا جواب دینا مشکل ہے ۔ میں نے بابل صاحب سے کچھ کہا تو نہیں مگر دل کی مایوسی پر قابو پا کر یہ محسوس کیا ——— یہ شاعر ——— یہ گیت کار ——— یہ شاعری کا شہزادہ ——— رمتہ جوگی ہے ۔

شہر لاہور (پاکستان)

۲/۳ سال پہلے مجھے ملک کے بٹوارے کے بعد لاہور جانا نصیب ہوا۔ میرے ساتھ میری پتنی اور میرا چھوٹا بیٹا کنال تھا۔ شام گئے ایک دعوت سے واپس آیا۔ ہوٹل میں داخل ہوا تو سامنے ایک انسان کھڑا تھا۔ جس کے ہزار رنگ ہیں اور ان گنت روپ۔ وہ تھے جناب قتیل شفائی صاحب۔ فرمانے لگے کہ آپ دو دن سے لاہور تشریف لائے ہوئے ہیں۔ اور میں دو رات سے سویا نہیں۔

اچھا ہوا یا برا ــــ کہ ان کے اس جملے سے کہ میں سویا نہیں ــــ میں رو دیا تھا۔

وہیں اسی ہوٹل کی لابی میں میں نے اپنے بیٹے رکی (کنال) سے کہا بیٹے فلاں چیز تو سناؤ جو میں تم سے ہر روز سنتا ہوں تو اسی وقت کنال نے گیت گانا شروع کر دیا۔

یہی نا کہ دنیا ملامت کرے گی
ہمیں پر بہکنے کا الزام رکھ دو
جو تم میں نہیں حوصلہ مے کشی کا
خدا کے لئے ہاتھ سے جام رکھ دو
آخر کا شعر تھا ــــ چلو لوٹ آئیں چلے تھے جہاں سے
نئے دکھ ملیں گے بھلا اب کہاں سے
قتیل اس تکلف سے بہتر یہی ہے
پرانے دکھوں کا نیا نام رکھ دو

قتیل صاحب میرے بیٹے کو خاموشی سے دیکھ رہے تھے۔ اس وقت ان کی آنکھوں میں ایک پاور۔ پوتر۔ آدمی۔ انسان یا شاعر کی جھلک نظر نہیں بلکہ ایک نیک۔ فرشتہ سیرت روح نظر آئی۔ جب میں نے کنال سے کہا کہ یہی قتیل صاحب ہیں تو وہ دیکھتا رہ گیا۔۔۔۔ اس کے چہرے پر شرم سی بھی تھی اور شاید ملال بھی۔

پھر خاموشی کو توڑتے ہوئے قتیل صاحب فرمانے لگے کہ اخبارات میں پڑھا ہے کہ آپ ایبٹ آباد بھی جانیوالے ہیں۔

میں نے عرض کیا جی ہاں ــ جانا ہے۔

فرمانے لگے آپ وہاں سے ہیں۔

میں نے کہا جی ہوں تو جنڈیالہ شیر خان ـ ضلع شیخوپورہ (شاعر اعظم پیر وارث شاہ ـ "ہیر" کے خالق کے گاؤں کا) مگر میری پیدائش ایبٹ آباد کی ہے (N.W.F.P) میرے ننہال وہاں سے ہیں۔ اور میری پیدائش وہاں کی ہے۔

ان کا سرخ چہرہ اور لال ہو گیا۔

میں نے کہا میں جانتا ہوں کہ آپ کا تعلق بھی ایبٹ آباد سے ہے۔

زمانے لگے نہیں میں آیت آباد سے پہلے ایک چھوٹی سی جگہ ہے۔ ہری پور ہزارہ۔

میرے چہرے کی مسکان کو اس عظیم ہستی نے جسے دنیا قتیل شفائی کے نام سے جانتی ہے۔ پکڑ لی۔ کہنے لگے۔ کیوں کچھ یاد آیا۔ میں نے کہا — ہاں — کبھی کسی زمانے میں میری والدہ کے دادا کی پھلوں کی منڈی تھی۔

انہوں نے نام پوچھا۔

میں نے کہا پنڈت ایشر داس۔

قتیل صاحب کچھ دیر سوچتے لگے۔ اور پھر پوچھا ایشر داس۔ وہ ملے سے۔ جن کی جیب میں ہمیشہ مٹھائی کی گولیاں رہتی تھیں اور بچے بھی ان کا انتظار کیا کرتے تھے کہ کب وہ آئیں گے اور کب مٹھائی کی گولی ملے گی۔ میں نے کہا جی ہاں۔ تو کہنے لگے پھر پنڈت ایشر داس کیا کہہ رہے ہو — لالہ ایشر داس کہو۔

میں نے کہا جی ہم سب انہیں لالہ جی ہی کہا کرتے تھے۔ تو قتیل صاحب مجھے کندھوں سے پکڑ (اس وقت ان کی آنکھوں میں نمی تھی) کہنے لگے میں نے بھی لالہ جی — اس بزرگ ہستی کی وہ مٹھائی کی گولیاں کھائی ہوئی تھیں — تو قتیل صاحب مجھ سے قد میں چھوٹے ہیں مگر اس وقت مجھے لگا ان کی سادگی — صاف گوئی کا قد زمین سے آسمان تک ہے۔ (چشم بد دور)

مجھے اپنی نئی فلم پنیتر یا بھ کے لئے ان کی ایک غزل چاہیے تھی۔ میں نے خط لکھ کر اجازت مانگی — تو اس خط کا جواب تھا۔ مجھ سے اجازت مانگتے ہوئے تمہیں شرم آنی چاہیے۔

جی، میں شرمندہ ہوں۔ پھر میں نے ایک اور خط لکھا کہ کیا ہی اچھا ہو اگر آپ اس کی ریکارڈنگ پر موجود ہوں۔ قتیل صاحب تشریف لے آئے۔

شان و شوکت — دنیا کو اپنا بڑا پن دکھانے کے لئے لوگ دوسرے شہر۔ دوسرے دیش میں جا کر بڑے بڑے ہوٹلوں میں ٹھہرتے ہیں۔ مگر قتیل صاحب اس گھونے سے جھوٹ اور دکھاوے سے کہیں دور — وہ اپنوں کے پاس رکتے ہیں۔ چاہے وہ بنگلے والا ہو یا جھونپڑے والا — چاہے وہ ہندو ہو۔ مسلمان ہو — سکھ ہو۔

قتیل صاحب کے اندر ایک ایسا آزاد پنچھی ہے جس کی اڑان کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

یہ صحیح ہے کہ چچا "غالب" فرما گئے ہیں کہ

ع کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

گستاخی معاف — چھوٹا منہ — بڑی بات — میں یہ کہہ سکتا ہوں اور کہوں گا کہ ہر پہلو سے — کہتا ہوں کہ "کہتا ہوں کہ قتیل صاحب کا ہے بیاں اور"

بھگوان ان کو ان کے پریوار کو ہمیشہ خوش رکھے

امر ————

"اللہ کرے زور قلم اور زیادہ"

قتیل

شہرت بخاری ۔ لندن

"قتیل شفائی ان چند انسانوں میں سے ہے جس نے اپنے کسی قول یا فعل سے برے دل سے اس احساس کو کم ہونے نہیں دیا ۔ جو اس وقت سے برقرار ہے جب سے میں اسے جانتا ہوں ۔ بعض تعلقات ایسے ہوتے ہیں جن کی ابتدا حافظے میں محفوظ نہیں رہتی اور جن کی انتہا قبر میں پہنچنے کے بعد بھی نہیں ہوتی ۔ تاہم یوں خیال گذرتا ہے کہ ہم دونوں ابھی نوجوانی کے دائرے میں تھے جب ملے تھے ۔ ہو سکتا ہے کہ وہ مجھ سے عمر میں پانچ سات برس بڑا ہو مگر محسوس نہیں ہوتا ہے اس تمام عرصے میں ہم ایک دوسرے میں اگر جذب نہیں ہوئے تو اتنے دور بھی نہیں ۔ ہے کہ دلوں میں اجنبیت کی پرچھائیاں آباد رہی ہوں یہ بات میں اس کی طرف سے اس لئے کہہ رہا ہوں کہ میں نے چاہا ہمیشہ اس کے چہرے پر محبت کی روشنی محسوس کی جب بھی آمنا سامنا ہوا . . . .

وہ نہایت وضع دار ، صاحبِ دل ، فراخ حوصلہ ، وسیع القلب ، اور دشمن کے دکھ میں بھی دکھی ہو جانے والا انسان ہے . . . . انسانوں کو بعض انسانوں سے اختلافات بھی ہوتے ہیں مگر اچھے انسان ان اختلافات کی ایک حد رکھتے ہیں ۔ انسانوں کو بعض انسانوں سے نفرت بھی ہوتی ہے مگر بھلے انسان نفرت کی ایک مقدار مقرر کر لیتے ہیں ۔ جب حریف تکلیف میں ہو ، جب عدو دکھ میں ہو تو صاحبِ دل لوگ سب کچھ بھول جاتے ہیں اور بے قرار ہو جاتے ہیں ۔

قتیل اچھا انسان ہے بھلا انسان ہے ۔ جو انسان اچھا ہو بھلا ہو اس کا دل جھم جھم کرتا ہے . . . اور جن کا دل جھم جھم کرے اس کا شعر کہ جس کا سرچشمہ ہوتا ہی دل ہے کیوں جھم جھم نہ کرے ۔ مجھے کچھ ایسا یاد ہے کہ جب میں شروع شروع میں ملا ہوں تو قتیل کے حالات کچھ اچھے نہیں تھے پس وہ قسمت آزمائی کیلئے راولپنڈی اور مری سے لاہور آ گیا وہ نہایت ایماندار ، محنتی اور دھن کا پکا آدمی ہے ۔ معلوم نہیں کیسے وہ فلمی دنیا میں پہنچ گیا ۔ اور کس جوہر شناس نے اسے زمین سے اٹھا کر مالا میں بند لیا ۔ ادھر وہ ترقی پسند تحریک کے قافلے میں پیش پیش تھا اور اپنے فن کو غزل ، نظم اور گیت کے

ذریعے روز افزوں ترقی اور شہرت کی طرف بڑھتا تھا ادھر فلموں میں اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر اپنی اور اپنے بال بچوں کی مادی ترقی میں منہمک تھا۔ عموماً یوں ہوتا ہے کہ جو فلم میں گیا وہ مجلس شعر کو خیرباد کہہ گیا ... اور رفتہ رفتہ اسے فلمی شاعر کہا جانے لگا .... معلوم نہیں کیسے قتیل نے یہ اہتمام کیا کہ دونوں کشتیوں میں پاؤں رکھے اور کوئی لہر، کوئی بھنور اس کا بال بیکا نہ کرسکا۔ ممکن ہے لوگوں کے ذہن میں ایسی کئی مثالیں ہوں مگر مجھے علامہ آرزو لکھنوی کے سوا کوئی اور مثال یاد نہیں ہے۔ ایسا تو ضرور ہوا ہے کہ اچھے اور باصلاحیت شاعر نے فلمی شاعری کی روایتی معیار سے قطعی مختلف معیار قائم کیا گیا ہو۔ اور نہایت دلکش نغمے تخلیق کئے ہوں ورنہ ایسا ہی عام طور سے دیکھا گیا ہے کہ برکہ در کان نمک رفت نمک شد آخر .....

قتیل کے سلسلے میں یہ بات اطمینان سے کہی جاسکتی ہے کہ وہ ان چند شاعروں میں سے ہے جس نے فلمی شاعری کو نہ صرف قابل قبول بنانے کی کوشش کی بلکہ ساحر اور مجروح کی طرح اس کا ایک ایسا معیار قائم کیا کہ متشاعروں کے چہرے صاف پہچانے جانے لگے۔ اور اصل شاعری میں بھی اپنے مقام سے پیچھے نہیں آیا۔ مشاعروں کے اکثر کامیاب شاعر کاغذ پر چت ہو جاتے ہیں خصوصاً ترنم کی بیساکھیوں کا سہارا لینے والے۔ قتیل شفائی بھی ایک طویل عرصے تک ترنم سے پڑھتا رہا۔ مجھے اس کا ترنم اچھا نہیں لگتا تھا مگر وہ پڑھتا تھا۔ اعتراض مجھے اچھا نہ لگنے کے باوجود یوں نہیں تھا کہ وہ کاغذ پر بھی ویسا ہی اچھا لگتا تھا۔ اور اب جب وہ ترنم ختم کرچکا ہے مشاعرہ اسی طرح لوٹتا ہے جس طرح پہلے لوٹتا تھا۔

یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ وہ طبعاً غزل کا شاعر ہے، کہ نظم کا شاعر ہے کہ گیت کا شاعر ہے۔ جو ردعمل اس وقت میرے ذہن میں محفوظ ہے وہ یہ کہ جیسے اسے مل کر آدمی کو خوشی ہوتی ہے۔ اسی طرح اس کا شعر سن کر ذوق سخن کو لذت محسوس ہوتی ہے۔ اسے پڑھ کر مزہ آتا ہے اور جو شاعری اپنے قاری یا سامع کو تضییع اوقات کا احساس نہ ہونے دے اس شاعری کے کیا کہنے ہیں۔ غرض یہ کہ نہ قتیل کو مل کر وقت کے ضیاع کا احساس ہوتا ہے نہ اس کا شعر پڑھ کر۔

میں اس سے زیادہ اس وقت اور کچھ کہنے کی حالت میں نہیں ہوں۔ شرمسار ہوں سوہن راہی سے اور معذرت خواہ ہوں قتیل شفائی سے " یار زندہ صحبت باقی "

قتیل شفائی

سوہن راہی ۔ لندن

اتنے قلیل عرصہ میں قتیل شفائی سے متعلق کچھ لکھنے کی سعی کرنا بہت ہی مشکل عمل ہے۔ وہ جتنا کھرا اور اچھا انسان ہے اتنا ہی اچھا شاعر بھی ہے۔ اس نے اپنی زندگی کے نشیب و فراز کو شاعری کے گل بوٹوں سے کچھ اس طرح سجایا ہوا ہے کہ یہ ہر ایک شاعر کے بس کا روگ نہیں۔ قتیل شفائی سے میری شخصی ملاقات کو ابھی ایک بھی سال نہیں گذرا لیکن اس تھوڑے سے عرصے میں میں نے قتیل شفائی کی شخصیت کے درپن کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ اس میں مجھے انسانیت، خودداری، پیار، شفقت، خلوص، قربانی، اور زندہ دلی کی وہ دھنک نظر آئی ہے کہ جس کے بیان کیلئے یہ مختصر سی تحریر بہت ہی ناکافی نظر آتی ہے مجھے قتیل صاحب کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کے وہ مواقع میسر ہوئے ہیں جو کہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہیں۔ غرور اور تعصب نام کی کوئی بھی چیز قتیل شفائی کی شخصیت میں نظر نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے دشمن بھی اس کی قدر کرتے ہیں۔ ایک شاعر کو اس سے بڑھ کر اور کیا مقبولیت ہوگی کہ اس کی زندگی میں ہی برصغیر کا ایک معروف جریدہ فن اور شخصیت اس کی ادبی کاوشوں کے اعتراف میں ایک یادگاری نمبر شائع کر رہا ہے۔ ورنہ ہماری تہذیب میں مردہ پرستی کی بیشتر مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔

قتیل شفائی اردو تہذیب کی ایک معتبر اور باوقار آواز ہیں۔ میں گذشتہ فروری پاکستان صرف اس لئے گیا تھا کہ میرے لئے قتیل پاکستان ہے اور پاکستان قتیل چاہیئے تو یہ تھا کہ میں قتیل شفائی کے ساتھ بیتے ہوئے رنگا رنگ لمحات کو کم از کم ایک خوبصورت مضمون کی شکل میں آپ کے سامنے پیش کرتا لیکن وقت کی کمی اور چند مجبوریوں کی وجہ سے ایسا ممکن نہیں ہو سکا۔ تاہم اب میرے ذمہ ہی نہیں بلکہ دیارِ مغرب میں اردو تہذیب کے ہر درد وہ لوگوں پر ایک قسم کا قرض رہ گیا ہے۔ اور امید کرنی چاہیئے کہ ہم قتیل شفائی اور فن اور شخصیت کے قتیل شفائی نمبر کو برطانیہ میں بڑے پیمانے پر پذیرائی کر کے قتیل شفائی کو اپنا خراجِ عقیدت پیش کریں گے۔

فن اور شخصیت کے قتیل شفائی نمبر شائع کرنے کے سلسلے میں میں اپنے کرم فرما محترم صابر دت کو تہِ دل سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

آخر میں صرف یہی کہنا پسند کروں گا کہ صابر دت نے اتنے قلیل عرصہ میں وہ کچھ اردو ادب کے لئے کر کے دکھا دیا جو کہ اردو کے بڑے بڑے رسائل اور مدیر برسوں سے نہیں کر سکے۔ صابر دت جیسے شعراء، ادباء اور ادب دوستوں کے زورِ قلم اور محنت سے ہی آج کے دور میں اردو زبان و ادب کا چراغ روشن ہے۔

دو پیغامات جو دیر میں موصول ہوئے

ڈاکٹر اے۔ اے۔ منشی (چیئرمین اردو اکادمی، مہاراشٹر)

مجھے یہ جان کر بڑی مسرت ہوئی کہ حسبِ سابق جناب صابر دت اردو کے ممتاز و مقبول شاعر قتیل شفائی کی حیات اور شاعری پر ایک ادبی دستاویز مرتب کر رہے ہیں۔ قتیل شفائی ہمارے مقبول ترین گیت نگار شاعر ہیں اور صابر دت صاحب کو میں مبارکباد دیتا ہوں کہ پچھلے سال چھپے ہوئے شاندار فیض نمبر کے بعد اپنے مجلہ "فن اور شخصیت" کا قتیل شفائی نمبر شائع کر رہے ہیں۔ مجھے یقینِ واثق ہے کہ یہ کوشش بھی حسبِ سابق کامیاب رہے گی اور اردو ادب میں ایک گرانقدر اضافہ سمجھی جائے گی۔

عبدالقدوس منشی (۵ر جولائی ۱۹۸۲ء)

نقش لائلپوری — بمبئی

صابر دت!

فن اور شخصیت کی اشاعت سے تم نے وہ کام سرانجام دیا ہے جسے اردو کے بڑے بڑے اجارہ دار نہیں کر پائے۔ تم نے یوں تو ہر نمبر کو خوبصورت، جامع اور ادبی دستاویز کی شکل دی ہے لیکن فیض نمبر نکال کر اردو داں طبقہ کے ذہن میں اپنا مقام بہت اونچا کر لیا ہے ـــــ قتیل نمبر کے اعلان نے لوگوں کو چونکایا ہے لیکن مجھے دلی مسرت بخشی ہے۔ قتیل پُرخلوص انسان اور بانکا شاعر ہے۔ اس کی غزلیں نظمیں اور رسیلے گیت دلوں کو گدگداتے اور ذہنوں کو جھنجھوڑتے ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس نے اپنا مقام برقرار رکھا ہے۔ قتیل مجھے اس لئے بھی عزیز ہے کہ اسکے ہر شعر میں پنجاب کی سوندھی مٹی مہک رہی ہے۔

مجھے یقین ہے قتیل نمبر بھی قتیل شفائی کی شاعرانہ عظمتوں کی طرح قارئین کے ذہنوں پر ہمیشہ ہمیشہ چھایا رہے گا۔
خدا تمہیں تمہاری انتھک محنتوں کا صلہ دے۔

نقش لائلپوری

گفتگو میں لہجہ مطربانہ کا شاعر

طاہر تونسوی

قتیل شفائی کے فن اور شاعری کی ان گنت جہتیں ہیں اور ہریالی سے لے کر چھتنار تک کا ریاضتِ فن کا سفر بلاشبہ قتیل شفائی کی ذہنی اُپج کا آئینہ دار ہے اور اُردو شاعری کا برگد بے مثال، اس کے فنی اور ذہنی سفر کی ایک کڑی "گفتگو" میں قتیل شفائی ایک نئے روپ میں سامنے آیا ہے اور عداوتوں کے نام نہاد پیکروں کو بھی یہ تسلیم کرنا پڑا کہ واقعی قتیل شفائی اردو غزل کا لاجواب شاعر ہے اور غزل کی صحت مند روایات کا عکس پورے عصری شعور کے ساتھ "گفتگو" کی غزلوں میں موجود ہے۔ اس اعتبار سے "گفتگو"، قتیل شفائی کی شاعری کی نمائندگی بھرپور انداز میں کرتی ہے۔ قتیل شفائی نے غزل میں درد و غم کی چاشنی سموئی ہے کہ یاسیت کسی طور سے بھی دستکیں نہیں دیتی بلکہ نغمگی اور طرب ناکی کے شگوفے پھوٹتے ہیں۔ غم کی خنک چھاؤں میں جو منظر نامہ تخلیق ہوتا ہے اور اس سے جس طرح درد کے جزیرے اُبھرتے ہیں۔ وہ بہرحال اُجلے موسموں کی خبر دیتے ہیں۔

من جُل کے برہنہ جیسے دنیا نے کیا ہے
اس درد نے اب میرا بدن اوڑھ لیا ہے
پھیلا ہے ترا کرب قتیلؔ آدھی صدی پر
حیرت ہے کہ تُو اتنے برس کیسے جیا ہے

جھونکوں سے بجلیوں کی بشارت بھی پائیں گے
ہم لوگ موسموں کے ولی بن کے آئیں گے
محنت کبھی کسی کی اکارت نہیں گئی
اک بوند بوئیں گے تو سمندر اُگائیں گے

علامت آج کا بہت بڑا مسئلہ ہے یہ بات درست ہے کہ علامتیں معنوی حسن کو اور بڑھا دیتی ہیں مگر یہ جمالیت اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب علامت کا پورے طور پر ابلاغ ہو جائے قتیل شفائی علامتوں کے خلاف نہیں ہے مگر اس نے جان بوجھ کر علامتوں کے استعمال سے گریز کیا ہے

کیوں کہ علامتیں حقیقت نگاری سے دور لے جاتی ہیں اور اس طرح حقیقت کے پردے میں اپنے تجربات اور وارداتِ قلبی کی باتیں کی ہیں۔ بقول سلیم اختر "گفتگو کی غزلیں قتیل شفائی کے فن میں ایک نئی جہت کی نشان دہی کرتی ہیں اور ان غزلوں میں ایک نیا قتیل نظر آتا ہے۔"

کیا عشق تھا جو باعثِ رسوائی بن گیا
یارو تمام شہر تماشائی بن گیا
بن مانگے مل گئے مری آنکھوں کو رت جگے
میں جب سے ایک چاند کا شیدائی بن گیا
برہم ہوا تھا میری کسی بات پر کوئی
وہ حادثہ ہی وجہِ شناسائی بن گیا

"اسلوب کے الجھاوے اور علامتوں کے طلسماتی کرشمے قتیل شفائی کو پسند نہیں حالانکہ وہ علامتوں کی خوبصورتی کا دل سے قائل ہے۔ وہ قاری سے ابلاغ کا رشتہ قائم رکھنا چاہتا ہے اور اسے بھول بھلیوں میں ڈھکیلنا نہیں چاہتا۔ وہ خود بھی اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ لہجہ اور موضوعات خلائی نہیں ہیں بلکہ ان کا تعلق زمین میں پھیلی ہوئی رنگا رنگ زندگی ہی سے ہے اور یہ شاعری انہیں انسانوں کے لئے کی گئی ہے جو اس کے کردار بھی ہیں اور قاری بھی اور جو خلا میں نہیں۔ زمین پر بستے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ زمین پر بسنے والوں سے غیر زمینی لہجے میں بات کرنا بہت بڑی ناانصافی ہے۔ اگر زمین سے ہمارا ناطہ نہیں ٹوٹا تو ہمیں اس کی مٹی کے مزاج سے آنکھیں نہیں پھیرنا چاہئیں۔"

چناں چہ اس کی شاعری میں اس کی کہی ہوئی باتوں کا پورا پورا عکس ملتا ہے اور وہ غیر زمینی لہجے میں بات نہیں کرتا۔ اس دور کے انسانوں کے دکھ درد کی بات کرتا ہے استحصالی قوتوں کے خلاف آواز اٹھاتا ہے۔ اس کے ہاں ماضی، حال اور مستقبل کے لمحوں کا کرب بے کراں شاعرانہ رعنائیوں کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ اس کے ہاں گھنے سایوں کا جنگل ہے جس میں سائے حرکت کرتے ہیں اور ان میں غزل کے بنیادی وصف تغزل کو بھی برقرار رکھا گیا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس نے غزل کو گیت کی زبان دی ہے چناں چہ قتیل شفائی کی غزل میں جھانجھنیں بجتی ہیں چوڑیاں کھنکتی ہیں۔

اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں بسا لے مجھ کو
میں ہوں تیرا تو نصیب اپنا بنا لے مجھ کو
میں جو کانٹا ہوں تو چل مجھ سے بچا کر دامن
میں ہوں گر پھول تو جوڑے میں سجا لے مجھ کو
مجھ سے تو پوچھنے آیا ہے وفا کے معنی
یہ تری سادہ دلی مار نہ ڈالے مجھ کو
خود کو میں بانٹ نہ ڈالوں کہیں دامن دامن
کر دیا تو نے اگر میرے حوالے مجھ کو

قتیل شفائی چوں کہ ایک ترقی پسند شاعر ہے اور اس نے ترقی پسند تحریک کا بھی بھرپور ساتھ دیا ہے اس لیے اس کی

غزلوں میں بغاوت، احتجاج اور معاشرتی بدحالیوں، بدعنوانیوں، بے انصافیوں، محرومیوں اور جبر و تشدد کے خلاف آواز اُبھرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ وہ انسانوں کے غیر انسانی رویے کے خلاف بھی احتجاج کرتا ہے اور کہہ اُٹھتا ہے۔

اے دوست تیری آنکھ جو نم ہے تو مجھے کیا　　میں خوب ہنسوں گا مجھے غم ہے تو تجھے کیا

اس شعر میں جو گہرا طنز پوشیدہ ہے اس کی کاٹ وہی محسوس کر سکتا ہے جو اس کرب سے گزرا ہے قتیل شفائی راہبروں کے بھیس میں رہزنوں کا بھی علم رکھتا ہے اور وہ ان سے وہی سوال کرتا ہے اور ان کا ہی دامن پکڑ کر صداقتوں کے علم اٹھا کر کہتا ہے ؎

ہم کو پاسبانوں سے برملا یہ کہنا ہے　　کب تلک ہمیں آخر قاتلوں میں رہنا ہے

قتیل شفائی استحصالی قوتوں کے رویے پر گہرے طنز کا اظہار کرتے ہوئے ان کی سازشوں کو بے نقاب کرتا ہے اور یوں وہ بظاہر انفرادیت کا لہجہ اختیار کر کے اجتماعیت کی بات کرتا ہے اور اس کے کرب سے ہر مظلوم کا چہرہ دیکھا جا سکتا ہے

اس دور میں توفیقِ انا دی گئی مجھ کو
کس جرم کی آخر یہ سزا دی گئی مجھ کو

میں نے جو کیا فصلِ بہاراں کا تقاضا
اک پھول کی تصویر دکھا دی گئی مجھ کو

کچھ نام لکھے ہی تھے ابھی میرے قلم نے
کاغذ کی طرح آگ لگا دی گئی مجھ کو

قتیل شفائی کے ہاں کچھ باتیں اُردو غزل کی روایت سے ہٹی ہوئی ملتی ہیں اور یہ اس کا کریڈٹ بنتا ہے کہ اس نے ان کہے مضامین کہے ہیں کہ وہ اُردو غزل کے لیے اجنبی ہیں۔ غزل کی روایت میں رقیب کو بُرا بھلا کہنا اس طرح رچا بسا ہوا ہے کہ اس سے فرار نہیں مگر نئے دور کا شاعر ان مفاہیم کو بھی بدل کر رکھ دیتا ہے وہ محبت کے وسیع تر معنی لیتا ہے وہ ذات کی نہیں بلکہ حالات کی بات کرتا ہے اور یہی رویہ قتیل شفائی کا بھی ہے وہ کہتا ہے ؎

وہ جب سے گیا شہر میں ہے قحطِ رقیباں
اس شہر کی رونق تھی اس اک شخص کے دم سے

چوروں کا احتساب نہ اب تک ہوا قتیل
جو ہاتھ بے قصور تھا وہ ہاتھ کٹ گیا

مجھ میں رچی ہوئی تیری خوشبو تھی اسلئے
بڑھ کر عدو بھی مجھ سے بغل گیر ہو گیا

قتیل شفائی کی یہ غزلیں پڑھ کر جو اہم بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس نے زبان و بیان اور لب و لہجے کو لطیف احساسِ جمال کے ساتھ ہم آہنگ کیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ زندگی کی مختلف جہتوں اور سطحوں پر گہری نظر اور مشاہدے کی وسعت کے باعث اس کی غزل میں بلا کی وسعت، گہرائی اور گیرائی پیدا ہوئی ہے جس میں فن کا گہرا رچاؤ بھی شامل ہے اور اس کا رنگ غزل کے مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ ہے موضوعات کی اس متنوع قوسِ قزح میں قتیل شفائی نے اپنے فن کو معیار سے نہیں گرنے دیا اور جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے ہمارے سامنے ہر بار ایک نیا قتیل شفائی اُبھرتا ہے جو دلوں کی برف کو عارضوں سے شناخت کرتا ہے اور یوں غزل سرا ہوتا ہے

یہ معجزہ بھی محبت کبھی دکھائے مجھے   کہ سنگ تجھ پہ گرے اور زخم آئے مجھے
میں گھر سے تیری تمنا پہن کے جب نکلوں   برہنہ شہر میں کوئی نظر نہ آئے مجھے

قتیل شفائی غزل کو خوب صورت لہجہ عطا کرتا ہے اور یہ لہجہ لہجۂ مطربانہ ہے اس لیے بھی کہ رجائی اور جمالیاتی نقطۂ نظر اس کی شاعری کی بنیاد ہے اور اس طرح کہ اُردو غزل قتیل شفائی کے ذہن پر رحم کر کے اتری ہے اور اسے یوں طاقت گویائی ملی ہے کہ ؎

تھکی انا کا سفر کہاں تک کہیں تو رُک جا کہیں تو دم لے
بنا دیا ہے مسافتوں نے ترے ہی قدموں کی دھول تجھ کو
یہ ریزہ ریزہ سی آرزوئیں کبھی تو کر دے مرے حوالے
میں اپنے بکھرے بدن کی مانند دیکھتا ہوں ملول تجھ کو

قتیل شفائی کی غزل کے بارے میں فیض صاحب نے یہی لکھا ہے کہ

" قتیل صاحب ایک ایسا منفرد رنگ رکھتے ہیں جس میں قریب قریب سب رنگوں کی جھلکیاں ملتی ہیں لیکن رنگا رنگی کے باوجود ان کا کلام یک رنگ ہے۔ اس یک رنگی میں لہجے کو بھی دخل ہے اور معانی کو بھی اور ان کا لہجہ ہمیشہ سے مطربانہ ہے۔ " اور یوں قتیل شفائی کی غزل کے اس مختصر جائزے سے اس کی فنی عظمت پورے طور پر اُبھر کر سامنے آتی ہے اور اب بھی اگر کچھ لوگ اس بات کو تسلیم نہ کریں تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ خدا نے ان کے دلوں پر قفل لگا دیئے ہیں اور چابی گہرے سمندروں میں پھینک دی ہیں۔ شاید یہ اشعار انہیں احساس دلا سکیں ؎

منزل جو میں نے پائی تو ششدر بھی میں ہی تھا   جھانکا تو اپنے خوں کے اندر بھی میں ہی تھا
آخر مجھے پناہ ملی اپنے آپ میں   رقصاں ہو جس میں روح وہ پیکر بھی میں ہی تھا

اور اُردو غزل کی تاریخ اس لہجے کو کب فراموش کر سکتی ہے ؎

میں نے پوچھا پہلا پتھر مجھ پر کون اٹھائے گا   دنیا بولی سب سے پہلے جو تجھ سے شرمائے گا

اس طرح یہ بات واضح ہے کہ قتیل شفائی کی غزل ایک نئی جہت کی علامت بنتی ہے اور اس میں اس کا رشتہ انسانوں سے نہیں ٹوٹتا اور قتیل شفائی کا یہ قول اس امر کی دلالت کرتا ہے کہ وہ ایک پہچان کار ہے اور اس نے فلمی گیتوں میں بھی ادبی چاشنی پیدا کر کے اپنے لیے ایک منفرد رنگ پیدا کیا ہے قتیل شفائی کہتا ہے

لفظوں کی گٹھڑیاں کو سروں سے اتار کر   لوگ اب قتیل میری غزل گنگنائیں گے

(طاہر تونسوی)

⁂ ⁂ ⁂

فیض نمبر کے بارے میں



فیض احمد فیض ــــــــــــــــ بیروت

عزیزی حمیدہ قمر صاحبہ،

تسلیم!

آپ کا خط اور اپنا نمبر ملا۔ دیر آید درست آید تو کچھ پٹی ہوئی سی بات ہے۔ آپ لوگ اس سے کہیں زیادہ داد اور احسان مندی کے مستحق ہیں۔

میں کل ہی کافی طویل غیر حاضری کے بعد یہاں پہنچا ہوں اس لئے کام کا انبار فوری توجہ کا منتظر ہے۔ یہ مختصر رسید ہی رقعہ ہے۔ دو چار دن میں احباب کی فہرست آپ کو بھجوا دوں گا۔ فی الحال اپنے جملہ معاونین اور پاکستان میں جن کی تحریریں یا اقتباسات شامل ہیں انہیں نمبر ارسال کر دیجئے (قتیل شفائی۔ ظفراللہ پوشنی۔ ممتاز حسین وغیرہ وغیرہ) قتیل شفائی نمبر کے لئے بھی ذرا سی فراغت ملی تو کچھ لکھ بھیجوں گا۔ صابر دت کو دعا و سلام پہنچا دیجئے۔

مخلص

فیض احمد فیض

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید ــــــــــــــــ تروپتی (آندھرا پردیش)

محبی صابر دت صاحب!

آداب! فیض احمد فیض پر "فن اور شخصیت" کی مخصوصی اشاعت وصول ہوئی۔ شکر گزار ہوں۔ اتنے ضخیم۔ اتنے دیدہ زیب اور اتنے دقیق شمارے کے لئے میری طرف سے پُر خلوص مبارکباد قبول فرمائیے۔ مضامین۔ تصاویر اور کلام فیض کے انتخاب، غرض کس کس زاویئے سے اس کی ستائش کی جائے۔ لیکن یہ چیزیں کچھ غیر معمولی اس لئے محسوس نہیں ہوتیں کہ ایسے معیاری اور سربلند شماروں کو شائع کرنا تو آپ کی عادت ہو چکی ہے۔ آپ کا مزاج بن چکا ہے۔ یقین ہے اردو ادب کو آپ ایسے معرکہ آرا شمارے دیتے رہیں گے۔ محترمہ سلمیٰ صدیقی صاحبہ کی خدمت میں بھی آداب! امید کہ آپ سب اچھے ہوں گے۔

ایک اور مرتبہ مبارکباد دیتے ہوئے۔

مخلص

اطہر جاوید

کنہیا لال پوسوال ــــــــــــــــ وزیر داخلہ ہریانہ (چنڈی گڑھ)

پیارے صابر دت!

کل شام کی ڈاک سے تمہارا "فیض نمبر" ملا۔ کام کی مصروفیات کی وجہ سے جواب میں تاخیر ہوئی۔

"فن اور شخصیت" نے اردو ادب کی دنیا میں ایک ممتاز نام پیدا کیا ہے اس کے پہلے خاص شمارے ہر اعتبار سے ایک نمایاں حیثیت اور اہمیت رکھتے ہیں آپ نے کمال یہ کیا ہے کہ پاکستان کے "نقوش"۔ "اوراق" اور "فنون" کا جواب ہندوستان

میں ایک ممتاز خصوصیت کے ساتھ پیدا کردیا ہے۔ ادبی جرائد کی تاریخ میں یہ ایک کارنامہ ہے جس کی ایک دائمی حیثیت ہے

صرف دعائے کامیابی   آپ کے کمال اور فن کا معترف

کے ایل، یو سوال

جیلانی بانو

حیدر آباد

محترم۔ تسلیم!

آپ کے دونوں خط ملے۔ "فیض نمبر" بھی ملا۔ دیکھ کر دل خوش ہوگیا۔ یوں تو فیض پر لکھی ہوئی ہر تحریر پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ مگر آپ نے تو اتنی بہت سی تحریریں اور اتنی اچھی تحریریں جمع کردی ہیں کہ سب کو کئی بار پڑھنے کو دل چاہتا ہے۔

آپ اور سلمیٰ آپا مبارک باد قبول کیجئے۔

فیض نمبر میں سلمیٰ آپا کے مزاج کی نفاست اور فن کاری پوری طرح نمایاں ہے۔

خدیجہ بیگم کی پچھلی تحریروں سے میں واقف نہیں۔ مگر صرف اس مضمون کو پڑھ کر ان کے دلکش اسٹائل سے متاثر ہوئی۔ انہوں نے فیض پر بہت اچھا مضمون لکھا ہے۔ سب ہی مضامین بڑی توجہ سے لکھے گئے ہیں بڑی محبت سے لکھے گئے ہیں۔ البتہ مجھے "ٹائیٹل پر آپ نے جو فیض کا چہرا دکھایا ہے وہ اچھا نہ لگا کہ ہم فیض کو بوڑھا اور تھکا ہوا بھی دیکھنا ہی نہیں چاہتے

"فن اور شخصیت" کے ذریعہ آپ نے ہندوستانی رسالوں کا معیار بلند کیا ہے۔ اور جس فن کارپر نمبر چھاپا وہ بڑی توجہ اور محنت کے ساتھ چھاپا۔

فیض نمبر چھاپ کر آپ نے ایک پاکستانی شاعر کو ہندوستانی ادیبوں کا ایک خراج تحسین پیش کیا ہے ویسے ہم تو کسی بھی شاعر ادیب کو کسی مخصوص ملک کے حصار میں قید کرنا نہیں چاہتے۔

سلمیٰ آپا سے میرا اور انور کا سلام کہئے۔

مخلص   جیلانی بانو

کشمیری لال ذاکر

چنڈی گڑھ

ڈیئر صابر!

محبت!

تمہارا خط مل گیا۔ فیض نمبر بھی مل گیا۔ دونوں کے لئے شکریہ۔

واقعی تم نے کئی جگا دریوں کے قد تراشنے کی کوشش کی ہے۔ فیض نمبر ایک بہت ہی بھرپور اور کامیاب کوشش ہے کچھ مضامین تو اتنے اچھے ہیں کہ انہیں دوسری بار بھی پڑھا ہے۔ مس حیدر، مسز سلمیٰ صدیقی۔ تم اور حمیدہ قمر سب مبارک باد کے مستحق ہیں۔

تمہارا بھائی
ذاکر

انیس دہلوی ـــــــ (مدیر فلمی ستارے) ـــــــ دہلی

عزیزم صابر دت صاحب آداب

"فن اور شخصیت" کا فیض احمد فیض نمبر شروع سے آخر تک دیکھتا اور پڑھتا چلا گیا۔ تمام مضامین نہایت معلوماتی، نئے، تیکھے، طباعت عمدہ اور پورا نمبر بہت ہی دیدہ زیب انداز میں اتنے اچھے کاغذ پر پیش کرنا اس مہنگائی کے دور میں کسی اردو کے شمارے کا اتنا زبردست ضخیم نمبر نکالنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ ہم ہندوستانی اردو ادب کے پروانے لاہور کے نقوش کے لئے چشم براہ رہتے تھے لیکن آپ نے متواتر مہندر ناتھ نمبر، غزل نمبر، ساحر نمبر، کیفی نمبر، ساحر نمبر، کیفی اعظمی نمبر، مجروح نمبر، گیت نمبر، کیسٹ نمبر، ادراب فیض نمبر لے نقوش کے نمبروں کی دھاک کم کردی ہے۔ واقعی آپ تو "نمبری ایڈیٹر" نکلے۔

خدا کرے زور قلم و صحافت اور زیادہ!

انیس دہلوی ۱۹۸۶ء
مدیر اعلیٰ۔ فلمی ستارے میگزین دہلی ۶

فکر تونسوی ـــــــ دہلی

صابر دت میاں!

فیض پر تم نے جو ضخیم اور علیم و شمیم بلکہ اسلام و علیکم قسم کا نمبر نکالا۔ اس پر ہمیں تحسین کے ڈونگرے برسانے کو جی چاہتا ہے لیکن آج کل بچاری تحسین اتنی سستی اور بے روح اور مشکوک چیز بن کر رہ گئی ہے۔ کہ اس کا ہر ڈونگرا یوں لگتا ہے جیسے وہ کوئی ڈپلی کیٹ برتی پنکھا ہو۔ جو بنایا تو چاندنی چوک دہلی میں جاتا ہے۔ مگر اس پر کسی مشہور کمپنی کی مہر لگادی جاتی ہے۔

مگر فیض تو ڈپلی کیٹ نہیں اور نہ وہ فلسطینی بچے ڈپلی کیٹ ہیں۔ جن کی معصوم زندگی کے کرب پر اس نے ایک لوری لکھی۔ جب یہ لوری اس نے دہلی کے بہت بڑے ہال میں ہزار ہا انسانوں کو سنائی۔ تو اس لوری نے سب کو رُلا رُلا دیا ــــ تمہارے فیض نمبر میں یہی لوری، فیض کی شخصیت کا لافانی عکس ہے تمہارا پورا نمبر اسی لافانیت کی ایک تاریخی اور کلاسیکل دستاویز ہے جسے بقول میرے ایک دوست کے (میرا وہ دوست معصومیت اور حماقت کا ملا جلا ماڈل ہے) اس دستاویز کو اگر زمین میں دبا دیا جائے اور سو سال بعد کھود کر نکالا جائے تو اس دور کی نسلیں بے ساختہ کہہ اُٹھیں گی۔ " ہاں ہم تو عظیم ہیں ہی۔ مگر ہمارا ماضی عظیم تر تھا۔ جس نے فیض کو جنم دیا۔ اور جس کی شعریت اور اظہار آنے والی ہر صدی کی شعریت اور اظہار بن کر رہ گئی"

میں سوچتا ہوں صابر! تمہیں بھی فیض نمبر کے بعد زمین میں دفنا دیا جائے (زندہ اور مُردہ کی شرط نہیں) اور ایک سو سال بعد محکمۂ آثار قدیمہ تمہیں کھود کر نکالے۔ اور سورخین ادب اس وقت تم پر جو تحسین کے ڈونگرے برسائیں گے۔ وہ ڈپلی کیٹ نہیں ہوں گے ــــ فیض جہاں ایک تہذیب کا خوشگوار نوحہ گر کہلائے گا۔ تم بھی اس تہذیب کی ادبی شخصیتوں کے کلاسیکل ترجمان کہلاؤ گے۔ جس نے اپنی ذات کی صرف واحد تمنا کا ہالہ اپنے اردگرد بنالیا تھا۔ زندگی کا واحد مقصد ــــ کہ وقت کی لافانی ادبی روح کو ضخیم و علیم و شمیم نمبروں کا نفیس و حسین جسم عطا کرنا احتیاطاً عرض ہے کہ فیض نمبر کے بعد شاید ہی تم کوئی جاں بہا نمبر نکال سکو ــــ تمہارے دفن ہو جانے کی معقول وجہ۔

اور نامعقول؟ اس نمبر میں ایک ہی شے تھی۔ اور وہ تھی فکر تونسوی کا بے روح طنزیہ مضمون۔

فکر تونسوی

قتیل شفائی ———— لاہور پاکستان

ڈیئر صابردت۔ سلام شوق

محترمہ بیگم معصومہ رضا کے ہاتھ فیض نمبر کی تین کاپیاں اور آپ کا خط مل گیا۔ مجھے امید ہے کہ اس دوران میں میرا ایک خط بھی آپ کو مل گیا ہوگا۔ دو تین دن سے فیض نمبر کا درشن کرنے والوں کا تانتا بندھا ہوا ہے۔ جسے بھی اس نمبر کی خبر ملتی ہے وہ دیکھنے آجاتا ہے لیکن ایک انار صد بیمار والا معاملہ ہے یہ نمبر کسی کو پڑھنے کے لئے دیا نہیں جا سکتا بس جستہ جستہ پڑھ رہا ہوں آپ نے تین کاپیاں بھیجی تھیں ایک انتظار صاحب کو اور ایک قاسمی صاحب کو دے دی ہے اور تیسری کاپی میں نے رکھ لی ہے۔ ذرا پڑھ لیں تو سب سے لے کر بکھرا دوں گا۔

آپ کا قتیل شفائی

اسد مفتی ———— ایمسٹرڈیم - ہالینڈ

محترم صابردت صاحب! سلام

قتیل صاحب کے ارشاد کے مطابق آپ کی جانب چند تصویریں اور ایک مفصل مضمون ارسال کیا تھا ہنوز رسید سے محروم ہوں۔

جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں قتیل صاحب امریکہ، کینیڈا، اور ولایت سے ہوتے ہوئے نومبر میں میرے غریب خانے پر تشریف لائے تھے خوب محفلیں جمیں اور ہنگامے برپا ہوئے۔ ہفتہ بھر کی رفاقت کے بعد آخر دسمبر میں وہ وطن عزیز روانہ ہو گئے۔ بمطابق حکم میں نے آپ کو ان کی تشریف آوری کی مفصل کارروائی بھجوائی تھی لیکن جواب سے محرومی کی بنا پر دوبارہ آپ کو یاد دہانی کروا رہا ہوں۔ اگر کہیے تو وہ سب کچھ ایک بار پھر لکھ بھیجوں؟

گزشتہ فیض صاحب ماسکو سے دو ایک روز کے لئے میرے گھر تشریف لائے تھے۔ کلام شاعر بزبان شاعر ریکارڈ کر کے اپنی لائبریری میں محفوظ کر لیا ہے۔ چونکہ ان کے پاس وقت کم یاب تھا اس لئے "حکایتیں، شکایتیں،" آئندہ ملاقات پر اٹھا رکھی ہیں۔ ان سے بھی آپ کا ذکر رہا۔

فیض صاحب ،، اپریل میں دوبارہ تشریف لائیں گے۔

انکی زبانی "فن اور شخصیت" کے "فیض نمبر" کی خوش خبری ملی۔ (اس سے قبل میں تخلیق لاہور میں اس کا اشتہار دیکھ چکا تھا) میری یہ دلی خواہش ہے کہ اس نمبر کو جلد از جلد حاصل کروں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ میرا یہ خط ملتے ہی آپ مذکورہ نمبر حوالہ ڈاک فرما دیں؟ اگر ممکن ہو تو زیر دستخطی آپ اور محترمہ سلمیٰ صدیقی کے ممنون رہیں گے کہ اس کا ہدیہ مجھے کہاں اور کس طرح ادا کرنا ہوگا؟

آپ کا ذکر خیر ڈاکٹر حمید اختر (ساحر لدھیانوی کے دوست) اور قتیل شفائی صاحب سے سنا ہے اور فیض صاحب سے بھی گفتگو رہی۔ کبھی فرصت میسر ہو تو ادھر تشریف لائیے کہ یہ خوبصورت شہر ہمیشہ سے خوبصورت لوگوں کا منتظر رہا ہے۔ محترمہ سلمیٰ صدیقہ صاحبہ کو سلام کہیے۔ میں نے کرشن چندر جی کی وفات پر اپنے مضمون کے ہمراہ انہیں خط ارسال کیا تھا۔ جواب سے ابھی تک محروم ہوں۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو اپنا جان کر حکم دیجئے۔

آپ کا مخلص اسد مفتی

اعتراف

"فیض احمد فیض" نمبر سے میں نے ادارۂ فن اور شخصیت میں شمولیت کی۔ غالباً ایک سال ہوگیا، ویسے تو ایک سال کا عرصہ کچھ بھی نہیں ہوتا۔ دیکھا جائے تو بہت کچھ ہوتا ہے۔ میں اخباروں میں پڑھا کرتی تھی کہ ہماری حکومت اردو کے فروغ کے لئے امداد بہم پہنچاتی ہے اور اکثر میں نے اتر پردیش اردو اکادمی، مدھیہ پردیش اردو اکادمی۔ بنگال اردو اکادمی کی اخباروں میں چھپی ادیبوں کے ناموں کی لمبی چوڑی فہرست دیکھی ہیں جن میں ڈیڑھ، دو لاکھ روپیہ ہر سال ڈھائی تین سو ادیبوں میں بطور انعامات تقسیم ہوتا ہے۔ اردو کی طالب علم ہونے کے ناطے میں نے ایک دور میں کسی بھی زبان میں دو ڈھائی سو ادیبوں کی فہرست نہیں دیکھی۔ زبانوں کی تاریخ میں وقت گذرنے پر پانچ تا دس ادیبوں کا ہی نام زندہ و جاوید رہتا ہے۔

فیض نمبر پر جس وقت میں نے کام شروع کیا تو قدم قدم پر دشواریاں راہ میں حائل ہوئیں۔
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں

ادب کی گروہ بندی کی میں قائل نہیں تھی لیکن یہاں میں نے سیاست کی طرح ادب کو بھی حصوں میں بٹتے دیکھا اور پھر صابردت صاحب جیسے محنتی۔ ایماندار۔ قابل آدمی کو ان گروہ بندیوں کے خلاف نبرد آزما پایا۔ ادب جیسی خوبصورت چیز کو کسی تعصب کا شکار نہیں ہونا چاہیے: یہ میرا عقیدہ ہے اور صابردت صاحب کا بھی۔

فیض نمبر کی اشاعت میں ہمیں کتنی دشواریاں پیش آئیں اسکو آپ چھوڑیئے کیونکہ فیض کے چاہنے والوں کی تعداد اتنی ہے کہ ہمارا نمبر چھپ گیا۔

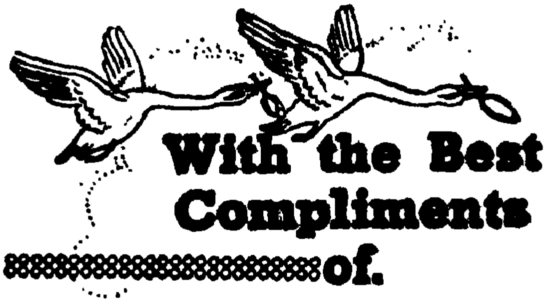
اس کے بعد ہم نے قتیل شفائی صاحب پر کام کرنا شروع کیا اتفاق سے یہ بھی پاکستان کے ہی شاعر ہیں۔ صابردت صاحب نے قتیل نمبر کا خاکہ مجھے بتایا تھا۔ قتیل نمبر جیسا بھی مرتب ہوا اب آپ کے سامنے ہے۔

ہمارے پاس قتیل صاحب کی کتابوں کا ایک ہی سٹ تھا، سو ہم نقاد حضرات کو کتابیں نہیں

بھیج سکے بہت سارے ادیب جو قتیل شفائی پر لکھنا چاہتے تھے کتابیں نہ ہونے کی وجہ سے اُن کے مضامین اس پرچے میں رہ گئے جس کے لئے ہم معذرت خواہ ہیں۔ بقول ڈاکٹر راہی معصوم رضا قتیل صاحب نہ تو سیاسی اعتبار سے بڑے شاعر ہیں نہ ادبی لحاظ سے۔ کسی شاعر کے بڑے ہونے کا فیصلہ تو وقت کے ہاتھوں میں دبا قلم ہی لکھتا ہے جو عوامی پسند و ناپسند کو پیش نظر ضرور رکھتا ہے۔ نظیر اکبرآبادی کو اپنے وقت میں کسی نے نہیں پوچھا۔ سو سال بعد عوام نے اپنا فیصلہ سنا کر نظیر کو بلند مرتبت شاعر بنا دیا۔ کچھ ایسا ہی قصہ قتیل صاحب کے ساتھ بھی ہے
ہم نے کوشش کی ہے کہ اس نمبر میں قتیل صاحب کے کلام کے مکمل انتخاب کے ساتھ اُن کی ایک جیتی جاگتی تصویر آپ کے سامنے آئے۔ اس نمبر میں کچھ فروگذاشت بھی ہیں جن کی طرف اشارہ کر رہی ہوں

- صفحہ نمبر 202 پر ڈاکٹر وحید قریشی کے بجائے ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا نام ہے۔
- صفحہ نمبر 217 پر ڈاکٹر آغا سہیل کے بجائے مظفر بخاری کا نام ہے۔
- صفحہ نمبر 233 پر تاج سعید کے نام کے بجائے امجد اسلام امجد کا نام ہے۔
- صفحہ 13 پر فہرست میں نصیح اکمل کی جگہ فصیح احمد غلطی سے لکھ دیا گیا ہے۔
- صفحہ نمبر 242 پر مظفر بخاری کے بجائے تاج سعید کا نام ہے۔

اور اب اجازت دیجئے
خدا حافظ
حمیدہ قمر



My Compliments

To,

Hamida Qamar

who is deeply involved in the process of giving a definite shape to eminent personalities. I highly appreciate the fortitude, she maintained. She has proved beyond question.

JAHANARA

Statement about ownership and other particulars about "FANN AUR SHAKHSIYAT" (Urdu) Magazine.

FORM IV

(See Rule 8)

1.	Place of Publication	:	38, Police Court Lane, Handloom House Annexe, Fort, Bombay 400 001.
2.	Periodicity of its Publication	:	Six Monthly, (Urdu)
3.	Printers Name	:	Hamida Qamar Partner Nargis Publications
	(Whether Citizen of India)	:	Yes
	Address	:	38, Police Court Lane, Handloom House Annexe, Fort, Bombay 400 001.
4.	Publisher's Name	:	Hamida Qamar Partner Nargis Publication
	(Whether Citizen of India)	:	Yes
	Address	:	38, Polish Court Lane, Handloom House Annexe, Fort, Bombay 400 001.
5.	Editors Name	:	Sabir Dutt
	(Whether Citizen of India)	:	Yes
	Address	:	38, Police Court Lane, Handloom House Annexe, Fort, Bombay 400 001.
6.	Name and Addresses of individuals who own the magazine and partners or Share holders holding more than one per cent of the Total Capital	:	Sabir Dutt Hamida Qamar 38, Police Court Lane, Handloom House Annexe, Fort, Bombay 400 001.

I, Hamida Qamar, hereby declare that the particulars given above are true to the best of my knowledge and belief.

Sd/-

HAMIDA QAMAR,
Publisher.

Congratulations

to

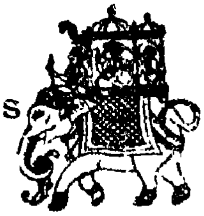
Editors of Fann Aur Shakhsiyat

With their latest issue on Qateel Shifai, they will teach the intellectuals to get out of their ivory towers.

Haji Mastan Mirza
Bawaji Bhai



WITH BEST
COMPLIMENTS
FROM



MANOJ KUMAR

and his
Unit of

PAINTER BABU

Issued by V. I. P. Films